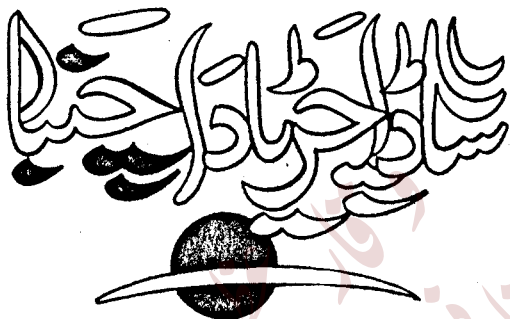


سازگار چاند لکھنا

نقیسہ عید





نفیسہ حمید

خواتین ڈائجسٹ

37- اُردو بازار، کراچی

پیش لفظ

مرد و زن کائنات کے دو ایسے رنگ ہیں جن میں سے کسی ایک کی بھی کمی اس کائنات کو پھیکا کر دیتی ہے۔ ان دونوں کے درمیان موجود ہر رشتہ اس کائنات کو خوب صورتی عطا کرتا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر ایک رشتہ کے درمیان محبت موجود ہو، بغیر محبت کے دنیا کا ہر رشتہ اپنی افادیت کھو دیتا ہے۔ خاص طور پر میاں بیوی کا رشتہ جو بظاہر سب سے زیادہ مضبوط، مگر درحقیقت سب سے زیادہ کمزور رشتہ ہوتا ہے جسے کسی بھی مرد کی زبان سے نکلے صرف تین لفظ پل بھر میں توڑ دیتے ہیں۔ حالانکہ سورہ النساء میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

”ذُرُوا اسَ اللہ سے جس کے واسطے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور رشتوں (کے ٹوٹنے) سے، بے شک اللہ تم پر نگران ہے۔“ (آیت نمبر ۱۷۶)

حلال کاموں میں ”طلاق“ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک ناپسندیدہ امر ہے جس سے بچنے کا حکم بار بار دیا گیا۔

اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت کا وارث مقرر کرتے ہوئے ہمیشہ اس سے نیک سلوک کرنے کا حکم دیا۔ مگر افسوس! ہمارے معاشرے میں ایسے مرد کثرت سے موجود ہیں جن کے نزدیک عورت کی حقیقت ان کے پاؤں کی جوتی سے بڑھ کر نہیں۔ ایسے مرد عورت کا استحصال کرتے وقت اپنے رب کے ہر حکم کو بھلا دیتے ہیں۔

میں نے اپنے اس ناول کے ذریعے ایسے ہی مردوں کو ایک پیغام دیا ہے جو عورت کو کمزور ترین ہستی سمجھ کر اسے ذلیل و خوار کرنا چاہتے ہیں، وہ مرد نہیں جانتے کہ عورت صرف اس وقت تک کمزور ہے جب تک وہ مرد کی محبت کے حصار میں ہو اور اس کے قدموں تلے رشتوں کی سرزمین موجود ہو۔ مگر جب اس سے یہ چھت چھین کر اسے اس بھری دنیا کی تپتی دھوپ میں جھلنے کے لیے چھوڑ دیا جائے تو پھر عورت سے زیادہ مضبوط ترین ہستی کوئی اور نہیں ہو سکتی اور ایسی عورت بڑے بڑے پہاڑوں کو ریزہ ریزہ کر سکتی ہے جس کا ثبوت یقیناً ”نبیرہ“ نے ضرور دیا ہے اور مجھے امید ہے عورت کی مضبوط قوت ارادی پر مبنی یہ ناول آپ سب کو ضرور پسند آئے گا۔

جملہ حقوق محفوظ ہیں

باراؤل 2013

ناشرین خواتین ڈائجسٹ

پریس پرنٹ لائن

قیمت 300 روپے

سول ایجنٹ:

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37، اردو بازار، کراچی

انتساب

سادا چڑیا دا چنبا

”عورت کے نام“

جس کی نفرت و محبت کی کوئی انتہا نہیں

اور

جس کے وجود کے بغیر یہ دنیا ناممکن ہے۔

”عورت، کبھی بھی میری کمزوری نہیں رہی اور یہ مجھے صرف ایک ہی رشتے میں اچھی لگتی ہے اور وہ ہے
”ماں“ کا رشتہ باقی اس سے وابستہ سارے رشتے فصول اور بے کار ہیں خاص طور پر بیوی کا رشتہ اور ازدواجی
تعلقات یہ ہی وجہ تھی کہ میں نے کہاں کو ہمیشہ شادی سے منع کیا پھر بھی جانے کیل انہوں نے میری شادی
کر دی۔“ کسی خوب صورت جملے کی منتظر بیوی نے ایک دم ہی سراٹھا کر اپنے سامنے موجود شخص پر نظر ڈالی جو اس
کے وجود سے یکسر بے نیاز بڑے ہی ظالمانہ انداز میں اپنا جزیہ پیش کر رہا تھا۔
”تم یہ مت سمجھنا کہ اپنی خوب صورتی کو مجھ پر بطور ہتھیار استعمال کر سکتی ہو کیونکہ میرے نزدیک خوب
صورتی کا معیار کافی مختلف ہے اور میرے معیار کے اعتبار سے تم میں کچھ بھی ایسا نہیں ہے جو مجھے متاثر کر سکے۔“
دھڑام دھڑام اس کے آس پاس بنے اونچے اونچے تاج محل زمین بوس ہونے لگے۔ یک دم ہی اسے ایسا
محسوس ہوا جیسے کسی نے پکھلا ہوا سیسہ اس کے کانوں میں اور ٹیل دیا، تو جین کا شدید احساس اس کے تن بدن کو
جلا گیا اور اسی جلن نے اسے دنیا وافیہا سے بل بھر میں ہی بے خبر کر دیا وہ بھول گئی کہ وہ کہاں موجود ہے؟ اور سامنے
بیٹھے شخص سے اس کا کیا رشتہ ہے اسے یاد کرنے پر بھی یاد نہ آیا کہ اس طرح کا انداز گفتگو اس سے پہلے بھی کبھی
کسی اور کا دیکھا ہے یا نہیں۔ وہ تو ہمیشہ خوب صورت الفاظ اور شیریں لہجہ سننے کی عادی تھی تو پھر یہ سب کیا تھا؟ اور
یہ سب کہنے والا کون تھا؟

اس کا شوہر اس کا مجازی خدا ہے جس نے پہلے ہی دن اسے کوئلوں کی بھیڑ پر بٹھا دیا تھا۔
”میرے اللہ! میری ساری زندگی اس شخص کے ساتھ کس طرح گزرے گی۔“ اپنی آئندہ زندگی کے تصور نے
اس کے حواس چھین لیے وہ یک دم ہی برف کی مانند ٹھنڈی ہو کر وہیں گر گئی۔



”تم بہت خوبصورت ہو۔“ سان اس کے کان کے قریب مگلتایا۔

”مجھے پتا ہے۔“ وہ اٹھ اٹھی۔

”آپ کوئی نئی بات بتاؤ۔“

”ایک تیار تم بھی بڑی خوش فہمی کا شکار ہو میں تو صرف مذاق کر رہا تھا۔“

”اوپھ! تو یہ مذاق تھا؟“ اس نے غصے سے اچکا کر سوال کیا اور ساتھ ہی برا سامنہ بھی بنایا جسے دیکھ کر سان نور سے ہنس دیا۔

”ایک بات بتاؤ تم کیوں چاہتی ہو کہ میں ہر وقت تمہارے حسن کے قہیدے پر ہتھاروں میری جان کبھی کبھی سچ سننے کی عادت بھی ڈالو صحت کے لیے اچھا ہوتا ہے۔“ پیو کے چہرے پر آئے بالوں کو سان نے اپنے ہاتھوں سے پرے ہٹایا۔

”اور سچ صرف اتنا ہے کہ تم اپنی تمام تر بد صورتی کے ساتھ میرے لیے دنیا کی خوب صورت ترین لڑکی ہو اور میں تم سے بے حد شدید محبت کرتا ہوں اتنی کہ شاید تمہارے بغیر گزرنے والا میرا دن زندگی کا آخری دن ہو گا۔“ سان کا شرارتی لہجہ ایک دم ہی گہیر سا ہو گیا۔

”چلو بہت ہو گیا ہو آگے سے مجھے اندر جانا ہے رحاب باجی میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔“ وہ سان کو ہٹاتی اندر داخل ہو گئی کیونکہ اسے علم تھا کہ رحاب جو کہ غنچہ سب اس کی بھابھی بننے والی تھی اس کی اور سان کی دلی وابستگی سے آگاہ تھی اور یہی وجہ تھی کہ جب بھی وہ رحاب سے ملنے آتی کسی نہ کسی بہانے گھڑی دو گھڑی یا ہر گھڑی ہو کر سان سے بھی بات کر لیتی ورنہ تو جانے کیوں سان سے اس کا بات کرنا اس کے بابا اور بڑے بھائی جنید کو بالکل بھی پسند نہ تھا کیونکہ شاید انہیں سان ہی پسند نہ تھا اور اس کی وجہ غالباً ”سان کی لا پرواہ فطرت تھی۔“

وہ پچھلے دو سالوں سے انٹر کے امتحان میں فیل ہو کر سب ہی کے لیے مذاق بناتا ہوا تھا جس کا احساس اسے بالکل بھی نہ تھا حالانکہ رحاب کا اکلوتا بھائی اور منجمن آئی کا کلا کو تاپنا ہونے کے ناتے اس پر بے حد مذمہ داریاں عائد تھیں جن سے وہ خود کو شاید اس لیے بھی بری الذمہ سمجھتا تھا کہ اس کے والد کی چھوڑی ہوئی بیٹیے تھا شاید اس کے سبب منجمن سے لے کر آج تک انہیں کسی مالی مسائل کا سامنا نہ کرنا پڑا اس کی والدہ ایک معاملہ فہم اور کافی دانش مند خاتون تھیں یہی وجہ تھی کہ سب حساب کتاب انہوں نے بڑے احسن طریقے سے سنبھالا ہوا تھا جس کے سبب سان اور رحاب کی زندگی بڑے مزے سے گزر رہی تھی اور کسی قسم کی شینش ان کی زندگی کا کبھی بھی حصہ نہ رہی تھی۔

”شفایہ برتن اٹھاؤ یہاں سے۔“ ٹی وی والے کمرے میں داخل ہوتے ہی جنید کی پہلی نگاہ کوٹنے والے صوف پر پڑی جو پیو کے نام سے منسوب سمجھا جاتا تھا وہاں رکھی پلیٹ اس میں بچا ہوا ٹھوڑا سا سالن اور چائے کا کپ اس بات کی نشاندہی کر رہا تھا کہ وہ کالج سے واپس آچکی ہے اور یقیناً ”کھانا کھا کر اپنے کمرے میں سونے بھی جا چکی ہے اس کی اس روئین کا تقریباً“ سارا گھر ہی عادی تھا اس کی یہ عادت منجمن سے ہی تھی ٹی وی دیکھنے کے ساتھ کھانا کھانا چائے پینا اور برتن اپنی جگہ پر ہی چھوڑ کر سونے چلی جاتا جو کہ اس کے بعد ہمیشہ شفایہ اٹھاتی تھی ابھی بھی جنید کے پکارے تھے وہ ڈانٹنگ ٹیبل پر بیٹھیں رکھتی ہوئی اندر آئی اور فوراً ”یہی برتن اٹھا کر واپس لٹی۔“

”ٹی وی کا ریموٹ وینا زرا میں اٹھانا بھول گیا۔“ جنید نے صوف پر نیم دراز ہوتے ہوئے شفایہ کو پھر سے پکارا اسے شاید عادت تھی کہ اپنے چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے بھی ہمیشہ شفایہ کو ہی پکارا کرتا تھا اور شفایہ بھی ایسی ہی بے لوث اور خدمت گزار لڑکی سب ہی کے کام آنے والی اس کی اور پیو کی عادتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا پھر

بھی دونوں آپس میں بہن سے زیادہ دوست تھیں اور اس کی ایک وجہ شاید شفایہ کی صلح جو عادت تھی جس کے باعث آج تک دونوں بہنوں میں کبھی معمولی سی بھی کھٹ پٹ نہ ہوئی تھی ان کی دوستی اور پیار پورے خاندان میں مثالی سمجھا جاتا تھا۔

وہ جیسے ہی یونیورسٹی سے گھر آئی گھر میں ہونے والی چل چل سے ہی اندازہ ہو گیا کہ کوئی خاص مہمان آنے والے ہیں اور ان مہمانوں کے بارے میں رحاب کو پہلے سے ہی پتا تھا کیونکہ تا صرف رات میں اسے اپنی بہن بتا دیا تھا بلکہ جنید نے بھی اسے اس سلسلے میں فون کر دیا تھا یہی وجہ تھی کہ بجائے کچن میں جانے کے وہ سیدھی اوپر اپنے کمرے میں آئی تاکہ جلدی سے فریش ہو کر نیچے جا کر امی کا ہاتھ بنا سکے اسی لیے جلدی سے اپنا بیگ رکھ کر اس نے الماری سے کپڑے نکالے اور واپس پلٹی کہ اسی دم دروازہ کھول کر سان اندر داخل ہوا۔

”آپ کا کپڑو ٹھیک ہے؟“

”ہاں کیوں؟ خیریت کوئی کام تھا؟“

”ہاں یار! میرا لپ ٹاپ کام نہیں کر رہا۔“ کہنے کے ساتھ ساتھ اس نے کپڑو ٹران کر لیا۔ رحاب بنا کوئی جواب دینے کا ہاتھ روم میں چلی گئی اور جب وہ نما دھو کر باہر نکلی تو سان ابھی بھی کپڑو ٹران ہی موجود تھا۔ اسے خاصی حیرت ہوئی کیونکہ عام طور پر اس وقت وہ گھر میں نہ ہوتا تھا بقول جنید کے باہر آوارہ گردی کر رہا ہوتا تھا اپنے دوستوں کے ساتھ رحاب نے ایک نگاہ اس کی جانب ڈالی اور ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے سیلے بال سلجھانے لگی۔

”آپ کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے چلاتے رک کر سان نے اسے پکارا۔

”ہاں بولو۔“ اندازہ تو اسے ہی تھا کہ سان کچھ کہنا چاہتا ہے اور کچھ کچھ وہ جان بھی چکی تھی مگر پھر بھی سان کے منہ سے سننا چاہتی تھی کہ وہ کس الجھن میں مبتلا ہے۔

”آج ڈریسنگ روم میں آ رہے ہیں نا؟“

”ہاں۔“ مختصر جواب دے کر اس نے شیشے سے ہی پیچھے بیٹھے سان کی کمر پر ایک نظر ڈالی۔

”آپ کی۔“ وہ شیشے میں مبتلا تھا۔

”جلدی بتاؤ سان کیا بات ہے مجھے نیچے جا کر امی کے ساتھ کام کروانا ہے تم جانتے ہو نا کہ امی اکیلی کب سے مصروف ہیں۔“

”وہ ایسا ہے کس۔“ وہ کپڑو ٹران کر کے اٹھ کھڑا ہوا اور رحاب کے عین مقابل آگیا رحاب خاموش کھڑی اس کے آگے بولنے کا انتظار کرتی رہی۔

”آپ امی سے کہیں کہ وہ آپ کی ڈیسٹ فکس ہونے سے پہلے میرے اور پیو کے رشتہ کی بات بھی انکل سے کر لیں۔“

جانے کیوں سان کے دل کو یقین تھا کہ اگر رحاب اور جنید کی شادی ہو گئی تو پھر اس کا رشتہ پیو سے ہونا تقریباً ناممکن ہے اسی خوف کے سبب اس نے اپنی دلی خواہش بہن کے ذریعے ماں تک پہنچانے کا فیصلہ کیا اس کی یہ بات سن کر پہلے تو رحاب حیران ہوئی اور پھر ہنس دی۔

”حد ہے یار میری جان پر پنی ہے اور آپ ہنس رہی ہیں۔“ وہ قدرے ناراضی سے بولا۔

رحاب نے ایک نظر اپنے سامنے کھڑے ٹھوڑے چار سال چھوٹے بھائی پر ڈالی جو قد و قامت میں رحاب سے کہیں اونچا ہو چکا تھا تا صرف قد و قامت بلکہ دیکھنے میں بھی وہ رحاب سے بڑا ہی دکھتا تھا اسے اس وقت سان پر

”بہت پار آیا۔“
”دیکھو سنان فی الحال یہ وقت یہ بات کرنے کے لیے مناسب نہیں ہے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی رحاب نے اسے سمجھانے کا فیصلہ کیا۔

”کیوں۔ اس وقت کیا ہے؟“
”تم اچھی طرح جانتے ہو کہ انکل احتشام اپنی زندگی میں سب سے پہلا مقام تعلیم کو دیتے ہیں اور اس سلسلے میں ان کے اصول نہایت سخت ہیں یہی وجہ ہے کہ ناصرف وہ خود بلکہ ان کی ساری اولاد ہی بہت قابل ہے۔“ وہ ذرا سارے کی اور بھائی پر ایک نظر ڈالی۔

”تم اور امان شروع سے ایک ہی ساتھ پڑھتے رہے ہو اور اب وہ ماشاء اللہ انجینئرنگ کا طالب علم ہے جبکہ تم نے سیکینڈ ایئر ہی پاس نہیں کیا پھر کس بنیاد پر امی تمہارے رشتہ کی بات کریں۔“ رحاب کی بات کافی حد تک درست تھی۔

”فہم آپلی ایہ سب جائیداد میری ہی تو ہے پھر کیا ضرورت ہے مجھے اعلیٰ تعلیم پانے ہو کرو سروں کی نوکری کرنے کی بس ذرا امی مان جائیں تو ان شاء اللہ جلد ہی اینارٹس شروع کروں گا اور یہ بات آپ لوگ انکل کو بھی سمجھا دیں کہ وہ میری نوکری نہیں قابلیت دیکھیں۔“ وہ اپنی غلطی تسلیم کرنے پر آمادہ ہی نہ تھا۔
”کون سی قابلیت؟“ رحاب نے ذرا اٹھیے لہجہ میں سوال کیا سنان کڑبڑا گیا اس سوال کا کوئی جواب فی الحال اس کی پاس نہ تھا۔

”پہلے تم برٹس شروع کرو کسی قابل ہو جاؤ پھر ہم تمہارے رشتہ کی بات انکل سے کرتے اچھے بھی لگیں گے ورنہ خود کو جسید کی جگہ رکھ کر سوچو کیا تم اپنی بہن کا رشتہ ایک ایسے لڑکے سے طے کر سکتے ہو جو انٹر کا امتحان بھی پاس نہ کر سکا ہو۔“ بچے جھلکے انداز میں اسے آئینہ دکھاتی رحاب باہر نکل گئی۔
”طہنت ہے یاران لوگوں کی سوچ پر اب اگر بندہ تعلیم حاصل کرنے کا شوق نہ رکھتا ہو تو کیا وہ لڑکی بھی پسند نہیں کر سکتا۔“ رحاب کے جاتے ہی اس نے نیو کو فون ملا لیا جو غالباً ”جاننا چاہتی تھی کہ سنان کی اپنی امی سے کیا بات ہوئی۔“

”ہاں تو اب کیا بندہ اپنی محبت کی خاطر ایک گریجویشن بھی نہیں کر سکتا، پلیز سنان زندگی کے ساتھ سنجیدہ ہو جاؤ ایسے یہ سب نہیں چلتا۔“ نیو نے جواباً ”اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”کیا مصیبت ہے یا راس تعلیم کو تو تم لوگوں نے میری ضد مٹا دیا ہے مجھے پتا ہے آج رات کو تمہارا باپ اور بھائی نے جب تک یہاں رہنا ہے اپنی قابلیت ہی کے گیت گاتے رہنا ہے۔“ وہ ایک دم ہی غصہ میں آیا ورنہ عام طور پر اسے غصہ بہت کم اور معمولی نوعیت کا آتا تھا اس میں برداشت کی صلاحیت کافی تھی۔
”ہاں تو تم بھی کوشش کرونا قابلیت میں ان کا مقابلہ کرنے کی۔“

”نہیں اچھی طرح پتا ہے نیو میں ہمیشہ کتنی تیاری کر کے امتحان دیتا ہوں پھر بھی جانے متھن کو مجھ سے کیا دشمنی ہے ہمیشہ ٹپل کر دیتا ہے۔“ اس کی تیاری کا نیو کو علم تھا لیکن اس وقت کوئی اور بحث کر کے وہ اس کا دل مزید توڑنا نہیں چاہتی تھی اسی لیے خاموش رہی اور وہ خود ہی جالے کیا کیا بولتا رہا۔
”تم سن رہی ہو یا نہیں کیا کہہ رہا ہوں؟“

”ہاں سنان سن رہی ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ رحاب آپلی ٹھیک کہہ رہی ہیں چلو اب میں فون رکھتی ہوں کیونکہ مجھے تیار ہونا ہے۔“

”ایک منٹ بات سنو میری۔“ اور وہ فون رکھتے رکھتے رک گئی۔

”آج وہ ہی وائٹ اور براؤن فرائڈ پہن کر آتا جو میں نے تمہیں عید پر گفٹ کی تھی۔“ ایک سیکنڈ میں ہی وہ سب کچھ بھول گیا۔

”اور ہاں مندی لگائی تھی تم نے۔“
”ہاں بالکل لگائی تھی۔“

اسے پتا تھا کہ سنان کو اس کے مندی والے ہاتھ بہت اچھے لگتے ہیں۔
”جھاسا تیار ہونا تمہیں پتا ہے تاکہ اس ڈنر کی واحد غلطی یہ ہے کہ اس میں تم آری ہو اور تمہارے دیدار کی چاہ میں ہم ابھی سے آنکھیں فرش راہ کیے بیٹھے ہیں۔“ کچھ لمحے قبل والی ساری ٹینشن اس کے دل سے نکل گئی تھی اب اگر اسے کچھ یاد تھا تو صرف ”نیو“ جسے دیکھنے کے لیے وہ تین گھنٹے گزارا بھی اسی مشکل ترین لگ رہا تھا۔

”یار تمہاری مسرت بہت ہی خوب صورت ہیں۔“ اپنے دوست کی بات پر ذرا کی ذرا نظر اٹھا کر سکندر نے نیو کی جانب دیکھا جو ریڈ شیفلون کی فرائڈ میں نفاست سے میک اپ اور جیولری کے ساتھ تک مک سے تیار خاصی خوب صورت لگ رہی تھی لیکن جانے کیوں اس کا اس قدر تیار ہونا سکندر کو عجیب سا محسوس ہوا۔ وہ آج سنان کے دوست کے گھر دعوت میں انوائٹڈ تھے جو کہ اینڈین مسلمان تھا اور جب سے سکندر یہاں آیا تھا اس کا دوست عباس مسلسل نیو کی تعریفیں کر رہا تھا اور اسے بالکل بھی اچھا نہ لگ رہا تھا جانے کیوں وہ عباس کی یہ سب فضول بکواس برداشت کر رہا تھا یہی وجہ تھی کہ گاڑی اشارت کرتے ہی اس نے ایک بھر پور ناقدانہ نظر نیو پر ڈالی جو کھڑکی کے باہر دیکھ رہی تھی۔

”کیا ضرورت تھی تمہیں اس قدر تیار ہو کر آنے کی ایک دعوت میں شرکت کے لیے تم لوگ اتنا تیار ہوتے ہو جتنا تیار ہمارے یہاں کی عورت شادی کے وقت بھی نہیں ہوتی۔“

”تم لوگ“ سے سکندر کی مراد یقیناً ”پاکستانی تھے کیونکہ وہ اپنی ہر بات میں یہ میسج ”تم لوگ“ ضرور استعمال کرتا تھا نیو نے اس کی کسی بات کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا جبکہ وہ ابھی بھی بولے جا رہا تھا۔

”تم لوگوں کو اور تو کچھ نہیں سکھایا جاتا لیکن منہ پر پینٹ کرنا ضرور سکھایا جاتا ہے گھر کے کسی بھی کام کاج میں زیر و فوقوں کا دل کیسے جیتا جاتا ہے اس سے لاعلم ہنس چوٹیں گھنٹے بازاری عورتوں کی طرح جتنا سنورنا ہی دیں گی عورتوں کا کام ہے۔“

ایک لمحہ کو تو نیو کا دل چاہا کہ پلٹ کر پوچھے تمہارے ہاں کی عورت اگر لوگوں کے دل جیتنے کا فن جانتی ہے تو پھر کیوں تمہاری بڑی بہن شادی کے دو ماہ بعد ہی طلاق لے کر آئی؟ لیکن اس کے بولنے کا کوئی فائدہ نہ تھا کیونکہ وہ اس انجینی دیس میں ناصرف اپنی زبان بلکہ تمام روایات اور ثقافت کے ساتھ بالکل تن تنہا تھی جبکہ اس کا مقابل اپنے پورے خاندان کے ساتھ تھا جس کا تجربہ گزرتے ہر دن میں نیو کو ہو چکا تھا۔

جب شروع شروع میں اس نے سکندر کی کسی بات پر جواب دینے کی کوشش کی تو ایک عجیب سا رد عمل دیکھنے میں آیا وہ بات صرف سکندر سے کرتی تھی اور جواب اس کا سارا خاندان دیتا جس میں اس کی ماں دونوں بہنیں یہاں تک کہ بڑی بہن کے دونوں بیٹے اور بڑے بھائی بھابی بھی شامل ہوتے ایک بہنوں کی ہی ذرا سا آدھی تھا جو کسی بھی معاملے میں اپنا حصہ ڈالنے سے زیادہ بہتر سمجھتا کہ خاموش رہے ویسے تو شاید نیو کو کسی بھی ایسی صورت حال کا مقابلہ کرنی لینی لیکن اصل مسئلہ زبان کا تھا اس کے سسرال والوں کی ایک عادت بہت ہی بری تھی وہ لوگ اس کے سامنے بیٹھ کر ساری گفتگو ہی ملائی زبان میں کرتے جو اس کی سمجھ میں بالکل بھی نہ آتی سونے پر سہاگہ یہ کہ دوران گفتگو خود پر پڑنے والی تسخیر آمیز نگاہیں اسے احساس دلاتی کہ موضوع گفتگو اسی کی ذات ہے اور

ایسے وقت میں وہ خود کو نہایت ہی بے بس محسوس کرتی اور یہی وہ لمحہ ہوتا جو اسے اپنے وطن سے دوری کا احساس دلالتا یہی وجہ تھی کہ آج جب وہ سکندر کے ساتھ عباس اور اس کی بیوی بیچہ سے ملی تو خاصی خوش ہوئی کیونکہ اس نے کتنے ہی دنوں بعد کسی کو اپنی زبان بولتے سنا تھا اور یہ احساس اتنا خوش کن تھا کہ اس کا دل ہی نہ چاہ رہا تھا کہ وہاں سے گھر واپس آئے لیکن ظاہر ہے کہ گھر تو اسے واپس جانا ہی تھا اپنی ان ہی سوچوں میں گھرے ہوئے اسے سکندر کا مسلسل تنقید کرنا ذرا بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا لیکن وہ بھی جانے کس مٹی کا پتا تھا نیو کے کسی بھی بات کا جواب نہ دینے کے باوجود وہ بولنے سے باز ہی نہیں آ رہا تھا۔ نیو کا سر دھکنے لگا۔

”اور یہ تم اتنی ہیل والی جوتی کیوں پہن کر گئی تھیں؟“ ایک اور تنقید جس کا جواب نیو کے پاس نہ تھا۔
 ”اب بتاؤ بھلا تم لوگ ہاتھوں پیروں پر نیل پالش کیوں لگاتی ہو دیکھنے والا فوراً سمجھ جاتا ہے کہ نماز نہیں پڑھتی اور بدروادار مندی بھی لگانا ضروری سمجھا جاتا ہے۔“
 ”محمد اللہ میں نماز باقاعدگی سے پڑھتی ہوں۔“ اتنی دیر میں یہ پہلا جواب تھا جو نیو نے اس متواتر بولنے ہوئے شخص کو دیا۔

”ویسے میں نے تو کبھی نہیں دیکھا جانے کب پڑھتی ہو بہر حال دوبارہ اپنے پاؤں پر لال نیل پالش مت لگانا ہمارے ہاں کپڑوں اور نیل پالش میں یہ کٹر بند عورتیں استعمال کرتی ہیں اور ویسے بھی لال نیل پالش کے ساتھ عورت کا کچھ عجیب سا تصور ہی میرے دماغ میں ہوتا ہے عجیب بھٹیوں والا کٹر ہے۔ جانے تم کس طرح اتنا ڈارک کٹر لگاتی ہو۔“ سکندر نے شاید چپ ہونا سیکھا ہی نہ تھا۔

”تمہارے پاؤں بہت خوب صورت ہیں۔“ ایک خوب صورت سی آواز اس کے کانوں میں گونجی جو یقیناً ”سان کی تھی اس نے گہرا کر اپنی آنکھیں کھول دیں لیکن اب وہ گاڑی میں نہ تھی اسے سکندر کی آواز بھی سنائی نہیں دے رہی تھی وہ کیا کہہ رہا تھا نیو کو کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا وہ ذہنی طور پر بہت پیچھے جا چکی تھی اس دور میں جب وہ اپنے دلس میں تھی۔

وہ اور رحاب شادی کی شاپنگ کے لیے بازار آئی تھیں امان نے آتے ہوئے سان کو بھی اپنے ساتھ لیا تھا احتشام صاحب اور چند کی طرح امان سان کے لیے مخالفانہ جذبات نہ رکھتا تھا بلکہ ان دونوں کے درمیان کافی اچھی دوستی تھی بازار پہنچتے ہی امان کو اس کا کالج فرینڈ مل گیا وہ اس کے ساتھ بڑی ہو گیا جس کی بنا پر سان ان دونوں کو لے کر جوتوں کی ایک مشہور دکان پر آگیا وہ اپنے جوتوں کی زیادہ تر شاپنگ یہیں سے کرتی تھیں رحاب کے ساتھ ساتھ نیو بھی اپنے لیے جوتے پسند کر رہی تھی جو اسے بارات اور ولیمہ کے سوٹ کے ساتھ پہننا تھے اس کے گورے گورے پاؤں پر لال نیل پالش عجیب سی چھب دکھا رہی تھی ہر بار جب وہ کوئی جوتی ٹرائی کر کے اتارتی تو سان کی نگاہیں اس کے پاؤں پر پڑ جاتیں اور بالا خرہ وہ بول ہی پڑا ”تمہارے پاؤں کتنے خوب صورت ہیں۔“ ۴۴ شہناک سے جوتے پسند کرتی ہوئی بیو چونک اٹھی اور فوراً ”اپنے پاؤں پر ایک نظر ڈالی جو کالی جوتی میں جکڑے بے حد نرم و نازک اور خوب صورت لگ رہے تھے سان کی خود پر اس قدر توجہ اسے مغرور سا کر گئی اور پھر اس دن شادی کے سلسلے میں اس نے جو بھی شاپنگ کی سب سان کی مرضی کے عین مطابق تھی۔ پہلے ہی جوتوں میں اس نے تیار کروائے تھے ان کے کٹر اس نے سان سے پوچھ کر ہی پسند کیے تھے کیونکہ رحاب کی شادی کے دنوں میں وہ بالکل ویسی نظر آتا جیسا تھی جیسی توقع سان اس سے کر رہا تھا حالانکہ اس کی پسند ناپسند میں پہلے ہی سان کا عمل دخل کافی حد سے زیادہ تھا۔ لیکن اسے اچھا لگتا اپنا ہر وہ کام جو وہ سان کی رضا کے مطابق سرانجام دیتی اور سان اسے تو شاید دنیا میں سوائے نیو کے کسی کچھ نظر ہی نہ آتا تھا لیکن اس کے باوجود جانے کیا بات تھی کہ وہ اپنی شخصیت کو

کبھی بھی احتشام صاحب کی مرضی کے مطابق ڈھال نہ سکا شاید یہ اس کے اندر کی سرکشی تھی جو اسے ہمیشہ وہی کام کرنے پر مجبور کرتی جو نیو کے پیپا کو سخت ناپسند ہوتا۔

دو دین کی کھڑکی سے سر نکالے باہر بھاگتے دوڑتے نظارے دیکھنے کے ساتھ ساتھ گھڑی کی سوئیوں کی ٹنگ ٹنگ بھی سن رہی تھی اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ اڑ کر گھر پہنچ جائے کیونکہ بھوک سے اس کا برا حال ہو رہا تھا اور بھوک تو وہ کبھی بھی حال میں برداشت نہ کر پاتی تھی آج سارا دن ہونے والی لگاتار کلاسوں نے اسے تھکا دیا تھا اور پھر جب وہ کینٹین گئی تو وہاں بھی تقریباً ”سب کچھ ہی ختم ہو گیا تھا لہذا اب جو بھی کھانا تھا گھر جا کر ہی کھانا تھا اس خیال میں گم وہ اچانک چونک اٹھی سامنے ہی روڈ پر کھڑا لڑکا یقیناً ”سان ہی تھا اس کے ساتھ اس کے دو دوست بھی تھے اس سارے منظر میں جوبات قابل اعتراض تھی وہ سان کے ہاتھ میں نظر آنے والا سلگتا ہوا سگریٹ تھا جس کے کش لگاتے ہوئے وہ بالکل عادی سگریٹ نوش لگ رہا تھا اس کا مطلب ہے سان سگریٹ بھی پی رہا ہے جب کہ اس کے خاندان میں کوئی بھی ایسا فرد نہ تھا جس کے پاس کبھی بھی نیو نے سگریٹ جیسی خرافات دیکھی ہوں اس کا دل ایک دم ہی غصے سے بھر گیا سان کی اس حرکت نے نیو کی تیز بھوک کو بھی پل بھر میں ہی ختم کر دیا اور وہ تھکے تھکے قدموں سے گھر داخل ہوئی شفا نے اپنی اور اس کی چائے تیار کر دی تھی سامنے ہی ٹیبل پر دھری تھی جبکہ اس نے قریب رکھی ٹرے میں بھی دیکھنے کی زحمت نہ کی کہ آج پکا ہوا کیا تھا خاموشی سے چائے پی اور وہیں کپ رکھ کر وہ اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گئی اپنا موبائل اس نے آف کر دیا تھا وہ آج سان سے بالکل بھی بات نہیں کرنا چاہ رہی تھی اسے سان پر کچھ زیادہ ہی غصہ آ رہا تھا حالانکہ اس سے پہلے کبھی بھی ایسا نہ ہوا تھا آج تو اسے غینہ بھی نہ آ رہی تھی۔ ”کیا بات ہے نیو تم نے آج کھانا کیوں نہیں کھایا؟“

شفا کھانا کھا کر اور نماز پڑھ کر کمرے میں سونے کے لیے آئی تھی نیو کے بے چینی سے ملتے پاؤں دیکھ کر وہ اندازہ لگا چکی تھی کہ وہ کسی ٹینشن میں ہے اور اس کی ہر ٹینشن عام طور پر سان کے متعلق ہی ہوتی تھی اس بات کا خاصا تجربہ شفا کو ہو چکا تھا پھر بھی وہ آج کی ٹینشن کا پس منظر جانا چاہتی تھی۔

”کچھ نہیں یا راجھی میں آئی تو روڈ پر سان کھڑا تھا۔“

”وہ تو روز اس وقت کھڑا ہوتا ہے غالباً“ اسے علم ہے کہ یہ ٹائم تمہارے کالج سے واپسی کا ہوتا ہے۔“ شفا کی یہ بات سو فیصد درست تھی۔

”ہاں لیکن تمہیں پتا ہے آج روڈ پر کھڑا وہ بالکل لٹکے لڑکوں والے اسٹائل میں سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔“ ٹینشن کا پس منظر کھل کر سامنے آگیا۔

”ہاں تو اس میں اتنی ٹینشن والی کیا بات ہے وہ سگریٹ پیتا ہے یہ بات سب ہی جانتے ہیں یہاں تک کہ پیپا کو بھی پتا ہے۔“ شفا نے اطمینان سے جواب دے کر اس کی اس غلط فہمی کو دور کر دیا کہ سان کی اس حرکت کا علم شاید گھر میں کسی کو نہ ہو۔

”تم نے مجھے یہ بات کیوں نہ بتائی پتا نہیں ہر بات مجھے ہی کیوں لیٹ پتا چلتی ہے۔“

اس لیے کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا تم بھی بھی سان کے حوالے سے کسی بات کا یقین نہیں کرتیں تاوقتیکہ خود اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لو بالکل ایسے جیسے آج۔ اگر یہی بات میں تم سے کہتی تو تم نے کتنا تھا کہ سب بکو اس ہے۔ یہ کوئی آج کی بات نہیں ہے جس پر تم اتنی ڈرہیں ہو رہی ہو وہ یہ کارنامہ پچھلے کئی ماہ سے سرانجام دے رہا ہے۔ تیز تیز بولتی شفا اس کی تمام غلط فہمیاں دور کر گئی تھیں اور جب شام کو اس نے یہ سب کچھ سان سے پوچھا تو پہلے تو صاف مکر گیا۔

”تم نے کسی اور کو دکھا ہو گا میں نے تو کبھی سرکٹ پی ہی نہیں۔“
 ”جھوٹ مت بولو سنان! تم اچھی طرح جانتے ہو میں بند آنکھوں سے بھی تمہیں دیکھ لیتی ہوں اس لیے مجھے کوئی غلط فہمی نہیں ہو سکتی۔“
 ”سو رہی یار آج پہلی بار ہی تھی وہ بھی تم نے پکڑ لیا۔“
 ”ایک اور سفید جھوٹ، تمہیں سرکٹ پتے ہوئے کئی دفعہ پایا اور جنید بھائی نے دیکھا ہے۔“ نہ چاہتے ہوئے اسے ان دونوں کا نام لیتا رہا۔ حالانکہ جانتی تھی کہ اس بات نے سنان کو جلنے تو ہے پر بٹھان دیا ہے اور یقیناً ”ایسا ہی ہوا وہ فوراً“ سے پہنچ کر پکڑ لیا۔
 ”تمہارے پایا اور بھائی کو کوئی اور کام نہیں ہے جو ہر وقت میری جاسوسی کرتے ہیں حد ہے یار۔“ اور اب نیو کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ خاموشی اختیار کر لے لیکن پھر بھی اس نے دل ہی دل میں تہیہ کر لیا کہ وہ سنان کو اس بارے میں دوبارہ سمجھانے کی کوشش ضرور کرے گی۔

پہلے گیندے کے پھولوں سے سجایا گیا اسٹیج بہت ہی دلکش لگ رہا تھا آج راحب اور جنید کی رسم جنا جوہال میں ایک جگہ انجام دی جا رہی تھی راحب یلو اور گرین سوٹ میں ملبوس بہت خوب صورت لگ رہی تھی اس کے ساتھ ہی وائٹ کرتے شلوار میں جنید بیٹھا تھا تقریباً ”تمام رسمیں ادا ہو چکی تھیں اب صرف فونو میٹیشن ہو رہا تھا سنان بھی اپنے پروفیشنل کیرئیر کی آنکھ سے ایک ایک منظر کو عکس بند کر رہا تھا بلکہ سچ تو یہ تھا اس ہمارے سارے وقت اس نے نیو کو ہی فوکس کیا تھا وائٹ پاؤں تک اتنی فراک اور چوڑی دار پا جاے میں بے حد خوب صورت لگ رہی تھی سنان دوران رسم بھی سارا وقت اسٹیج پر اس کے قریب ہی منڈلا نا رہا اتنا قریب کہ اسے نیو کے سانس کی آواز بھی واضح طور پر سنائی دے رہی تھی اور ابھی بھی وہ اسٹیج کے بالکل سامنے رکھے صوف پر بیٹھا تھا جبکہ نیو اور شفا دونوں اسٹیج پر موجود تھیں سنان کی نظروں کا محور صرف ایک ہی ہستی تھی وہ مسلسل اس کی تصویریں فوکس کر رہا تھا کہ یک دم ہی اس نے ناگوار سی سے کیرا پرے ہٹا کر اسٹیج پر نظر ڈالی جہاں نیو حمزہ سے کھڑی جانے لیا تائیں کر رہی تھی حمزہ اس کی خالہ کا بیٹا تھا اس کی کسی بات نیو نہ دے سے کھلکھلائی جس کے ساتھ ہی اس کے خوب صورت سفید ٹیگٹینوں والے آئینوں کا عکس اس کے چہرے پر جھلایا سنان یک دم ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا اور تیز چڑوگ بھڑنا اسٹیج پر ان دونوں کے پاس پہنچ گیا۔
 ”ہکس کیو ڈی۔“ حمزہ کی جانب دیکھتے ہوئے اس نے نیو کو بانو سے تمام لیا۔
 ”نیچے آؤ تمہیں امی بلار ہی ہیں؟“
 ”ایک منٹ حمزہ میں ابھی آئی۔“ وہ غصت زدہ ہو گئی کیونکہ حمزہ اس کی جانب تک رہا تھا۔
 ”وائے ناٹ شیور۔“ وہ میرے سے مسکرایا۔

”کیا بد تمیزی ہے سنان! بانو چھوٹو میرا کوئی دیکھ لے گا۔“ ہال میں سب ہی مصروف تھے اور اللہ کا شکر تھا کہ کسی کی توجہ ان پر نہ تھی سنان کی اس حرکت کو صرف شفا نے ہی دیکھا تھا جو وہاں اسٹیج پر ان کے ساتھ موجود تھی اگر جنید بھائی دیکھ لیتے تو یہ سوچ کر وہ ایک دم ہی گھبرا اٹھی اور جلدی سے سنان سے اپنا بانو چھڑوایا۔
 ”یہ حمزہ تم کو کون سی الف لیلی کی کہانیاں سن رہا تھا۔“ طنز کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر شدید غصہ بھی موجود تھا اپنے بلیک کرتے کے بانو کمینوں تک فولڈ کیے۔ نیو سے جرح کرنا سنان اسے بہت ہی اچھا لگا۔
 ”تم مجھ پر رشک کر رہے ہو؟“ نیو نے حیرت سے سوال کیا۔
 ”نہیں جگر میں مرکز بھی اتنے گھٹیا انداز سے تمہارے بارے میں نہیں سوچ سکتا میں تو صرف حمزہ کی تم پر توجہ

دیکھ کر ڈر رہا ہوں تمہارے باپ اور بھائی سے جو انسان کی پہچان اس کے نام کے ساتھ لگی ہوئی ڈگریوں سے کرتے ہیں اور تم اچھی طرح جانتی ہو کہ حمزہ کے نام کے ساتھ دو تین ڈگریاں تو ضرور موجود ہیں ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں۔“
 بات کے اختتام پر اس نے نیو سے تصدیق چاہی۔
 ”پہلی بات تو مجھے جگر مت کہنا کہ ایک دم لو فرنا نہ لفظ لگتا ہے۔“
 ”چلو جگر نہ سہی جان تو ٹھیک ہے نا۔“ وہ شرارت سے ہنسا ہوا ”صرف نیو نے اسے گھور کر دیکھا۔“
 ”دوسروں کی ڈگریوں کو اپنے لیے مسئلہ بنانے سے زیادہ اچھا یہ نہیں ہے کہ ایسی کم از کم ایک ڈگری تم بھی لے لو۔“
 ”ڈگری یعنی کون سی مشکل ہے پیسے سے سب مل جاتا ہے اصل مسئلہ تو تمہارا باپ ہے جو ڈگری بھی تصدیق شدہ چاہتا ہے۔“

”ہاں تو اس میں غلط کیا ہے کیوں نہیں تم اس بات کو سمجھتے۔“ وہ ذرا خفگی سے بولی۔
 ”چلو چھوٹو میرے اتنے اچھے موڈ کو ایسی باتوں سے خراب نہ کرو پیسے تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں نے لی کام میں داخلہ لے لیا ہے اور ان شاء اللہ جلد از جلد ایک ڈگری ہو لڈر ہو ہی جاؤں گا۔“ نیو کی خفگی نے اس تھوڑا سا پریشان کر دیا تھا۔ سوائپنی بات سے وہ اس کی ناراضی دور کرنے کی کوشش کرتا ہوا بولا۔ جس میں کافی حد تک وہ کامیاب بھی ہو گیا۔

آج ریحہ اس سے ملنے آئی تھی جانے کیسے اس کی ساس نے اسے کھانے پر روک لیا ورنہ تو وہ ہمیشہ ریحہ کی ساس کی کمزری ہوئی باتیں ان کی موت کے بعد یاد رکھے رہتیں اور کسی نہ کسی موقع پر ضرور ایسا قصہ سناتیں جو ان دونوں خواتین کے اختلافات پر مبنی ہوتا یہی وجہ تھی کہ جب ریحہ نے شادی کے بعد اس کی دعوت کی تھی تو سکندر نے فوراً ”منع کر دیا۔“

”اس کا گھر کے۔“ اہل سے بہت دور کم از کم ایک سے ڈیڑھ گھنٹہ کا سفر اور میں اتنی لمبی ڈرائیو نہیں کر سکتا۔“ سراسر نالائے والا انداز تھا وجہ صرف اتنی تھی کہ اس کی ساس حاجہ بیگم کو اپنی منہ کا سرال بالکل پسند نہ تھا جبکہ ریحہ کی شادی اسی خاندان میں ہوئی تھی نیو وجہ جاننے کے باوجود خاموش رہی حالانکہ اس کا بہت دل چاہ رہا تھا اپنی پیاری سی کزن سے ملنے کا جو اس کی بہترین دوست بھی تھی اور پھر اس نے بہت ہی سہولت سے ریحہ کو منع کر دیا اس کے انکار کو ریحہ نے انا کا مسئلہ نہ بنایا یہ بھی وجہ تھی کہ آج وہ اپنے میاں عبدالوہاب کے ساتھ اس سے ملنے آئی اس کی آمد نے نیو کو خاصا خوش کر دیا تھا۔ وہ اپنے وطن سے دور اپنوں کے لیے ترسی ہوئی تھی اس کی ساس کچن میں مصروف تھیں وہ اپنی عادت کے عین مطابق کسی کو بھی کچن کے کاموں کو ہاتھ نہ لگانے دیتیں شاید انہیں کسی کا بھی کوئی کام پسند ہی نہ آتا تھا یہاں تک کہ پہلی بار ہی نیو کی کافی ہوئی سبزیوں بھی وہ جھجکت کر دی تھیں جس کے باعث دوبارہ نیو نے کبھی بھی ان کی مدد کرنے کا سوچا ہی نہ تھا اسے اپنی ساس کے ہاتھ کا کھانا طبعی پسند نہ تھا شاید ملائی کھانے یا کھانا کھانوں سے طبعی مختلف ہونے کے سبب ہی نیو کو پسند نہ تھے عجیب جھیکے پیٹھے کھانے اس کے سرال میں کم نمک مرچ کا ہی روان تھا شروع شروع میں تو اسے خاصی مشکل ہوئی لیکن اب اس نے نوڈلز کے کافی ٹیکٹ اپنے پاس رکھ لیے تھے جنہیں وہ ”فولٹا“ دیتا کر کھا لیتی اس کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ بھی تو نہ تھا آخر پیٹ کا دوند خ تو بھرنا ہی تھا کھانا تیار ہو چکا تھا جو اس کی ساس نے اپنی بیٹی رفیدا کے ساتھ مل کر میل پر لگا دیا۔

رفیدا سکندر سے دو سال بڑی تھی اور اپنی طلاق کے بعد ماں ہی کے ساتھ رہتی تھی وہ ایک کوریئر کمپنی میں جاب

کرتی روز صبح آٹھ بجے جینٹری شرت سر اسکارف لیے سائیکل پر سوار اپنے کام پر روانہ ہو جاتی اور پھر رات میں واپس آتی گھر پر سارا دن بیوا اپنی ساس کے ساتھ تنہا ہوتی اس کی ساس بچن کے کام ختم کر کے لاؤنج میں اونچی آواز سے ٹی وی لگا لیتیں۔ جہاں اس کا پسندیدہ ملائی سیریل اس وقت آتا تھا پھر کھانا کھا کر وہ ایک گھنٹہ اپنے کمرے میں سونے ضرور جاتیں لیکن جاتے جاتے ریموٹ کہیں چھپا جاتیں۔ ان کی اس حرکت نے شروع شروع میں تو بیو کو خاصا تپا لیکن اب وہ دیگر تمام باتوں کی طرح اس بات کی بھی عادی ہو چکی تھی۔

”تم اس دن میری دعوت پر کیوں نہیں آئی تھیں؟“ عبدالوہاب باہر سکندر کے ساتھ تھا اور وہ دونوں کمرے میں تنہا تھیں اسی لیے کمرے سے باہر نکلتے نکلتے ریجہ پوچھ بیٹھی۔

”سکندر کا کہنا تھا کہ تمہارا گھر یہاں سے ڈیڑھ گھنٹہ دور ہے اور وہ اتنی لمبی ڈرائیو تک نہیں کر سکتا۔“

”میگا پور یہاں سے صرف ایک گھنٹہ کی مسافت پر ہے جہاں میں رہتی ہوں۔“ ریجہ نے بیو کی طرف دیکھتے ہوئے بتایا۔

”اور تمہیں نہیں پتا کہ میرے گھر کے قریب ہی تمہارا جیٹھ عمر اور اس کی بیوی روزینہ رہتے ہیں جہاں ہر دوسرے دن سکندر بھائی چکر لگاتے ہیں پھر جانے تمہیں کیوں منع کر دیا۔“

وجہ تو وہ پہلے سے ہی جانتی تھی لیکن اب وہ مصالحت کی زندگی گزارنے کی عادی ہو چکی تھی یہ ہی سبب تھا کہ اس نے نہ تو پہلے سکندر سے اس سلسلے میں کوئی جرح کی تھی اور نہ ہی اس کا آئندہ کوئی ایسا ارادہ تھا اسی لیے خاموش رہی ڈانٹنگ نیبل پر ملائی روایتی کھانے موجود تھے وہ ہی ابلے ہوئے چاول لال مرچوں کی چٹنی چھوٹی چھوٹی فرانی پھلیاں اور چکن کا سانپھو پچی پکی سبزیاں بھی نیبل پر موجود تھیں ایک دم ہی بیو کو پاکستانی دعوتیں یاد آئیں اور اس کے ساتھ ہی برائی اور کباب کی مخصوص خوشبو نے اس کے تنہوں سے لگرا کر اسے بے قرار کر دیا آج تو کھانے کے ساتھ تھوڑی نان بھی تھے جو یہاں قریب ہی ایک پاکستانی ہوٹل پر ملتے تھے پھر بھی وہ سب نہ تھا جو پاکستان میں ہوتا تھا وہ خاموشی سے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی تھوڑے سے چاول پلیٹ میں ڈالے اور ذرا سا سانپھو ڈال کر کھانے لگی سانپھو میں موجود چکن بالکل سفید رنگ کا تھا اس کی ساس سالن کو زیادہ بھون کر کھانا جاہلیت کی نشانی قرار دیتی تھیں چکن ذرا سے کھی میں ڈال کر مسالا کے ساتھ ہی پانی ڈال دیا جاتا اور ایسا کھانا سالن گھر کے تمام افراد بڑی رغبت سے کھاتے ماسوائے اس کے اور اب بھی ایسا ہی تھا جبکہ ریجہ بھی خاصی رغبت سے یہ سب کچھ کھا رہی تھی اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ پچھلے دس سالوں سے یہاں رہائش پذیر تھی۔ جو بڑا تھوڑا بہت کھا کر گزارا کرتی اسی لیے اس کی بھوک بالکل ختم ہو گئی تھی اور وہ صرف ضرورت کے تحت ہی تھوڑا بہت کھانا زہر مار کرتی۔

”تم کھانا کیوں نہیں کھا رہی ہو؟“ سے بے دلی سے کھانا دیکھ کر ریجہ نے سوال کیا۔

”یہ اتنا ہی کھاتی ہے شاید وہاں دیس میں غربت زیادہ ہونے کے باعث لڑکیوں کو کھانا کم دیا جاتا ہے۔“ اس کے بولنے سے قبل سکندر بول اٹھا اور سکندر کی اس بات پر فرید انس دی یہ غالباً ”کوئی گھٹیا سا غیر اخلاقی مذاق تھا بیو صرف خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی۔“

”نہیں سکندر بھائی ایسا نہیں ہے آپ شاید کبھی پاکستان نہیں گئے یا پھر وہاں کی کوئی دعوت انینڈ نہیں کی ہمارے ہاں دعوتوں پر خاصا اہتمام کیا جاتا ہے اور میرا خیال کہ بیو کو بھی اس وقت اپنے وطن کی کوئی زبردست سی دعوت یاد آگئی ہے۔“ ریجہ خاصی بول رہی تھی اور کچھ اسے یہ جرات عبدالوہاب سے بھی لی تھی۔ جو ہمیشہ اپنی بیوی کی ہاں میں ہاں ملا کر اس کی حوصلہ افزائی کرتا تھا۔

”جب تمہیں یہاں کا کھانا پسند نہیں ہے تو کیوں اپنا کھانا نہیں بناتیں۔“ جاتے جاتے اسے ریجہ نے سمجھایا

جواباً وہ صرف خاموش رہی لیکن جب رات فون پر یہی بات اس کی ممانے کی تو وہ خاموش نہ رہ سکی۔

”مما آپ جانتی ہیں مجھے کو کنگ نہیں آتی؟“ وہ بے بسی سے بولی۔

”تو تینا پکانا شروع کر دو خود ہی آجائے اب تو اتنے کو کنگ کے چمیل آتے ہیں کہ کچھ مشکل ہی نہیں رہا۔“

ابعد انہیں کیا بتائی کہ ٹی وی پر مکمل اجارہ داری اس کی ساس کی تھی کیونکہ یہی وہ ان ہی کا تھا جبکہ بیو کو چیز کے نام پر اس کے والد نے جو رقم دی تھی وہ سکندر کے اکاؤنٹ میں بھی نیو کے بار بار کینے پر بھی وہ الگ سے کمرے کے لیے ٹی وی لے کر نہ آیا تھا اس بات کی اجازت سرحال اسے اپنی ماں سے نہ لی تھی۔

”ان کی ٹی وی پر پاکستانی چمیل سیٹ نہیں ہیں۔“ اس نے بے دلی سے جواب دیا۔ اتنی دور بیٹھی اس کی ماں بیو کے گھر کے ماحول سے قطعی بے خبر تھیں اس لیے بھی شاید مشوروں سے نوازی رہی تھیں۔

”مما یہاں پاکستانی کھانے کوئی نہیں کھانا پھر تین بھلا میں اکیلی یہ سب کچھ کرایا کروں گی۔“

”جب پاکستان آتے ہیں تب تو سب کچھ کھاتے ہیں سرحال اور سناؤ کچھ چاہیے تو نہیں تمہارے پیپا کے کوئی دوست اپنی جگہ سمیت ملا لیا جا رہے ہیں اگر کچھ چاہیے ہو تو تینا دو میں بھیج دوں گی۔“

”نہیں ماما مجھے کچھ نہیں چاہیے ابھی تو جو کچھ میں وہاں سے لائی ہوں وہی استعمال نہیں ہوا تو مزید کا کیا کروں گی۔“ نہ چاہتے ہوئے نہ بول سکی۔

”کیوں۔“ کہیں جاتی نہیں ہو کیا؟“

”جاتی تو ہوں مگر بہت کم اور پھر ہمارے وہاں کا کپڑا یہاں پسند نہیں کیا جاتا۔“

”حیرت ہے بیو جہاں تک مجھے یاد رہتا ہے ریجہ تو آج تک اپنے کپڑے پاکستان ہی سے منگواتی ہے اس کے تو سسرال والے اپنے بچوں کی شادی کی شایگ بھی نہیں کرتے آتے ہیں۔“

”بہت فرق ہے ماما ریجہ اور میرے گھر کے ماحول میں مجھے تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آخر کیا سوچ کر میرا رشتہ یہاں ملے گا تھا؟“ ٹی ویوں سے دل میں بولی چنگاری کو ذرا سی ہوائی تو سلگ اٹھی اور شکوہ لیوں پر اُٹھ گیا۔

”صل میں بیو یہ سب نصیب کے کھیل ہوتے ہیں اور شاید تمہارے نصیب میں سکندر ہی کا ساتھ تھا جو تمہیں مل گیا اب پنا کو شش کرو اسے اپنے رنگ میں ڈھالنے کی اور یہی عورت کی جیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے شوہر کو اپنا ہم نوا کر سکے ان شاء اللہ مجھے امید کہ تم بھی ایسا کرو گی لیکن ابھی کچھ ٹائم لگے گا اس وقت تک تھوڑا صبر اور برداشت سے کام لو۔“

”جی کو تباہی کو نصیب کا کھیل قرار دے دینا شاید ہم انسانوں کی فطرت ہے۔“ اس وقت اپنی ماں کا جواب سن کر بیو کے دل غم میں یہی ایک جملہ آیا جو شاید کافی عرصہ پہلے اس نے کہیں پڑھا تھا لیکن وہ بولی کچھ نہیں اسے تو آج بھی اپنے باپ کے غرور میں ڈوبے ہوئے وہ آخری الفاظ یاد تھے جو انہوں نے بیو کو بھجھاتے ہوئے کہا تھا۔

”بہنا زندگی میں کامیابی کے لیے ہمیشہ اپنے سے اوپر دیکھو اور یاد رکھو تم سے نیچے والا تمہارے لیے کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔“

”کاش پیپا آپ میری شادی سے قبل یہاں آکر دیکھ تولیے کہ ان لوگوں کا معیار زندگی کیا ہے۔“ لیکن شاید اس کے باپ کے نزدیک زندگی گزارنے کے لیے جو ضروری چیزیں تھیں وہ بدرجہ اتم اس گھر میں موجود تھیں شان دار رہائش بڑی سی گاڑی اور سب سے بڑھ کر سکندر کے نام کے ساتھ موجود ڈگریوں کی لسٹ جو اس کے باپ کے لیے بہت زیادہ اہمیت رکھتی تھیں سانچ کتا تھا اس کا باپ انسان کی پہچان اس کی ڈگری سے کرتا تھا سانچ کا نام سوچتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے جنہیں صاف کرتی جیسے ہی وہ پٹی یک دم نگاہ سامنے بیڑ پر موجود سکندر پر پڑی جو جاتے کمرے میں کب آ گیا تھا۔

”آپ کب آئے؟“

”اس وقت جب تم اپنی ماں سے میری اور میری ماں کی چھٹی کر رہی تھیں۔“ اپنی شرٹ کے بٹن کھول کر اس نے بیڈ پر پھینک دی نیو اس کے چہرے پر چھائی کر خلی دیکھ کر ڈر سی گئی اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا جواب دے اسے تو سوچنے سے بھی یاد نہ آیا کہ اس نے اپنی ماں سے کیا بات کی تھی جس میں سکندر یا اس کی ماں کی کوئی برائی موجود تھی وہ تو صرف یہاں کے ماحول ہی کے بارے میں گفتگو کر رہی تھی لیکن اب صفائی دینا بے کار تھا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اپنے حق میں دی جانے والی کوئی بھی دلیل سکندر کے غصے کو معذرت نہیں کر سکتی اسی لیے خاموشی سے آگے بڑھ کر بیڈ پر بیڑی ہوئی اس کی شرٹ اٹھانا چاہی تاکہ دھونے والے کپڑوں میں ڈال سکے لیکن قبل اس کے کہ وہ شرٹ اٹھاتی سکندر نے ایک جھٹکے سے شرٹ اس کے ہاتھ سے چھین لی۔

”مالہ مالہ۔“ وہ حلق کے بل چلایا اور دوسرے ہی لمحہ اس کی ماں اور رفیدادوں بھاگ کر کمرے میں داخل ہو گئیں۔

”کیا ہوا؟“ رفیداد نے ملانی زبان میں بھائی سے پوچھ کر ایک نگاہ غمت زدہ کھڑی نیو پر ڈالی اور نیو کا تو شرمندگی کے مارے برا حال تھا اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایک ذرا سی بات پر سکندر نے اتنا ہنگامہ کیوں کھڑا کر دیا ہے۔

”یہ میری شرٹ لے جاؤ دھونے کے لیے گندے کپڑوں میں رکھ دو اگر یہ شرٹ اس مہارانی نے یہاں سے اٹھا کر باہر لے جا کر رکھ دی تو کل کو یہ اپنی ماں سے فون پر یہ بھی شکایت کرے گی کہ ہم اس سے گندے کپڑے اٹھواتے ہیں۔“ صرف یہ الفاظ اردو زبان میں بولے گئے اس کے بعد کی تمام گفتگو تینوں کے درمیان ملانی میں ہوئی جس میں سے چند ایک باتوں کے سوائے وہ زیادہ کچھ نہ سمجھ سکی کیونکہ اسے ابھی ملانی پوری طرح سمجھ نہ آتی تھی لیکن ان چند باتوں سے بھی نیو کو اندازہ ہو گیا کہ کمرے میں موجود تینوں افراد نہ صرف اس کے گھروالوں بلکہ اس کے وطن کے تمام لوگوں کے بچے اور بیڑے میں مصروف ہیں ایک ذرا سی بات کا اتنا بڑا ایٹھ بٹایا گیا کہ اس کے بعد نیو نے اپنی ماں سے کوئی گلہ کرنا بھی چھوڑ دیا اور اب تو ویسے بھی جب بھی کسی پاکستان سے فون آتا اس کی ساس بیسہ اس کے سر پر سوار ہو جاتیں اور یہ بھی شاید ان کے بیٹے کی ہی کوئی خاص ہدایت تھی۔

”تم آج کی دعوت میں کیا بنا رہی ہو میرے لیے؟“ وہ ٹی وی دیکھنے کے ساتھ ساتھ کانوں میں ہیڈ فون ڈالے آہستہ آواز میں سنان سے باتیں کرتے میں مصروف تھی جس کا علم صرف شفا کو تھا جو کچن میں ماما کے ساتھ شام کی دعوت کی تیاریوں میں ان کا ہاتھ بٹا رہی تھی اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد اگر اسے حالات حاضرہ سے باخبر بھی کر جاتی یہ دعوت رحاب کی شادی کے بعد پہلی دفعہ اس کے گھروالوں کے اعزاز میں دی جا رہی تھی رحاب کی خالہ اور ان کا بیٹا امر کا سے آئے ہوئے تھے اسے تو یہ بھی علم نہ تھا کہ دعوت کا مینو کیا ہے؟ اسے اگر علم تھا تو صرف یہ کہ رات میں اس نے کیا پسنا ہے ابھی بھی وہ گود میں بیڑی سے بھری نوکری رکھ کر مزے سے سنان سے باتیں کر رہی تھی اور ساتھ ساتھ شام کی تیاری کے حوالے سے اس کی رائے بھی معلوم کرتی جا رہی تھی کہ ایک دم ہی سنان نے اس سے یہ سوال کر لیا وہ فوراً ”گڑبڑا گئی۔“

”میں شاید فرائیڈ رائس بناؤں۔“ چاک ہی اس کی نگاہ اپنے قریب رکھی سبزی سی بھری نوکری پر بڑی رنگ برنگی سبزیاں جو شفا سے کائنات کے لیے دے گئی تھی یقیناً ”فرائیڈ رائس“ کے لیے ہی تھیں یہ ہی سوچ کر اس نے سنان کو جواب دے دیا۔

”اے گڈ یا ر پھر تو آج دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھانا چاہیے ایک ساتھ ہی شام کو تمہارے ہاتھ کے بنے ہوئے فرائیڈ رائس کا مڑاؤں گا۔“ اور فون بند کر کے وہ سبزیوں کا باؤل لیے کچن میں آگئی جہاں ناہید گوشت صاف کر رہی

تھی جبکہ ماما اس کے پاس کھڑی اسے ہدایات دے رہی تھیں۔

”بیٹا یہ سبزیاں سلپ پر رکھ دو اور ایسا کر شفا کو بھی بلاؤ اگر فرائیڈ رائس کے لیے مسالا بنالے۔“

”ماما فرائیڈ رائس میں بناؤں۔“ ردا ایک دم چونک گئیں اور پیچھے پلٹ کر اپنی اس بہاری سی بیڑی پر ایک نظر ڈالی بلیک لائک شرٹ کے ساتھ بلیک ہی ٹیل پالش لگائے اپنے اسٹوکنگ شدہ ہال کھولے وہ ان سے اجازت طلب کر رہی تھی۔

”بناؤ مگر ایسا کر پہلے اپنے بال باندھو کیونکہ کچن میں کھلے بالوں سے کام کرنا تمہارے پیپا کو پسند نہیں ہے اور ہاں۔“ انہوں نے بل بھر کر گ کہ کچھ سوچا اور پھر بولیں۔

”ایسا کر شفا کو اپنے ساتھ لگاؤ کیونکہ تم یہ کام پہلی بار کرنے لگی ہو اور پھر بیٹا گھر کی حد تک تو ٹھیک ہے لیکن یہاں سوال جو کہ مہمانوں کا ہے اس لیے میں نہیں چاہتی کہ کسی بھی معاملے میں میری یا تمہاری سبکی ہو۔“ بڑے ہی نرم لہجہ میں انہوں نے ساری بات نیو کو سمجھائی جو اس کی سمجھ میں آ بھی گئی مگر پھر بھی اس سے کچھ غلط ہو ہی گیا۔

”چاول میں جب ایک کٹی رہ جائے تو ناہید سے کہنا ان کا پانی نکال دے گی۔ زیادہ گل نہ جائیں۔“ شفا جلدی جلدی اسے ہدایات دے کر باہر نکل گئی کیونکہ اسے امان کے ساتھ کچھ ضروری سامان خریدنے کے قریبی مارکیٹ تک جانا تھا۔

”ایک کٹی رہ جانا۔“ یہ جملہ نیو کی سمجھ میں ہی نہ آیا لیکن چاول زیادہ گل کر چنچ بن جائیں یہ بات وہ بخوبی سمجھ گئی اور اسی خوف سے اس نے جلدی جلدی چاول نکالے اور پھر شفا کی اگلی ہدایات کے عین مطابق فرائیڈ رائس تیار کر لیے اور انہیں ہلکے دم پر ہی چھوڑ دیا تھا کہ مہمانوں کے آنے کے بعد کھولا جائے اور پھر وہی ہوا جس کا ردا کو ڈر تھا۔ چاول کافی دیر دم کے باوجود مکمل طور پر نہ گلے تھے بلکہ ان میں ابھی بھی کٹی باقی تھی اور نمک تو غالباً وہ ڈالنا ہی بھول گئی تھی پہلے تو یہ کو خوش کی گئی کہ چاول مہمانوں کو سرو نہ کیے جائیں لیکن پھر کچن آئی نے ڈانٹنگ ٹیبل کے گرد بیٹھے ہی پہلا سوال نیو کے پکائے گئے فرائیڈ رائس کے متعلق ہی کیا تھا ”نان انہیں بتا چکا تھا اب بچاؤ کی کوئی صورت نہ تھی ماسوائے اس کے کہ اودھ کے فرائیڈ رائس لاکر ٹیبل پر رکھ دیے جائیں اور پھر ایسا ہی کیا گیا۔“

”چاول نئے تھے اسی لیے نیو کو اندازہ ہی نہ ہوا۔ اسی لیے تھوڑے کچے رہ گئے ہیں۔“ کسی بھی متوقع صورت حال سے بچنے کے لیے ردا نے پہلے ہی وضاحت کر دی اور پھر ان کی توقع کے عین مطابق سارے چاول جوں کے توں ٹیبل پر بڑے رہے کسی نے بھی دوبارہ چار چمچے سے زیادہ کھانے کا حوصلہ نہ کیا سوائے سنان کے جس نے کسی بھی دوسری ڈش کو ہاتھ نہیں لگایا اور پلیٹ بھر کر چاول کھالے حالانکہ کھانے کے دوران بیٹھنے بلکہ آوازیں اسے دینا یا بارگاہی بھی کہ کچھ اور لے لو ایسا نہ ہو تمہارے پیٹ میں درد ہو جائے۔

”میرا پیٹ خاصا سخت ہے ای لکڑ پتھر سب ہضم کر لیتا ہے۔“ وہ ہنس کر بولا۔

”اور ویسے بھی آپ جانتی ہیں مجھے فرائیڈ رائس بہت پسند ہیں۔“ وہ سب کچھ جانتی تھیں یہ بھی کہ یہ چاول وہ صرف اس لیے کھا رہا ہے کہ نیو نے بنائے تھے ورنہ اس کا معیار کھانے کے معاملے میں خاصا بلند تھا اور اس سلسلے میں وہ کوئی بھی سمجھوتہ نہ کرتا۔

”رحاب کے چہرے پر بھی واضح ناگواری کے تاثرات تھے اس کی امی یہ محسوس کر رہی تھیں کہ شادی کے بعد سے رحاب نیو کے معاملے میں خاصی بدل گئی ہے اب وہ جب بھی گھر آتی نیو کے پھوپھن یا ہر وقت اس کی تیاری کو ہی موضوع گفتگو بنائے اٹھتی اور یہ شاید جینے کے اس طرز کا جواب تھا جو وہ سنان کے سلسلے میں ردا رکھتا

تھا۔
 ”بی بی بن کو تو کچھ آتا نہیں ہے اور سارا وقت میرے بھائی کے عیب ایسے نکالتے ہیں جیسے خود بتا نہیں کیا ہوں؟“ جانے رحاب کس بات پر پتی ہوئی تھی مجھ میں نہ آیا لیکن وہ اس سے پوچھ کر بات بڑھانا نہ چاہتی تھیں۔

”اور امی ایک بات آپ کو اور بتاؤں آپ سنان کو سمجھائیں کہ وہ نیو کا خیال اپنے دل سے نکال دے۔“
 ”تم جانتی ہو بیٹا یہ میرے بس کی بات نہیں ہے کیونکہ اس معاملے میں وہ کسی کی بھی نہیں سنتا۔“ اور یہ سچی بات تھی۔

”پھر بھی امی آپ سنان کو سمجھائے گا ضرور کیونکہ وہ آپ کا اکلوتا اور واحد سارا ہے ایسا نہ ہو کہ اس کے کسی غلط فیصلے کی سزا کل کو مجھے یا آپ کو بھگتنی پڑے۔“
 ”میں تمہاری بات سمجھی نہیں تم کیا کہنا چاہتی ہو۔“

”اصل میں امی نیو اپنے گھر میں بہت ہی لاڈلی ہے اور جنید کی تو کچھ زیادہ ہی اور آپ یقین کریں کہ پورے خاندان میں اسے خوب صورتی کا سہل سمجھا جاتا ہے۔“ وہ کیا کہنا چاہتی تھی ابھی تک مجھ پر واضح نہ ہوا تھا۔
 ”اور سنان کی لا پرواہ فطرت سے تو آپ واقف ہی ہیں اب اگر کہیں غلطی سے اشتہام انکل نے یہ رشتہ دے بھی دیا جو کہ مجھے کسی طرح ممکن نہیں لگ رہا تو آپ کے لیے تو مشکل کھڑی ہو جائے گی اس حوالے سے میری جان بھی عذاب میں پھنس جائے گی یہ لوگ ذرا زرا بات پر مجھے کٹرے میں کھڑا کر دیا کریں گے۔“ اب وہ رساں سے انہیں سمجھا رہی تھی اور رحاب کا یہ نقطہ نظر مجھ کی سمجھ میں تو آ رہا تھا لیکن سنان کو یہ سب سمجھانا ان کے لیے مشکل ہی نہیں ناممکن بھی تھا اسی لیے خاموش ہی رہیں کیونکہ ان کے خیال میں خاموش رہنا ہی زیادہ بہتر تھا۔



وہ آج سکندر کے ساتھ کے اہل سی سی آئی تھی جانے کتنے عرصہ بعد آج سکندر کو یہ احساس ہوا کہ اسے کوئی اچھی سی پاکستانی فلم دکھالائے کیونکہ یہاں اکثر وہ بھرتیائی پاکستانی فلمیں لگا کرتی تھیں فلم دیکھنے کے بعد دونوں نے قریب ہی ایک پاکستانی ریستورنٹ میں کھانا بھی کھایا ایک عرصہ بعد پاکستانی برائی کھا کر اسے پھر سے اپنے وطن کی یاد آگئی اور پھر واپسی پر ایک گروسری شاپ سے اس نے پاکستانی مشہور برائڈز کے کچھ سالوں کے ڈبے لے لیے اور اگلے دن وہ اس وقت چچن میں داخل ہوئی جب اس کی ساس بڑے ہی مصروف انداز میں کھانے کی تیاری میں مصروف تھیں وہ چچن کے دروازے پر ہی کھڑی ہو گئی عجیب تذبذب سی کیفیت تھی اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ اپنا مدعا کس طرح ان کے سامنے پیش کرے۔

”کوئی کام ہے تمہیں مجھ سے؟“ وہ کبھی اس طرح چچن میں نہ آئی تھی اسی لیے بظاہر کام میں مصروف غافلہ نے اس سے پوچھ ہی لیا۔

”وہ اصل میں آئی میں آج برائی بنانا چاہ رہی تھی۔“ جھجکتے ہوئے اس نے جواب دیا۔
 ”لیکن ہمارے گھر میں تو برائی کوئی نہیں کھاتا۔“ اب وہ انہیں کیا بتائی کہ کل رات ہی سکندر اس کے ساتھ برائی کھا کر آیا ہے وہ جانتی تھی کہ یہ خبر اس کی ساس کو سخت ناگوار گزرے گی اور وہ سو سکا ہے ان کے شدید رد عمل کے باعث آئندہ وہ سکندر کے ساتھ منانے والی اس چھوٹی سی تفریح کو بھی کھو دے اس ڈرنے اس کی زبان بند رکھی۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں یہ برائی صرف اپنے لیے بنانا چاہتی ہوں۔“
 ”بیٹا تو تمہیں منع تو نہیں کر رہی لیکن اتنی ہی بنانا جتنی تم کھا سکو ویسے بھی رات کی کھائی ہوئی برائی سکندر کو

بھگم نہیں ہوئی پیٹ خراب ہو گیا ہے اس کا۔“ عجیب جتنا ہوا انداز تھا۔
 وہ تو سکندر انہیں بتا چکا ہے کہ وہ برائی کھا کر آیا تھا اس کے ساتھ ہی نیو کو یہ احساس شدت سے ہوا کہ سکندر اپنے اور اس کی درمیان گزرنے والا پہل اپنی ماں سے ضرور شیر کرتا ہے اور پھر اپنی ساس کی ہدایت کے مطابق اس نے صرف اتنی ہی برائی بنائی جتنی وہ رات میں کھا سکے رات کو کمر میں اس نے پہلے کبھی چاول نہ بنائے تھے چنانچہ پانی کی صحیح مقدار کا اندازہ نہ ہونے کے سبب چاول ذرا زیادہ گل گئے تھے لیکن ذائقہ پھر بھی اچھا ہی تھا یا پھر چوائس نہ ہونے کے سبب یہ برائی بھی اس کے لیے لذیذ تر تھی چوما بند کر کے وہ منانے کھس گئی ساتھ ہی اس نے اپنے دو جوڑے بھی دھوئے تھے وہ فارغ ہو کر نکلی تو بھوک شدت سے چمک اٹھی تھی کمرے سے باہر نکلی تو سامنے ہی ڈانگ پر اس کی ساس سکندر سکندر کی بڑی بہن سیکہ نے اور اس کے دونوں بیٹے بھی موجود تھے۔ اس کی ساس آج دن میں اپنی مصروف کیوں نظر آ رہی تھیں وجہ نیو کی سمجھ میں آگئی۔ اس کی اس مصروفیت کا سبب بیٹی کی آمد تھی نیو باہر جانے والا دروازہ کھول کر بڑے سے صحن میں آگئی جس کی پھولی پھولی دیواروں سے دور تک سامنے کا روڈ نظر آ رہا تھا بالکل سامنے والے ٹیرس پر گیتا چھوٹی سی نیکر پہنے وانہر لگا رہی تھی نیو کو دیکھ کر وہ در سے ہی مسکرا دی اور زور شور سے ہاتھ لہرایا گیتا شروع دن سے نیو کی خوب مصوری کی دیواری تھی وہ جب بھی رفید اسے پہنے آتی نیو کی تعریف ضرور کرتی جسے سن کر رفید کے منہ کا زاویہ بگڑتا لیکن گیتا اس بات کی پروا بالکل نہ کرتی تھی۔

”وہ ایک انڈین لڑکی تھی اور ملانی ایرلائن میں جاب کرتی تھی کپڑے نار پر ڈال کر نیو پلٹ تو ایک نظروں سے باہر بنے اس صحن پر ڈالی جہاں سارے گھر کی جوتیاں موجود تھیں یہاں ایک روایت یہ بھی تھی کہ جوتیاں گھروں میں پہننے کا رواج بالکل نہیں تھا۔ یہاں تک کہ ایسے فنکشن جو گھروں میں ہی ادا کیے جاتے ہیں وہاں بھی جوتیاں باہر ہی رکھی جاتیں جس کے سبب لوگ جوتیوں کی خریداری پر بھی زیادہ رقم صرف نہ کرتے شروع شروع میں تو نیو کو یہ بہت ہی عجیب محسوس ہوا جب وہ کسی گھر کو فنکشن میں اپنی بہت سی قیمتی اور بڑے پیمانے پر خریدیں ہوئی جوتی گھر کے باہر اتار کر اندر لگتی لیکن اب وہ دوسری باتوں کی طرح اس کی بھی عادی ہو گئی تھی لکڑی کا دروازہ کھول کر وہ اندر آگئی جہاں کھانا شاید آخری مراحل پر تھا وہ خاموشی سے چچن میں آگئی ریک سے پلیٹ اتاری اور چولہے پر رکھی دیکھی تک آئی آج کافی دنوں بعد شدید بھوک کا احساس اس کے حواس پر غالب ہو رہا تھا۔ لیکن جیسے ہی اس نے ڈسکن اٹھایا دیکھی بالکل خالی تھی وہ حق دق رہ گئی۔

”یہ کیا سارے چاول کہاں گئے؟“ اس کی آواز خود بخود بلند ہو گئی۔
 اسی وقت اس کی ساس چچن میں آئی تھیں ساتھ سیکہ بھی تھی جس نے اپنی پلیٹ دھو کر ریک میں واپس رکھ دی وہ تمام لوگ کھانا کھانے کے بعد اپنی اپنی پلیٹیں خود دھوئے تھے اور اتنے عرصہ کی زندگی میں یہ واحد کام تھا جو نیو کو پسند آیا تھا اس نے کبھی بھی ان لوگوں کے چچن میں کسی دعوت کے بعد رتوں کا ڈھیر نہ دیکھا تھا۔

”وہ برائی تو ساری کبیر کھا گیا۔ اسے برائی بہت پسند ہے۔“ اس کی ساس نے تو جواب دینے کی زحمت نہ کی تھی لیکن سیکہ نے چچن سے باہر نکلتے ہوئے بتا گئی تھی اور بھوک کی شدت سے نیو کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے وہ بھی آخر انسان تھی کب تک برداشت کرتی پلیٹ کو زور سے سلپ پر پھینتی وہ تیزی سے باہر نکلی تاکہ اپنے کمرے میں جاسکے۔

”سے کیا ہوا؟“ نے پیچھے اسے سکندر کی حیرت میں ڈوبی آواز سنی دی لیکن اس نے پلٹ کر نہ دیکھا۔
 ”مگر برائی اتنی ہی تم تھی تو آپ کو منع کر دینا چاہیے تھا میں نہ کھانا آپ تو لگ رہا ہے پیٹ میں درد ہی ہو گا۔“ سمیر کا انداز صاف بتانے والا تھا اور پھر کمرے میں جاتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی ایک تو کچھ دنوں سے

اس کی طبیعت بھی خراب تھی ہر وقت متلی سی محسوس ہوتی اور ساتھ میں کمزوری کے سبب چکر بھی آرہے تھے اس پر اتنی محنت سے تیار کی گئی ہرانی بھی نصیب نہ ہوئی۔
”یہ تم کمر بند کیے کس کا نام کر رہی ہو؟“ جانے سکندر کب کمرے میں آیا اسے وقت کا احساس ہی نہ رہا تھا اس کا سر بہت دکھ رہا تھا اور پیٹ میں شدید اینٹنشن سی محسوس ہو رہی تھی۔ جس کے باعث وہ اٹھ بھی نہ پار ہی تھی۔

”کیا رونا پا زاری کر رہی ہو ایک بریانی تھی نا جو کبیر نے کھالی اس پر قحط زدہ قوم کی طرح اتنا دوا دیا کیوں عجیب ہوا ہے کیا تمہارے گھر میں جب کوئی مسمان آتا ہے تو تم لوگ اسی طرح کمرے بند کر کے ان کی واپسی کا انتظار کرتے ہو۔“ اس نے ایک ہی جھٹکے میں نیو کو بستر سے اٹھا کر کھڑا کر دیا۔
”پلیز سکندر پھوٹو دو مجھے میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“
”ظاہر ہے جب تک میری بیٹی گھر رہے گی تمہاری طبیعت ٹھیک بھی کیسے ہو سکتی ہے۔“ اس کی ساس اور سیکند بھی کمرے میں آگئی تھیں۔

”چھوٹو سکندر! میں جا رہی ہوں۔“ سیکند کا منہ پھولا ہوا تھا۔
”تمہیں اندازہ ہے تمہاری اس حرکت نے مجھے اپنی بسن اور ہنوتی کے سامنے دو کوڑی کا کر دیا ہے۔“ وہ دیوانوں کی طرح اسے بھونچوڑا ہوا بولا اس کا حلق خشک ہو گیا تھا اپنی نا سازی طبیعت کے باعث اور بے عزتی کا شدید احساس وہ ایک بار پھر رو دی دروازے کی چوکت پر کبیر بھی کھڑا تھا گھر کا ہر فرد خاموشی کے ساتھ اس کی اس قدر بے عزتی کا نظارہ دیکھ رہا تھا۔
”چلو باہر آؤ میرے ساتھ اور بھائی شاہ فرید کے سامنے کبیر سے معافی مانگو کیونکہ تمہاری آج کی اس گھٹیا حرکت نے میری ماں اور بسن کا بہت دل دکھایا ہے۔“

اپنی ماں اور بسن کے دکھے دل نے سکندر کو یہ احساس ہی بھلا دیا تھا کہ اس کے سامنے کھڑی ہوئی عورت کے سینے میں بھی دل ہے اور شاید وہ بھی کسی کی بسن ہے اور اس دور دہس میں اتنے سارے لوگوں کے درمیان بالکل تن تنہا ہی ہے۔ چوبیس گھنٹے حقوق اللہ کے چکر میں سرگرداں لوگ حقوق العباد کی ادائیگی کیوں بھول جاتے ہیں شاید ان کے نزدیک صرف ماں اور بسن یا پھر خونی رشتوں کے حقوق کی ادائیگی ہی حقوق العباد سمجھی بیوی تو ایسے ہی سکندر کے نزدیک میری جوتی تھی وہ ہمیشہ کتا کہ بیوی وہ جوتی ہے جو صرف پاؤں میں اچھی لگتی ہے اسے سر پر بٹھایا نہیں جاسکتا۔

سکندر کی باتیں سن کر اسے محسوس ہوا جیسے اس کا سانس ہی بند ہو جائے گا لیکن ایسا کچھ بھی نہ ہوا وہ بمشکل خود کو گھسیٹتی ہوئی باہر گئی اور سب کے سامنے پندرہ سالہ کبیر سے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی اس تمام عمل کے دوران گھر کا ہر فرد خاموش تماشائی بنا کھڑا رہا اس کی ساس عمید اور کبیر نے اس کی اس بے بسی کو دل بھر کے انجوائے کیا وہ ساری رات نیو کو ایسا محسوس ہوتا رہا جیسے وہ کانٹوں کے بستر لیٹی ہو سکندر بھی گھر نہ آیا تھا اس کا کہنا تھا کہ آج اس کے کسی دوست کے گھر ذکر اللہ کی محفل ہے اس لیے وہ رات وہیں رکے گا اور صبح گھر آئے گا لیکن اس کے گھر آنے یا نہ آنے سے نیو کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا، آج کی اس بے عزتی نے فی الحال نیو کے دل سے سکندر کے لیے پیدا ہونے والی تھوڑی سے محبت کو بھی ختم کر دیا تھا۔

جائے موسم کیسا عجیب سا ہو رہا تھا خواہ دل کو اس کر دینے والا شاید خزاں آگئی تھی جس کا اندازہ جا بجا کرے ہوئے پتوں سے لگایا جاسکتا تھا پتے بھی ٹڈنڈ نظر آرہے تھے نیو کو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ یہ خزاں کا موسم

اس کے اندر تک اتر گیا ہو۔ صدف خالہ آئی ہوئی تھیں حمزہ کے ساتھ جس نے سی اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کر لیا تھا نیو کا بالکل دل نہ چاہ رہا تھا کمرے سے باہر نکلے وہ کانٹوں میں بیڑ فون لگائے گائے سن رہی تھی جب دروازہ کھول کر شفا اندر داخل ہوئی اس نے شاید نیو سے کچھ کہا تھا نیو کی سمجھ میں ہی نہ آیا شفا نے آگے بڑھ کر اس کے کان سے بیڑ فون نکال دیا۔

”یہاں بیٹھی گائے سنتی رہو باہر خالہ حمزہ کے لیے تمہارا پروڈونل لے آئی ہیں۔“ دل کیوں اداس تھا وجہ فوراً نیو کی سمجھ میں آگئی۔

”دامغ تو نہیں خراب ہو گیا خالہ اور حمزہ کا۔“ غصے کی شدت سے اس کی آواز یکدم ہی تیز ہو گئی۔

”آہستہ بولو خواہنا خوار کر کے کوئی تماشاکھڑا مت کرو۔“

”شفا پلیز خالہ کو ابھی جا کر منع کر دو کہ مجھے حمزہ سے شادی نہیں کرنی۔“

”افو! نیو تو تم ایک دم سے اتنی جذباتی کیوں ہو جاتی ہو بے وقوف لڑکی ابھی تو صرف پروڈونل آیا ہے فائنل فیصلہ تو سب کے مشورے کے بعد ہی کیا جائے گا۔“

شفا بے شک اس سے چھوٹی تھی لیکن ہر معاملے میں اس سے زیادہ ہی سمجھ دار تھی نیو کو اس کی اس خوبی کا اندازہ تو پہلے سے ہی تھا لیکن آج وہ دل سے اس کی معترف ہو گئی۔

”اور ویسے بھی نیو حمزہ ہر لحاظ سے ایک اچھا لڑکا ہے اور میرا خیال ہے کہ ایسے رشتے ٹھکرانا کفرانِ نعمت ہے لہذا سب کچھ بھول کر خاموش ہو جاؤ اور بیوی کو وہ فیصلہ کرنے دو جو تمہارے حق میں بہتر ہو۔“

”میرے حق میں سنان کے سوا کچھ بہتر نہیں ہو سکتا۔“ وہ خود سری سے بولی اس کا اٹل لہجہ اس کے پختہ ارادے کی غمازی کر رہا تھا سنان کے سوا کسی دوسرے شخص کی گنجائش شاید نیو کی زندگی میں بالکل نہ تھی اس کا اندازہ تو شفا کو بہت پہلے ہی ہو چکا تھا۔ سنان نے موبائل کی شاپ شروع کر دی ہے اور ساتھ ہی وہ بی کام کی کلاس بھی انیڈ کر رہا ہے ممکن ہے پختہ آئی بھی اس کا پروڈونل لے کر جلد آجائیں یہ تمام باتیں رات ہی اس کی سنان سے ہوئی تھی۔

”پھر بھی میں تو تمہیں ایک ہی مشورہ دوں گی اپنا فیصلہ بیویوں کو کرنے دو اور سب کچھ اللہ پر چھوڑ دو جو تمہارے حق میں بہتر ہو وہ فیصلہ ہی سامنے آئے۔“ لیکن نیو پر ان تمام باتوں کا کوئی اثر ہونے والا نہ تھا یہی وجہ تھی کہ جیسے ہی خالہ اور حمزہ گھر جانے کے لیے نکلے فوراً ”روا کے پاس پہنچ گئی جانے اس نے خالہ کے گھر سے نکلنے کا انتظار بھی کیسے کیا تھا۔

”پلیز آپ خالہ کو منع کر دیں حمزہ کے پروڈونل کے سلسلے میں۔“ بنا تمہید کے جاتے ہی اس نے اپنا دم عیاں کر دیا۔

”کیوں حمزہ میں کیا برائی ہے جو میں اس رشتہ سے انکار کر دوں۔“ نیو کی بے باکی پر وہ آ کو غصہ تو بہت آیا لیکن وہ برداشت کر گئیں وہ نہیں چاہتی تھیں کہ کوئی بھی ایسی بات ہو جو رحاب کے کانوں تک پہنچ کر گھر سے باہر نکلے رحاب کسی اور سے کوئی بات بے شک نہ کرتی لیکن لازمی طور پر اپنی والدہ سے وہ یہ ذکر ضرور کرتی جو ردا نہیں چاہتی تھیں۔

”میں نے یہ کب کہا کہ اس میں کوئی برائی ہے۔“

”تو پھر۔“

”پھر یہ کہ وہ مجھے پسند نہیں ہے اور ہمارے مذہب میں شادی کے لیے لڑکے لڑکی کی باہمی رضامندی کا ہونا سب سے زیادہ ضروری ہے لہذا پلیز ماما! پتھر اس کے کہ میں خود خالہ یا حمزہ سے بات کر دوں آپ انہیں منع

کرویں۔“ اور پھر رد کا جواب سنے بغیر ہی وہ کمرے سے نکل گئی اس کے بعد کیا ہوا اس نے یہ سب جاننے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی اس کے لیے تو اتنا ہی کافی تھا کہ حمزہ کے پروپونل سے انکار کر دیا گیا تھا اور یہ بات اسے شفا نے ہی بتائی جسے سن کر نبیو نے سکھ کا سانس لیا ماما کا موڈ نبیو سے خراب تھا لیکن یہ سوچ کر کہ خود ہی تھوڑے دنوں میں ٹھیک ہو جائیں گی۔ اس نے خود کو تسلی دی نبیو کے رشتے سے انکار کے فوراً بعد ہی صدف خالہ نے شفا کا رشتہ نامک لیا جس پر کسی کو کوئی اعتراض نہ تھا اور ایک ہی ہفتے بعد شفا اور حمزہ کا رشتہ طے کر دیا گیا۔

”رحاب بیٹا مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔“ رحاب آج کافی دنوں بعد اپنی امی سے ملنے آئی تھی۔ جنید صبح آٹس جاتا ہوا اسے چھوڑ گیا تھا۔ ابھی وہ کھانا کھا کر ان ہی کے ساتھ کمرے میں آگئی جبکہ ستان باہر نکل گیا تھا۔

”جی امی بولیں کیا بات ہے۔“ وہ تکیے سے ٹیک لگا کر لیٹ چکی تھی جب اسے جینم نے پکارا یہی وجہ تھی کہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی اس کی چٹھی جس نے یہ احساس دلایا تھا کہ بات یقینی طور پر نبیو کے حوالے سے ہے۔ ”بیٹا! تم جنید سے ستان کے رشتہ کی بات کرو۔ اب تو ماشاء اللہ وہ کمانے لگا ہے اور پھر ماشاء اللہ گریجویشن کی تیاری بھی کر رہا ہے۔“ رحاب کی کچھ دن قبل کی گئی ساری باتیں جینم بھول چکی تھیں یا جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا تھا۔ اس بات کا اندازہ رحاب کو بھی ہو چکا تھا اسی لیے خاموش رہی۔ ”دیکھو بیٹا تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ستان نبیو کو بے حد پسند کرتا ہے۔ اور اس سلسلے میں وہ کسی کی کوئی بھی بات سننے پر آمادہ نہیں ہوتا لہذا بہتر یہ ہی ہے کہ جو وہ چاہتا ہے اس میں ہم سب راضی ہو جائیں۔“ رحاب کی خاموشی کو محسوس کر کے جینم نے وضاحت کی۔

”وہ تو ٹھیک ہے امی لیکن مجھے امید نہیں ہے کہ جنید اس رشتہ پر راضی ہوں گے پتا نہیں کیا بات ہے وہ ستان سے بہت چڑتے ہیں“ اور پھر آپ خود بھی دیکھیں جب سے میری شادی ہوئی ہے ستان نے بھی جنید کو سلام تک نہیں کیا۔“ جینم نے بیٹی کی بات بڑے محل سے سنی۔

”لیکن بیٹا جب وہ سلام کرتا تھا جنید نے کبھی دھتک سے جواب بھی تو نہیں دیا اور یسے بھی بیٹا اس وقت اصل مسئلہ نبیو اور ستان کا رشتہ ہے اور مجھے امید ہے کہ تم اپنے اکلوتے بھائی کی اس خوشی کو پورا کرنے کے لیے ضرور میرا ساتھ دو گی مجھے یقین ہے کہ تمہاری بات جنید ضرور مانے گا اور اگر وہ رضامند ہو گیا تو پھر اتنا مسئلہ باقی نہیں رہے گا جہاں تک میرا خیال ہے احتشام بھائی جنید کی بات کو کبھی رد نہ کریں گے۔“

جینم کی ساری امید ہی رحاب اور جنید سے وابستہ تھی انہیں اس بات کا یقین تھا کہ رحاب اس رشتہ پر جنید کو رضامند کر ہی لے گی لیکن رحاب کا ایسا کوئی بھی ارادہ فی الحال نہ تھا جانے کیوں وہ دل سے چاہتی تھی کہ ستان اور نبیو کا رشتہ نہ ہو کہ بھابھی بننے ہی رحاب کے دل میں اپنی منہ کے خلاف حاسدانہ جذبات بے دار ہو گئے تھے حالانکہ وہ ایسی لڑکی نہ تھی پھر بھی جانے کیوں شاید اس میں کچھ قصور نبیو کا بھی تھا جب سے رحاب کی شادی ہوئی تھی شفا تو اکثر اس کے پاس ہی رہتی اس کے سارے کام بھی کرتی لیکن اتنے دنوں میں نبیو نے کبھی بھی رحاب سے زیادہ بات نہ کی تھی اور جب بھی کبھی وہ کسی فیملی کی دعوت میں گئے ہمیشہ وہاں موجود لوگوں نے رحاب کو زیادہ اہمیت دینے کے بجائے نبیو پر اپنی توجہ زیادہ مرکوز رکھی اسی کی تعریف میں تمام افراد زین و آسمان کے قلابے بھلاتے رہتے یہ سب کچھ وہ سسرال میں تو برداشت کر رہی تھی لیکن اب یہ نہیں چاہتی تھی کہ ستان سے شادی کے بعد رحاب کا اپنا خاندان بھی نبیو ہی کا گرویدہ نظر آئے ان تمام باتوں کو سوچتے ہوئے وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ نبیو اور ستان کا رشتہ کبھی بھی نہیں ہونے دے گی اور اس سلسلے میں اسے کیا کرنا تھا یہ سب کچھ وہ سوچ چکی تھی۔ اس اپنی

سوچ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اسے کچھ عملی اقدام کرنے تھے جن پر عمل در آمد اسے اپنی ماں سے ہی شروع کرنا تھا ابھی بھی جینم کے کہنے کے مطابق اس کا جنید سے بات کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا اور جینم کو اس سلسلے میں اس نے کیا جواب دینا تھا یہ سب کچھ وہ پہلے سے ہی پلان کر چکی تھی۔

”تمہاری بیوی ماں بننے والی ہے۔“ مقامی ڈاکٹر نے ملائی زبان میں سکندر کو مخاطب کیا اور قریب ہی سر جھکائے بیٹھی نبیو نے چونک کر سر اٹھایا اور ایک نظر اپنے قریب دو سری کرسی پر موجود سکندر پر ڈالی جو ٹانگ پر ٹانگ دھرے بیڑی ہی بے نیازی سے ڈاکٹر کی بات سن رہا تھا اس خبر سے اس کے چہرے پر کوئی بھی تاثر نہ ابھرا بالکل سپاٹ اور بے تاثر چہرے کے ساتھ وہ ڈاکٹر کی جانب تک رہا تھا۔

”مسٹر سکندر! آپ کی سسرمت کمزور ہیں اب آپ کو چاہیے کہ ان کی غذا کا مناسب خیال رکھیں۔“ اور جانے کیا کیا اس کے کچھ الفاظ نبیو کو سمجھ آ رہے تھے اور کچھ بالکل بھی نہیں سکندر نہایت غافل انداز میں ڈاکٹر کی تمام ہدایات سن رہا تھا اور جیسے ہی وہ کرسی سے اٹھا نبیو بھی اٹھ کھڑی ہوئی ساری رات آنے والی النہوں کے سبب وہ بے حد کمزوری محسوس کر رہی تھی ثقاہت زندہ حالت میں اپنے وجود کو بمشکل کھینچتی وہ قدم کھینچی خاموشی سے گاڑی میں آ بیٹھی اور شاید یہ پہلا دن تھا جب سارے راستے سکندر نے کوئی بات نہ کی اور خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا چندہ منٹ بعد وہ اپنے گھر میں تھی جہاں روزمرہ میں کے مطابق اس کی نند سیکنہ اپنے دونوں بیٹوں کے ساتھ سامنے ہی برآمدے میں موجود تھی اس کی ساس قریبی ہی صوفے پر بیٹھ کر ہر شہمہ از بھی ان دونوں کے اندر داخل ہوتے ہی وہ بھی اٹھ بیٹھیں۔

”یہ ماں بننے والی ہے۔“ ایک خبر کی طرح سکندر نے برآمدے کے عین درمیان میں کھڑے ہو کر نسب کو بتایا۔ ”وہ ماں بننے والی ہیں۔“ سب سے پہلا رد عمل کبیر کی طرف سے آیا جو نبیو کو عجیب سا محسوس ہوا۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی بھی کسی ایسے مسئلہ پر بچوں کو اپنی رائے دینے نہ دیکھا تھا۔ بہر حال جو بھی تھا نبیو کو کبیر کا تبصرو اچھا نہ لگتا لیکن وہ ہنا کچھ کے خاموشی سے اپنے کمرے میں آگئی اس کے لیے مزید اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا اب تقریباً ناممکن تھا۔

”تم کیا کھاؤ گی۔“ سیکنہ اس کے پیچھے ہی کمرے میں آگئی۔ ”جو بھی مل جائے۔“ مختصر سا جواب دے کر اس نے اپنا سر تکیے پر ڈال دیا اور پھر تھوڑی دیر میں ہی سیکنہ اس کے لیے سوپ بنا لائی جو کافی مزے دار تھا وہ آہستہ آہستہ پینے لگی لیکن اس ڈر سے کہ کہیں وہ بارہ الٹی نہ آجائے اس نے تھوڑا سا پی کر لیا اپنے بیڈ کے قریب ہی رکھ لیا اور خود آنکھیں موند لیں آج اسے اپنی ماں اور شفا کی یاد شدت کے ساتھ آئی تھی اتنی شدت سے کہ اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

”امی میں نے آپ کو پہلے ہی منع کیا تھا کہ آپ ستان کو سمجھائیں لیکن آپ نے میری بات نہ مانی اور اب نتیجہ دیکھ لیا۔“ رحاب منہ پھلا کے جینم کے پاس بیٹھی تھی وہ جب سے آئی تھی ایسی ہی باتیں کر رہی تھی اور جینم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اسے کیا جواب دیں۔

”آپ کو پتا ہے میری بات سن کر جنید کس قدر ناراض ہوئے۔“ ”میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ جب جنید ستان کی بہن سے شادی کر سکتا ہے تو پھر ستان اس کی بہن سے کیوں نہیں حیرت ہے ایک ہی گھر میں رہنے والے دو افراد کے لیے علیحدہ علیحدہ قانون بنے ہوئے ہیں بھائی کے

لیے کچھ اور بہن کے لیے کچھ اور ہم نے توجید کو رشتہ دیتے ہوئے یہ نہیں سوچا تھا کہ وہ ہمیں پسند کرتا ہے تو کیوں رشتہ دیا جائے پھر جانے کیوں تمہارے سرال والوں نے اس بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنا لیا ہے۔ ”رحاب کی باتوں نے خبثت کو غصہ دلا دیا۔

”افوہ ای مسئلہ پسند نا پسند کا نہیں ہے ان کا کہنا ہے کہ ہمارے ہاں وٹے ٹے کی شادی نہیں ہوتی ہم جہاں سے بیٹیاں دیاں دیتے ہیں۔ ”رحاب نے خبثت کے غصہ کو دیکھتے ہوئے انہیں محل سے سمجھانا چاہا۔

”میرا بیٹا ٹھیک کتنا تھا یہ رشتہ تمہارے رشتے سے پہلے طے ہونا چاہیے تھا کہ اگر وہ مجھے اپنی بیٹی دیتے تو میں بھی اپنی بیٹی انہیں دیتی لیکن اب تو وہ مجھ پر با اختیار ہو گئے ہیں۔ ”خبثت کی بے بسی ان کے لہجہ میں بھی دور آئی۔

”بہر حال ای میرا تو آپ کو قیمتی مشورہ یہ ہے کہ آپ عبدالرحمن ماموں کی مرید سے سنان کا رشتہ طے کر دیں یہ شادی کے بعد کچھ عرصہ امریکہ میں رہے گا تو خود ہی اس کے سر سے نبیو کا بھوت اتر جائے گا اور پھر ماموں اسے معطل ہونے میں بھی مدد دیں گے ویسے بھی مرید ان کی اکلوتی بیٹی ہے اور ساتھ ہی جینہ کو بھی یہ پتا چل جائے گا کہ دنیا ان کی بنی پر ختم نہیں ہو سکتی۔ ”رحاب تو اپنا مشورہ دے کر چلی گئی لیکن خبثت کو ایک نئی سوچ دے گئی اور اگر واقعی ان کے بس میں ہوتا تو وہ رحاب کے مشورے پر فوراً سے پنشنر عمل درآمد کر کے جینہ کی فیملی کو ضرور نچا دکھاتیں لیکن بات ان کے اختیار میں نہ تھی اور وہ سنان سے کوئی مشورہ کے اپنا اگلا قدم نہیں اٹھا سکتی تھیں۔ اور سنان، مرید کے رشتہ پر کبھی آنکھ نہ ہو گا یہ بات وہ اچھی طرح جانتی تھیں اسی لیے اپنے اس خیال کوئی الحاح انہوں نے ایک سائیڈ پر رکھ دیا اصل مسئلہ تو سنان تک جینہ کا انکار پختا تھا اور وہ جانتی تھیں کہ یہ انکار سننے ہی سنان کا رد عمل انتہائی شدید ہو گا اور پھر ایسا ہی ہوا۔

”جب تک اکل احتشام میرے رشتہ پر ہاں نہ کریں آپ رحاب کو گھر لے آئیں۔ ”وہ سخت لہجہ میں یہ سب کہتا خبثت کے سامنے کھڑا تھا۔

”تمہارا دماغ تو نہیں خراب ہو گیا اس سارے مسئلہ سے رحاب کا کیا تعلق ہے کیوں سارے خاندان میں میری جگہ ہنسائی کر رہے ہو۔ ”خبثت کی بات سننے کے بعد وہ کمرے میں نہیں رکا اور تیزی سے دروازہ کھول کر گھر سے باہر نکل گیا وہ اتنا غصے میں تھا کہ اس وقت اسے روکنا یا سمجھانا بالکل بے کار تھا اس کے باہر نکلتے ہی خبثت نے اپنا سر دونوں ہاتھوں پر گرا لیا ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح بیٹے کو اس کی چاہت لا کر دیں یہ سب کچھ ان کے اختیار سے باہر تھا وہ بالکل بے بس ہو چکی تھیں۔

”کہہ دو نبیو تمہارے بھائی کے انکار کے بعد میرے پاس صرف ایک ہی آپشن ہے اور وہ یہ کہ اب ہم دونوں کورٹ میں جے کہیں اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ میرے پاس نہیں ہے۔ ”نبیو ایک بچے چمٹی ہوتے ہی کانچ سے باہر نکل آئی تھی اور اب قریبی ریستورانٹ میں بیٹھی سنان کی گفتگو سن رہی تھی اس کے پاس صرف ایک گھنٹہ باقی تھا وہ بچے اس کو یوں آجاتی تھی اور دین کے آتے ہی شفا نے اسے مسیج کر دیا تھا لہذا وہ چاہتی تھی کہ جو بھی بات ہے وہ سنان جلد از جلد کر لے۔

”کورٹ میں جے۔ ”نبیو نے حیرت سے سنان کے الفاظ دہرائے۔

”تم جانتے ہو تمہارا اٹھایا گیا ایک ڈراما غلط قدم تمہاری بہن کا گھر جا ڈرے گا وہ میری بھابھی ہے سنان تم یہ کیوں بھول جاتے ہو؟“

”کچھ نہیں ہوتا میری بہن کے گھر کو میں تمہارے بھائی کی فطرت اچھی طرح جانتا ہوں وہ تمہارے لیے اپنا کھ بہاؤ نہیں کرے گا اور وہ بھی اس وقت جب اس کی بیوی ہاں بننے والی ہو۔ ”وہ اپنی بات پر اڑا رہا اور ویسے بھی اس

وقت اس کے دماغ میں صرف ایک ہی سوچ تھی وہ ہر حال میں جینہ کو نچا دکھانا چاہتا تھا غصہ کی حالت میں وہ یہ بھی بھول گیا تھا کہ جینہ سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ یہ ٹھوس حقیقت تھی کہ سنان نبیو کی محبت میں اپنے ہوش و حواس کھو چکا تھا اسے شاید اچھے برے کی پہچان بھی نہ رہی تھی اس کا بس چلتا تو ابھی اور اسی وقت نبیو کو لے کر کورٹ میں گھڑا کر دیتا اور ایسا شاید ممکن بھی ہو جاتا اگر رحاب نبیو کی بھابھی نہ ہوتی بس ایک یہ ہی وجہ تھی جس نے سنان کے پاؤں میں پیریاں ڈال رکھی تھیں۔

”جو بھی ہے سنان یہ ناممکن ہے تم ایسا کرو آئی کو ایک دفعہ ماما کے پاس بھیجو اس سلسلے میں میں خود ان سے بات کروں گی۔ ”شفا کا مسیج آچکا تھا نبیو اپنا بیگ اٹھا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کاش میری بہن تمہاری بھابھی نہ ہوتی۔ ”پا ہر نکلتے نکلتے اس نے اپنے پیچھے سنان کا یہ جملہ سنا ضرور لیکن رکی نہیں جینہ نے اس رشتہ سے کب انکار کیا اسے کچھ علم نہ تھا یہاں تک کہ اس بات کا ذکر اس نے اپنے گھر کے کسی بھی فرد سے سنا تھا اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے لیکن سنان کی بکھری حالت نے اسے بے حد پریشان کر دیا تھا اور وہ جانتی تھی کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے بالکل سچ ہے حیرت اس بات کی تھی کہ رحاب نے جینہ سے کب بات کی؟ پھر اس کا جواب خبثت آئی تک بھی پہنچ گیا اور اس تمام قصہ کا علم اسے ہی نہ تھا جو اس کمائی کا مرکزی کردار تھی۔

”میرا خیال ہے سنان سے کہو کہ خبثت آئی سے کہے وہ باقاعدہ پروپوزل لے کر پیپا کے پاس آئیں۔ ”شفا نے ساری بات سننے ہی اسے مشورہ دیا جبکہ دل سے وہ خود بھی یہ نہیں چاہتی تھی لیکن اس شام جب خبثت آئی نے سنان کا پروپوزل لے کر نبیو کے گھر آنا تھا جینہ نے ایک ایسا انتہائی قدم اٹھایا جس نے نبیو تک آنے والے سنان کے سارے راستوں کو مسدود کر دیا۔

”تم ڈیوری کے لیے پاکستان کیوں نہیں آ رہیں؟“ روانے سخت لہجے میں نبیو سے استفسار کیا۔

”حد ہے ماما تو آپسے کہہ رہی ہیں جیسے میں پاکستان کے ہی کسی دوسرے شہر میں رہائش پذیر ہوں اور آپ کے کتنے ہی فلائٹ پکڑاؤں گی۔“

”چھا ایسا کرو تم اپنی ساس سے میری بات کرو اور میں انہیں کہوں کہ ہمیں پاکستان بھیجیں۔ ”نبیو کے لہجہ میں در آنے والی بے بسی نے روا کو معاملے کی نزاکت کا احساس دلا دیا۔

”یہ معاملہ نبیو اور سکندر کا ہے میں بھی اس سے بات کر لوں گی اور میرا خیال ہے کہ آپ بھی اس سلسلے میں اسی سے بات کریں۔ ”نبیو نے روا کے کہنے کے مطابق اپنی ساس سے ان کی بات کروادی حالانکہ اپنی ساس کا جواب پہلے سے ہی جانتی تھی کیونکہ اتنے عرصے میں وہ قاطعہ کی ڈیپلو جک فطرت کو اچھی طرح جان چکی تھی اور پھر سکندر کا جواب اس کی توقع کے عین مطابق تھا۔

”پاکستان۔“ اپنی بی بی کی بات سننے ہی اس نے حقارت سے لفظ پاکستان دہرایا اس بل نبیو کا بس نہ چلا کہ اپنے سامنے کھڑے شخص کا منہ تو ڈھالنے ہی کی بجائے شفا نے اسے اپنی لیٹ میں لے لیا۔

”میرا بچہ سکندر نظام کا بچہ پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک میں پیدا ہو جانا دلچسپی کے دوران پچاس فیصد بچے صرف اس لیے مرجاتے ہیں کہ انہیں صحت کی بنیادی سہولیات میسر نہیں ہوتیں۔ ”حقارت آمیز لہجہ جو نبیو کے اعصاب پر ہتھوڑے کی طرح برس رہا تھا کہ کتنا چاہتی تھی کہ پاکستان جیسے ترقی پذیر ملک میں روزانہ پیدا ہونے والے بچوں کی تعداد آج بھی ملاییشیا کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے لیکن وہ صرف سوچ سکی کیونکہ اس وقت کوئی بھی بات منہ سے نکال کر وہ مزید فساد مکڑا کر نہیں چاہتی تھی۔

”اور تمہاری ماں نے یہ سوچ بھی کیسے لیا کہ میں تمہیں ڈیلوری کے لیے پاکستان بھیج دوں گا جہاں نہ کوئی ڈھنگ کا اسپتال اور نہ ہی ڈاکٹرز ایسے جن پر اعتبار کیا جاسکے روزانہ ہی کسی نہ کسی پاکستانی چینل پر تمہارے اسپتالوں میں ہونے والی ہنگامہ آرائی دکھائی جاتی ہے ہر دن اپنی لاپرواہی سے وہ کسی نہ کسی انسان کی جان لے لیتے ہیں۔“ سکندر نے کبھی پاکستان کا کوئی اسپتال نہ دیکھا تھا اس کا یہ تجزیہ صرف ہمارے میڈیا کا مریہون منت تھا جو کچھ اس نے کسی ٹی وی چینل پر دیکھا جوں کا توں نیو کے سامنے پیش کر دیا اب مزید کوئی بات کرنے کی گنجائش بالکل ختم ہو چکی تھی خوشی کا وہ احساس جو اپنے وطن جانے کا کچھ دیر قبل نیو کی رگوں میں خون بن کر دوڑ رہا تھا اپنی موت آپ مر گیا وہ یکدم ہی مایوس ہو گئی۔

”میرا خیال ہے کہ تمہاری امی یہاں آجائیں ملائیشیا تمہاری ڈیلوری کے لیے تم ان سے بات کر لو۔“ اور پھر اپنا یہ خیال اس نے روا کے سامنے بھی پیش کر دیا۔

”اور ویسے بھی انہی آپ یہاں آئیں گی تو یقین کریں مجھے بہت زیادہ خوشی ہوگی۔“ تمنا ہی پر اخلاق لہجہ نیو کے لیے یہ سب کچھ نیا نہ تھا وہ جانتی تھی کہ سکندر اس کے گھر والوں سے ہمیشہ ایسی ہی گفتگو کرنا شہید آئیں لہجہ اور پھولوں جیسے الفاظ یہ ہی وجہ تھی کہ اس کی ماں کبھی بھی یہ ماننے پر تیار نہ ہوتی تھی کہ سکندر کبھی بد اخلاقی کا مظاہرہ بھی کر سکتا ہے۔

”بیٹا وہ مودے گھر سے باہر سو مسئلے مسائل ہوتے ہیں تم ہی اس کی باتوں کو انور کر دیا کرو۔“ یقین جانو کبھی بات نہ بڑھے گی۔“ شروع شروع میں اس کی کسی ایسی شکایت کا جو وہ اپنی ماں سے سکندر کے سلسلے میں کرتی یہ ہی جواب ملتا پھر آہستہ آہستہ اس نے اپنی ماں سے بھی اپنا حال دل کتا چھوڑ دیا اسے حیرت ہوتی سکندر کی شرس بیانی سن کر۔ ”یا اللہ یہ شخص کس طرح جولاہا بنا ہے بالکل گرگٹ کی مانند۔“ کٹر ایسا ہوتا سکندر کا موڈ کسی بات پر سخت آف ہوتا اور ایسے میں نیو کے گھر سے فون آجاتا تو یکدم ہی سکندر کا لہجہ تبدیل ہو جاتا اور پھر جب تک وہ پاکستان بات کرتا ایک نیا سکندر سامنے ہوتا معزز با اخلاق خوش گفتار اور جانے کیا کیا اور فون بند کرتے ہی وہ واپس اپنی دنیا میں آجاتا کرخت اور بد مزاج، مغرور غرض کون سی ایسی خصوصیت تھی جو سکندر میں یہ درجہ اتم موجود نہ ہو۔

”صل میں بیٹا ہم شفا کی شادی کرنا چاہتے ہیں اسی لیے میں چاہ رہی تھی کہ نیو پاکستان آجاتی کچھ میری بھی مدد ہو جاتی۔“

”اس حالت میں جبکہ اسے خود مدد کی ضرورت ہے وہ آپ کی کیا مدد کرے گی آپ شاید نہیں جانتیں اسے الطموں نے بہت بدل کر دیا ہے اور یقین جانیں اسے آپ کی اشد ضرورت ہے۔“ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس دنیا میں نیو کا سب سے بڑا ہمدرد صرف اور صرف سکندر ہی ہوئے شاید یہ بھی علم نہ تھا کہ صبح سے اس نے کچھ کھایا بھی ہے کہ نہیں نیو نے جلدی سے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور پھر جانے کب وہ سو گئی اسے پتا ہی نہ چلا۔



”میں رحاب کو طلاق دے رہا ہوں۔“ الفاظ تھے یا کوئی ہم جو عین روا کے کالوں کے قریب پھٹا ان الفاظ کی شدت سے ان کا پورا جسم لرز اٹھا اپنے کپکپاتے وجود کو سنبھالنے کے لیے انہوں نے قریب رخمی کرسی کی پشت تھام لی انہیں یقین ہی نہ آیا کہ کچھ دیر قبل گئے گئے یہ سنگین الفاظ ان کے اپنے بیٹے جنید کی زبان سے ادا ہوئے ہیں وہ جنید جس کے نزدیک ”زندگی“ کا دوسرا نام ”رحاب“ تھا پھر ایسا کیا ہو گیا جو آج انہیں یہ سب کچھ سننے کو مل رہا تھا وہ یکدم ہی بے چین ہوا تھیں۔

”ایسا کیا کر دیا رحاب نے جو تم نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا۔“ بڑی مشکلوں سے انہوں نے اپنا جملہ کھل کیا۔

”اس بے چاری نے کیا کرنا تھا جو کچھ کیا ہے وہ آپ کی اس لاڈلی بیٹی نے کیا ہے۔“ جنید نے یکدم ہی اپنی توپوں کا رخ عین دوازے کے درمیان کھڑی نیو کی طرف موڑ دیا جو جنید کی تیز آواز سن کر ابھی ابھی وہاں آئی تھی اسے تو اصل بات کا علم بھی نہ تھا کہ جنید اس قدر غصہ میں کیوں ہے؟ اسے میں سے اچانک ہی جنید کی سانپ جیسی پھونکار اور قہر آلود لگا ہوں نے اس کے حواس ہی گم کر دیے وہ سمجھ نہ پائی کہ جنید کیا کتنا چاہ رہا ہے؟

”تمہارا دل غ تو خراب نہیں ہو گیا تم دونوں میاں بیوی کے کسی بھی پر ایلم سے اس کا کیا تعلق ہے۔“ وہ سوال جو نیو کے ذہن میں آیا تھا خود بخود روا کی زبان سے ادا ہو گیا۔

”صل تعلق تو اسی کا ہے ماما رحاب کی بد نصیبی تو صرف اتنی ہے کہ وہ سان کی بہن ہے۔“ صل قصہ کیا ہے؟ اگر وہ دن قبل وہ سان سے نہ ملی ہوتی تو شاید آج اپنی ماں کی طرح بے خبر ہوتی جو ہوتی کھڑی جنید کا منہ تنک رہی تھیں۔

”اسے کیا یاد کچھ رہی ہیں میں سچ کہہ رہا ہوں رحاب کے ساتھ ہونے والی کسی بھی زیادتی میں سراسر قصور نیو وارو سان کا ہے۔“

”آپ تو سارا دن گھر رہتی ہیں آپ کو اتنا بھی ہوش نہیں ہوتا کہ باہر آپ کی بیٹی کیا گل کھلا پھر رہی ہے۔“ جنید نے ایک ہی سیکنڈ میں اپنی ماں جانی پر الزامات کی بھرمار کر دی نیو کو تو یقین ہی نہ آیا کہ سامنے کھڑا شخص اس کا پارا بھائی جنید ہے اور یہ جو کچھ بھی وہ سن رہی ہے اس کے بھائی کی زبان سے ہی ادا ہو رہا ہے جنید کے منہ سے نکلنے والے الفاظ نے اسے شرم سے زمین میں گاڑ دیا وہ جو کبھی رحاب اور جنید کی ملاقاتوں کی باتیں رہی تھیں پلٹ کر اسے بھائی کو گزرے وقت کے حوالے سے کوئی طعنہ بھی نہ دے سکی الفاظ جیسے اس کے حلق میں ہی کہیں گم ہو گئے۔

”آپ جو روز اسے گھر سے کالج بھیجتی ہیں کیا آپ کو یقین ہے کہ یہ کالج جاتی بھی ہے یا سان کے ساتھ کلچرے اڑاتی پھرتی ہے۔“ وہ مسلسل بول رہا تھا۔

نیو نے ایسا کیا کر دیا آخر جو جنید اس قدر غصہ میں ہے۔ روا کی کچھ سمجھ میں ہی نہ آ رہا تھا جنید کے اس قدر رکیک الزامات نے غصہ کی شدت سے ان کا بلڈ پریشر بھی کر دیا۔

”کیا کیا اس کر رہے ہو تم جو منہ میں آ رہا ہے بکے ہی چلے جا رہے ہو تمہیں کچھ اندازہ بھی ہے کہ کس طرح کے گھٹیا الزامات تم اپنی بہن پر لگا رہے ہو، شرم کنی چاہیے تمہیں۔“ جانے کب احتشام صاحب آفس سے گھر واپس آئے اتنے ہنگامہ میں کسی کو پتا ہی نہ چلا اب جو ان کی تیز آواز سنی تو سب ہی یکدم ہوش میں آ گئے۔

”میں الزامات نہیں لگا رہا بلکہ جو ج ہے وہ آپ سب کو بتا رہا ہوں۔“ پوچھیں اس سے یہ سان سے ملنے ریسٹورنٹ نہیں جاتی وہ بھی کالج ناٹم میں، اور تو اور یہ محترمہ اس سے کورٹ میرج کرنے کے پلان بھی بتا رہی ہیں۔“ وہ جو یہ سمجھی تھی کہ پاپا کو سامنے دیکھ کر جنید خاموش ہو جائے گا اس کا یہ خیال فوراً سے پشیم غلط ثابت ہو گیا۔

”کس نے کہا تم سے یہ سب؟“ احتشام صاحب اس کے قریب آ گئے ان کے ماتھے پر پڑی تیوریوں میں مزید اضافہ ہو گیا۔

”سان نے خود۔“ یقیناً جنید جھوٹ بول رہا تھا اور یہ بات صرف وہی جانتی تھی باقی کمرے میں موجود کوئی بھی شخص اس طرح نہیں سوچ رہا تھا اور پھر احتشام صاحب کے اگلے جملے نے پل بھر میں اسی کے اس خیال کی تصدیق بھی کر دی۔

”اس گھٹیا شخص کی جرات کیسے ہوئی تم سے یہ سب فضول بکواس کرنے کی۔“ غصہ کی زیادتی سے ان کی آواز

مزید تیز ہو گئی۔

”اسے یہ جرات آپ کی اپنی بیٹی نے خود عطا کی ہے پوچھیں اس بے غیرت سے اگر وہ شرافت سے اپنی ماں کو رشتہ کے لیے بھیجوا تا تو کیا آپ ہاں نہ کرتے۔“ جنید اس سارے معاملے کو ایک بالکل ہی غلط رخ دے رہا تھا نیو کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس طرح کیوں کر رہا ہے؟ اس کے بے سروا ازمات کا نیو کو کس کوئی جواب نہ تھا وہ کہتا چاہتی تھی کہ جنید جھوٹ بول رہا ہے لیکن کچھ غصہ اور کچھ خوف کی شدت کے اس کی آواز بند ہو گئی اور وہ ہیں نشیں پر بیٹھ کر زور زور سے رونے لگی کسی نے بھی اس پر دھیان نہ دیا۔

”بس اسی لیے میں نے سوچا ہے کہ میں بھی اس کھٹیا شخص کی بہن کو طلاق دے کر اسی طرح ذلیل کروں گا جس طرح وہ ہمیں کرنا چاہتا ہے۔“

”تم ایسا کچھ نہیں کرو گے اس سارے معاملے میں رحاب بے چاری کا کیا قصور ہے جو تم اسے اپنے بھائی کے کسی غلط فعل کی سزا کا حق دار قرار دے رہے ہو یہ سراسر زیادتی ہے جو اللہ کے نزدیک بھی ناپسندیدہ فعل ہے۔“ اس وقت کسی کو بھی نیو کی تکلیف کا احساس نہ تھا جو اسے اپنے گئے بھائی کے ہاتھوں پہنچی تھی بلکہ وہاں موجود ہر شخص کی ہمدردی کا مرکز رحاب تھی جو اس گھر کی بہو تھی۔

”دیکھو بیٹا میرے کام لو اور اپنے انتقام کا نشانہ اپنی بیوی کو نہ بناؤ عزت ہے وہ ہمارے گھر کی جا کر آج ہی اسے واپس لاؤ جانتے ہو اس کی ماں کس قدر پریشان ہے آج ہی ان کا مجھے آفس میں فون آیا تھا۔“ رحاب دونوں قبل ہی اپنے گھر گئی تھی دیے بھی جب سے وہ ریگنٹ ہوئی تھی اکثر وہ پیشخبری گھر پہنچ جاتی تھی آج اس کے چلے جانے میں ایسی کیا انہونی ہو گئی تھی نیو کی سمجھ میں ہی نہ آیا۔

”بیوہ اٹھو اپنے کمرے میں چلو۔“ جانے وہ کب تک اسی طرح فرش پر بیٹھی رہتی اگر شفا اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا نہ کرتی وہ ہاتھ کھڑی ہوئی پہلے تو سوچا شفا کے ساتھ اپنے کمرے میں چلی جائے لیکن پھر کچھ سوچ کر اس نے آہستگی سے شفا سے اپنا بازو چھڑوایا اور احتشام صاحب کے کمرے کی جانب بڑھ گئی اسے روکنے کے لیے شفا آگے بڑھی مگر وہ اسے سامنے سے ہٹاتی اندر داخل ہوئی اور سیدھی احتشام صاحب کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔

”پاپا ابھی جنید بھائی نے آپ سے میرے اور ستان کے متعلق جو کچھ کہا وہ سب جھوٹ پر مبنی ہے میرا یقین کریں پاپا ہم دونوں کا کورٹ میں جرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“ وہ بے ربط بنا سوچے سمجھے بولتی چلی گئی اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ خود پر لگائے گئے الزامات کی تردید کس طرح کرے؟ وہ جانتی تھی کہ اس وقت اس کی بات پر گھر کے کسی بھی فرد نے یقین نہیں کرنا پھر بھی ضروری تھا کہ وہ سچائی بتانے کی کوشش ضرور کرے اسی خیال نے اسے ہمت بخشی تھی جو وہ اس طرح احتشام صاحب کے سامنے کھڑی اپنا موقف بیان کر رہی تھی اس کی بات ختم ہوتے ہی احتشام صاحب نے ایک ذرا سی نظر اٹھا کر اپنے سامنے کھڑی نیو کو دیکھا جس کی آنکھیں شدت گریہ سے سرخ پڑ چکی تھیں اور پھر اسے نظر انداز کرتے ہوئے انہوں نے ساتھ ہی موجود شفا پر دسری نظر ڈالی۔

”اسے کمرے میں لے جاؤ ابھی مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلطی انہوں نے اس مسئلے پر میں مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتا۔“

”پاپا بلیر میری بات۔“ وہ آگے مزید کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن شفا نے کہنی ہی نہ دیا۔

”میرے ساتھ آؤ نیو تمہیں جو بات پاپا سے کہنی ہے بعد میں کر لیتا۔“ نیو نے ایک نظر اپنے باپ پر ڈالی جنہوں نے بیڈ کراؤن سے سر نکال کر آنکھیں موند لی تھیں جس کا صاف مطلب یہ تھا کہ اب وہ نیو سے کسی بھی قسم کی کوئی بات کرنا نہیں چاہ رہے یہ بات وہ سمجھ چکی تھی اسی لیے خاموشی سے شفا کے ساتھ اپنے کمرے میں

آگئی۔

”میری سمجھ میں نہیں آ رہا جنید بھائی اور رحاب بھائی کیوں چاہتے ہیں کہ تمہارا اور ستان کا رشتہ نہ ہو۔“ اس کے پیچھے ہی شفا بھی اندر آ گئی تھی اور وہ جو اپنے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں کھو بیٹھی تھی شفا کی بات سنتے ہی یکدم اس کا سوہا ہوا ذہن جاگ اٹھا اس قدر دھوکہ و تکلیف میں بھی خوشی کا ایک چھوٹا سا احساس اس کی روح کو سرشار کر گیا یقیناً ”کوئی تو ایسا تھا جو اس کی بے گناہی کا یقین رکھتا تھا اس کے اور شفا کے خیالات کس قدر ملتے جلتے تھے اس لمحہ اسے اپنی اس چھوٹی سی بہن پر بے حد پیار آیا لیکن ”رحاب“ اس کے بارے میں تو نیو نے کبھی بھی اس طرح نہ سوچا تھا جس طرح کا تجزیہ شفا پیش کر رہی تھی۔

”اور ہاں نیو مجھے ایک بات بتاؤ بالکل سچ ہے۔“ شفا بیڈ پر اس کے قریب بیٹھ چکی تھی۔

”کیا بات۔“ جانے شفا کیا پوچھتا چاہ رہی تھی۔

”کیا ستان نے تم سے کورٹ میں جرنے کے بارے میں کوئی بات کی تھی؟“ نیو نے فوراً نگاہ اٹھا کر شفا کی جانب دیکھا اس کے اس طرح کہنے سے شفا گر بنا گئی۔

”میں تم پر کوئی شک نہیں کر رہی بلوی صرف مجھے ایک بات کلیئر کرنی ہے اسی لیے تم سے پوچھ رہی ہوں میری بات کا جواب دو۔“

”ہاں۔“ نیو کو اپنے اور ستان کے درمیان ہونے والی چند روز قبل کی گفتگو فوراً اسے پیشور یاد آگئی۔

”لیکن شفا وہ سب تو اس نے صرف غصہ میں کہا تھا اور میں نے فوراً ہی اس کی اس تجویز کو رد بھی کر دیا تھا۔ تم مجھے اچھی طرح جانتی ہو شفا میں کبھی ایسا کر ہی نہیں کر سکتی۔“

”مجھے یقین مت دلاؤ نیو مجھے تم پر مکمل بھروسہ ہے کہ تم کبھی ایسی غلط بات سوچ بھی نہیں سکتیں۔“ شفا نے نہایت پیار سے اپنی بہن کے دونوں ہاتھوں کو تھام لیا جس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیل رواں جاری ہو چکا تھا شفا کو اس پل سے حد افسوس ہوا جانے کیوں جنید اس کی خوشیوں کی راہ میں حائل ہو گیا ہے اس نے نیو کے خوبصورت چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے سوچا وہ جانتی تھی کہ جنید شروع سے ہی ستان کو پسند نہیں کرتا حالانکہ بظاہر اس کا کوئی سبب بھی نہ تھا اور اب تو اس کی یہ کدورت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ اپنی سگی بہن کے لیے بھی اس کا دل مروہ ہو گیا تھا اور صرف ستان کی ضد میں وہ نیو کی دل آزاری کا سبب بن رہا تھا جس کا شاید اسے احساس بھی نہ تھا۔

”مجھے تو صرف ایک بات سمجھ میں نہیں آ رہی کہ جو بات تمہارے اور ستان کے درمیان ہوئی اس کا علم جنید بھائی کو کیسے ہوا؟“

”وہ یہ سب تو میں نے سوچا ہی نہیں۔“ شفا کی اس بات نے نیو کے ذہن پر چھائی ہوئی دھند کو کس قدر صاف کرنا شروع کر دیا یقیناً ”شفا“ کہہ رہی ہے۔ ”ستان اور میری گفتگو کا علم کسی تیسرے شخص کو کیسے ہوا؟“

”تم ستان سے معلوم کرو مجھے یقین ہے کہ اس نے غصہ کی حالت میں یہ کن ترانی اپنی ماں یا بہن کے سامنے بھی ضرور کی ہوگی اور پھر بھائی ہی کے ذریعے یہ سب بات بھائی تک پہنچی ہے۔“

”لیکن رحاب بھائی نے ایسا کیوں کیا؟“ شفا دہاتوں نے نیو کو شکا کر دیا وہ جان چکی تھی کہ شفا جو کچھ کہہ رہی ہے وہ کافی حد تک درست ہے پھر بھی اس کا دل نہ مان رہا تھا کہ کوئی بہن اپنے شوہر کے ساتھ اپنے گئے بھائی کے کئی جذبات کو بھی دھسکس کر سکتی ہے جب کہ شوہر بھی ایسا جو اس کے بھائی سے بدلی ہر رکھتا ہو۔

”میں یہ تو نہیں جانتی نیو کہ رحاب بھائی نے یہ سب کیوں کیا؟ لیکن مجھے اتنا یقین ضرور ہے کہ جنید بھائی جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ سب بھی ایک ڈرامہ ہے کیوں کہ دونوں قبل ان دونوں میاں بیوی کو میں نے خود گھر سے جاتے

دیکھا ہے، میں اس وقت اتفاق سے ٹیرس پر کھڑی تھی جب یہ دونوں میاں بیوی ہنستے کھیلنے گھر سے نکلے تھے پھر یہ سب کیا ہو گیا یقین کو مجھے تو کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا بہتر یہ ہے کہ تم خود سنان سے بات کرو تاکہ واضح ہو کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ ”شفایات ختم کر کے اٹھ کھڑی ہوئی اور حقیقت بھی یہ ہی تھی کہ اب اس کے لیے لازمی ہو چکا تھا کہ وہ سنان سے اس مسئلے پر کھل کر بات کرے تاکہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہونے اور پھر شفا کے باہر نکلے ہی اس نے جلدی سے سنان کا نمبر ملایا سنان نے دوسری ٹیل پر ہی فون اٹھالیا۔ سنان سے گفتگو نے شفا کی ہر بات کو جع ثابت کر دیا واقعی سنان نے اپنی کورٹ میرج والی تجویز رحاب کے سامنے رکھی تھی اور شاید رحاب ڈر گئی کہ اگر حقیقت میں ان دونوں نے یہ کھلیا قدم اٹھالیا تو اس کا اثر رحاب کے گھر پر پڑے گا بس اسی سوچ کے تحت رحاب نے یہ سب کچھ جنید کو بتا دیا سنان کو علم ہی نہ تھا کہ غصہ کی حالت میں زبان سے ادا کیے گئے کچھ غلط جملے اس طرح ساری بات لو کاؤں کے اور اب وہ بے حد شرمسار تھا۔

”یار میں نے آپ سے جو کچھ کہا محض غصہ کی کیفیت میں کہا اور یہ بات آپ ہی جانتی ہیں پھر انہوں نے یہ سب جنید سے کیوں کہا مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“ وہ جنید کو بھی بھی بھائی نہ کہتا تھا شروع شروع میں تو بیوے نے ٹوکا بھی مگر اب اس مسئلہ پر چپ سا دھ چکی تھی۔

”جو بھی ہوا سنان بالکل غلط ہوا اور اب تمہی الحال آئی کو پاپا کے پاس مت بھیجنا ورنہ بات مزید بگڑ جائے گی۔“

”وہ تو ابھی خود بھی نہیں آ رہیں کیوں کہ دونوں سے آپ نے رد و کر ہم سب کو پریشان کر رکھا ہے اب وہ چاہتی ہیں کہ جلد از جلد میرا نکاح مرنے سے کر دیا جائے تاکہ ان کا گھر برباد ہونے سے بچ جائے۔“

”اور تم کیا چاہتے ہو؟“ بیوہ کے لہجہ میں خود بخود نفی اتر آئی۔

”میں تو صرف نہیں ہی چاہتا ہوں اور یہ بات تم خود بھی اچھی طرح جانتی ہو۔“ سنان نے ہلکے پھلکے انداز میں بیوہ کو دھیان دینے کی کوشش کی اور پھر وہ اس میں خاصی حد تک کامیاب بھی رہا اور جب پندرہ منٹ بعد بیوہ نے فون بند کیا تو وہ خاصی مطمئن تھی اب وہ ہر امید تھی کہ حالات جلد ہی اس کے حق میں موافق ہو جائیں گے۔

میں جس گمان میں تھی وہ گمان ٹوٹ گیا
کڑی دھوپ میں لو سائبان ٹوٹ گیا
تم سے ملایا رب نے حیرانی سی رہتی تھی
دیکھو وقت کی گردش سے خواب حیراں ٹوٹ گیا

کتنے ہی ادا اس دن چپ چاپ گزر گئے رحاب کے سلسلے میں جنید نے کیا فیصلہ کیا ہے وہ جان ہی نہ سکی اس کے امتحان ہونے والے تھے یہ ہی وجہ تھی کہ وہ اپنے ذہن کو تمام سوچوں سے آزاد کر کے فی الحال اپنی بدھائی میں مصروف تھی۔ سنان سے اس کی گفتگو ہوتی تھی مگر بہت کم رحاب ابھی تک اپنے گھر ہی میں بیٹھے ہی غمگین تھی اس کی ڈیوڑھی متوقع تھی اور اس سلسلے میں اس نے لازمی اپنی ماں کے گھر جانا تھا اور اس بات کا علم گھر میں سب ہی کو تھا اس کے باوجود وہ اکثر وہی جتن اپنی کسی نہ کسی بات سے اسے یہ احساس دلانے کی کوشش ضرور کرتیں کہ اس سب کی ذمہ دار وہ اور سنان ہیں اسی لیے وہ اپنے کمرے سے بھی کم ہی باہر نکلتی شفا اپنی خوبصورت اور لاڈلی بہن کی یہ حالت دیکھ کر کڑھتی رہتی لیکن اس سارے مسئلہ کا حل اس کی سمجھ میں بھی نہ آ رہا۔ رہا جنید تو اس نے تو اس دن کے بعد سے بیوہ سے بالکل بات ہی نہ کی تھی ایسا لگتا تھا جیسے ان دونوں کے درمیان موجود خون کا رشتہ ٹوٹ چکا ہو صرف ایک امان کی ذات ایسی تھی جسے ان تمام حالات سے کوئی فرق نہ پڑا تھا۔

بیوہ آج بھی اس کی پیاری سی بہن تھی اور وہ حتی الامکان کوشش کرتا کہ بیوہ کو پھر سے اسی زندگی کی طرف لے جائے جس کی وہ عادی تھی امان اور شفا کی محبت اور حوصلہ ہی تھا جس نے بیوہ کو اس یقین کی سیڑھی پر کھڑا رکھا تھا

کہ سنان صرف اور صرف اس کا ہے اور ان شاء اللہ جلد از جلد تمام حالات ویسے ہی ہو جائیں گے جسے وہ چاہتی ہے اسے صرف انتظار تھا وقت کا وہ جانتی تھی کہ رحاب کی ڈیوڑھی کے بعد تمام حالات ٹھیک ہو جائیں گے کیوں کہ جنید بیوی چھوڑ سکتا تھا اپنا بچہ نہیں لیکن آنے والے وقت نے اس کی تمام سوچوں کو غلط ثابت کر دیا اور اسے یقین آ گیا کہ نصیب سے لڑنا بندے کے اپنے اختیار میں نہیں ہے اور ہمیں اگر انسان بالکل بے دست و پا ہو جاتا ہے اور ایسا ہی کچھ بیوہ کے ساتھ بھی ہوا وقت کے دھارے نے اسے ایک ایسے موڑ پر لا کر کھڑا کر دیا جہاں سنان اور اس سے وابستہ یادیں نقش پائیں کر رہ گئیں۔



کے ایل۔ آئی۔ اے ایئر پورٹ سے باہر نکلتے ہی اس کا دل بھر آیا اپنا وطن اور اپنے لوگوں کی یاد اس قدر شدت سے اس پر حاوی ہوئی کہ اس کا دل چاہا آس پاس موجود تمام لوگوں کو نظر انداز کر کے وہیں دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دے اس کے چاروں طرف موجود تمام روئیں معدوم ہو گئیں اور ایک دم ہی ڈھیروں ڈھیر سناٹوں نے اس کے وجود پر اناراج جمالیا وہ عالم بے خودی میں گھری ایئر پورٹ کی پارکنگ میں کھڑی تھی سکندر گاڑی نکال رہا تھا ایک دم ہی جواز کے تیز انجن کی آواز پر اس نے اپنا سر اوپر اٹھایا ملائیشین ایئر لائن کا جہاز اپنے تیز شور کے ساتھ اس کے سر پر گزر گیا ردا آج پورے دو ماہ بعد اسی فلائٹ سے پاکستان واپس گئی تھیں اور یہ دو ماہ کس طرح پلک چھپکتے گزرے بیوہ کو بتا ہی نہ چلا وہ تو صرف اس احساس سے ہی سرشار تھی کہ اس تمام عرصہ میں سکندر اور اس کے گھر کے تمام ہی افراد نے ردا کے ساتھ ساتھ بیوہ کا بھی بھرپور خیال رکھا۔

سکندر اس کی ماں کو کھانے لڑکائی بھی لے کر گیا بیوہ نے اپنے ملائیشیا قیام کے پورے ایک سال بعد یہ جنت نظیر جزیرہ دیکھا جس کی خوبصورتی کا ذکر وہ اکثر ذہن پر تریبہ سے سنتی تھی اور یہاں آ کر اسے خود بھی یقین آ گیا حدنگاہ تک پھیلا خوبصورت نیلا پانی اس کی مکمل توجہ اپنی جانب کھینچ رہا تھا اسے فوراً ہی ہاں بے یاد آ گیا جس پر اگر تھوڑی سی توجہ دی جائے تو بہترین سیاحت گاہ بنایا جاسکتا ہے صاف و شفاف پانی کے ساتھ ساتھ چاروں طرف پھیلی ہوئی بھی عجیب بہار دکھائی دیتی تھی چاروں طرف موجود خوبصورت ہوٹل اسے ایک الگ سی خوبصورتی پیش رہے تھے ایک رات انہوں نے قریبی ہوٹل میں قیام کیا رفیقہ ابھی ان کے ساتھ تھی اور وہیں پر ہی شاید پہلی بار اپنی ماں کے اصرار پر اس نے لاسی لمہ اور چکن سانبھو بھی کھایا حالانکہ اسے ملائی کھانے بالکل بھی پسند نہ تھے لیکن آج جب سب کے ساتھ مل کر کھایا تو اسے اچھا لگا ردا کی واپسی سے قبل سکندر انہیں بازار بھی لے گیا اور شفا کے علاوہ گھر کے دیگر افراد کے لیے شاپنگ بھی خود کروا کر دی تھی ردا کی پسند کو مد نظر رکھتے ہوئے وہ اکثر ہی صبح ناشتے میں ایک پاکستانی ریسٹورنٹ سے چنے کا سالن اور نان لے آتا حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اس کی ماں نے اپنے قیام کے دوران یہاں بہت ساری پاکستانی ڈشز بھی بنائیں جو تقریباً ”سب کو ہی پسند آئیں“ خاص طور پر پیٹھے دہی بڑے جو ہر روز ہی شام میں وہ سکندر کی خاص الخاص فرمائش پر بناتیں وہ سکندر کے لیے پاکستان سے بہت سارے کرتے شوار بھی لے کر آتی تھیں کھل کہ وہاں مروانہ شلوار قمیص کی اتنی ورائٹی نہ تھی اور سکندر کی فیملی میں پاکستانی کرتے بے حد پسند کیے جاتے تھے۔

سکندر ہر جمعہ مسجد جاتے ہوئے نیا کرتے شلوار بے حد شوق سے پہن کر جاتا اور بیوہ کو یہ سب کچھ بہت اچھا لگتا ایک ماہ قبل ہی وہ ایک عدد خوبصورت بیٹے کی ماں بن چکی تھی جس کا نام ردا نے حصار کھا جو سب کو ہی بے حد پسند آیا غرض کہ آج دو ماہ بعد اس کی ماں ملائیشیا سے بے حد خوش اور مطمئن واپس گئی تھی اس وعدے کے ساتھ کہ چھ ماہ بعد ہونے والی شفا کی شادی میں سکندر اور بیوہ دونوں نے لازمی شرکت کرنی ہے اور چھ ماہ بعد وطن جانے کا احساس ابھی سے اس کے حواسوں پر سوار ہو چکا تھا وہ سارے راستے ان ہی سوچوں میں گم رہی بتا ہی نہ چلا کہ گھر

آگیا دروازے کے سامنے گاڑی رکھتی ہی اسے شدت سے حماد کی یاد آئی جو وہ اپنی ساس کے پاس چھوڑ کر گئی تھی بے قراری سے لکڑی کا بڑا گیت کھول کر وہ تیز چلتی برآمدے میں داخل ہوئی جہاں سامنے ہی جھونپڑ پر لٹھی فاطمہ کوئی ملائی چھیل دیکھ رہی تھیں۔

”حماد کہاں ہے؟“ ان کے قریب موجود حماد کے خالی جھولے پر نظر پڑتے ہی بے اختیار اس کے منہ سے نکلا اس کی ساس کے جواب دینے سے قبل ہی سامنے چھوٹے کمرے کا دروازہ کھول کر ایک بیچیس چھبیس سالہ انڈونیشین لڑکی باہر نکلی یہ کمرہ جب سے وہ آئی تھی اس نے بند ہی دیکھا تھا شاید یہ اس کے سر کا اسٹری روم تھا اس لڑکی کی دوہاں غیر متوجہ موجودگی سے زیادہ اس کا حلیہ حیرت انگیز تھا نہایت ہی چھوٹا سا اسکرٹ اور سیلوئس کلمے گلے کا بلاؤز جو کمرے کی بنیادوں سے بالکل بھی میل نہ کھاتا تھا اس کے جھلکتے بدن کو دیکھ کر نبیو خود ہی شرمندہ سی ہو گئی۔

”یہ کون ہے؟“ تھوڑی دیر کے لیے وہ حماد کو یکسر بھول چکی تھی اور اس کی توجہ مرکز صرف اور صرف سامنے کھڑی لڑکی تھی۔

”یہ ایدھا ہے حماد کی گورنس۔“ سکندر گاڑی کھڑی کر کے ابھی ابھی اندر داخل ہوا تھا۔

”حماد کی گورنس۔“ اس نے حیرت سے پلٹ کر سکندر سے سوال کیا۔

”ہاں کیونکہ مجھے تم پر بالکل ٹرسٹ نہیں ہے جانے کس طرح پچھ پالو اپنا کوئی کام تو تم ڈھنگ سے کر نہیں سکتیں پچہ کی ذمہ داری کیا پوری کرو گی۔“ یقیناً ”سامنے کھڑی میڈارو نہیں جانتی تھی پچہ بھی سکندر کے ان الفاظ نے اسے جی بھر کر شرمندہ کیا اس نے فوراً ”ایک نظر اپنی ساس پر ڈالی جو نہایت لائق تھی سے نی وی دیکھنے میں مصروف تھیں۔ تو بالآخر یہ سب لوگ اپنے چلے آتا کر پھر سے اپنے اصل کی طرف لوٹ گئے ہیں اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر سوچا اور اس کے ساتھ ہی شدید محسوس کا احساس اس کے رگ و پے میں اتر گیا اب مزید کچھ کہنا بے کار تھا وہ خاموشی سے سکندر کے پاس سے گزرتی اپنے کمرے میں آئی جہاں حماد کا چھوٹا بیڈ خالی پڑا تھا ایک دم ہی اس کے دل کو کچھ ہوا اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔

ایک ماہ میں وہ پہلی رات تھی جو اس نے حماد کے بغیر گزار دی ساری رات ہی وہ بے سکون رہی لیکن اس رات کے بعد آنے والی ہر ایسی رات ہی اس کا مقدر بن گئی اور اپنے مقدر سے سمجھوتہ کرنے کی عادت تو اسے اس وقت سے ہی ہو گئی تھی جب ستان کی جگہ سکندر کا نام اس کا نصیب بننا تھا اور اب ہر گزرتے دن نے اس کے اور حماد کے درمیان بھی ایک انوکھا فاصلہ بڑھا دیا تھا جسے وہ چاہتے ہوئے بھی عبور نہ کر سکی۔

محسوس کر رہا ہوں میں جینے کی تنہائیاں
شاید مجھے کسی سے محبت نہ رہی۔

کئی دنوں سے جاری بارش آج کچھ تھمی تھی اس نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر نئی لکڑی کی بانڈری وال سے پرے سامنے روڈ پر ایک نظر ڈالی دھلائی صاف ستھری روڈ جس کے کنارے لگے ہوئے ہرے بھرے درخت سارے منظر کو رعنائی بخش رہے تھے فٹ پاتھ پر رونق ہی رونق تھی یہاں لوگوں کو بارش کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہ پڑتا تھا ان کا کارروان زندگی دونوں حالتوں میں یکساں رواں رہتا تھا وہ ملائی عورت بھی اپنے مخصوص مقام پر چھتری کے نیچے اپنا فوڈ اسٹال لگائے بیٹھی تھی اس کے قریب ہی بے بی چیز پر ایک چھوٹا سا پچہ موجود تھا وہ کیا بیچتی تھی نبیو کو آج تک پتا ہی نہ چلا اور نہ ہی کبھی اس نے جاننے کی کوشش کی تھی لیکن اتنا ضرور تھا یہ سب فوڈ اسٹال اسے پاکستانی برگر اور چنے چاٹ کی یاد ضرور دلاتے یہ وہ چیزیں تھیں جن کے لیے وہ ہاں ترس گئی

تھی۔

نبیو نے اپنے قیام کے دوران جگہ جگہ فٹ پاتھ پر عورتوں کو ایسے ہی اسٹال لگائے مختلف اسٹا فروخت کرتے دیکھا تھا جن میں میک اپ کاساں بچوں کے کھلونے اسٹیشنری حتیٰ کہ مختلف گھریلو الیکٹرونکس کا سامان بھی ہوتا اور جب بھی وہ ایسے اسٹال دیکھتی اسے پاکستان ضرور یاد آتا جہاں اس طرح عورت کا فٹ پاتھ پر بیٹھ کر روزی کمانے کا تصور ہی محال تھا ملائیشیا اور پاکستان دونوں ہی نام صرف ایشیائی بلکہ اسلامی ممالک بھی ہیں لیکن دونوں کی ثقافت اور موسم میں زمین آسمان کا فرق ہے جب سے نبیو یہاں آئی تھی اس نے بھی سردی ہی نہ دیکھی تھی یہاں موسم معتدل رہتا ذرا سی گرمی پڑتی تو گرم۔ ہمہ بارش برس اچھی اور یہ پرستی بارش اسے اپنے شہر کراچی کی یاد دلاتی جہاں سالوں بعد ہونے والی بارش اتنا کھل کر برسی کہ ہر طرف جل جل ہو جاتا لگتا اور اشری ڈوب جائے گا پھر بھی اسے بارش اور بارش کے پکوان اچھے لگتے تھے اور اب اس نے ایک ٹھنڈی ٹھہری بج ہے جو چیز انسان کو وافر مقدار میں نصیب ہو وہ اپنی قدر کو دیتی ہے انسان یا تو اس سے اکتا جاتا ہے یا پھر اس کا عادی ہو جاتا ہے اس بات کا عملی تجربہ نبیو کو وقت نے سکھایا تھا۔

اب تو بارش اور اس کی دیوانگی سب وقت کے ساتھ خام خیالی ہو چکی تھی پچہ بھی جانے کیوں آج اتنے عرصہ بعد اس کا دل چاہا وہ اس موسم میں سامنے نظر آنے والی سرمئی روڈ کے فٹ پاتھ پر دوڑ تک پیدل جائے بالکل تنہا اور اکیلی۔ یہ ہی سوچ کر اس نے قریب لگے آئینہ میں موجود اپنے عکس پر ایک نظر ڈالی ٹخنوں سے اوچی ہوئی سیکسی جو اس نے کل شام سے ہی پہن رکھی تھی اور اب بھی اس کا دل ہی نہ چاہا کہ اسے تبدیل کرے آئینہ دیکھ کر لگتا ہی نہ تھا کہ اس میں نظر آنے والا عکس اس نبیو ملک کا ہے جس کی ایک مسکراہٹ کا سارا زمانہ دہانہ ہوا کرتا تھا اب تو لگتا تھا مسکرائے ہوئے بھی صدیاں گزر گئیں پرانی یادوں کے ساتھ ہی ستان کی یاد بھی ایک میس بن کر اس کے دل میں جاگ اوری اسے اندر تک چر گئی۔

”جانے وہ کیا ہو گا؟“ آج کئی دنوں بعد اس نے سوچا اور نہ اس نے تو کبھی کسی سے ستان کے بارے میں جاننے کی کوشش ہی نہ کی تھی وہ اسے اپنا گزرا ہوا وقت سمجھ کر زندگی سے نکال چکی تھی یہاں تک کہ روا کے دو ماہ کے قیام کے دوران بھی اس نے ایک دفعہ کبھی ستان کا ذکر نہ کیا البتہ کچھ عرصہ قبل شفا نے اسے فون پر بتایا تھا کہ رحاب اپنے گھر گئی ہے کیونکہ ستان اور مرینہ کا ٹکڑ چ ہے بس پھر اس کے بعد اس نے کبھی بھی اس کے بارے میں جاننے کی کوشش نہ کی ستان اس کی زندگی کا ایک ایسا ورق تھا جسے وہ بچاؤ چکی تھی۔

”نبیو تم اتنی خوبصورت کیوں ہو؟ جانتی ہو تمہیں دیکھ کر میرا دل چاہتا ہے تمہیں ایسے ہی میرے سامنے بیٹھی رہو اور میں تمہیں دیکھتا رہوں اور یہ وقت ہمیں گم جائے اے کاش۔“ جانے کیوں آج نہ چاہتے ہوئے بھی ستان اور اس کی باتیں اسے بڑی شدت سے یاد آ رہی تھیں اتنی کہ خود بخود اس کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے۔

”یہ کس کی یادیں آنسو بہا رہی ہو؟“ ایسے ہی سکندر کب کمرے میں آیا اسے پتا ہی نہ چلا اس نے جلدی سے اپنے ہاتھ سے آنکھ میں آیا پانی صاف کیا اور بتا کوئی جواب دیے کھڑکی کا پردہ برابر کھڑا اس لکھ اس کا دل کوئی بھی بات کرنے کو نہ چاہا رہا تھا اور ایسے میں خاموشی ہی بہتر تھی۔

”آواز نہیں آ رہی میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔“ یہ سکندر کی علوت تھی جب وہ جان جانا کہ نبیو جواب دینے سے کھڑا رہی ہے وہ اسی طرح اسے زچ کرنا۔

”کچھ نہیں شفا کی شادی کے بارے میں سوچ رہی ہوں صرف چند دن رہ گئے۔“ ہر وقت دلخیز آنے والی سوچ نے اسے کسی بھی طرح کے فساد سے بچالیا۔

”آہ ہاں یاد کیا میں آج ہی امیجیسی گیا تھا لیکن وہ کسی بھی طرح حماد کا پردہ نہیں دے رہے۔“

”کیوں؟“

”اصل میں نبیوہ ہمارے ملک کے قانون کے تحت چھ ماہ بعد بچے کا اور پینٹل برتھ سرٹیفکیٹ بنتا ہے پھر اس کے بعد انٹرنیشنل پاسپورٹ ملتا ہے اس سے پہلے ویزے کے لیے اپلائی کرنا ذرا مشکل ہوتا ہے۔“ سکندر نے تفصیلاً سمجھایا جواب میں وہ خاموش رہی یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ ربیحہ اور عبدالوہاب ایک ہفتہ قبل اپنی دواہ کی بجی لے کر کس طرح پاکستان گئے ہیں؟ کیا انہیں بجی کے لیے ویزے کی ضرورت نہ تھی یا ان کے لیے یہاں کا قانون الگ تھا اور سکندر کے لیے الگ۔

”میرا خیال ہے کہ سکندر بھائی تمہارے ساتھ حماد کو پاکستان بھیجنا نہیں چاہ رہے اسی لیے جان بوجھ کر ہمارے پتا رہے ہیں۔“ اس کے کانوں میں کچھ دن قبل کا کما ہوا ربیحہ کا جملہ گونجا جس پر اس دن تو اسے یقین نہ آیا تھا لیکن آج ضرور آگیا۔

”اب تم بتاؤ میں کل تمہارا پاسپورٹ جمع کروادوں تم اکیلی چلی جاؤ دواہ کے لیے میں اور حماد یہیں رہتے ہیں اور ویسے بھی تمہاری بہن کی شادی میں ہمارا کیا کام ہے۔“

”نہیں رہیں۔“ دل پر جبر کر کے اس نے اپنا سر انکار میں ہلایا۔

”میں حماد کو اکیلا چھوڑ کر پاکستان نہیں جاؤں گی۔“

”تو یہاں حماد کون سا تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔“ سکندر دھیسے سے طنز انداز میں بٹا اور تولیہ اٹھا کر ہر صحن کے دوسرے سرے پر بے باتھ روم کی جانب بیڑھ گیا وہ ہمیشہ ہی باتھ روم استعمال کرتا تھا بقول اس کے اٹیچ بٹھ روم انگریزوں کا دیا ہوا تختہ تھا اور ان سے پاکیزگی کا احساس پیدا نہیں ہوا بہر حال یہ اس کی اپنی ذاتی سوچ تھی اور ہر شخص اپنی اپنی سوچ کا خود مالک ہوتا ہے ہم کسی بھی دوسرے شخص کی سوچ پر لاکھ چاہتے ہوئے بھی اختیار حاصل نہیں کر سکتے۔



”مجھے پتا تھا سکندر بھائی نے حماد کو تمہارے ساتھ پاکستان نہیں بھیجا اس لیے ہی جھوٹے بھانے لڑ رہے تھے۔“ ربیحہ دودن قبل پاکستان سے آئی تھی اور آج اس سے ملنے اپنے شوہر کے ساتھ اس کے گھر آئی ہوئی تھی اس کے آنے کا ایک مقصد وہ سامان پہنچانا بھی تھا جو اس کے گھر والوں نے اس کے اور حماد کے لیے بھیجا تھا۔

”اور یقین کر دو شفا کی شادی میں سب نے ہی نہیں بہت مس کیا اور تمہاری بھابی تو خوب کید کید کر تمہارے حالات جاننے کی کوشش کر رہی تھی۔“ رحاب کے ذکر کے ساتھ ہی شان کا ہیولہ پھر سے اس کے سامنے آکر اٹھ رہا ہوا جانے آج کل اسے کیا ہو گیا تھا دل ہر وقت شان کو ہی یاد کرتا حالانکہ وہ جانتی تھی کہ اب یہ سب کچھ بے کار ہے پھر بھی وہ دل ہی کیا جو کسی کی ہان لے۔

”بھابی کے گھر والے بھی تھے شادی میں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی یہ سوال اس کے لبوں پر آگیا۔

”ہاں ان کی امی سے بھی ملی تھی میں۔“

”واہ اچھا۔“ چاہتے ہوئے بھی وہ ربیحہ سے شان کے بارے میں کوئی سوال نہ کر سکی ویسے بھی جب سے اس کی شادی ہوئی تھی شان اس دن کے بعد سے کبھی بھی ان کے گھر نہ آتا تھا یہاں تک کہ وہ اپنے بھانجے کی برتھ ڈے پر بھی نہ آتا تھا اور یہ بات بھی کچھ عرصہ قبل اسے شفا نے ہی بتائی تھی جو آج بھی مکمل جزئیات کے ساتھ اسے یاد تھی۔

”سچ ہے جن سے دل کے رشتے ہوتے ہیں انہیں دل سے نکالا نہیں جاسکتا۔“

”ویسے یار تمہاری بھابی بڑی لکی عورت ہے۔“

”وہ کس طرح۔“

”دیکھو ناپاکل نارمل شکل و صورت رکھتے ہوئے بھی قسمت کی کتنی دھنی ہیں شوہر کاٹھ کے الو کی طرح چاروں طرف منڈلا پھر رہا تھا پوری شادی میں اور یقین جانو چند بھائی آج بھی ان کے سامنے بڑے خوبصورت اور ہینڈم نظر آتے ہیں۔“ ربیحہ نے ہنسنے ہوئے اپنی بات مکمل کی۔

”خوبصورتی عورت کا نصیب نہیں بناتی ربیحہ! اور نہ یقین جانو میں آج دنیا کی سب سے خوش نصیب عورت ہوتی۔“ اس نے ایک سرو آہ بھر کر جواب دیا اس کی اس بات کا جواب ربیحہ کے پاس نہ تھا اسی لیے وہ خاموش رہی اور پھر ربیحہ کے جانے کے بعد اس نے اپنی ساری رات اپنے گھر والوں کے ساتھ ساتھ شان کو بھی یاد کرتے ہوئے گزار دی آج بھی سکندر گھر نہ آیا تھا اپنے کسی کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گیا ہوا تھا جبکہ اس کی ساس اور رفید اپنے بڑے بھائی عمر کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ گھر پر صرف وہ اور ایدہ صاحبیں حماد ایدہ صاحبی کے پاس تھا اب تو ویسے بھی وہ اسی کا عادی ہو چکا تھا اگر کبھی نبیوہ لے بھی جیتی تو فوراً ہی رونے لگتا یہ ہی وجہ تھی نبیوہ بھی اسے کم ہی ہاتھ لگاتی تاکہ وہ ڈسٹرب نہ ہو اس کا کمر گھر کے آخری سرے پر تھا جس کی ایک کھڑکی باہر بڑے سے صحن میں کھلتی تھی کھڑکی پر گرل بھی نہ تھی اندر سے کنڈی لگانے کے باوجود اسے ایسا محسوس ہوا جیسے باہر شیشے کے اس پار کوئی موجود ہو گھر میں پھیلا ہوا سانا ساری رات اسے ہولانا رہا اور اسی سوچی جاتی کیفیت میں کب گھر ہوئی اسے پتا ہی نہ چلا نماز پڑھ کر وہ کمرے سے باہر نکلی تاکہ کچن میں جا کر ایک کپ چائے بنا سکے رات بھر کی آنکھ پھولی نے اس کا سر دکھایا تھا باہر نکلتے ہی اس کی نگاہ کچھ فاصلے پر کھڑے سکندر پر پڑی جو غالباً باتھ روم سے باہر نکلا تھا گیلیا تولیہ اس کے کندھے پر تھا۔

”آپ کب آئے؟“ سے حیرت ہوئی۔

”رات ہی آگیا تھا۔“ سکندر نے آہستہ سے جواب دے کر تولیہ سے اپنے بال صاف کیے اور اسے صحن میں لگی تار پر پھیلا دیا۔

”ایڈہانا شتاؤز اجلدی لے آؤ۔“ اسے مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے اس نے ایدہ کو پکارا اور اس دم نبیوہ کو یاد آگیا کہ گھر میں ان دونوں کے علاوہ ایک تیسری ہستی بھی موجود ہے بجلی کی مانند کچن کی جانب لپکی تاکہ سکندر کو خودناشتا بنا کر دے اس وقت اس کا بے چین دل اسے کوئی اور ہی کمائی شاربہ تھا جسے وہ سنتا نہیں چاہ رہی تھی کچن کے اندر داخل ہوتے ہی اس نے ایک نظر سامنے سب کے پاس کھڑی ایدہ چار ڈالی جس کے کندھوں پر آتے کیلے بال ایک نیا افسانہ بنا رہے تھے وہ غالباً ”سکندر کے لیے کارن فلیکس اور جس تیار کر رہی تھی۔ نبیوہ کو مکمل طور پر نظر انداز کر کے اس نے ٹرے میں سارا سامان رکھا اور خاموشی سے اس کے پاس سے گزر گئی بالکل مختصر شارٹ پر سیلوئس چھوٹا سا فپ گلے کا بلاؤز اس کا شرمناک حلیہ نبیوہ کو شرمندہ کر گیا سکندر کے سامنے اس کا ناشتا رکھنے کے بعد اپنی بلیک کافی اور کوکیز لے کر وہ عین اس کے مقابل بیٹھ گئی جیسے وہ سکندر کی کس بات پر زور زور سے ہنس رہی تھی کھڑکی سے نظر آنے والے اس منظر نے اس کے تن بدن میں آگ سی لگادی اپنی مستی میں گم ایدہ حال اور سکندر نا صرف اسے بلکہ حماد کو بھی نظر انداز کر چکے تھے جو جھولے میں لیٹا مسلسل رو رہا تھا غالباً ”وہ بھوکا تھا نبیوہ نے طیش میں آکر پلیٹ سب پر پتی اور تیزی سے باہر نکلی بنا کچھ کے حماد کو جھولے سے نکالا وہ گیلیا تھا اسی لیے اسے قدر شدت سے رو رہا تھا اپنی کم مائیگی کا احساس نبیوہ کو بھی رلا گیا وہ حماد کو لیے ہوئے اپنے کمرے میں آگئی اسے صاف ستھرا کر کے کپڑے تبدیل کیے پھر فیزینا کر دیا۔

اس کے دل سے چائے کی خواہش اور بھوک کا احساس ختم ہو چکا تھا اس نے حماد کو سلاپا اور تمہاس میں موجود گرم پانی سے اپنے لیے بلیک کافی تیار کی اور ساتھ ہی کچھ کوکیز کھا کر لیٹ گئی اس کا دل ہی نہ چاہا کہ وہ کمرے سے

باہر نکل کر کالی کلونی ایدھا کا سامنے کرے جو آج اس پر صرف اس لیے سبقت لے گئی تھی کہ اس کے ساتھ سکندر تھامشام میں رفید اور فاطمہ بھی گھر آگئیں ان کی موجودگی میں ایدھا عجماد کو اس کے کمرے سے لگتی سکندر گھر نہ تھا جانے وہ کب باہر گیا تھا نبیوہ نے جاننے کی کوشش ہی نہ کی اپنی عزت کو مزید خراب کرنے سے زیادہ بہتر یہ تھا کہ جو کچھ اس نے فاطمہ کی غیر موجودگی میں دیکھا اس کا ذکر کسی سے نہ کرے اور اسی میں اس کی بہتری ہی تھی اس خیال کے ذہن میں آتے ہی وہ بالکل خاموش ہو گئی اس رات جب سکندر گھر آیا تو کچھ شرمندہ شرمندہ سا تھا یا شاید یہ نبیوہ کی خام خیالی تھی جو بھی تھا کافی عرصہ بعد سکندر نے وہ رات اس کے ساتھ گزار دی اور سکندر کے پل بھر کے التفات نظر نے نبیوہ کے دل میں دن بھر کے غبار کو دھو دیا۔ وہ پل بھر میں ہی سب کچھ بھلا کر شانت ہو گئی۔

”شاید مجھے غلط فہمی ہوئی ہو۔“ اپنے بے چین دل کو طفل تسکینوں سے بہلاتے ہوئے تمام رات گزر گئی لیکن آنے والے اگلے کئی دنوں نے نبیوہ پر ثابت کر دیا کہ اس رات سکندر کی گھر میں موجودگی محض اتفاق نہ تھی بلکہ ایدھا اور سکندر کی پلاننگ کا ہی نتیجہ تھی اور جانے ایسا وہ دنوں کب سے کر رہے تھے کبھی بھی تو اسے محسوس ہوتا کہ رفید اور فاطمہ دونوں ہی سکندر اور ایدھا کے درمیان موجود شرمناک تعلق سے آگاہ ہیں اور اس کی طرح پردہ پوشی کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہیں اور یہ سب آگہی ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کی تکلیف میں اضافہ کا سبب بن رہی تھی وہ خود کو بے حد بے بس محسوس کرتی سب سے زیادہ دکھ کی بات یہ تھی کہ وہ اپنا درد کسی کے سامنے بیان بھی نہ کر سکتی تھی۔ اسی لیے وہ خاموش تھی اور اس کی خاموشی نے ایدھا کے رویہ کو خاصا تبدیل کر دیا تھا وہ بالکل اس طرح ری ایکٹ کرنے لگی تھی جیسے نبیوہ میڈ ہو اور وہاں لکن اور یقیناً یہ احساس اسے سکندر کی نظر کرم نے ہی عطا کیا تھا جس کا نبیوہ کو پورا یقین تھا۔

ساڈا چڑیاں دا چنبا لے
باہل اسال اڑ جانا
ساڈی لمبی اڈاری اے
اسال مڑ نہیں آونا

وہ سکندر کے کزن کی بارات کے ساتھ شاہ عالم آئی ہوئی تھی یہاں عام طور پر شادیاں دوپہر میں ہی انجام پاتی تھیں بارہ بجے بارات شاہ عالم پہنچ گئی جہاں تمام مہمانوں کی تواضع لال کمرے شربت سے کی گئی گھر کے بوڑے سے ہال میں نیچے نیچے کاہٹ پر تمام مہمان خواتین برائمن تھیں نکاح مسجد میں ہو چکا تھا شیشے کی دیوار سے پار لالان میں دھڑے دھڑے بڑے بڑے دیپچوں میں کھانا تقریباً تیار ہو چکا تھا ٹیبل لگ چکے تھے اور ہر ٹیبل پر برنز موجود تھے جن پر ڈشز رکھ دی گئی تھیں چیئرزنی شرت کے ساتھ پورے ہال ڈھکے نہایت گوری چچی اور موٹی سی مقامی عورت کھانے کی ٹھگرائی میں مصروف تھی اور یقیناً تمام گھٹوگ بھی اس کی ترتیب کر رہے تھے نبیوہ کو یقین تھا کہ کچھ ہی دیر میں کھانا لگا دیا جائے گا اور ویسے بھی یہاں کھانا کھاتے ہی گھر واپسی کا روانہ نہ تھا بلکہ تمام لوگ اطمینان سے شام تک شادی والے گھر میں موجود رہتے اور مختلف گانوں پر ناپنے کے ساتھ ساتھ مختلف انداز سے انجوائے کرتے تو من کو تیسری دفعہ ڈریس تبدیل کروا کر سامنے بچے بوڑے سے صوف پر بٹھا دیا گیا تھا اب وہ ہنگ شلوار قمیص میں لباس تھی جب بارات آئی تھی دس دن سے سن غراہ پہنا تھا پھر ساڈی اور اب یقیناً ”وائٹ میکسی“ کا نمبر تھا اور پھر اس کے بعد میڈیا کا عام روایتی لباس یہ تمام ملبوسات پار لروالی خود اپنے ساتھ لائی تھی جن کا رایہ الگ سے ہوتا اور جیسے جیسے پارلر سے آئی لڑکی لباس تبدیل کرواتی ویسے ہی ساتھ میک اپ بھی تبدیل کرتی جاتی ڈیک پر نہایت مشکل زبان میں پنجابی گانے لگے ہوئے تھے۔

یہاں آس پاس سکھ کافی اکثریت سے آباد تھے اسی لیے ان کی زبان کا رنگ یہاں کے مقامی لوگوں کی زبان میں بھی جھلکتا تھا۔ نصرت فتح علی خان، شوکت علی اور رشمال کی گائیکی سکھوں کے علاوہ دیگر لوگوں کو بھی بہت پسند تھی کبھی کبھی تو نبیوہ کو سخت حیرت ہوتی جب وہ یہاں پرانے پاکستانی گانے سنتی اور وہ بھی ایسے جن کے بارے میں اسے کچھ بھی معلومات نہ ہوتیں یکے بعد دیگرے لگائے جانے والے مختلف گانوں پر تمام لوگ خوب ناچ رہے تھے اور نبیوہ نہایت دلچسپی سے ان بے فکرے لوگوں کو دیکھ رہی تھی جن کی عمر کی کوئی حد نہ تھی کچھ سال کے بچے سے لے کر ستر سال کے مردوں سب خوب کھل کر نغمہ کر رہے تھے سکندر کے جس کزن کی شادی تھی وہ خود بھی خوب ناچ رہا تھا اور ایسے میں جب وہ اس محفل میں پوری طرح منہمک تھی جانے کب اور کس نے ڈیک پر شازیہ منظور کا گانا گایا۔

ساڈا چڑیاں دا چنبا لے

اور اس آواز کے گونجنے ہی نبیوہ صرف جسمانی طور پر اس ہال میں رہ گئی جبکہ اس کا ذہن ایک دم ہی پرواز کرتے ہوئے بہت دور اپنے دیس پہنچ گیا وہ دیس جس کی خوشبو ڈیڑھ سال گزرنے کے باوجود نبیوہ کو بے چین رکھے ہوئے تھے اور اس پیاری سی خوشبو کے ساتھ اپنوں کی مک بھی نبیوہ کی روح کے اندر اتر گئی وہ بے خود ہو گئی اور اس عالم بے خودی میں سب کچھ بھلا بیٹھی اسے یہ بھی بھول گیا کہ اب اس کی پہچان نبیوہ سکندر کے نام سے ہے اسے یاد رہا تو صرف یہ کہ وہ نبیوہ ملک ہے وہ نبیوہ ملک جس کے دل پر سنان کی حکمرانی تھی جو سنان کے نام کے ساتھ دھڑکتا تھا اور لگتا تھا کہ اس نام کے جھنڈے ہی مرجائے گا لیکن آج ڈیڑھ سال گزر جانے کے باوجود نہ صرف زندہ تھا بلکہ شاید کافی حد تک سنان کی یادوں سے بھی خالی ہو چکا تھا۔

”جانتی ہو صلاح انکل اور آئی عاتشہ اس بار پاکستان کیوں آئے ہیں؟“

وہ آج کل اپنے امتحانات میں کافی مصروف تھی یہ ہی وجہ تھی کہ پچھلے پورے ایک ہفتہ کے دوران اس کی ملاقات انکل صلاح سے صرف دو چار بار ہی ہوئی تھی اور ویسے بھی وہ دنوں میاں بیوی جب سے پاکستان آئے تھے اپنی بیوی سرگرمیوں میں ہی مصروف تھے اور عام طور پر گھر بھی کم ہی نظر آتے تھے اور اب جو اچانک شفا نے ان کے حوالے سے اسے مخاطب کیا تو اس کی کی بورڈ پر چلتی ہوئی انگلیاں ایک دم ساکت ہو گئیں اور اس نے پلٹ کر شفا کی جانب دیکھا جو اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”وہ تمہارے لیے اپنے کسی بھانجے کا رشتہ لائے ہیں۔“ شفا جلدی جلدی اپنی بات ختم کر کے واپسی کے لیے مڑ گئی یہ جانے بغیر کہ اس خبر نے نبیوہ پر کیا اثر ڈالا ہے۔

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ نبیوہ اپنی کرسی کو دھکیلے ہوئے تیزی سے اٹھ کھڑی ہوئی اور آن کی آن میں شفا کو جالیا جو ابھی دروازے پر ہی تھی۔

”وہ ہی جو مجھے ممانے بتایا۔“ اس کا اطمینان قائل دیدہ تھا۔

”شفا تم تو سب کچھ جانتی ہو پھر بھی۔“

”پھر بھی کیا؟“

”پلیز شفا میری بات کو سمجھنے کی کوشش کرو میں سنان کے بغیر مر جاؤں گی۔“ وہ سسک پڑی۔

”تم ممانے کہو کہ وہ صلاح انکل کو صاف صاف منع کر دیں۔“

”مجھے لگتا ہے نبیوہ تمہارا دل غ خراب ہو گیا ہے تم اس سے قیل بھی جانے کتنے اچھے رشتوں کو اپنی بے وقوفی کے سبب گنوا چکی ہو میری مانو اس بار ایسی حماقت مت کرو کیونکہ گزر تا ہوا وقت تمہیں تباہ کر جائے گا اور بار بار

اچھے رشتے تمہارے دروازے پر دستک دینے نہیں آئے گے اس حقیقت کو تسلیم کر لو سن! تمہارا نصیب نہیں ہے پھر بھی اگر تمہیں یقین ہے کہ اتنا سب کچھ ہونے کے بعد بھی جہنم آئی تمہارے رشتے کے لیے آس گئی تو میرا تمہیں بہترین مشورہ یہ ہے کہ تم ان سے کہو کہ وہ فوراً آجائیں اور پیار سے تمہارے لیے بات کریں ورنہ جو ہو رہا ہے اسے خاموشی سے ہونے دو۔

شفائے بہت ہی پیارے اور دھیمے لہجے میں اپنے سامنے کھڑی اپنی معصوم بہن کو سمجھانے کی کوشش کی جو آج بھی اس امید پر تھی کہ حالات جلد ہی بہتر ہو کر اس کے اور ستان کے حق میں ہو جائیں گے، جبکہ رحاب پچھلے دو ماہ سے اپنی اہی کے گھر تھی۔ بقول ستان، جنید اس سے ملنے ایک دفعہ میں نہ گیا تھا جانے اس نے ستان سے کیوں دشمنی پال رکھی تھی یہ بات کسی کی بھی سمجھ سے بالاتر تھی، پھر بھی وہ دونوں اسی امید پر رہے تھے کہ رحاب کی متوقع دیوری کے ساتھ ہی جنید کا دل بھی صاف ہو جائے گا اور وہ اپنے بچے کی خاطر سب کچھ بھول کر رحاب کو گھر واپس لے آئے گا اور اب جب صرف درمیان میں ایک ماہ باقی رہ گیا تھا۔ شفا کی دی ہوئی اس نئی خبر نے اسے مزید حواس باختہ کر دیا۔ اسے سمجھ ہی نہ آیا کہ وہ شفا کی بات کا کیا جواب دے۔

”لیکن شفا تم اچھی طرح جانتی ہو جب تک جنید بھائی رحاب کو گھر واپس نہیں لائیں گے۔ آئی کس طرح میرے رشتے کے لیے آسکتی ہیں۔“

”تو پھر بھی کے لیے قربانی دے دو، کیونکہ جنید بھائی اس وقت تک رحاب بھائی کو گھر نہیں لائیں گے جب تک تمہارا کہیں رشتہ پکا نہ ہو جائے۔“ شفا یہ کہہ کر کی نہیں بلکہ تیزی سے آگے بڑھ گئی اور اس کے جاتے ہی نبیو نے فوری طور پر ستان سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ جس کا آج صبح سے کوئی مسیح بھی نہ آیا تھا اور اگلے ہی پل کمپیوٹر کی مخصوص آواز نے بتایا کہ آپ کا مطلوبہ نمبری الحال بند ہے اور پھر بار بار اس کا نمبر ملانے کے بعد نبیو مایوس ہوئی، لیکن جانے کیوں ہر ٹھوڑی دیر بعد وہ پھر نئی امید کے ساتھ اس کا نمبر ملائی اور جلد ہی ناامیدی سے بند کر دی۔ اس کے لیے ان حالات میں ستان سے رابطہ کرنا تزییر تھا اور اس رابطہ کی کوشش میں وہ ساری رات ہی مصروف رہی۔



صلاح بن محمد کا تعلق ملائیشیا کے ایک دار گھراے تھا۔ ان کے والد نام صرف کئی پاکستانی مدارس کی مالی معاونت کرتے تھے بلکہ ان ہی کی کوششوں کے سبب کئی ملازمین عالم دین کا کورس مکمل کر کے واپس جا چکے تھے۔ اسی سلسلے میں وہ اکثر و بیشتر پاکستان آیا کرتے جہاں ان کی ملاقات احتشام صاحب والد ملک اکرم سے ہو گئی اور پھر یہ ملاقات جلد ہی بہترین دوستی میں ڈھل گئی اور یہ دوستی اس قدر بڑھی کہ اگلی نسل تک منتقل ہو گئی۔ احتشام صاحب اور صلاح محمد کی دوستی اتنی پرانی تھی کہ نبیو نے ہوش سنبھالتے ہی ان دونوں میاں بیوی کو اکٹراپنے گھر آتے جاتے دیکھا تھا۔ یہ جوڑا بے اولاد تھا۔ اسی سبب بچوں سے ان کی محبت فطری تقاضے کے تحت تھی۔ ویسے تو وہ ان چاروں بہن بھائیوں سے ہی بے حد محبت کرتے تھے لیکن عائدہ شروع سے ہی نبیو کے ساتھ زیادہ دلی لگاؤ رکھتی تھیں۔ وہ جب بھی پاکستان آتیں ہمیشہ نبیو کے لیے تحائف کی تعداد دوسرے بچوں کے مقابلے میں زیادہ ہوتی۔ شاید دوسرے لوگوں کی طرح انہیں بھی نبیو کی خوب صورتی نے متاثر کر رکھا تھا۔ جو بھی تھا وہ دونوں میاں بیوی نبیو کو بھی بے حد پسند تھیں۔ وہ تو آج تک ملائیشیا نہ گئی تھی۔ لیکن اس کے مما اور پیادہ دیواروں سے ہو کر آچکے تھے اور تا صرف صلاح انکل بلکہ ان کی تمام فیملی کے حسن اخلاق اور مہمان نوازی سے خاصے متاثر ہوئے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اب جو صلاح محمد نے نبیو کا رشتہ اپنے بھانجے سکندر نظام کے لیے اٹکا تو کسی کو بھی اس میں کوئی قباحت نظر نہ آئی۔ اسوائے نبیو کے جو اس رشتے پر کسی بھی طور تیار نہ تھی اور اپنا یہ

انکار اس نے خود رونا تک پہنچا دیا۔ رونا نے احتشام صاحب سے مشورہ کر کے جواب کے لیے تقریباً دو ماہ کا وقت لے لیا۔

جس کا سبب یہ بتایا گیا کہ چونکہ رحاب گھر پر موجود نہیں ہے لہذا اس کی واپسی کے بعد اس سے مشورہ کر کے جو بھی فیصلہ ہو گا اس سے آپ کو آگاہ کر دیا جائے گا۔ رونا نے عائشہ کو بتایا کہ رحاب اپنے بچہ کے ساتھ تقریباً ڈیڑھ سے دو ماہ تک اپنے گھر واپس آجائے گی۔ پھر ہی ہم کوئی بات کر سکیں گے۔ چونکہ وہ گھر کی بڑی بہن ہے لہذا اس سے مشورہ کرنا بھی اسی طرح ضروری ہے جس طرح گھر کے دیگر افراد سے اور ان کی یہ بات نہ صرف عائشہ کی سمجھ میں آگئی، بلکہ انہیں خوشی ہوئی کہ گھر میں ہو کر اس قدر اہمیت دی جاتی ہے اور پھر جلد ہی وہ اس وعدہ کے ساتھ ملائیشیا واپس گئیں کہ انہیں جو بھی جواب دیا جائے گا وہ مثبت ہی ہو گا۔ جبکہ رونا کو خود معلوم نہ تھا کہ اس سلسلے میں ان کا جواب کیا ہو گا؟ انہوں نے بھی فی الحال اس معاملے کو اللہ کے سپرد کر دیا اور اس وقت تک خاموش ہو گئیں۔ جب تک رحاب کے سلسلے میں کوئی فیصلہ نہ ہو، وہ اور احتشام صاحب اس سلسلے میں جنید پر کافی دباؤ ڈال چکے تھے۔ لیکن وہ انتہائی درجہ کی ڈھٹائی کے ساتھ کان لیٹے ہوئے تھا اور اب تو اس سلسلے میں ستان بھی کافی دباؤ ڈالتے ہوئے تھا جس کا اندازہ اکثر ہی نبیو اس سے ہونے والی گفتگو سے لگا چکی تھی۔ اس کا یہ خیال بھی اب تقریباً غلط ثابت ہو گیا تھا کہ جنید اس سلسلے میں کوئی ڈرامہ بازی کر رہا تھا۔

رحاب نے نیک خوب صورت بیٹے کو جنم دیا تھا۔ اس خبر نے سارے ہی گھر کو سرشار کر دیا۔ پہلی بار پھر بھی بننے کا احساس اسے اور شفا کو بھی نہال کر گیا۔ احتشام صاحب سمیت سارا گھر جہنم کی طرف گیا ہوا تھا۔ صرف ایک وہی نہ گئی تھی۔ حالانکہ وہ بھی جتنی جانتی تھی۔ لیکن رونا اسے لے کر ہی نہ گئیں۔ اس کی ایک وجہ تو غالباً ستان ہی تھا اور دوسری شاید جنید جو بھی تھا اس نے خود بھی ساتھ جانے کی ضد نہ کی اور خاموشی سے اپنا کمر بند کر کے گانے سننے کے ساتھ ساتھ اپنا اسائنمنٹ مکمل کرتی رہی اور جب شام میں یہ لوگ واپس آئے تو شفا خاصی چپ چاپ تھی۔

”کیا بات ہے شفا؟“ میں اتنی خاموش ہو؟“ کچھ دیر تو نبیو اسے نوٹ کرتی رہی اور جب برداشت نہ ہوا تو پوچھ ہی بیٹھی۔

”کچھ نہیں یار بس ایسے ہی جنید بھائی کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔“

”کیا ہوا جنید بھائی کو؟“ نبیو کا اسائنمنٹ مکمل ہو گیا تھا۔ اس نے اپنا بن بند کر کے سائیڈ پر رکھا اور پوری توجہ شفا کی جانب مبذول کر دی۔ شفا کی خاموشی نبیو کے دل کو ہولائے جا رہی تھی اور کچھ انہوں نے اسے یکدم ہی بے چین کر دیا۔

”میں کیا ہوتا ہے میں تو صرف ان کی ضد اور ٹیلا پن کی بات کر رہی ہوں، جانتی ہو وہ دن سے بھائی اسپتال میں ایڈمٹ ہیں۔ ان کی حالت کچھ زیادہ اچھی نہ تھی۔ ایسے میں جہنم آئی نے جانے کتنے فون جنید بھائی کو کیے۔“ شفا نے ہاتھ روک کر نبیو کی جانب دیکھا۔

”تو کیا جنید بھائی اسپتال نہیں گئے؟“ نبیو حیرت زدہ تھی۔

”نہیں ایک بار گئے تھے، صرف ٹھوڑی سی دیر کے لیے اور اس کے بعد سے اب تک نہیں گئے۔ آج بھی پیلا نے فون کیا تو کہا میں آفس سے سیدھا واپس آ جاؤں گا، لیکن پھر جانے کیا سوچا، تاں یہ کہ آئے ہی نہیں بلکہ اپنا فون آف کر دیا، یقیناً ان کی فیملی کے کئی لوگ آئے ہوئے تھے۔ نئے مہمان کو دیکھنے ان سب کے سامنے پایا کی بے حد سبکی ہوئی۔ وہ تو جہنم آئی نے یہ کہہ کر بات سنبھال لی کہ جنید شہر سے باہر ہے۔ مجھے تو سمجھ میں نہیں آ رہا نبیو کہ آخر یہ جنید بھائی کیا چاہتے ہیں۔“ اپنی بات کو تفصیل سے بیان کرنے کے بعد اس نے نبیو سے رائے

طلب کی جو ابھی تک یہی سوچ کر جان تھی کہ اگر جیند بھائی اپنا بیٹا دیکھنے بھی نہیں گئے تو پھر کیسے ممکن ہو گا کہ وہ رحاب بھائی کو آسانی سے گھر لے آئیں گے یقیناً ”نبیو کے اور اندازوں کی طرح یہ اندازہ بھی غلط ثابت ہو گیا۔ وہ جو یہ سمجھ رہی تھی کہ بچہ کی پیدائش کے ساتھ ہی جیند بھائی کا غصہ ختم ہو جائے گا اور وہ بھاگے بھاگے رحاب بھائی کے قدموں میں جا بیٹھیں گے غلط سمجھ رہی تھی جیند بھائی سنان سے کیوں اتنی ضد لگا رہے ہیں کہ صرف اس کی ضد میں اپنے گھر کو بھی آگ میں جھونکنے جا رہے ہیں یہ سب اس نے سوچا ضرور مگر زبان سے کچھ کہنا نہ کیا کیونکہ یہ سب باتیں شفا کے ساتھ کرنے کا کوئی قاعدہ نہ تھا شفا نے بھی اس کی خاموشی کو محسوس کر کے مزید آگے کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا اور خاموشی سے کپڑے تبدیل کرنے کا ہاتھ روک لی گئی۔

”جیند بھائی یہ سب کچھ کیوں کر رہے ہیں؟ اور وہ کیا چاہتے ہیں۔“ رات ہی آنے والے سنان کے فون نے ہر بات کو اس پر واضح کر دیا۔

”جہیں بتا ہے یا تمہارے بھائی نے میرے لیے کیا پیغام بھیجا ہے؟“ سنان کا لہجہ آج کافی تبدیل تھا۔ وہ کچھ تھکا تھکا سا لگ رہا تھا۔ نبیو نے یہ سب شروع میں ہی نوٹ کر لیا تھا۔ لیکن پوچھا صرف اس لیے نہیں کہ وہ چاہتی تھی کہ سنان خود ہی اپنا حال دل اسے سناے اور صرف حال چال پوچھنے کے بعد ہی وہ اپنے اصل مدعا پر آگیا۔

”جہیں پیغام بھیجا ہے؟“ نبیو کا دل دھڑک اٹھا۔

”اُپی خیر کرنا“ جیند بھائی کیا چاہے ہیں۔“

”کیا پیغام بھیجا ہے سنان انہوں نے؟“ سنان کا لہجہ بہت کچھ غلط ہونے کی نوید سنارہا تھا۔

”وہ کہتے ہیں کہ جب تک میں ان سے معافی نہ مانگوں گا وہ رحاب اور اپنا بچہ دیکھنے گھر نہ آئیں گے سوچو نبیو جب وہ میری بہن کی اس حالت میں خیریت دریافت کرنے میں اپنی انا کا سر بلند رکھے ہوئے ہیں تو وہ میری بہن کو واپس اپنے گھر کس طرح لے کر جائیں گے اسی سوچ نے میری راتوں کی نیند اڑا دی ہے۔“ سنان نے عرصہ میں پہلی بار سنان کے لہجہ میں اپنی بہن کا دکھ بول رہا تھا شاید اس کی بھی یہ امید آج ٹوٹ گئی تھی کہ بچے کی پیدائش جیند کو سب کچھ بھلائے پر مجبور کر دے گی۔

”لیکن سنان تم نے ایسا کیا خطا کی ہے جس کی شرط جیند بھائی نے معافی رکھی ہے۔“ بظاہر تو اس معافی کی وجہ ہی نبیو کی سمجھ میں نہ آ رہی تھی۔

”پتا نہیں یا ران کا کہنا ہے کہ میں نے بیش ان سے بہت بد تمیزی کی ہے جس کے سبب وہ میرے گھر آنے سے قاصر ہیں۔ لہذا جب تک میں معافی نہ مانگوں وہ اپنا بچہ دیکھنے بھی نہ آئیں گے۔“

”پھر تم نے کیا سوچا؟“

”کیا سوچتا ہے میں نے امی سے کہا ہے کہ وہ بات کر لیں پھر جس طرح جیند کے گامیں کرنے کو تیار ہوں۔ ظاہر ہے نبیو مجھ میں اور تمہارے بھائی میں بہت فرق ہے میں صرف اپنی ضد اور انا کی خاطر اپنی بہن کا گھر نہیں اجاڑ سکتا جبکہ تمہارا بھائی اپنی ضد اور انا کے لیے اپنی بہن کا گھر بسنے ہی نہیں دیتا چاہتا بہر حال اب جو بھی ہو میرے لیے پہلی فوجیت میری بہن کا گھر ہے اس کے بعد میں کچھ اور سوچوں گا۔“

”تو سنان تم ہی آج تک ہی گئے اور منزل پر پہنچنے سے قبل ہی ہمت ہار دی۔“ نبیو نے یہ سب سوچا ضرور لیکن سنان سے نہ کہا کیونکہ اب یہ سب کہنے کا کوئی قاعدہ اسے نظر بھی نہ آ رہا تھا۔ ظاہر ہے رحاب کا گھر اجاڑ کر بھی سنان کا گھر نہ بس سکتا تھا۔ اس بات کا یقین نبیو کو وقت نے دلا دیا۔ لیکن آج سنان کے رویہ نے اسے کافی دلہواشتہ کر دیا اور اب اسے محسوس ہو رہا تھا کہ انسان کسی بھی حالت میں اپنے نصیب سے نہیں لڑ سکتا۔

”سنان تمہارا نصیب نہیں ہے۔“ شفا کے کچھ ہی عرصہ قبل کہنے کے الفاظ اپنی مکمل جزئیات سمیت نبیو کو یاد

آگئے اور پھر اس نے خود کو وقت کے دھارے کے سپرد کر دیا۔ اسے آج بہت شدت سے یہ احساس ہوا کہ وہ بارہا بچے ہے اور یقیناً اس کے بھائی کی بے جا ضد نے اس بار کو اس کا مقدر بنایا ہے اور اب اس کے لیے بہتر یہی تھا کہ وہ ہر معاملے میں مکمل طور پر خاموشی اختیار کر لے اور پھر اس نے ایسا ہی کیا اور جو کچھ اس کے نصیب میں درج تھا وہ خود بخود ہوتا چلا آیا۔ اب کسی کوشش کے وہ نبیو ملک سے نبیو سکندر بنادی گئی۔ اس تمام عمل نے اسے بے حس کر دیا اور اس کے تمام احساسات بالکل مرہ ہو گئے اور وہ جو یہ سمجھتی تھی کہ سنان سے دوری اس کی موت کا سبب ہوگی۔ سب خام خیالی ثابت ہوا یہ ایک ٹھوس حقیقت ہے کہ کوئی کسی کے لیے نہیں مرنے والا مگر مرنے تو صرف دل اور دل کی موت ایسی موت ہے جو کسی کو نظری نہیں آتی اور پھر مرہ دل کے ساتھ زندگی کا دھواڑ ترین سفر طے کرنا اس قدر ٹھن ہے ہوتا ہے اس کا اندازہ بھی نبیو کو ہونے لگا تھا۔

اس نے چاہا میں شیشے کو پتھر کر لوں
بن کے پتھر بھی دل ٹاوان ٹوٹ گیا
شامسا لہجہ جب منکر ہوا وفاؤں سے
زمن چھن گئی اور آسمان ٹوٹ گیا



جہاز کے لینڈ کرتے ہی اس کا دل چاہا وہ اڑ کر لاؤنج سے باہر نکل کر اپنے پیادوں کے پاس پہنچ جائے لیکن بہت کوشش کے باوجود مسلمان کی کلیرنس میں ہی تقریباً ”ایک گھنٹہ لگ گیا اور پھر نہایت بے قراری کے عالم میں باہر نکلتے ہی سامنے گھرے امان کو دیکھ کر وہ خود پر قابو ہو بیٹھی امان بھی اسے دکھ کر حیرتی سے آگے بڑھا اور گلے لگایا جانے لگی دیر وہ اسی طرح امان کے گلے لگی رہی جب اسے شفا نے بانو سے پکڑ کر مٹایا اور ہنسی ہوئی بولی۔

”ہم بھی آئے ہیں تمہیں لینے بہنا ہم پر بھی نظر کرم کرو۔“ نبیو نے بنا کوئی جواب دیے شفا کو گلے لگایا اور ساتھ ہی اپنی آنکھوں میں آنے آنسوؤں کو شوشہ سے صاف کیا۔

”حماد تمہیں آیا۔“ اسے اپنے قریب سے ہی حمزہ کی آواز سنائی دی۔

”نہیں۔“ مختصر جواب دے کر وہ حمزہ سے ملنے اور پھر شفا سے باتیں کرتی ہوئی باہر نکلی حمزہ اور امان ٹرائی کے ساتھ کافی آگے نکل چکے تھے جبکہ وہ سب کی خیر خیریت دریافت کرتی آہستہ آہستہ شفا کے ساتھ باہر جاری تھی جب اچانک شفا کو بھی حماد یاد آگیا۔

”تم حماد کو کیوں نہیں لے کر آئیں؟“ جواباً ”وہ خاموش رہی یہ تو سب جانتے تھے کہ سکندر نہیں آ رہا لیکن وہ حماد کو بھی چھوڑ کر آئے گی اس کا علم کسی کو نہ تھا اسی لیے یہ خبر سب کے لیے ہی حیرت کا سبب بننے والی تھی کہ تقریباً ”سوا سالہ بچہ چھوڑ کر کوئی ماں دو سرے دیس آجائے کوئی اس ماں کے دل کا حال نہ جانتا تھا جس نے اپنا صرف ایک سالہ بچہ خود سے دور کر رکھا تھا یہ تو صرف وہی جانتی تھی کہ وہ حماد کے بغیر کسی طرح زندگی گزار رہی ہے اپنے سسرال میں تو اسے کبھی کسی کے سوالوں کا جواب نہ دیتا لیکن یہاں شیفے میں جبکہ اس سے جواب طلبی ہوئی اس کا اندازہ اسے ایئر پورٹ پر ہی ہو گیا تھا یہی وجہ تھی کہ گھر سے ایئر پورٹ تک کے تمام راستے وہ خود کو لوگوں کے سوالنامہ کے لیے تیار کرتی رہی اور پھر اس کی توقع کے عین مطابق گھر جاتے ہی اسے حماد کے حوالے سے ہر ایک کو فیس کرنا پڑا۔ نبیو نے بھی امان کی شادی کے سلسلے میں گھر ممانوں سے بھر دیا تھا۔

”نبیو تمہارا بیٹا نہیں آیا۔“ جیسے ہی وہ مسلمان رکھ کر فارغ ہوئی چھوٹی چچی حیرت کا اظہار کرتی اس کے سامنے آ کر کھڑی ہوئیں۔

”نہیں چچی۔ اصل میں وہ چھوٹا بہت ہے یہاں کی گرمی برداشت نہیں کر سکتا۔“ وہ آہستہ سے جواب دے کر

روا کے پاس جا بیٹھی جو غالباً ”مہمانوں کی فہرست بنا رہی تھیں اسے اتنے عرصہ بعد یوں اپنوں کے درمیان بیٹھنا بہت اچھا لگ رہا تھا وہ اب تک یقین ہی نہ کر پا رہی تھی کہ وہ اپنی سرزمین پر اپنے گھر میں موجود ہے شفا چائے کے ساتھ بہت سارے لوازمات لے آئی تھی لیکن اس کا دل کچھ بھی کھانے کو نہ چاہا اس نے چائے کا کپ اٹھا کر آہستہ آہستہ پینی شروع کی ساتھ ہی ساتھ وہ ہال میں ہونے والے تمام عمل کو بھی بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی جب اچانک اسے کسی نے پکارا۔

”ارے نبیو تم آگئیں۔“ اس نے نظر اٹھا کر مخاطب کی جانب دیکھا وہ یقیناً ”رحاب تھی پہلے سے ذرا موٹی اور رنگت بھی خوب کھلی کھلی خوب بھی سنوری رحاب پہچانی ہی نہ جاری تھی رحاب پر نظر پڑتے ہی یکدم اس کے سامنے گزرا ہوا گل اپنی پوری مٹی سمیت اُن کھڑا ہوا اسے بالکل اپنے قریب سے ہی ستان کی درود میں ڈوبی آواز سنائی دی وہ آواز جو آج بھی اس کے خوابوں میں آکر اس سے نیند چھین لیا کرتی تھی۔

”میرا مشورہ مانو نبیو تم سکندر سے شادی کر لو کیونکہ یہ ہی ہم دونوں کے لیے بہتر ہوگا۔“ یہ آواز ستان کی ضرور تھی لیکن الفاظ اس کے نہ تھے اس کے اندر کوئی اور بول رہا تھا اسے تو مجبور کیا گیا تھا ان الفاظ کی ادائیگی کے لیے جن کے ادا ہوتے ہی اس کا ستان سے ہر رشتہ ختم ہو گیا وہ جو یہ سمجھتی تھی کہ اس کے اور ستان کے درمیان موجود دل کا رشتہ بہت ہی مضبوط اور انوث ہے اس دن پہلی بار اسے اندازہ ہوا کہ دل کے رشتے مضبوط ضرور ہوتے ہیں لیکن اتنے ہی نازک بھی جو ذرا سی ٹھیس لگنے سے پارہ پارہ ہو جاتے ہیں ایسا ہی کچھ نبیو کے ساتھ بھی ہوا ستان کے منہ سے نکلے ہوئے صرف ایک جملے نے اس کے حساس دل کو چھلنی چھلنی کر دیا خاموشی سے فون رکھتے تھکے دل ہی دل میں فیصلہ کر چکی تھی کہ آج کے بعد یہ آواز دوبارہ نہیں سننی فون بند کرتے ہی وہ ستان کے لئے آخری بار تڑپ تڑپ کر بولی اس قدر کہ شفا سے سنبھالنی مشکل ہو گئی پھر اس کے ہال کرتے ہی اگلے پفٹہ اس کا نکاح سکندر سے کر دیا گیا رخصتی دوبارہ تک متوقع تھی تاکہ پیسے زونہ و تیار ہو سکیں یہ دوبارہ کا عرصہ نبیو نے ایک پھر کی مانند گزارہ ستان نے اس دوران اس سے رابطہ کرنے کی کافی کوشش کی لیکن وہ خود تک آنے والے ہر راستے کو بند کر چکی تھی اس نے اپنا مویا کل آف کر دیا اور وہ اس سلسلے میں شفا سے بھی کچھ سننے کو تیار نہ تھی۔

حیرت کی بات تو یہ تھی کہ اس نے ان دوبارہ میں ایک بار بھی ستان کو یاد نہ کیا حالانکہ وہ جانتی تھی کہ وہ صرف ماں اور بہن کی محبت کے ہاتھوں مجبور ہوا ہے لیکن اس کی اس مجبوری نے نبیو کے دل میں ایک گمراہی باندھ دی جو رخصتی تک دور نہ ہوئی وہ جب جب سوچتی اسے بے حد دکھ ہو تاکہ ہر شخص نے اپنے مفاد کے لیے اس کی خوشیوں کو داؤ پر لگا دیا اور ان تمام لوگوں میں ستان بھی شامل تھا یہی وجہ تھی کہ رحاب کے ساتھ منسلک ستان کے رشتہ نے اس کے دل سے رحاب کو بھی دور کر دیا جبکہ چند تو اس کے دل سے اس دن ہی اتر گیا تھا جس دن اس نے اپنی جھوٹی انا کی سرپا بندی کے لیے اسے ناجائز طور پر استعمال کیا تھا یہی سبب تھا کہ دو سال سے زائد عرصہ گزر جانے کے باوجود وہ آج تک کچھ نہ بھولی تھی اب جو رحاب نے اسے مخاطب کیا تو نبیو کا دل ہی نہ ہلکا کہ جواب دے وہ اسے مکمل طور پر نظر انداز کرتی اٹھ کھڑی ہوئی اور قریبی سوٹ کیس سے کپڑے نکالنے لگی تاکہ فریش ہو سکے۔

”نبیو تم نے شاید رحاب بھابھی کو پہچانا نہیں۔“ یہ اس کی کوئی کزن تھی جو شاید اسے یہ احساس دلانا چاہ رہی تھی کہ اس کی حرکت بد تمیزی میں شمار ہوتی ہے اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اسے رحاب کی طرف پلٹنا پڑا رہی سا گلے بھی ملی۔

”مجھے آئے ہوئے تقریباً ”چھنڈ“ ہو گیا ہے آپ شاید بازار گئی ہوئی تھیں۔“ رحاب اس کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے خاصی متاثر نظر آ رہی تھی۔ جس کا اندازہ نبیو کو فوراً ہی ہو گیا وہ جانتی تھی کہ رحاب ظاہری شان و شوکت

پر جان دینے والی عورت ہے اس خیال کے ذہن میں آتے ہی نبیو نے سوٹ کیس کھول کر اپنا جیولری باکس نکالا اور روا کے حوالے کر دیا۔

”پلیز ذرا میری یہ جیولری سنبھال لیں ایک تو یہاں لوڈ شیڈنگ بہت ہوتی ہے جب آئی تھی تب بھی لائٹ نہ تھی اب پھر جلی گئی مسلسل جزیئر کی آواز نے میرا دلغہ شل کر دیا ہے اور پھر آپ نے اے سی بھی جزیئر پر نہیں لگایا آپ کو بتا ہے میں اتنی گرمی بالکل بھی برداشت نہیں کر سکتی ہمارے ہاں تو کبھی لائٹ گئی ہی نہیں ہے اور میں ہر ٹائم اے سی میں رہنے کی اتنی عادی ہو چکی ہوں کہ سمجھ میں نہیں آ رہا یہاں کس طرح رہاؤں گی شکر ہوا میں صدا کو نہیں لائی ورنہ بہت مشکل ہوتی۔“ اس کی گفتگو پر سکندر کا رنگ کب چڑھا اسے اندازہ ہی نہ ہوا اور اب اپنے الفاظ کی ادائیگی پر وہ خود بھی حیران رہ گئی۔ وہ اس قدر تبدیل ہو چکی تھی اسے خود بھی اندازہ نہ تھا اور اس دن پہلی رات ہی اٹھ کھٹنے کی لوڈ شیڈنگ نے اسے سکندر کی یاد دلادی۔

”تمہارا اوپن ٹکٹ ویسے تو تین ماہ کا ہے مگر مجھے امید ہے کہ تم دوبارہ سے بھی پہلے واپس آ جاؤ گی کیونکہ یہاں کی سہولیات دیس میں نکلنے نہیں دیتیں۔“ سکندر کا فخریہ لہجہ اسے سخت برا لگا۔

”وہ دیس میرا اپنا ہے سکندر اور مجھے یقین ہے کہ یہاں کی کوئی لکڑی سولت میرے لیے میرے وطن اور اپنے پیاروں سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی۔“ لیکن ایک ہی رات میں اسے اپنا عواہر و محسوس ہوا جو بھی تھا ملائیشیا میں قیام کے دو سال میں اسے لوڈ شیڈنگ جیسا عذاب نہ بھگتنا پڑا تھا اور پھر یہاں کی بار بھی شہر کے خراب حالات کے باعث اسے گھر میں محصور ہونا پڑا اسے اپنے گھر کے پوائنٹ پانی میں بھی بو محسوس ہوتی وہ جب سے آئی تھی مسلسل منل و اثر استعمال کر رہی تھی وہاں کی گرہنی یہاں کی گنا بھڑ کی تھی یہی وجہ تھی کہ وہ جب بازار جاتی ہے دریغ خرچ کرتی اس کی شاہ خرچی نے سب کو دنگ کر رکھا تھا اور ہر دفعہ کی قیمتی شاپنگ سے رحاب کے چہرے پر آتے تاثرات اسے خوب مزادیتے وہ جو وہاں سے سوچ کر آئی تھی کہ گھر جاتے ہی اپنے ماں باپ سے سکندر کے رویہ کا ذکر ضرور کرے گی انہیں بتائے گی کہ آپ کے ایک غلط فیصلے نے میری زندگی کو اجڑا کر کے رکھ دیا ہے اس نے تو یہاں تک سوچ لیا تھا کہ اب واپس سکندر کے پاس نہیں جانا لیکن عجیب بات تھی کہ پاکستان آتے ہی اس کا وجود و حصول میں منہمک ہو گیا تھا اس کے وجود کا ایک حصہ یہاں تھا جبکہ دوسرا وہ ملائیشیا ہی چھوڑ آئی تھی ہرگز نہ دن اس کی بے چینی میں اضافہ کا سبب بن رہا تھا وہ جو آج تک یہ سمجھتی رہی کہ اس کی زندگی صدا کے بغیر بھی گزر سکتی ہے اس کی یہ سوچ خام خیال ثابت ہوئی تا صرف صدا بلکہ یہاں آکر تو اسے اپنا وہ گھر بھی شدت سے یاد آیا جہاں پورے استحقاق کے ساتھ ایدہا ہر اجماع تھی جو دنیا کی نظر میں کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی سکندر کے لیے سب کچھ تھی اور ایک وہ خود جو سکندر کی سب کچھ ہوتے ہوئے بھی شاید کچھ نہ تھی جو بھی تھا یہاں رہائش کے دوران لوگوں کی دی ہوئی عزت و احترام نے اسے یہ باور کروا دیا کہ عورت جو کچھ ہے اپنے گھر سے ہے لوگوں کی رشک بھری نظروں اور تعریفی کلمات نے اسے یہ احساس دلایا کہ اس کا سبب سکندر کی ذات ہے سچ ہے گھر کے بغیر عورت کی ذاتی حیثیت بالکل زریو ہے اس خیال نے نبیو کو باز رکھا کہ وہ سکندر کے حوالے سے کسی سے کوئی گفتگو نہ کرے بلکہ جس طرح دنیا سمجھ رہی ہے سمجھتی رہی کیونکہ اسی میں اس کی بھلائی تھی کہ اپنی عزت خود بخود بانی جائے ورنہ دوسری صورت میں کوئی بھی آپ کو عزت کے لائق نہیں سمجھے گا۔

”یہ لو نبیو سے بات کر لو۔“ وہ میز پر بیٹھی نیچے آتے جاتے لوگوں کو دیکھنے میں منہمک تھی جب اسے بالکل اپنے قریب جنید کی آواز سنائی دی اس نے پلٹ کر ایک نظر جنید پر ڈالی جو فون اس کی طرف بڑھائے غصہ کھڑا تھا کہ وہ کب اس کے ہاتھ سے لے

”کون ہے؟“ نیو نے سیل لیتے ہوئے آہستہ سے سوال کیا۔
 ”سکندر ہے تمہارا سیل شاید آف ہے اس لیے تمہاری خیریت دریافت کرنے کے لیے میرے نمبر پر فون کر لیا۔“ جنید کی وضاحت اس کے لیے حیرت انگیز تھی اسے سکندر سے کم از کم یہ توقع نہ تھی کہ اس کے سیل آف ہونے کی صورت میں وہ جنید سے رابطہ کرے گا اسی حیرت کی کیفیت میں اس نے خاموشی سے سیل اپنے کان سے لگایا جبکہ جنید اندر کر کے میں جا چکا تھا۔

”ہیلو۔“

”کیسی ہو؟“

”ٹھیک ہوں حماد کیسا ہے؟“

”بالکل فٹ اور تمہیں بہت یاد کر رہا ہے۔“

”حماد مجھے یاد کر رہا ہے؟“ وہ حیرت بھری سرگوشی میں بولی۔

”کیوں کیا تم اس کی ماں نہیں ہو؟“ سکندر کا انداز گفتگو اس کے لیے بالکل نیا تھا وہ تو اس لہجہ کی عادی ہی نہ تھی دل تو چاہا پلٹ کر پوچھے آپ نے مجھے کب حماد کی ماں بننے دیا لیکن یہ وقت اور یہ جگہ اس بحث کے لیے قطعی نامناسب تھے بہتر یہی تھا کہ خاموش رہا جائے اور وہ خاموش ہی رہی۔

”بہر حال میں نے تمہاری خیریت دریافت کرنے کے لیے فون کیا تھا کیونکہ مجھے اندازہ ہے کہ دیس کے لوگوں کو دوسروں کے ٹوہ لےنے کی بہت عادت ہے ایسے میں اگر میں تم سے رابطہ نہ کروں تمہاری خیریت دریافت کرنے کے لیے تو تمہارے اپنے تمہارا جینا حرام کروں گے خاص طور پر تمہاری بھابی۔“ وہ بلا ٹکان اپنا تجربہ پیش کر رہا تھا نیو کو سمجھ نہ آیا کہ یہ اظہار ہمدردی تھا یا طنز بہر حال جو بھی تھا وہ سکندر کے اندازے کی اس قدر رد عمل پر دمگ رہ گئی ساتھ ہی ساتھ اسے طمانیت کا احساس بھی ہوا کہ کسی بھی حوالے سے سسی سکندر نے اس کا خیال تو رکھا۔

وہ شفا کے ساتھ پارلر آئی ہوئی تھی جہاں شفا اور رحاب کو اپنا ہنہو کٹ لیتا تھا جبکہ نیو وہیں قریب رکھی کرسی پر بیٹھی پارلر میں کام کرنے والی لڑکیوں کو دیکھنے میں منہمک تھی جو بڑی مشتاقی سے اپنا ہر کام سر انجام دے رہی تھیں اسی دوران اس کا سیل بج اٹھا سکندر کا نمبر دیکھتے ہی اس نے نیس کاٹن دیا کرفن کان سے لگالیا۔

”ہیلو۔“

”تمہارا پس کب آ رہی ہو؟“ بغیر تمہید کے سکندر نے سوال کیا۔

”مجھے تو کچھ پتا نہیں ہے۔“ وہ اس سوال کے لیے قطعی تیار نہ تھی اس لیے یکدم گڑبڑا سی گئی۔

”دراصل شادی کی دعوتوں کا سلسلہ جاری ہے اور سب ہی چاہتے ہیں کہ میں ان میں شریک ہو کر واپس جاؤں۔“

”ویل تمہیں تقریباً ایک ماہ سے کچھ زیادہ وقت ہو گیا ہے اسی لیے پوچھا اور ویسے بھی تمہیں حماد بہت یاد کر رہا ہے۔“

”جی میں آپ کو دو تین دن تک کفرم ہتا دوں گی۔“ حماد کا نام سنتے ہی اس کا دل بھر آیا اور لہجہ نرم ہو گیا۔

”اوکے اللہ حافظ۔“ فون بند کر کے اس نے ہینڈ بیگ میں رکھتے رکھتے ایک نظر سامنے مرر سے نظر آتے رحاب کے عکس پر ڈالی جس کی مکمل توجہ کامر کا اس وقت اسی کی ذات تھی۔

”لگتا ہے سکندر بھائی تمہارے بغیر اداس ہو گئے ہیں۔“ قد اوم آئینہ میں تفصیل سے اپنا جائزہ لیتی ہوئی رحاب کا انداز بالکل سرسری تھا۔

”آلہ ہاں۔“ وہ چونک اٹھی۔

”تو پھر کب واپس جا رہی ہو؟“

”دیکھو شاید اگلے ہفتہ تک۔“ واپس تو جانا ہی تھا جب یہ طے تھا تو کیوں نہ اس عزت کے ساتھ واپس جایا جائے کہ آپ کا شوہر آپ کے لیے بے قرار ہے نیو کا جواب اس سوچ کے عین مطابق تھا جو اس نے رحاب کو دیا اور گھر آتے ہی رحاب تقریباً ”ایک ایک فرد کو تپا چکی تھی کہ سکندر اور حماد نیو کے فراق میں بے تاب ہیں اور وہ چاہتے ہوئے بھی کسی بات کی تردید نہ کر سکی اگلے پندرہ دن میں اس کی سیٹ بکثرفم ہو گئی اور اس نے واپسی کی راہ لی اس امید کے ساتھ کہ شاید کوئی نئی بہار اس کی زندگی میں داخل ہونے کی منتظر ہو۔

فاطمہ اور رفید اسندھا کن گئی ہوئی تھیں جہاں سیکر کے دیور کی شادی تھی جانا تو نیو نے بھی تھا لیکن جانے کیوں صبح اٹھتے ہی اس کی طبیعت خراب ہو گئی سر میں ہلکا ہلکا سار دو تورات سے ہی تھا لیکن صبح ناشتا کرنے کے ساتھ ہی اسے ایک دم ہی التیایا شروع ہو گئیں۔ التیوں کے ساتھ آنے والے چکر نے اسے اس قدر بڑھال کر دیا کہ اس کے لیے اٹھ کر کھڑا ہونا محال ہو گیا مجبوراً ”فاطمہ اسے گھر ہی چھوڑ گئیں جبکہ سکندر اپنے فارم پر گیا ہوا تھا فاطمہ اسے سوپ بھی بنا کر دے گئی تھیں جو جوں کا توں فریق میں رکھا تھا اس نے صرف معمولی سا چکھا ہی تھا کہ مٹکی سی محسوس ہونے لگی اور پھر ڈر کے مارے اس نے ہاتھ ہی نہ لگایا فاطمہ نے ایدھا کو جاتے جاتے خصوصی ہدایت کی تھی کہ نیو کا خیال رکھے اور اس ہدایت ہی کے تحت ایدھا نے اسے دوپہر میں فریڈر رائس اور شاشلک جی بنا دیا تھا لیکن طبیعت کی خرابی کے سبب نیو سے کچھ بھی نہ کھایا گیا اور وہ سارا دن اسی طرح کمرے میں بڑھال پڑی رہی جیسے ہی شام کے سائے گہرے ہوئے اور اندھیرا اس کے کمرے کی کھڑکی سے جھانکنے لگا وہ ایک دم ہی بے زار سی ہو گئی دل چاہا کہ فوراً ہی کمرے سے باہر نکل جائے لہذا جیسے تیسے وہ اٹھ کھڑی ہوئی پاؤں میں سیلپروپینے بالوں میں برش کر کے انہیں سمیٹ کر کچھو لگالیا۔

”مجھے کچھ دیر یا ہر پٹھ کرنی وی دیکھنا چاہیے۔“ گھر میں پھیلے سائے سے گھبرا کر اس نے سوچا۔

”کیوں نہ میں ایدھا کے ساتھ باہر واک کر آؤں۔“ حالانکہ اس کی ایدھا کے ساتھ اتنی دوستی نہ تھی پھر بھی اس خیال کے ذہن میں آتے ہی وہ ایدھا کے کمرے کی طرف بڑھ گئی حسب معمول اس کے کمرے کا دروازہ بند تھا ویسے بھی حماد اپنی بیوی چھوڑا اور رادی کے ساتھ گیا ہوا تھا تو ظاہر ہے کہ ایدھا بھی اس کی طرح حاکم اپنے کمرے میں ہی تھی اسی سوچ کے تحت اس نے ایدھا کے کمرے کے دروازے کا ٹاب کھمادیا اور تیزی سے دروازہ کھولتے ہی سامنے نظر آنے والے منظر نے اسے اپنے پاؤں پر کھڑا بنا دھوا کر دیا ایدھا اپنے کمرے میں آکھلی نہ تھی اس کے ساتھ سکندر بھی تھا ایدھا کے ساتھ ساتھ سکندر کو بھی یہ امید نہ تھی کہ نیو اس طرح ایدھا کے کمرے میں آجائے گی کیونکہ ایدھا کو کوئی ڈیڑھ سال سے اس گھر میں تھی بلکہ شاید اس سے بھی کچھ زیادہ ٹام ہو گیا تھا لیکن کبھی بھی آج سے پہلے نیو اس کے کمرے میں نہ آئی تھی دونوں کا اگر آمناسامنا ہوا تھا تو صرف پچھن میں بالادوں میں یہ ہی وجہ تھی کہ اسے اس طرح کمرے میں عین سامنے دیکھ کر سکندر اور ایدھا دونوں کے ہی حواس کم ہو گئے۔

”آپ یہاں کیا کر رہے ہیں؟“ وہ اپنے قدم تھپتھپتی سکندر کے سامنے جا کھڑی ہوئی اس کے حلق سے نکلنے والی آواز بھی خلاف توقع خاصی تیز تھی جس کی سکندر کو بالکل بھی امید نہ تھی وہ تو شاید یہ تصور بھی نہ کر سکتا تھا کہ نیو اس طرح اس کے سامنے کھڑی ہو کر اس سے کسی بھی سلسلے میں جواب طلبی کر سکتی ہے۔

”کیا تو آج سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا پھر آج کیسے اس میں اتنی جرات آئی کہ وہ مجھ سے میرے معمولات کے بارے میں دریافت کرے شاید میرا ہی تصور تھا جو میں نے پچھلے کچھ دنوں میں اسے کچھ زیادہ ہی منہ لگالیا تھا۔“

ایدا اور سکندر وہاں سے جا چکے تھے یہ جانے بغیر کہ وہ زندہ بھی ہے یا نہیں اور وہ ساری رات اس نے ایک شدید اذیت کے عالم میں گزار دی خود کو بمشکل ٹھہرتی وہ اپنے کمرے تک آئی اور بستر پر گرتی ہی بلک بلک کر رونے لگی اس کا یہ رونا، تکلیف اور تڑپ دیکھنے والا وہاں کوئی نہ تھا سوائے اللہ کی ذات کے جو بندوں سے ان کے کیے گئے ہر ظلم کا حساب ضرور لیتا ہے لیکن بندہ اس بات کو نہیں سمجھتا یہی وجہ ہے وہ ظلم کرتے وقت اللہ کو بھول جاتا ہے لیکن اللہ بدلہ لیتے ہوئے ظالم کو یاد ضرور رکھتا ہے اور اسے یہ شاید مکافات عمل کہتے ہیں۔

نبیو نے کمرے سے باہر نکلنا بالکل ترک کر دیا تھا بس صبح میں ایک کپ چائے کے ساتھ کوکیز لے لیتی یا پھر دل کرتا تو ڈولر لٹا لیتی ورنہ سارا دن کمرے میں بیڑی رہتی اپنی تکلیف سے بڑھ کر احساسِ ذلت تھا جو اسے کمرے سے باہر نکلنے بھی نہ دیتا اس کی بھوک و پیاس بالکل ختم ہو چکی تھی وہ خود میں ایدھا کا سامنا کرنے کی ہمت نہ پاتی تھی ایدھا اس دن سے مسلسل اس کے لیے دوسرے میں کھانا رکھ جاتی تھی لیکن نبیو کا دل ہی نہ چاہتا کہ وہ اس کھانے کو ہاتھ لگائے یہی وجہ تھی کہ ایک دن کا کھانا اگلے دن دوسرے تک جوں کا توں بڑا رہتا جو ایدھا واپس لے جاتی اور پھر سے تازہ کھانا رکھ جاتی اس واقعہ کے تقریباً چار دن بعد رفید اور فاطمہ بھی واپس آگئیں فاطمہ جس دن سندھا کن گئی تھیں نبیو کی طبیعت اس دن بھی خراب تھی یہی وجہ تھی کہ سامان رکھ کر ہاتھ منہ دھوتے ہی وہ نبیو کے کمرے میں آگئیں جو اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔

”کیا ہوا تم نے لائٹ کیوں نہیں چلائی۔“ فاطمہ نے ٹٹل کر سوچ بوری سے ٹیپ لائٹ کا بٹن آن کیا اور ایک سیکنڈ میں ہی کمرہ دودھیا روشنی میں نہما گیا سامنے ہی بیڑی پر آڑی ترچھی نبیو پر بیڑی تھی جس کی دھوئیلی کی مانند تیز چلتی سانسوں کی آواز اتنی دور سے بھی واضح سنائی دے رہی تھی۔ فاطمہ تیزی سے آگے بڑھیں اور نبیو کے چہرے پر بکھرے ہوئے بالوں کو سمیٹا اور اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھا جو بخار کی شدت سے سلگ رہا تھا وہ گھبرا اٹھیں اور اسے چھوڑ کر تیزی سے باہر کی جانب لپکیں۔

”ایدا ہا۔ ایدھا۔“ سکندر گھر واپس آچکا تھا اور برآمدے میں رفید کے قریب ہی بیٹھا شادی کا احوال سن رہا تھا ایک دم جو گھبراہٹ کے عالم میں کمرے سے باہر آتی فاطمہ کو دیکھا تو خود بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

”کیا ہوا اماں خیریت تو ہے؟“

”خیریت کہاں؟ جانتے ہو نبیو بخار میں پھنک رہی ہے اور تمہیں اتنا بھی ہوش نہیں کہ اسے ڈاکٹر کے پاس ہی لے جاتے۔“ فاطمہ غصہ سے چلائی۔

”ہفتہ والے دن بھائی صاحب اس سے ملنے آ رہے ہیں اور اس کی حالت دیکھو تو ایسا محسوس ہو رہا ہے جیسے کوئی مردہ ہو ٹوگ کیا سمجھیں گے ہم نے اسے بھوکا مار رکھا ہے۔“ فاطمہ کی پریشانی ان کے لہجے سے عید اٹھی۔

”ہاں تو آئے دو ماموں صاحب کو وہ خود دیکھ لیں ایک بیمار مریضہ جو انہوں نے کیا کستان سے لا کر ہمارے پلے باندھ دی ویسے بھی اماں پرانہ منانا تو جس دن سے شادی ہو کر یہاں آئی ہے ایسی ہی کم صم ہے لگتا ہے اسے ہم پسند ہی نہ آئے تھے بلکہ میرا تو خیال ہے وہ یہاں شادی پر راضی ہی نہ تھی۔“ رفید انے اپنے بھائی کی حمایت کرتے ہوئے کہا۔

”صل میں ماموں صاحب نے کوئی فکرو وگرتو دیکھا نہیں بس نری گوری چڑی لاکر میرے متھے منڈھ دی اور اب جو میں ان کا لایا ہوا تحفہ بھگت رہا ہوں تو میرے خیال میں اس سلسلے میں انہیں ہمارا شکر گزار ہونا چاہیے۔“ سکندر کی بھٹائی پورے عروج پر تھی۔

”پھر بھی سکندر جو بھی ہے وہ تمہاری بیوی ہے ذمہ داری ہے وہ تمہاری۔“ جانے کیوں آج فاطمہ کے اندر نبیو

اس سوچ کے دماغ میں آتے ہی سکندر کے ماتھے پر بڑی تیوریوں میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔

”ڈاؤن ڈو یو مین؟“ اس نے اپنی محسوس اچکانے ہوئے سخت لہجہ میں سوال کیا۔

”تم اچھی طرح جانتی ہو میں اس طرح کے سوال و جواب کا عادی نہیں ہوں۔“ تھوڑی دیر قبل نبیو کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر سکندر کے اندر جو گھٹی سی پیدا ہوئی تھی وہ فوراً ہی اڑن چھو ہو گئی اس نے خود کو ایسے سنبھال لیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو جبکہ ایدھا اس تمام گفتگو کے دوران ہاتھ روم جا چکی تھی بالکل اس طرح جیسے اس کا اس مسئلہ سے کوئی تعلق ہی نہ ہو حالانکہ سکندر کے اس جواب نے نبیو کو دوڑی کا کر دیا تھا پھر بھی اس نے ہمت نہ ہاری اور بدستور سکندر کے سامنے ڈٹی کھڑی رہی۔

”بے شک آپ اس طرح کے سوال و جواب کے عادی نہ ہوں گے لیکن آج آپ کو میرے اس سوال کا جواب دینا ہو گا کہ آپ اس آواز لڑکی کے ساتھ کس طرح گلچھوڑے اڑا رہے ہیں؟ آپ میں ذرا سی بھی شرم ہو تو آپ کو ہٹا چلے کہ یہ کتنی گھٹیا حرکت ہے جو ابھی آپ نے کی ہے۔“ سکندر جیسا بھی تھا اس کا قانونی شوہر تھا اس کے بیٹے کا باپ تھا پھر وہ کس طرح برداشت کرتی کہ وہ گھر میں بد حال پڑی ہو اور اس کا شوہر اس کے بچے کی میڈ کے ساتھ عیاشی کر رہا ہو۔

”ہو میرے سامنے سے تم جاہل قوم کی جاہل عورت تم لوگوں کو سوائے دوسروں کی کردار کشی کے کوئی اور کام بھی کرنا آتا ہے یا نہیں؟“ وہ حلق کے بل چلا یا اس کی تیز آواز سننے ہی نبیو لرز گئی وہ گھر پر بالکل تنہا تھی ایسے میں اگر سکندر غصہ کی حالت میں اس سے کوئی زیادتی کرتا تو وہ اپنا بچاؤ بھی نہ کر سکتی تھی اس خیال کے تحت ہو سکتا ہے کہ وہ خاموشی سے کمرے سے باہر نکل جاتی اگر ہاتھ روم سے ٹائل لپٹ کر ایدھا باہر نہ نکل آتی اس کے شرمناک حملے نے نبیو کو سگایا کہ وہ دیکھنا لیکن اس سے بھی زیادہ گھٹیا اس کی وہ حرکت تھی جو اس نے نبیو کو پتانے کے لیے کی وہ اسے بالکل نظر انداز کرتی ہوئی سکندر کی جانب بڑھی اور اسے بازو سے تھام لیا۔

”گول ڈاؤن مائی ڈیئر۔“ سکندر کے کندھے پر پیار سے اپنا بازو رکھتے ہوئے اس نے پکارا اور پھر اسے ساتھ لیے نبیو کے پاس سے گزرتی باہر نکل گئی اس کی اس حرکت نے نبیو کی برداشت کو بالکل ختم کر دیا اور وہ خود پر سے اختیار کھو بیٹھی تیزی سے ان کے پیچھے باہر لپکی اور حلق کے بل چلائی۔

”چھوڑو اسے حرافہ عورت۔“ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ ایدھا اردو نہیں جانتی لیکن اپنے غصہ کا اظہار اپنی زبان میں زیادہ اچھی طرح کیا جاسکتا ہے۔ اس کے منہ سے نکلنے والے ان الفاظ کی دیر تھی کہ سکندر نے پلٹ کر ایک زوردار طمانچہ اس کے منہ پر دے مارا۔

”منع کیا تھا زیادہ بکواس مت کر لیکن تم بیچ تمہاری سمجھ میں کوئی بات نہیں آتی الوکی پٹھی اب بول کے دکھاؤ۔“ نبیو کے سر کے بالوں کو اس نے اپنی مٹھی میں جکڑ کر زوردار جھکا دیتے ہوئے نفرت سے کہا خوف کے سبب نبیو کی سانس بند ہونے لگی۔

”چھوڑو مجھے پلینے چھوڑو۔“ خود کو چھڑوانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے وہ رو پڑی لیکن اس کے رونے کا بھی سکندر جیسے پھول انسان پر کوئی اثر نہ ہوا۔

”اب بولو اگر اپنے باپ کی اولاد ہو تو اب کون جو تم بچھلے چندہ منٹ سے بک رہی ہو گھٹیا عورت۔“ اسے سر کے بالوں سے پکڑ کر سکندر نے دو بار پر دے مارا اس کے ہونٹوں سے رستے خون کا ذائقہ اس کے حلق کے اندر تک اتر گیا دیوار سے ٹکرانے کے بعد وہ نیچے فرش پر آگری تکلیف کی شدت کے سبب اس کے حلق سے تیز جیج برآمد ہوئی ساتھ ہی اس کے پیٹ میں اینٹھن سی ہوئی جس کے سبب اس کے لیے فرش سے اٹھنا محال ہو گیا اسے اب اندازہ ہوا کہ وہ صبح سے بھوکا ہے وہ اپنا پیٹ پکڑ کر بلک بلک کر رونے لگی اس کی یہ آواز سننے والا وہاں کوئی نہ تھا

”برہمگنٹھ“ اسے یکم دم شاک سا لگا وہ توجہ سے پاکستان سے آئی تھی مسلسل منصوبہ بندی کی گولیاں استعمال کر رہی تھی پھر یہ سب کیسے ہو گیا وہ پریشان ہو اٹھی اور اس کی یہ پریشانی فاطمہ اور سکندر سے چھپی نہ رہ سکی۔

”کیا تم یہ بچہ نہیں چاہتیں؟“ گاڑی میں بیٹھتی ہی سکندر نے قدرے جھپٹتے ہوئے انداز سے نیو سے سوال کیا اور یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب چاہتے ہوئے بھی نیو ہال نہ دے سکی۔

”میرے چاہنے یا نہ چاہنے سے کیا ہوتا ہے اب تو جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔“ تنہی سے جواب دے کر اس نے اپنی نظر کھڑکی سے باہر دوڑتے بھاگتے نظاروں پر لگا دی ہلکی ہلکی برستی بارش باہر کے مناظر کو بہت خوبصورتی بخش رہی تھی لیکن آج نیو کو کچھ بھی اچھا نہ لگ رہا تھا اس کے دل کا موسم خزاں زندہ تھا اور سچ تو یہ ہے کہ باہر کا موسم بھی صرف اس وقت ہی اچھا لگتا ہے جب آپ کے اندر کا موسم اچھا ہو اور پھر گھر پہنچتے ہی اس نے پہلی فرصت میں ربیعہ کو کال ملا کر ساری بات بتائی۔

”اے مبارک ہو۔“ ربیعہ نے غلوص دل سے اسے مبارک دی جسے نیو نے بالکل نظر انداز کر دیا ربیعہ کو ساری بات بتانے کا مقصد ہرگز نہ تھا جو وہ بھی سمجھی نیو کے پاس سوائے ربیعہ کے کوئی ایسا ساتھی نہ تھا جس سے وہ اپنا اتنا اہم مسئلہ ڈسکس کر سکتی۔

”مجھے یہ بچہ نہیں چاہیے۔“ وہ فیصلہ کن انداز میں بولی۔

”مجھے ابارش کن کرنا ہے میں نے اس سلسلے میں مشورہ کرنے کے لیے تمہیں فون کیا ہے۔“

”پاگل ہو گئی ہو تم بھلا تم خود سوچو تم دونوں میاں بیوی کے کسی بھی پر اہم سے اس معصوم جان کا کیا تعلق ہے جو ابھی دنیا میں آئی بھی نہیں ہے۔“ ربیعہ نے اسے سمجھاتے ہوئے بڑے پیار سے کہا۔

”تم نہیں جانتیں ربیعہ میں نے عداوتی پیدائش سے لے کر آج تک کا وقت کتنی اذیت سے گزرا ہے ابھی تو میں اس اذیت ہی کی عداوتی نہیں ہو سکی ہوں تو بتاؤ بھلا مزید تکلیف کیسے بھگت سکوں گی میرا یقین کر دو ربیعہ پورے نو ماہ کی تکلیف برداشت کر کے اپنا بچہ کسی دوسرے کے حوالے کرنا جس قدر اذیت ناک عمل ہے تم بھی نہ جان سکو گی کیونکہ تم اس تکلیف سے نہیں گزریں۔“ وہ سبک رہی تھی اس کے لہجہ میں بوتا دکھ ربیعہ کا دل چیر رہا تھا۔ اس کے پاس کوئی ایسا جملہ نہ تھا جس سے وہ اس جھڑکی ماری ماں کو تسلی دے سکتی لیکن جو بھی تھا نیو کے دکھ اور تکلیف نے اسے بھی رلا دیا بے شک وہ بھی یہاں پر دس میں اپنے گھر والوں سے دور ترین تھا تھی لیکن اس کے ساتھ عبدالوہاب اور اس کے دو پیارے پیارے بچے تھے جبکہ نیو تو بالکل ہی تنہا دامن تھی۔

”مگر تم میری اس سلسلے میں کوئی مدد نہیں کر سکتیں تو میں سامنے والی شو بھا سے بات کر لیتی ہوں۔“ اس کی مسلسل خاموشی سے اپنا مطلوبہ نتیجہ حاصل کرتی ہوئی نیو بولی۔

”دیکھو نیو جو تم چاہ رہی ہو وہ اس مسئلے کا حل نہیں ہے۔“

”تو پھر تم بتاؤ حل کیا ہے۔“ جواباً وہ جھکے جھکے انداز میں بولی۔

”میری ماں تم اس سلسلے میں بالکل صالح سے بات کرو انہیں اپنا تمام مسئلہ بتاؤ انہیں ہر وہ بات بتاؤ جو تمہارے دل کے اندر ہے اپنے ساتھ سکندر کا رویہ ایسا حال اور سکندر کے تعلقات اور عداوتی خود سے دوری جہاں تک میں سمجھتی ہوں وہ یقیناً اس سلسلے میں تمہاری مدد کریں گے کیونکہ یہاں سارے خاندان میں ان کی کافی سنی جاتی ہے۔“ ربیعہ اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔

”یاد رکھو نیو ظلم کرنے سے زیادہ گناہ کا روہ ہے جو ظلم سہتا ہے اپنی خاموشی کو ختم کرو جب تک اس احساس کے ساتھ اپنی ہر بے عزتی برداشت کرو گی کہ کہیں تمہارے حالات لوگوں کو تم پر نہ ہنسائیں بی بیو نیو اپنے اندر

کی ہمدردی جاگ رہی تھی۔

”ماں تم کو بتانا چاہتے تھے بھرے بھرے جسم کی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں یہ سوکھی چڑی تو مجھے کبھی بھی پسند نہ آتی پھر بھی تم نے ماموں صالح کے کہنے پر مجھے یہاں بھجوا دیا۔“ اور سکندر کے ان الفاظ نے اندر پڑی نیو کو سلگا کر رکھ دیا بے عزتی اور شک کے شدید احساس نے اس کے اعصاب کو سن کر دیا وہ جو بچپن سے اس خیال میں زندہ تھی کہ حسن اس کی بچکانہ ہے آج یہ خیال ٹوٹ کر کرجی کرجی ہو گیا۔

”حسن دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے۔“ بہت پہلے کہیں پڑھا ہوا یہ جملہ آج شدت سے اسے یاد آیا اور وہ سبک پڑی۔

”جس سے محبت کی جائے وہ دنیا کا حسین ترین انسان ہوتا ہے۔ ہماری محبت دیکھنے والے کو حسن بخشی ہے۔“ ایسا محسوس ہوا جیسے سانپ اس کے کان کے قریب گنگنا رہا ہو وہ چونک اٹھی بمشکل آنکھیں کھولیں اور تکیہ سے سر اٹھایا سارا کمر اچھا نہیں بھائیں کر رہا تھا جبکہ باہر سے سکندر اور رفیدہ کی مسلسل آواز سنائی دے رہی تھیں جانے سکندر کیا کہہ رہا تھا کیونکہ اب وہ ملائی میں بات کر رہا تھا جو نیو کو سمجھ تو آتی تھی لیکن اس کے تیز تیز بولنے جملے اس کیفیت میں وہ سمجھ نہ پاری تھی البتہ ہر جملے کے ساتھ رفیدہ کی بے اختیار تنہی اسے اپنی ذات کی تذلیل محسوس ہو رہی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے رفیدہ اس پر ہی ہنس رہی ہو اور پھر یہ آوازیں یک دم بند ہو گئیں اور باہر خاموشی طاری ہو گئی اور اگلے ہی سیکنڈ میں فاطمہ کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئیں وہ خاموشی سے آنکھیں موندے لپٹی تھی آنسو ایک لیکری شکل میں اس کے گالوں پر بہہ رہے تھے۔

”نیو“ فاطمہ نے بالکل قریب آکر اسے پکارا۔

”سکندر گاڑی نکال رہا ہے تم کپڑے تبدیل کر کے باہر آ جاؤ میں تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے کر جاؤں۔“ فاطمہ نے آہستہ سے اسے کندھے تمام کر لایا وہ بتا کچھ بولے خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی بمشکل اپنے وجود کو کھینچتی الماری سے کپڑے نکال کر ہاتھ روم میں مٹس مٹی سنک کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے منہ پر پانی کے چھینٹے مارتے ہوئے بے اختیار اس کی نظر سامنے لگے آئینہ میں نظر آتے اپنے عکس پر بڑی زبرد چہرہ اندر دھکی آنکھیں جن کے گرد کالے حلقے نمایاں تھے یہ تو وہ نیو ہرگز نہ تھی جسے وہ جانتی تھی جانے وہ ہنستا مسکراتا خوبصورت چہرہ کہاں کم ہو گیا اس وقت تو سامنے نظر آنے والا چہرہ کسی مودے کے چہرے سے بھی بدتر تھا۔

”سکندر صبح کتنا ہے کیا ہے مجھ میں جو کوئی شخص مجھ سے محبت کرے میں ایسی تو نہ تھی پھر مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے۔“ اپنی حالت پر تاسف زدہ وہ کمرے سے باہر نکلی گھر کے عین سامنے سکندر گاڑی لیے کھڑا تھا فاطمہ بھی اس کے ساتھ تھی وہ خاموشی سے پچھلا دروازہ کھول کر ڈھکے سی گئی سکندر اور فاطمہ جانے آپس میں کیا بات کر رہے تھے اس نے سننے کی کوشش ہی نہ کی اور بد دل سے گاڑی کی سیٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں موندیں اور تقریباً پندرہ منٹ کے اندر ہی وہ ایک مشہور سرکاری اسپتال میں موجود تھی جہاں آتے ہی اکثر اسے اپنے ملک کے سرکاری اسپتال یاد آ جاتے جن کا کوئی پرسان حال نہ تھا جبکہ یہاں کی گورنمنٹ اپنے عوام کو تمام تعلیمی اور صحت کی سہولیات فراہم کرنے کی ذمہ دار تھی جس کا واضح ثبوت وہاں کے سرکاری اسپتال اور اسکول تھے اسپتال کی ایرجنسی میں آنے سے بمشکل پندرہ سے بیس منٹ ہی ہوئے تھے جب اس کے تمام ٹیسٹ لے لیے گئے اور پھر جلد ہی اس کی تمام میڈیکل رپورٹس بھی آ گئیں اس تمام عرصہ میں سکندر سخت بے زار کن صورت بنائے اس کے قریب ہی کرسی پر ابرار اجماع تھا جبکہ فاطمہ باہر تھی۔

”مبارک ہو مسٹر سکندر آپ کی بیوی امید سے ہے۔“ ٹیبل کے سامنے بیٹھی لیڈی ڈاکٹر نے تمام رپورٹس کا جائزہ لینے کے بعد سکندر کو مقامی زبان میں مخاطب کیا۔

ہمت پیدا کرو حالات کا مقابلہ کرنے کی اور یہ عہد کرو کہ کچھ بھی ہو جائے تم نے اپنا یہ بچہ سکندر کے حوالے نہیں کرنا اور اس کے لیے ابھی سے کوشش کرو۔" ربیعہ نے اسے ایک نیا راستہ دکھایا۔ یہ سب تو اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا اب جو ربیعہ نے سمجھایا تو اسے سب کچھ سمجھ میں آگیا۔

"ہاں شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔" ربیعہ کی حوصلہ افزائی نے اس کے اندر ایک نئی روح بھونک دی۔

"مجھے بالکل صاف سے ضروریات کرنی چاہیے۔"

"ہاں ضرور کرو اور اگر پھر بھی تمہارے مسئلے کا حل نہ نکلے تو میں تمہارے ساتھ ہوں۔" مخون رکھتے رکھتے اس نے نبیو کو ہر ممکن تسلی دی۔



تمہارے یوں پھرنے کا مداوا ہو بھی سکتا تھا
ذرا جو تم ٹھہر جاتے کوئی تدبیر کر لیتے

شان اپنی آنکھوں پر باندھ رکھے پچھلے ایک گھنٹہ سے اسی پوزیشن میں لیٹا ہوا تھا۔ بظاہر تو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے سوچا ہو۔ لیکن اس کے مسلسل ہلنے پاؤں اس امر کی نشاندہی کر رہے تھے کہ وہ جاگ رہا ہے۔ مخنم دوبارہ اسے اسی حالت میں لیٹا دیکھ کر دو روزے سے واپس پلٹ گئی تھیں۔ لیکن اب جو تیسری بار انہوں نے اندر جھانکا تو اسی سابقہ پوزیشن میں اسے لیٹا دیکھ کر وہ واپس نہ پلٹ سکیں اور اندر داخل ہو کر اس کے بالکل سر کے قریب جا پہنچیں۔

"شان۔۔۔" انہوں نے ہولے سے پکارا۔ کچھ دیر جواب کا انتظار کیا۔ کوئی رسپانس نہ پا کر وہ بے اختیار اس کا بازو ہلاتے پھینکیں۔

"شان۔۔۔"

"جی۔۔۔" اس نے اس پوزیشن میں لیٹے لیٹے جواب دیا۔

"کھانا کھا لو بیٹا دوسرے تین بج گئے ہیں۔"

"مجھے بھوک نہیں ہے۔" اس کی سابقہ پوزیشن برقرار تھی۔ اس کے انکار کے بعد مزید بحث کرنا بے کار تھا۔ مخنم جانتی تھیں کہ اگر اس نے انکار کر دیا تو اب اس سے ہاں کرنا ناممکن ہے۔ کیونکہ پچھلے کچھ سالوں سے وہ پہلے والا شان نہ رہا تھا جو اپنی ماں کی ہر بات پر ہاں کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا اور یقیناً اس سب کی ذمہ دار وہ خود ہی تھیں۔ کچھ دیر تو وہ اس کے انکار کے بعد بھی گھڑی رہیں۔ لیکن جب کوئی رد عمل شان کی طرف سے نہ ملا تو تھکے تھکے قدموں سے واپسی کے لیے پلٹ گئیں۔ ابھی دو روزے تک نہ پہنچی تھیں کہ اپنے پیچھے انہیں شان کی آواز سنائی دی۔

"ایک منٹ امی رکے گا۔" وہ فوراً رک گئیں اور پلٹ کر دیکھا شان بیڈ سے پاؤں لٹکا کر بیٹھا ہوا تھا۔ مخنم اس کے پاس جا کھڑی ہوئیں۔

"کیا ہوا بیٹا بولو۔" بے قراری ان کے لہجہ میں جھلک رہی تھی۔ انہیں پکارنے والا بالکل ساکت ہو چکا تھا جیسے کوئی پتھر کا مجسمہ۔

"شان تم کچھ کہہ رہے تھے۔" مخنم نے بے اختیار اس کے کندھے کو پکڑ کر ہلایا۔

"آگ۔۔۔ ہاں۔۔۔" وہ چونک اٹھا۔ نظراٹھا کمر کی جانب نکلا۔ اس کی لال سرخ آنکھوں میں پانی سا تیر رہا تھا۔ کسی خیال کے تحت مخنم شرمندہ سی ہو گئیں۔

"کیا بات ہے بیٹا بولو۔" نہ چاہتے ہوئے بھی نبی ان کے لہجہ میں گھل گئی۔

"مان کی شادی میں نبیو آپ سے ملی تھی؟" یہ کیسا سوال تھا مخنم کو امید نہ تھی کہ شان ان سے نبیو کے بارے میں کوئی بات کرنے والا ہے۔ وہ گڑبڑاسی گئیں۔ سمجھ ہی نہ آیا کیا جواب دیں۔

"ہاں ملی تو تھی، کیوں کیا ہوا؟"

"نہیں بس ایسے ہی پوچھ لیا، پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگ رہا ہے وہ اپنے گھر میں خوش نہیں ہے۔" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔

محسوس تو مخنم کو بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ لیکن جب انہوں نے رجا ب سے یہ ذکر کیا تو اس نے فوراً "سے بیشتر ان کے اس خیال کو رد کر دیا۔

"یہ صرف آپ کی فضول سوچ ہے۔ وہ اپنے گھر میں بہت خوش ہے۔ ہر دوسرے دن سکندر بھائی کا اسے فون آتا ہے اور پھر ایسا شو ہر کماں لے گا جو نبیو کے پیچھے اس کا بچہ سنبھال رہا ہو اور نبیو مزے سے گھوم پھر رہی ہو اور ہاں پلے زاب آپ یہ الٹی سیدھی باتیں شان کے سامنے مت سمجھئے گا۔"

اتنے سال گزرنے کے باوجود رجا ب کے لہجہ میں آج بھی نبیو کے لیے موجود حسد جھلک رہا تھا۔ اس دن کے بعد انہوں نے دوبارہ اس پنج پر سوچا بھی نہ تھا تو پھر یہ بات شان تک کیسے پہنچی جہاں تک انہیں یاد پڑتا تھا شان تو نبیو سے ملا بھی نہ تھا اور وہ بھی ان کے گھر ہونے والی دعوت میں بھی شریک نہ ہوئی تھی۔ پھر شان نے اتنی گہرائی تک کیسے سوچا۔

"تم ملے تھے نبیو سے؟" اپنے اندر کی خلش ان کی نوک زبان پر بھی آگئی۔

"آپ کو امید ہے کہ اتنا سب کچھ ہونے کے بعد وہ مجھ سے ملے گی۔" اللہ وہ ان سے سوال کر بیٹھا، جس کا جواب مخنم کے پاس نہ تھا۔

"آپ اسے نہیں جانتیں امی وہ بہت ضدی لڑکی ہے، ایک بار جو چھوڑ دیا سو چھوڑ دیا۔ وہ سست ضرور ہے، لیکن اگر کسی مقصد کو اپنی زندگی کا حصہ سمجھ لے تو ہار نہیں مانتی اور پھر میرے پاس تو خود اتنی ہمت نہ تھی کہ میں اسے فیس کر سکتا۔ آپ تو اچھی طرح جانتی ہیں تاکہ میں نے آپ سب کے کہنے پر کس طرح اس کا دل توڑا تھا اور مجھے یقین تھا کہ جو کچھ میں اس سے کہہ رہا ہوں اس سب کے بعد میں کبھی بھی دوبارہ اس سے بات نہ کر سکوں گا پھر بھی میں نے وہ سب کیا جسے کرنے پر میرا دل اور ضمیر دونوں آمادہ نہ تھے۔" وہ تھکے تھکے لہجہ میں بولا، مخنم چوری بن گئیں۔

"میں نے اسے ایک دوبارہ ہر دیکھا تھا۔ اس کے چہرے کی شادابی ختم ہو گئی ہے۔ آنکھوں کی چمک مائل پڑ گئی ہے۔ وہ بہت تیز حال تھی۔ ہنسی اس کے لبوں تک آتا بھول گئی ہے۔ بہت کمزور ہو گئی ہے امی وہ۔" وہ ایک جذب کے عالم میں بول رہا تھا۔ اس کے الفاظ قطرو قطرو بن کر مخنم کے دل میں اتر رہے تھے۔ کاش چند اور رجا ب اپنی ضد میں میرے بچے کی خوشیاں داؤ پر نہ لگاتے۔ کیا ملا ان دونوں کو میرے معصوم بچے کا دل اجاڑ کر، لیکن شاید نبیو اس کا نصیب ہی نہ تھی۔ ورنہ یہ سب کچھ اتنا مشکل نہ ہوتا جتنا ہو گیا۔ اس کو کہتے ہیں اللہ کے رضا اور نصیب کا لکھا جس کے آگے انسان بالکل بے بس ہو جاتا ہے اور اس سوچ نے ان کے دل کو ڈھارس دینے میں مدد دی۔

"تمہارے ماموں کا فون آیا تھا۔" ضروری تھا کہ شان کا دھیان کسی اور طرف لگایا جائے۔

"وہ رخصتی کے بابت دریافت کر رہے تھے کہ کب تک ارادہ ہے۔" انہیں یہ ہدایت بھی رجا ب نے ہی دی تھی کہ شان کو جلد از جلد مہینہ کے پاس بھیج دیں۔ تاکہ اس کا دل بمل سکے۔ کیونکہ شان کی یہ کھوئی کھوئی سی کیفیت کسی سے بھی پوشیدہ نہ تھی۔ اس کے قریبی سب لوگ ہی جانتے تھے کہ وہ نبیو کے فراق میں دنیاواری بھول چکا ہے۔ آج بھی اس کے دل سے نبیو کی یاد نہیں گئی۔ وہ ابھی بھی اس کے حصار محبت میں گرفتار ہے اور

اس کا آسان حل یہی نظر آ رہا تھا کہ جلد از جلد اس کی شادی کر دی جائے تاکہ وہ گھرواری میں الجھ کر اپنے ماضی سے بچھا چھڑا سکے۔ حالانکہ ماضی ایسی چیز ہے جو انسان کا بچھا اتنی آسانی سے نہیں چھوڑتا۔ مگر یہ بات سب کی سمجھ میں نہیں آئی۔

”آپ کا جب دل چاہے یہ کار خیر انجام دے دیں۔ کیونکہ مجھے اس تمام سلسلے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔“ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ پاؤں میں سلیر پہنے اور بڑے بڑے ڈگ بھرتا دروازہ کھول کر کمرے سے اور پھر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اسے جاؤ کیلئے کمر بننے کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور بے اختیار ان کے دل سے دعا نکلی۔

”اے خدا میرے بیٹے کے نصیب میں بھی اچھی خوشیاں لکھ دے۔ وہ خوشیاں جو اس سے روٹھ گئی ہیں اس کے نصیب کی روشنی خوشیوں کی ذمہ دار بھی ہیں ہی ہوں، میری بد نصیبی کہ بیٹی کا گھر بسنے کے لیے بیٹا کا دل اجاڑ دیا۔ میرے مالک مجھے معاف کرنا۔“ دعا کے ساتھ ساتھ ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔

نبیو کے فون کرنے کے دو دن بعد ہی صالح محمد اور عائشہ فاطمہ کے گھر آئے۔ ان کا غصہ سے سرخ چہرہ اور اکھڑا اکھڑا انداز فاطمہ کو سمجھا گیا کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ ویسے بھی صالح محمد ناصر فون سے بڑے تھے بلکہ اپنی بارعب شخصیت کے باعث سارے خاندان میں عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کی اس طرح بغیر اطلاع آمد فاطمہ اور گھر کے دیگر افراد کے لیے اچھے سے کابا عاٹ تھی۔

”مجھے تو یقین نہیں آتا کہ تم اتنی ظالم بھی ہو سکتی ہو۔“

فاطمہ کے سلام کے جواب میں انہوں نے کھڑے کھڑے ہی انہیں لٹا دیا۔

”بھلا برائے دیس سے ایک بچی لا کر اس کے ساتھ ایسا سلوک بھی روا رکھا جاسکتا ہے جو تم سب نے مل کر نبیو کے ساتھ کیا۔ مجھے تو شرم آئی ہے تمہیں اپنی بہن کہتے ہوئے۔“ وہ صوفہ پر بیٹھنے کے بعد بھی مسلسل بول رہے تھے۔ غصہ کی شدت سے ان کا چہرہ لال بھبھو کا ہو رہا تھا۔

”میری سمجھ میں نہیں آیا یا ماموں کے ہم نے ایسا کیا کر دیا جو آپ آتے ہی اتنا غصہ کر رہے ہو۔“ فاطمہ تو خاموشی سے سر جھکائے کھڑی تھیں، لیکن رفیدا جو ماموں کی آمد کی اطلاع سن کر ابھی بھی الاؤ بخ میں آئی تھی۔ زیادہ دیر برداشت نہ کر سکی اور فوراً ”ہی بولی بڑی۔ اس کے اس طرح بولنے کا صلح محمد نے سخت برا متایا۔ جس کا اندازہ ان کے چہرے کے بگڑے زاویے کو دیکھ کر بخوبی لگایا جاسکتا تھا۔

”تم خاموش رہو رفیدا، ہم تم سے بات نہیں کر رہے۔“ رفیدا کی دخل اندازی عائشہ کو بھی پسند نہ آئی اور انہوں نے فوراً ”ٹوک دیا۔

”یہ اس گھر کی ممبر ہے ماما اور آپ اس سے اس لہجہ میں بات نہیں کر سکتیں۔“ سکندر نے ایک نظر رفیدا کے محنت زدہ چہرے پر ڈالی اور پھر فوراً ”پلٹ کر عائشہ کو جواب دیا۔

”اور تم لوگ سب کسکے ہو؟“ عائشہ نے تھکے لہجے میں پوچھا۔

”میں آپ کی بات سمجھا نہیں، آپ ذرا اکل کرتا میں کیا کتنا چاہتی ہیں۔“ سکندر کی بے نیازی پورے عروج پر تھی۔

”پہلے تو تم مجھے یہ بتاؤ یہ سامنے کھڑی لڑکی کون ہے؟“ صالح محمد نے عائشہ کو اشارے سے خاموش کرواتے ہوئے دروازے میں کھڑی ایڑھا کی سمت دیکھا۔ جس کا مختصر لباس انہیں مجبور کر رہا تھا کہ اس کے متعلق کی جانے والی گفتگو کے دوران بھی اس کی طرف نگاہ اٹھانے سے گریز کیا جائے۔

”صدا کی میڈ۔“ جواب سکندر کے بجائے رفیدا کی جانب سے آیا۔

”لیکن مجھے تو یہ میڈ سے زیادہ کچھ اور دکھائی دے رہی ہے۔“

”میں آپ کا مطلب پھر نہیں سمجھا کہ آپ کیا کتنا چاہ رہے ہیں۔“

”اس عورت کا کلیہ میڈ سے زیادہ دھندلا کرنے والی جیسا ہے۔“ اب اکل صارف سے مزید برداشت نہ ہوا اور وہ ترش کر بولے۔

”ماموں آپ جو بات کرنے آئے ہیں وہ کریں۔ میرے گھر کے کسی بھی فرد کی کردار کشی کا آپ کو کوئی حق حاصل نہیں ہے۔“ سکندر نے بات کرنے کے دوران ایڑھا کو بھی کمرے میں واپس جانے کا اشارہ کر دیا۔

”وہ بھوکا فاطمہ بات صرف اتنی ہے کہ ایڑھا اور سکندر کے درمیان جو بھی تعلق ہے وہ اب کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے۔“ صالح محمد کے ان الفاظ نے کمرے میں موجود تمام لوگوں کے چہرے کی رنگت کو یکسر تبدیل کر دیا۔ کسی کو امید نہ تھی کہ وہ اس طرح کھل کر اس موضوع پر گفتگو کریں گے۔

”اول تو شرعی اور قانونی لحاظ سے یہ تعلق ناجائز ہے۔ دو نم اس تعلق کے نتیجہ میں یہ اپنی بیوی کی حق تلفی کر رہا ہے جس کا اسے قطعی احساس نہیں ہے اور نہ ہی تم اسے اس غلطی کا احساس دلا رہی ہو۔ جبکہ یہ تمہاری ذمہ داری ہے کیونکہ تم اس کی ماں ہو۔“

”پہلے تو مجھے یہ بتائیں کہ آپ سے یہ سب کچھ اس کس نے کی ہے؟“ سکندر نے نبیو کی جانب ہنستے ہوئے زہر خند لہجہ میں کہا۔

”جس نے بھی کہا تم وہ چھوڑو صرف یہ بتاؤ کیا یہ سب غلط ہے۔ کیا تم نے ایک ماں کی گود اجاڑ کر ڈیڑھ دو ماہ کا بچہ اس عورت کے حوالے نہیں کیا؟ جو اب میری ان سب باتوں کا۔“

”میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا کہ وہ صدا کی میڈ ہے۔“

”میڈ ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بچہ کون سے عمل طور پر علیحدہ کر دیا جائے۔ ہر حال اب تک جو بھی ہوا وہ سب ہو گیا۔ لیکن آئندہ تم مجھے نبیو کا سر پرست سمجھنا اور یاد رکھنا یہ اب میری ذمہ داری ہے اور اس کے سلسلے میں ہونے والی کسی بھی شکایت کی باز پرس میں خود تم سے کروں گا۔ کیونکہ اللہ کے سامنے اس پر کی جانے والی ہر زیادتی کا ذمہ دار میں ہوں۔ میں نے ہی تمہاری نیک نیتی کی گواہی دے کر اس کے باپ سے یہ رشتہ مانگا تھا۔“

بات کرتے کرتے صالح محمد اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے ساتھ ہی عائشہ بھی اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”اور ایک بات اور آئندہ اگر تم لوگوں نے اس بچی سے کوئی زیادتی کرنے کی کوشش کی تو میں اپنا اور تمہارا رشتہ بھول جاؤں گا اور پھر کہیں ایسا نہ ہو کہ میں تم لوگوں کو عدالت میں ٹھینے پر مجبور ہو جاؤں۔“ سکندر کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ فاطمہ بالکل خاموش تھیں جیسے منہ میں زبان ہی نہ ہو۔

”ماموں آپ اطمینان سے بیٹھیں اور کھانا کھا کر جائیں۔“ رفیدا نے آگے بڑھ کر صالح محمد کے ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

”میں رفیدا پہلے یہ صرف میری بہن کا گھر تھا۔ لیکن اب بیٹی کا بھی ہے اور میں بہن بیٹی کے گھر سے پانی پیتا بھی پسند نہیں کرتا۔“ انہوں نے اپنا ہاتھ چھڑا کر رفیدا کے سر پر رکھتے ہوئے کہا۔

”اور وہاں فاطمہ اب اس بچی کی گود خالی کرنے سے پہلے ہی سوچ لیتا کہ اس کا باپ بھی یہاں موجود ہے۔“ صالح محمد نے آگے بڑھ کر نبیو کے سر پر ہاتھ رکھا جو قریبی صوفے پر سر جھکائے خاموش بیٹھی اپنے ہونٹ چبا رہی تھی۔ صالح محمد کے اس محبت بھرے اظہار نے اس کے دل کو مزید دھکی کر دیا اور اس کی آنکھیں پانی سے لہالب بھر گئیں۔

”اور ایک آخری بات سکندر تمہیں اور تانوں، کسی بھی قانون کے تحت تم اپنی پاک باز اور نیک بیوی سے اس

کے بچے چھین کر ایک بے لباس اور فاحشہ کے حوالے نہیں کر سکتے۔ کیونکہ جو تربیت یہ اپنے بچوں کی کر سکتی ہے وہ ایدھا کے بس کی بات نہیں ہے اور اگر یقین نہ ہو تو کسی بھی عدالت میں اس بات کو ثابت کر کے دکھانا چلو عاشر۔ ”عاشہ کو پکارتے ہوئے وہ شیشے کا دردانہ کھول کر لاؤنج سے باہر نکل گئے۔ ان کے باہر نکلنے کے کچھ دیر تک تو سب لوگ اپنی اپنی جگہ ساکت کھڑے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ ان کو سمجھ ہی نہ آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو گیا۔ ماحول پر ایک سکوت سا طاری ہو گیا تھا جسے رفیدہ کی آواز نے توڑا اور سب ہی یک دم ہوش میں آ گئے۔ ”ماں تم کو آج کل بہت ہمدردی ہو رہی تھی اس سے اب بھگتو۔“ یہ کہہ کر وہ کمرے میں رکی نہیں کچھ گنگنائی اپنے کمرے کی سمت بڑھ گئی اگلے ہی پل سکندر اور فاطمہ بھی اس کے پیچھے ہی چل دیے بیرو خاموشی سے اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی ریبہ کے کہنے پر صلح لمحہ سے بات کرنے کا اس نے رسک ضرور لے لیا تھا لیکن یہ نہ جانتی تھی کہ اب آگے کیا ہونے والا ہے۔ صلح لمحہ کی آند کا رد عمل رات ہونے سے پہلے ہی ظاہر ہونا شروع ہو گیا شام کو ہی سکینہ اپنے بیٹے کبیر کے ساتھ آگئی کچھ دیر بعد ہی عمر اور روزنہ بھی پہنچ گئے غالباً ”ان کی یہ آند فاطمہ یا سکندر کی طرف سے خیمے جانے والے فون کل کا نتیجہ تھا۔ آتے ہی ان کا زور زور سے بولنا اس بات کی نشاندہی کر رہا تھا کہ وہ تمام بات سے بخوبی آگاہ ہیں بیو کے کمرے کا دردانہ کھلا ہوا تھا جس سے باہر ہونے والی ہنگامہ آرائی اس کے کمرے تک آ رہی تھی۔

”اس کی اتنی جرات کیسے ہوئی کہ اس نے ماموں کو فون کر کے سکندر کی کردار کشی کی۔“ سکینہ کا اشارہ یقیناً ”اس کی جانب تھا۔

”معاف کرنا سکندر اس میں سارا قصور تمہارا ہے تم اچھی طرح جانتے ہو میرا میاں ابھی بھی میرا موبائل چیک کرتا ہے کہ میں کس سے بات کر رہی ہوں ایک تم ہو جس نے شاید کبھی یہ بھی نہیں دیکھا کہ تمہاری بیوی کے فون میں کس کس کا نمبر موجود ہے۔“ سکینہ کی بات سو فیصد جھوٹ پر مبنی تھی اس کا میاں تا صرف ایک شریف النفس انسان تھا بلکہ اس پر سکینہ کا مکمل کنٹرول بھی تھا۔ بیو کو کیا کوئی بھی نہیں مان سکتا تھا کہ وہ سکینہ کا فون چیک کرنا ہو گا لیکن اس کی بات رد کرنے کی جرات بھی کسی میں نہ تھی۔

”میری اور روزنہ کی شادی کو اتنے سال ہو گئے اس میں ابھی تک اتنی جرات نہیں ہے کہ کسی سے میری شکایت کر سکے۔“ یہ عمر کی لڑائی تھی دونوں بہن بھائی یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ سب سے زیادہ آزادی اس گھر میں صرف بیو کو ہی حاصل ہے جس کا وہ ناجائز استعمال کر رہی ہے۔ جواباً ”سکندر نے کیا کہا بیو کو سمجھ ہی نہ آیا ایک تو اس کی آواز خاصی دھیمی تھی دوسرا اسے حماد کے روئے کی آواز اندر تک سنائی دی تھی یقیناً اس کی وجہ کبیر تھا وہ جب بھی آتا تھا مسلسل حماد کے ساتھ شرارت کرتا اس سلسلے میں اسے کوئی بھی منع نہ کرتا تھا جب حماد زیادہ چڑا تا تو روزنہ لگتا پھر کچھ دیر تک ٹوکیہ باز رہتا لیکن جیسے ہی حماد سب کچھ بھول کر پھر اس سے کھیلنے کی کوشش کرتا وہ دوبارہ اسے تنگ کر کے رلاتا ایسا ہی اب بھی مسلسل ہو رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد حماد کے روئے کی آواز باہر سے آنے والی آوازوں کو معدوم کر دیتی بیو چڑی گئی اسے کبیر پر سخت غصہ آیا جو ایک چھوٹے معصوم بچے کو مسلسل تنگ کر رہا تھا لیکن وہ باہر جا کر کچھ کہہ نہ سکتی تھی کیونکہ اس وقت باہر جا کر کچھ کہنا بالکل ایسے تھا جیسے بھڑوں کے جھتے میں ہاتھ ڈالنا لہذا وہ خاموشی سے اٹھی قریب رکھا دھپٹہ اٹھایا باہر نکل آئی لاؤنج میں سب کو نظر انداز کر کے اس نے جیسے ہی شیشے کا دردانہ کھیل کر باہر نکلنا چاہا ایک دم حماد بھاگتا ہوا اس کی طرف آیا وہ بے اختیار رک گئی سرخ سفید رگت گول مثل حماد بیو نے جھک کر اس کے گال پر بوسہ دیا۔

”میرے ساتھ باہر چلو گے آؤں کریم لے کر دوں گی۔“ اس کے لہجہ میں مامتا جھلک رہی تھی۔

”نہیں۔“ حماد نے نفی میں اپنا سر ہلایا۔

”تم گندی عورت ہو میرے پایا کو تنگ کرتی ہو۔“ ملائی زبان میں جیسے ہی اس نے یہ جملہ کہا اسے اپنے قریب ہی کبیر کا قہقہہ سنائی دیا یہ جملہ یقیناً ”اس کا سکھایا ہوا تھا بیو کو لیکن آئیہا کہ اس خاندان کا ہر فرد نفسیاتی مرض ہے وہ ایک ٹھنڈی سانس بھر کر سیدھی ہو گئی پہلے دل تو چاہا کہ اسے خوب کھری کھری ستائے یا کم از کم سکندر سے جا کر یہ سوال کرے کہ۔

”یہ ہے وہ تربیت جس کے لیے تم نے اپنے بیٹے کو میڈ کے حوالے کیا تھا۔“ وہ جانتی تھی کہ ان دونوں باتوں کا کوئی فائدہ نہیں ہے تاؤ کبیر پر اس کی کسی ڈانٹ کا اثر ہونے والا تھا اور نہ ہی سکندر کے نزدیک اس کے کہے گئے کسی جیلے کی اہمیت تھی خود کو بے وقعت کرنے سے اچھا تھا خاموشی سے باہر نکل جائے اور اس نے ایسا ہی کیا لکڑی کے گیٹ سے باہر نکلتے ہی اس کی نگاہ سامنے روڑے کے دوسری طرف کھڑی شوہا پر پڑی شوہا نے اسے دیکھتے ہی ہاتھ ہلایا۔ بیو نے ایک پلک کے لیے سوچا اور روڑا اس کر کے اس کے قریب جا پہنچی۔

”میرے ساتھ مارکیٹ تک چلو گی۔“ چونکہ شوہا انڈین تھی اس لیے بیو اس سے ہمیشہ اردو میں ہی بات کرتی تھی۔

”شیوور۔“ اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

پاکستان سے واپس آتے ہوئے اسے روانے کافی رقم دی تھی اور آج انکل صلح بھی جاتے ہوئے اسے کچھ ملائی کرنسی دے گئے تھے جبکہ سکندر کا کہنا تھا کہ جب میں ضرورت کی ہر چیز تم کو لا دیتا ہوں تو پھر الگ سے پیسوں کا کیا جواز بنتا ہے البتہ امان کی شادی کے سلسلے میں اس نے بیو کو تا صرف اچھی خاصی شاپنگ کروائی تھی بلکہ خاصی رقم بھی دی تھی جس میں سے ابھی بھی کچھ اس کے پاس محفوظ تھی اسی لیے وہ مارکیٹ تک آگئی تھی تاکہ اپنی ضرورت کی کچھ اشیاء خرید کر کمرے کی الماری میں رکھ لے پھر واپسی میں وہ سامنے ہی اسٹال لگائے بیٹھی ملائی عورت کے پاس رک گئی اس کے پاس ساہنہ اور بوائل چاول موجود تھے جن کے ساتھ لال بڑی مرچ کی چٹنی اور چھوٹی چھوٹی فرانی پھلیاں بھی تھیں۔

”کھانا کھاؤ گی۔“ گھر کی شیش کو خارج کرنے کے لیے ضروری تھا کہ اپنا دھیان باہر لگایا جائے اسی سوچ کے تحت اس نے شوہا سے سوال کیا اور اس کے مثبت جواب کے ساتھ ہی دونوں سامنے رکھی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ کچھ دور فٹ پاتھ پر غالباً ”کوئی چٹنی عورت بیٹھی تھی اس کے پاس رکھے مالے اس بات کی نشاندہی کر رہے تھے کہ وہ عبادت کر رہی ہے۔ بیو بڑی دلچسپی سے اس سارے منظر کو دیکھ رہی تھی۔

”جانتی ہو یہ جس جگہ بیٹھی ہے یہاں ان کی مخصوص عبادت گاہ ہے۔“ شوہا نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے اسے معلومات فراہم کیں۔ اتنی دیر میں ان کا آؤر کیا ہوا کھانا بھی پہنچ گیا تھا۔

”ہاں مجھے ایک دفعہ سکندر نے بتایا تھا کہ یہ اپنی عبادت گاہیں اسی طرح روڑے کے کنارے بناتے ہیں اور پھر وہاں یہ سب فروٹ رکھ جاتے ہیں جو غالباً ”ان کے کسی دیوتا کے لیے ہوتا ہے۔“ بیو نے آہستہ آہستہ کھاتے ہوئے جواب دیا۔

”ہاں اور جب ان کی کوئی منت پوری ہوتی ہو تو دیوتا وہ فروٹ رات میں ہی زمین پر آکر کھا لیتا ہے ورنہ اگلی صبح یہ سب کچھ ویسا ہی عبادت گاہ میں موجود رہتا ہے۔“

”اور اگر یہ تمام فروٹ رات ہی کوئی شخص آکر لے جائے تو کیسے پتا چلے کہ دیوتا نے کھایا؟“ بیو کو چٹنی قوم کے اس عقیدے نے تھوڑا سا حیران کر دیا۔

”ظاہر ہی بات ہے سب کو ہی پتا ہے کہ یہ منت کا پھل ہوتا ہے پھر کیسے کوئی شخص اتنی جرات کر سکتا ہے کہ عبادت گاہ میں آکر چوری کر لے۔“ شوہا نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”تم کبھی خود آنا کر دیکھ لینا اگر منت پوری نہ ہونی ہو تو پھل مچ تک اسی روڈ کے کنارے موجود مخصوص عمارت گاہ میں رکھالے گا بصورت دیگر تمہاری منت پوری ہوگئی ہوگی۔“

”جھا۔“ نیو نے مزید بحث میں الجھنا بے کار سمجھا سب کے اپنے اپنے عقائد اور رسومات ہوتی ہیں اس سلسلے میں الجھنا صرف بے فنی ہوتی ہے اس خیال نے اسے مزید کچھ کہنے سے باز رکھا اور پھر جب وہ ڈیڑھ سے دو گھنٹہ بعد گھر واپس آئی تو سیکڑے جاچکی تھی البتہ روزینہ اور عمر گھر میں موجود تھے وہ خاموشی سے اپنے کمرے میں آگئی شاپنگ بیگ بید پر رکھی تھی کہ روزینہ بھی اس کے پیچھے ہی آگئی وہ بے بھی وہ بڑی بے ضروری عورت تھی بھی کسی کے مسئلے میں دخل اندازی نہ کرنے والی اس کی جاب کافی سخت تھی مچ سے لے کر شام سات تک وہ آفس رہتی آج ہی شاید آفس سے سیدھی ہی یہاں آگئی تھی محض اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔

”اسلام علیکم بھابھی آجائیں بیٹھ جائیں۔“ نیو نے خوش دلی سے سلام کر کے بیڈ پر اس کے لیے جگہ بنائی۔

”کیسی ہیں آپ؟“ وہ بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

”شکراً اللہ میں تو بالکل ٹھیک ہوں سوچا چلتے چلتے تمہاری خیریت بھی دریافت کر لوں کیسی ہو تم؟“

”آپ کے سامنے ہی ہوں جیسی ہوں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ تھوڑی سی تلخ ہوگئی۔

”ویسے تم نے اچھا کیا اگل صبح کو یہ حال اور سکندر کے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔“ روزینہ دھیمی آواز میں بولی نیو کو سمجھ میں نہ آیا کہ اسے کیا جواب دینا چاہیے کیونکہ اس گھر میں رہتے ہوئے اس کے لیے دوست اور دشمن کی پہچان بہت مشکل تھی وہ جواباً ”خاموش رہی۔“

”میں جانتی ہوں نیو تمہارے لیے ہم میں سے کسی پر بھی اعتبار کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن بھی ہے پھر بھی یقین کرو میری سب ہمدردیاں تمہارے ساتھ ہیں اگر تمہیں اس گھر میں رہتے ہوئے بھی میری مدد و کار ہو ضرور ملتا ہو سکتا ہے میں تمہارے کسی کام آجاؤں۔“ روزینہ ہمیشہ سے نیو کے ساتھ ہمدردانہ رویہ رکھتی تھی جس کا اندازہ کئی بار اسے ہوا تھا پھر بھی اس سلسلے میں کسی پر اعتبار کرنا ایک مشکل امر تھا وہ نہیں چاہتی تھی کہ کسی کو بھی علم ہو کہ صلح محمد کو فون اس نے کیا ہے یہی سوچ کر وہ خاموش رہی۔

”جھا چلا اب میں چلتی ہوں۔“ اس کی مسلسل خاموشی کو محسوس کر کے روزینہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”عمر گاڑی اشارت کر رہا تھا میں نے سوچا تم سے مل لوں۔“ اس نے اپنے جلدی اٹھنے کا جواز بھی بتا دیا اس کے ساتھ ہی نیو اٹھ کھڑی ہوئی۔

”شکریہ بھابھی آپ کی اس ہمدردی کا۔“ روزینہ سے گلے ملتے ہوئے اس نے کہا۔

”یقین کریں اگر مجھے کبھی بھی کوئی مسئلہ ہوا تو میں ضرور آپ سے ٹسکسپی کر لوں گی۔“ روزینہ نے اسے جو حوصلہ عطا کیا تھا اس کی جھلک اسی کے لہجہ میں بھی آگئی جیسے روزینہ نے بھی واضح طور پر محسوس کیا اسے آج اور کل کی نیو میں ایک واضح فرق نظر آیا اسے اندازہ ہوا کہ شاید نیو کو اس محض میں کوئی روزن مل گئی ہے جس نے اسے زندگی گزارنے کا حلیہ سکھا دیا ہے یا شاید گزرتے وقت نے اسے مضبوط کر دیا تھا ہر حال جو بھی تھا روزینہ کو یہ سب اچھا لگا کیونکہ اسے ہمیشہ با حوصلہ عورتیں اچھی لگتی تھیں۔



محسوس کر رہا ہوں میں جینے کی تنگیوں
شاید مجھے کسی سے محبت نہیں رہی

ایک انجان نمبر سے آنے والا انجان مسیح جانے کس کا تھا جو نیو کے موبائل پر موصول ہوا نمبر غالباً پاکستان کا تھا اور ایسا پہلے ایک ہفتہ سے مسلسل ہو رہا تھا اور وہ چاہ کر بھی نہیں جانتا چاہتی تھی کہ یہ نمبر کس کا ہے ابھی بھی

مسیح پڑھ کر بے دلی سے اس نے موبائل سائیڈ پر رکھ دیا۔

”کس کا مسیح ہے؟“ سکندر کپیوٹر پر کوئی کام کر رہا تھا بظاہر تو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ نیو سے قطعی لا تعلق ہو لیکن اس کے سوال کرتے ہی نیو کو اندازہ ہوا کہ اس کی توجہ مکمل طور پر اس کی طرف ہی لگی ہوئی تھی۔

”پتا نہیں۔“ اس نے بے دلی سے جواب دے کر آنکھیں موند لیں۔

”یہ نمبر تو پاکستان کا ہے۔“ سکندر نے کب اس کے قریب رکھا فون اٹھایا اسے پتا ہی نہ چلا جب اپنے قریب سکندر کی آواز سنی تو چونک کر آنکھیں کھول دیں سکندر غالباً ”اسی نمبر پر کل ملا رہا تھا نیو کے کپاؤں سے تو زمین ہی سرک گئی وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ سکندر اس طرح بھی کر سکتا ہے کیونکہ وہ جیسا بھی تھا کم از کم جنس اس کی فطرت میں شامل نہ تھا یہ یقیناً ”سیکنڈ کی پڑھائی ہوئی کوئی بیٹی تھی نیو کو گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔“

”میرا فون دو۔“ سکندر نے اس کا ہاتھ ہوا ہاتھ سختی سے تھام لیا فون ابھی بھی اس کے کان سے لگا تھا یقیناً ”دوسری طرف بیل جاری تھی فون کیے بنا بھی وہ جانتی تھی کہ دوسری طرف کون ہے کال ریسیو کر لی تھی نیو کو سانس لینا محال ہو گیا دوسری طرف سے کچھ کہا گیا سکندر نے کوئی بھی جواب نہ دیا وہ مسلسل خاموشی سے دوسری طرف کی بات سن رہا تھا نیو کا ہاتھ ابھی بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔

”یہ سنان کون ہے؟“ کان سے فون لگائے لگائے وہ نیو کی طرف پلٹا۔

”اب یہ مت کہنا کہ تم نہیں جانتیں کیونکہ تمہارا وہ رانا عاشق ابھی بھی تمہارے فراق میں مر رہا ہے۔“ پتا نہیں سنان نے فون بند کیا تھا یا ابھی بھی لائن پر موجود تھا نیو کو سمجھ ہی نہ آیا کہ وہ کیا جواب دے۔

”اے۔۔۔ انا۔۔۔“ وہ اسے بازو سے پکڑ کر ہار لے آیا۔

”کرؤر اہاموں صلح کو فون میں انہیں بتاؤں اس ٹیکسٹ ساعورت کے کروت جس کے یا را ابھی بھی پاکستان سے اسے فون کرتے ہیں۔“ وہ مسلسل چلا رہا تھا جبکہ نیو دعا کر رہی تھی کہ زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے یہ تو صرف وہ اور اس کا اللہ ہی جانتا تھا کہ سکندر جو کچھ کہہ رہا ہے سب لغو اور فضول ہے لیکن آج اس کی اسی بات کی گواہی دینے والا وہاں کوئی نہ تھا۔

”کیا ہو گیا کیوں اتنا ہنگامہ کر رہے ہو؟“ قاطرہ کے ساتھ رفید ابھی کمرے سے باہر آگئیں۔

”کسی سے مسیح پر بات کر رہی تھی میں نے اس کے ہاتھ سے فون چھین کر کل ملائی دوسری طرف کوئی مروتھا فون ریسیو کرتے ہی بولا میں جانتا تھا جان من تم ضرور فون کرو گی کیونکہ تم تو بی بی اپنے سنان کے لیے تمہیں یہ جانے سکندر جیسے لوگ کہاں سے بچ میں آگئے۔“ سکندر کی بات سو فیصد جھوٹ پر مبنی تھی نیو جانتی تھی کہ سنان کبھی بھی ایسی گھٹیا زبان استعمال نہیں کرتا ابی اس دن کی بے عزتی کا بدلہ لینے کا موقع آج ہی سکندر کے ہاتھ آیا تھا جسے وہ کسی بھی صورت ضائع نہ کرنا چاہتا تھا اسی لیے اس کے جودل میں آ رہا تھا وہ کیے جا رہا تھا اس کی ہر بات کا مقصد صرف اور صرف نیو کو بد کردار ثابت کرنا تھا کیونکہ اسی طرح وہ صلح محمد کو بچا دیکھا سکتا تھا۔ نیو کا ذہن بالکل ہی ماؤف ہو گیا۔

”توبہ استغفار میرے بیٹے کو سارے خاندان میں بدنام کر دیا اور اپنے گندے کروتوں کا پتا ہی نہیں۔“ قاطرہ اس کے قریب آ کر بولیں۔ ”تجواں کر رہا ہے یہ بہتان لگا رہا ہے مجھ پر۔“ نیو سکندر سے اپنا بازو چھڑواتے ہوئے

دور سے چیخی۔

”میں بکواس کر رہا ہوں۔“ سکندر نے اسے بالوں سے پکڑ کر کھینچا۔

”پھر سے کہنا میں بکواس کر رہا ہوں۔ بولو ذرا ایک بار پھر سے بولو۔“ وہ مسلسل اس کے بالوں کو جھکے دیتا ہوا

”ہاں۔ ہاں۔ جھوٹ بول رہے ہو تم۔“
فاطمہ اس کے قریب آکر بولیں۔ ”کیوں کر رہا ہے یہ بہتان لگا رہا ہے مجھ پر۔“ نبیو سکندر سے اپنا بازو چھڑواتے ہوئے زور سے چبٹی۔
”میں کیوں کر رہا ہوں۔“ سکندر نے اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹا۔
”پھر سے کہنا میں کیوں کر رہا ہوں۔ بولو ذرا ایک بار پھر سے بولو۔“ وہ مسلسل اس کے بالوں کو جھٹکتے دیتا ہوا بولا۔

”ہاں۔ ہاں۔ جھوٹ بول رہے ہو تم۔“
وہ تکلیف اور زلت کے طے طے احساس کے تحت روتے ہوئے بولی۔
”صرف مجھ سے اپنا بدلہ لینے کے لیے جھوٹا الزام لگا رہے ہو۔“
”میں تم پر الزام لگا رہا ہوں آوارہ عورت۔“ سکندر نے اس کے منہ پر ایک زوردار طمانچہ مارا۔ اسے لگا اس کی سانس بند ہو جائے گی۔ وہ زمین پر بیٹھ کر زور زور سے رونے لگی اس سے قبل کہ سکندر ایک بار پھر اس کی طرف بڑھتا فاطمہ دونوں کے درمیان آگئی اور سکندر کو بازو سے پکڑ کر روک لیا۔
”چھوڑو اسے سکندر یہ ماں بننے والی ہے اس حالت میں اگر بچے کو کوئی نقصان پہنچا تو کیا ہو گا لوگ ہمیں ہی ذلیل کریں گے اسے کوئی کچھ نہ کہے گا۔“ فکر اس کی نہ تھی بلکہ اس بچے کی بھی خود دنیا میں آیا تھا جو بھی تھا فاطمہ کی بروقت مداخلت نے اسے بچا لیا تھا۔
”اے تو میں چھوڑ دیتا ہوں لیکن تم ابھی ماموں صالح کو فون کرو اور ہاں عبد الوہاب اور اس کی پاکستانی بیوی کو بھی بلاؤ میں سب کو بتاؤں اس عورت کے کرو ت۔“ وہ ہاتھ میں پکڑا موبائل نچا کر بولا۔
”صالح کسی کام کے سلسلے میں پاکستان گیا ہوا ہے واپس آجائے تو میں ضرور بات کروں گی لیکن فی الحال ابھی تم اپنی زبان بند رکھو۔“
”اور یہ تم کسے فون ملارہی ہو؟“ سکندر سے بات کرتے کرتے وہ رفیدہ کی طرف متوجہ ہوئی جو لینڈ لائن سے کسی کانبرڈائل کر رہی تھی۔

”عبد الوہاب کو۔“ رفیدہ کے جواب نے نبیو کے ہوش گم کر دیے شان کے مسیج ابھی بھی اس کے موبائل میں موجود تھے جو سکندر کے ہاتھ میں تھا یہ مسیج اسے گناہ گار ثابت کرنے کے لیے کافی تھے اگر پاکستان بھی اس نمبر کا حوالہ دیا جاتا تو سب سمجھ جاتے کیا قصہ ہے اور اسے ہی تصور وار سمجھا جاتا اس کا داغ شل ہو گیا وہ سمجھ نہ پا رہی تھی کہ شان نے اس کا نمبر لیا کہاں سے لیکن وہ اتنا جانتی تھی کہ وہ ابھی بھی اسے مسیج بھیجے گا جو اس کے گناہوں کی فرست میں اضافہ کا سبب بنیں گے ضروری تھا کسی طرح شفا کو فون کر کے یہ سب کچھ بتایا جائے یا کم از کم رعبہ سے ہی اس کا رابطہ کرنا لازمی ہو چکا تھا اس سے پہلے اگر یہ سب کسی اور سے رعبہ تک پہنچے گا تو لازمی اسے زلت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

”اللہ میری مدد فرما۔“ بے اختیار اس کے دل سے دعا نکلی جو اگلے ہی لمحے عرش پر جا پہنچی۔
”رکھو فون جب تک صالح بھائی سے بات نہ ہو تم عبد الوہاب کو فون نہیں کرو گی۔“ فاطمہ نے آگے بڑھ کر لائن ڈسکنکٹ کر دی جس کا رفیدہ نے خاصا برا منایا غصہ کے اظہار کے طور پر وہ صوفہ سے اٹھی گود میں رکھا کٹن زمین پر پھینکا اور پاؤں پختی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ زوردار دروازہ بند کرنے کی آواز لائن میں بھی سنائی دی۔ سکندر لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا حماد اس چوٹی سے گھر آکر رونے لگا تھا ایدھا اسے اٹھا کر اندر کمرے میں لے گئی۔ فاطمہ اس طرح کچن کی جانب بڑھ گئیں جیسے کچھ دیر قبل یہاں کچھ ہوا ہی نہ تھا نبیو دیوار سے ٹیک لگا کر زور

زور سے رونے لگی اس کے رونے کی آواز سن کر فاطمہ پھر نکلیں کچھ دیر کھڑی اسے دیکھتی رہیں کچھ سوچا پھر آگے بڑھیں نبیو کو زور سے تمام کر کھڑا کیا وہنا احتجاج کیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اے کمرے میں جاؤ یہ مسئلہ رونے دھونے سے حل ہونے والا نہیں ہے۔ سکندر بہت غصہ میں ہے، میں کوشش کروں گی کہ آج جو کچھ ہوا اس کا ذکر اپنے بھائی سے نہ کروں لیکن تم بھی آئندہ احتیاط کرنا اپنے پچھلے معاشرے کو بھول جاؤ اب تم شادی شدہ عورت ہو جس کے لیے اس کا مردی سب کچھ ہوتا ہے اگر مرد کے تعلق غیر عورتوں سے ہوں تو کوئی انگلی نہیں اٹھاتا لیکن اگر عورت خراب ہو تو معاشرہ جینے نہیں دیتا اب تم خود سوچو تم پاکستان سے آتے ہی پریگنٹ ہو گئیں ساتھ ہی تمہاری عاشقی کی خبریں بھی عام ہو رہی ہیں بھلا بتاؤ ہمارے لیے تنقیدی بے عزتی ہے یہ سب کچھ جو سنے گا وہ تو تمہارے بچے پر بھی شک کرے گا۔“

فاطمہ کا اظہار ہمدردی اس کی سمجھ میں اب آیا تو اس بات کا مقصد یہ ثابت کرنا تھا کہ میں بد چلن عورت ہوں اسی لیے اتنی تنہید باندھی گئی اس کا مطلب یہ تھا کہ ان میں سے کوئی بھی ایسا نہ تھا جو انسان کہلانے کے لائق ہو اسے یک دم ہی اپنے آپ سے گھن محسوس ہوئی جو سکندر جیسے خود غرض شخص کا بچہ دوسری بار پیدا کرنے والی تھی۔ وہ تو آج تک یہ ہی سمجھ نہ پائی تھی کہ سکندر اس کی ماں اور بہن کو اس سے کیا دشمنی ہے؟ اگر وہ سکندر کی شادی پاکستان میں نہیں کرنا چاہتے تھے تو کیوں کی؟ یہ رشتہ اس کے ماں باپ نے زبردستی تو نہ دیا تھا پھر وہ جتنا سوچی اس کا داغ شل ہوتا جاتا سکندر کا رویہ اس کی سمجھ سے بالاتر ہو گیا تھا اس کے اس نفسیاتی پن کی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور تھی جو جلد ہی اسے معلوم ہو گئی جسے سنتے ہی نبیو پر سب کچھ واضح ہوتا گیا۔



”نبیو سے بات ہوئی؟“ روانے شفا کے قریب بیٹھ پر بیٹھے ہوئے اپنا کئی بار کا کیا ہوا سوال پھر سے دہرایا جہاں تک شفا کو یاد پڑتا تھا پچھلے پندرہ دن سے اس کی ماں کوئی پچاس دفعہ یہ سوال کر چکی تھی جس کا جواب ہمیشہ نفی میں ہی ہوتا۔

”نہیں امی اس کا فون ابھی بھی آف جا رہا ہے۔“ اس نے جواب دے کر دوسرے جنید اور اماں پر ایک نظر ڈالی جو آئی سی یو کے باہر کسی ڈاکٹر سے مصروف گفتگو تھے۔
”پاپا کو روم میں کب شفٹ کر رہے ہیں۔“

”میرا خیال ہے شام تک کیوں گے تم ایسا کرو نبیو کے گھر کے نمبر فون کرو یا پھر سکندر سے بات کرو تم جانتی ہو تمہارے پاپا نے روم میں جاتے ہی ایک بار پھر نبیو کی بابت دریافت کرنا ہے۔“
”دون دن پہلے میری سکندر بھائی سے بات ہوئی تھی انہوں نے کہا تھا گھر جا کر نبیو سے بات کرو اتنے ہیں لیکن ابھی تک ان کی کال ہی نہیں آئی اب مجھے اچھا نہیں لگ رہا ایک بار پھر انہیں ڈسٹرب کروں۔“ شفا نے تفصیل سے جواب دیا۔

”چھما۔“ روانے کچھ دیر سوچا اور پھر اپنے پرس کی زپ کھول کر تھوڑی سی تلاش کے بعد ایک کارڈ نکالا شفا کی طرف بڑھایا۔

”اس کے پیچھے نبیو کے گھر کا نمبر ہے میرا خیال ہے تم اس نمبر فون کرو۔“ اسے کارڈ تھا کہ وہ جنید کی جانب چل دیں اور پھر کی بار کی کوشش نے شفا کو یاس کر دیا تیل تو جاری تھی شاید گھر پر کوئی نہ تھا وہ بھی بیٹھ سے اٹھ کر وہیں چل دی جہاں اس کے گھر کے دیگر افراد موجود تھے۔ پہلے وہ آئی سی یو کی طرف گئی شیشے کی دیوار سے اس پار اپنے باپ پر ایک نظر ڈالی ان کی آکسیجن ہٹا دی گئی تھی ایک نرس ان کے قریب کھڑی تھی غالباً انہیں روم میں شفٹ کیا جا رہا تھا اسے کس قدر اطمینان حاصل ہوا پھر وہ اپس پلٹ کر اپنی ماں کی جانب آگئی۔

پاس کھڑا تھا۔

”مجھے یہ پہلی لہنا ہے۔“ حماد اس کے قریب آیا۔

”جسٹ اے منٹ بیٹا ابھی دیتے ہیں تمہیں یہ پیار سا پہلی۔“ سکندر نے ہا ہر کھی پہلی چیز لا کر کاٹ کے قریب رکھ دی۔ حماد اس پر چڑھ گیا اور فوراً کاٹ میں لیٹے ابوزر کے ننھے سے ہاتھ کو تھام لیا نیو اس منظر کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔

”ایک مکمل فیملی میں، میرا شوہر اور میرے دونوں بچے۔“ کچھ دیر کے لیے ہی سہی اس نے اپنے دل کو اطمینان دلایا۔

”کیسی ہو؟“ سکندر اس کے قریب آکھڑا ہوا۔

”ٹھیک ہوں۔“ مختصر سا جواب دے کر وہ اٹھ بیٹھی اور بیڈ سے ٹیک لگالی۔ اتنی دیر میں سکندر اپنی جیب سے کچھ نکال چکا تھا۔

”یہ لو اپنا سیل۔“ اس نے نیو کو کامو بائل اس کے تکیے کے قریب رکھ دیا۔

”میں نے سم تبدیل کر دی ہے نئی سم میں تمہارے تمام جاننے والوں کا نمبر محفوظ کر دیا ہے مجھے امید ہے کہ اب تم اپنا نمبر فالٹو لوگوں کو نہ دو گی۔“ بات کرتے کرتے وہ رکا ایک نگاہ نیو پر ڈالی جو خاموشی سے بیٹھی اپنے ناخنوں کو تنک رہی تھی۔

”تمہارے گھر والے تم سے بات کرنا چاہتے ہیں چاہو تو تم خود فون کر لو۔ اس میں ہیلنس ہے ورنہ تمہاری بہن کچھ دیر تک تمہیں کال کرے گی۔“

”وہ تو یہ وجہ ہے جو آج اتنے عرصہ بعد مجھے فون لوٹانے کی ضرورت پیش آئی۔“ نیو نے تلخی سے سوچا اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتی اس کا سیل گنگنا اٹھا۔ امان کا نمبر اسکرین پر جگمگا رہا تھا۔

”ہیلو۔“ بیس کاٹھن ہنسی کر کے اس نے فون کان سے لگا لیا دو سری طرف شفا تھی جس نے بڑے پر جوش انداز میں اسے مبارکباد دی پھر گھر کے تقریباً تمام افراد نے اس سے فردا فردا بات کی اس کی ناسازی طبیعت کے باعث روانے سب کو منع کر دیا کہ کوئی اسے احتشام صاحب کے بارے میں نہ بتائے گا ویسے بھی اب وہ بالکل ٹھیک تھے اور جب اس سے امان کی بیوی حنیان نے بھی بات کی تو اسے یکدم رحاب یاد آئی۔

”رحاب بھابھی کہاں ہیں؟“ فون رکھنے سے قبل اس نے شفا سے دریافت کیا۔

”وہ دراصل اپنی ای کی طرف گئی ہیں۔ مرینہ پاکستان آئی ہوئی ہے اگلے ہفتہ سان کی شادی ہے اسی سلسلے میں شاپنگ میں مصروف ہیں۔“ شفا نے تفصیل سے جواب دیا اور نیو پوچھ بول ہی نہ سکی سان سے اس کا کوئی رشتہ نہ تھا جو تھا وہ بھی ٹوٹے ہوئے زمانے گزر گئے پھر بھی جانے کیوں اس کی شادی کا سنتے ہی نیو کا دل جھجھک سا گیا اسے احساس ہوا شاید سان آج بھی اس کے دل میں کہیں موجود ہے۔

”میں بھی گنتی بے وقوف ہوں خود ایک شادی شدہ زندگی گزار رہی ہوں دو بچوں کی ماں بن چکی ہوں اور آج بھی یہ چاہتی ہوں کہ سان کسی کانہ ہو شاید میں خود غرض ہو گئی ہوں جو کسی دوسرے کو خوش نہیں دیکھ سکتی اس سوچ نے اسے شرمندہ کر دیا۔

”اللہ کرے سان کو وہ تمام خوشیاں نصیب ہوں جو میرا مقدر نہ بن سکیں۔“ اس نے صدق دل سے دعا کی۔

کیسے انداز شوق سے کہہ دیا تم نے الوداع

جیسے صدیوں سے تیرے دل پر کوئی بوجھ تھے ہم

اس کی آنکھ سے آنسو نچکا اس نے گہرا کر سکندر کی طرف دیکھا جو فون پر شاید امان سے بات کرنے میں مصروف

”میرا خیال ہے ان کے گھر بری کوئی نہیں ہے مگر آپ پریشان نہ ہوں میں آج رات ہی گھر جاتے ہی دوبارہ فون کروں گی۔“ روا کے سوال کرنے سے قبل ہی اس نے انہیں تفصیل بتا کر نسلی بھی دے ڈالی اور پھر اپنے وعدہ کے مطابق رات کے نو بجے جب ملائیچیا میں بارہ بج چکے تھے اس نے دوبارہ کال کی تین بار فون کسی نے ریسپونڈ نہ کیا جو بھی بارہو سری طرف سے فون اٹھالیا گیا۔

”ہیلو۔“ مینڈ میں ڈوبی ہوئی کوا زرفیدہ کی تھی۔ شفا شرمندہ سی ہو گئی اپنی پریشانی میں اس نے نام کے اس فرق پر حیان ہی نہ دیا تھا جو بھی تھا اب فون بند کرنا نری حماقت تھی۔

”اسلام علیکم مجھے نیو سے بات کرنی ہے۔“ زفیدہ اسے اس کی ویسے بھی اتنی بات چیت نہ تھی۔

”ہاں۔“ امان۔“ زفیدہ نے بنا جواب دیے فون سائیڈ پر رکھ کر اپنی ماں کو پکارا اس کی تیز آواز زیریں سے باہر بھی سنائی دے رہی تھی جلد ہی فون ایک بار پھر اٹھالیا گیا۔

”اسلام علیکم آئی میں شفا بات کر رہی ہوں۔“

”وعلیکم السلام بیٹا خیریت تم نے اتنی رات میں فون کیا۔“

”جی دراصل نیو کا فون مسلسل آف جا رہا تھا۔“ اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا بات کرے۔

”ہاں وہ اسپتال میں ہے۔“

”اسپتال میں۔“ اسے اچھا سا ہوا جہاں تک اسے یاد پڑتا تھا ابھی تو نیو کی ڈیوری میں تقریباً دو ماہ کا وقت درکار تھا پھر وہ اسپتال میں کیوں تھی وہ گھبرا سی گئی۔

”انہی سب ٹھیک تو ہے نا؟“

”ہاں ہاں اللہ کا شکر ہے سب ٹھیک ہے۔ دراصل سکندر کو اللہ تعالیٰ نے ایک اور بیٹے سے نوازا ہے۔“

”وہ آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔“ اسے عجیب تو لگا فاطمہ نے نیو کے بجائے سکندر کا نام لیا۔ لیکن وہ بولی کچھ نہیں۔

”خیر مبارک اور تمہارے وہاں سب خیریت ہے۔“

”جی ہاں بس بابا کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے اسی سلسلے میں نیو سے رابطہ کر رہے تھے جو نہ ہو سکا سو آپ کو زحمت دی اب پلیر ہو سکے تو میری اس سے بات ضرور کروادیتے گا میں منتظر رہوں گی۔“

”آجما اب کیسے ہیں احتشام بھائی۔“

”شکر الحمد للہ اب تو ٹھیک ہیں بہر حال آپ سکندر بھائی اور نیو کو بھی ہماری طرف سے مبارک دیتے گا اور ہو سکے تو اس کی ہم سے بات کروادیں کیونکہ گھر میں سب ہی بہت پریشان ہیں۔“

”میں سکندر سے کہہ دوں گی وہ بات کروادے گا تم گھر پر سب کو میرا سلام دینا۔“ اس کے ساتھ ہی فاطمہ نے فون بند کر دیا۔

”عجیب سے لوگ ہیں اگر آئی فون بند کرنے سے پہلے اللہ حافظ کہہ دیتیں تو ان کا کیا جاتا۔“ شفا نے کلس کر سوچا تو ٹوٹی دیر تو وہ ریسپونڈ ہاتھ میں لیے بیٹھی رہی پھر فون رکھ کر دوبارہ اپنی ماما کا نمبر ملایا تاکہ انہیں نیو اور اس کے بیٹے کے بارے میں اطلاع دے سکے۔



وہ دائیں طرف کروٹ لے کر کاٹ میں لیٹے اس چھوٹے سے فرشتے کو دیکھنے میں اتنی محو تھی کہ کب دروازہ کھول کر سکندر اور حماد اندر آئے اسے پتا ہی نہ چلا۔

”واؤ یہ تو بہت کیوٹ ہے۔“ حماد کی آواز اس کے کان سے گزرائی وہ یکدم چونک اٹھی۔ سکندر بھی کاٹ کے

تھا۔

”شکر ہے اس نے نہیں دیکھا ورنہ جانے میرا کیا حشر کرتا۔“ اپنے دل کی خلش دور کرنے کے لیے اس نے کٹ میں پڑے ابوذر کو گویا اسے اپنے سینے سے پیچھے ہونے سے احساس ہوا کہ اس کی زندگی کا حاصل تو اب صرف اس کے بچے ہیں۔

جانے وہ کون تھی جو پچھلے آدھے گھنٹہ سے مسلسل سکندر کے پاس کھڑی تھی بیوی نے اسے ”ج سے قبل پہلے کبھی نہ دیکھا تھا فاصلہ ہونے کے باوجود وقفہ وقفہ سے اس کی کھنکھاتی ہنسی کی آواز نیو کے کانوں سے ٹکر رہی تھی آج حماد کی سالگرہ تھی جس کا اہتمام ایک قریبی ہوٹل میں کیا گیا تھا تمام مہمان آچکے تھے جن سے بیوی بخوبی واقف تھی واحد یہ لڑکی تھی جس نے آج پہلی بار دیکھا تھا اسے حیرت تھی کہ سکندر حبیب شاہک مزاج مرد بھی کسی لڑکی کے ساتھ کھڑا بلند و بانگ قہقہہ لگا سکتا ہے اسی تجسس نے اسے مجبور کیا کہ وہ روزینہ سے اس لڑکی کے بارے میں دریافت کرے جو اس کے برابر ہی صوفہ پر براجمان کسی رشتہ دار خاتون سے باتوں میں مگن تھی جب اسے بیوی نے ٹھوکا دیتے ہوئے اپنی طرف متوجہ کیا۔

”بھابھی یہ لڑکی کون ہے؟“ اس نے کچھ فاصلے پر کھڑی لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے روزینہ سے دریافت کیا۔

”کون سی لڑکی؟“ روزینہ نے بدھیا نی سے یہاں وہاں دیکھا۔

”فودہ سامنے دیکھیں بلیک میسکی میں جو سکندر کے قریب کھڑی ہے۔“

”کہاں۔۔۔ اوہ اچھا وہاں۔۔۔“ بیوی کے اشارے کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے سر ہلایا۔

”وہ سکندر کے چھوٹے چچا کی بیٹی نور بیڑا ہے۔“

”مگر میں نے تو اسے پہلے بھی نہیں دیکھا؟“ بیوی نے حیرت سے کہا۔

”حالا نکہ میں توئی باران کے کھڑکی ہوں۔“

”نہیں دیکھا ہو گا کیونکہ وہ اس سے قبل یہاں تھی نہیں۔“ روزینہ نے اپنی توجہ مکمل طور پر بیوی کی طرف مرکوز کر دی۔

”صل میں شاید تمہیں کسی اور بات کا علم بھی نہیں ہے۔“

”کسی اور بات سے کیا مراد ہے آپ کی؟“ بیوی نے اپنے قریب ہی کٹ میں لیٹے ہوئے ابوذر کے منہ سے فیڈر ہٹا کر سائڈ پر رکھتے ہوئے سوال کیا۔

”یہ لڑکی سکندر کی صرف کزن ہی نہیں ہے بلکہ اس کی سابقہ منگیترا اور محبوبہ ہونے کا اعزاز بھی رکھتی ہے۔“ وہ آہستہ آواز میں بولی۔

”واٹ۔۔۔“ سکندر کی محبوبہ ”کیا یہ سچ ہے؟“ درحقیقت خبر خاصی حیران کن تھی۔

”ہاں بھلا میں تم سے جھوٹ کیوں بولوں گی۔“

”نہیں نہیں بھابھی میرا یہ مطلب نہیں ہے مجھے تو حیرت صرف اس بات پر ہے کہ جب سکندر کی کزن ناصر صوفہ اس کی محبوبہ بلکہ منگیترا بھی تھی تو پھر میں ان دونوں کے درمیان میں کہاں سے آئی۔“ اس نے اپنے قریب کھڑے حماد کو دیکھا جو ابوذر کو باریا کر رہا تھا۔ حماد ماں کے قریب نہ پھٹکا تھا مگر بھائی کی محبت اسے ٹکے نہ دیتی تھی۔ ذرا ذرا درمیان میں وہ اسے چھوئے ضرور آتا تھا۔ اس کا ابوذر سے یہ اظہار محبت بیوی کو مت اچھا لگتا ابھی بھی وہ سب کچھ بھول کر ایک پل کے لیے حماد اور ابوذر کی جانب متوجہ ہو گئی اسی سے اس کی نگاہ ایدہا پر پڑی جو سکندر اور نور بیڑا

کے پاس جا کھڑی ہوئی تھی۔

”بھابھی کیا آپ کو ان دو عورتوں کے درمیان میری جگہ نظر آ رہی ہے؟“ اس کی اس بات کا جواب روزینہ کے پاس نہ تھا اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

”آپ مجھے بتائیں گی کہ سکندر نے نور بیڑا سے شادی کیوں نہ کی؟“

”ہاں تم پہلے تم یہ وعدہ کرو کہ کسی سے یہ سب باتیں نہ کرو گی جو میں تمہیں بتاؤں گی۔“

”آپ اچھی طرح جانتی ہیں کہ میری کسی سے اتنی دوستی نہیں ہے جس سے میں یہ سب کچھ شیئر کروں۔“

”صل میں بیوی شادی سے صرف چند دن قبل یہ لڑکی اپنے بینک میں جاب کرنے والے کسی سکھ نوجوان کے ساتھ بھاگ گئی تھی۔“ روزینہ کی آواز بالکل مدھم ہو گئی۔

”اوہ۔۔۔“ اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ مزید کیا کہے۔

”اور پھر اس کے بعد نہ جانے اس نے رامیش سے نکاح کیا یا نہیں مجھے تو یہ بھی علم نہیں ہے کہ وہ مسلمان ہوا بھی تھا یا نہیں، بہر حال جو بھی ہے کچھ عرصہ قبل جب تھپاکستان گئی تھیں اپنے بھائی کی شادی کے سلسلے میں ان ہی دنوں یہ محترمہ روٹی دھوئی واپس آئیں اور ماں باپ نے اسی عزت سے دوبارہ گلے لگا لیا وہ تو شکر ہے اپنے ساتھ کوئی بچہ نہیں لے آئی ورنہ جانے اس کا کیا مذہب ہوتا جس کی ماں مسلمان اور باپ سکھ تھا اللہ معاف کرے۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ نور بیڑا کی محبت نے سکندر کو کبھی میرا نہ ہونے دیا۔“

”غلط سمجھ رہی ہو تم سکندر نے اس کا غم ایک ہفتہ سے زیادہ نہ منایا تھا اس واقعہ کے صرف ایک ماہ بعد ہی اس کا الفیو کسی ہندو لڑکی سے شروع ہو گیا تھا یہ وہ دن تھے جب فاطمہ بر ملا یہ کہتی تھیں کہ سکندر ایک ہندو کو اسلام میں داخل کرنے والا ہے وہ لڑکی رفیداک کی دوست بھی تھی۔“

”اوہ پھر۔۔۔“ اس کے رکتے ہی بیوی جلدی سے بولی۔

”پھر کیا وہ بھی سکندر کو دھوکہ دے گئی اور یہاں سے جاب ختم کر کے انڈیا واپس چلی گئی لیکن جاتے جاتے اس نے سکندر پر نہایت ہی رکیک قسم کے الزامات لگائے جانتی ہو اس نے کیا کہا؟“ بات کرتے کرتے اس نے بیوی کے خوبصورت چہرے پر ایک نظر ڈالی پتک کا لہرائی سوٹ کی جھلک اس کے چہرے پر بھی پڑ رہی تھی جس سے بیوی کی رنگت خاصی کھلی کھلی سی محسوس ہو رہی تھی۔

”نہیں۔۔۔“ بیوی نے نفی میں سر ہلایا۔

”جلدی سے بتا دیں میرا خیال ہے کیا ہے۔“ اسے خطرہ تھا کہ اس روزینہ کی بات درمیان میں ہی نہ رہ جائے جبکہ آج وہ سب کچھ جان لیتا چاہتی تھی۔ سکندر کی مختلف پرتوں میں چھپی شخصیت حیرت و حیرت اس کے سامنے عیاں ہو رہی تھی اس کی شخصیت کا ہر تار رنگ اسے چونکا رہا تھا وہ حیرت کے ساتھ ساتھ شاک بھی تھی اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا جانے اب روزینہ مزید کیا کہنے والی تھی کون سا نیا انکشاف اس کی نوک زبان پر تھا۔ مارے تجسس اس کا سارا وجود ہمہ تن گوش تھا۔

”سادھنا جانے سے پہلے مجھ سے اور رفیداک سے ملی تھی اس کا کہنا تھا کہ سکندر ہم جنس پرستی کا شکار ہے۔“

”کیا۔۔۔“ اس کا منہ شدید حیرت کے عالم میں کھلا کھلا رہ گیا۔

”ہاں بیوی جانے یہ سچ تھا یا جھوٹ وہ کہتی تھی کہ اس نے یہ سب کچھ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اس کا کہنا تھا سکندر کی اس خلیا حرکت نے اسے مجبور کیا ہے کہ وہ اپنے وطن واپس لوٹ کر اپنے ہی ہم مذہب سے شادی کر لے کیونکہ اسے یہاں اگر اپنے ہم مذہبوں اور سکندر میں کوئی نمایاں فرق نظر نہ آ رہا تھا۔“ بیوی کے کان سانس سانس کر رہے تھے اس نے دور کھڑے سکندر پر ایک نگاہ ڈالی بظاہر صاف ستھری لیکن درحقیقت گھٹاؤنی

شخصیت۔

”میں زندگی میں ہمیشہ کوشش کرتا بلندی کی جانب دیکھوں۔“ اس کے کانوں میں اپنے باپ کا یہ جملہ گونجا اس کا دل دھوا۔

”کاش پاپا یہاں ہوتے تو آپ کو پتا چلتا کہ میں کتنی بلندی پر ہوں جہاں سے نیچے آنا صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔“ آپ کے اس شوق بلندی نے مجھے ایک ہماڑ پر لا کھڑا کیا ہے۔ پاپا جہاں سے گر کر میرا وجود ریزہ ریزہ ہو سکتا ہے اور کچھ بھی نہیں جانتے کیوں ماں باپ اپنی اولاد کو ایسی بلندیوں کی طرف دھکیلے ہیں جہاں سے واپسی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔

”بھابھی ان سب باتوں کا انکل صاحب کو علم تھا؟“ اس نے ایک نظر درویشے انکل صاحب اور عائشہ آنٹی پر ڈالی۔

”تمہارا کیا خیال ہے؟“ روزینہ نے پلٹ کر اس سے سوال کیا۔

”میرا تو یہ خیال ہے کہ وہ علم تھوڑا ہی ہے میرے ساتھ یہ زیادتی نہ کرتے۔“ وہ پراعتقاد لہجہ میں بولی۔

”تو پھر یہ سن لو کہ تمہارا خیال سو فیصد غلط ہے۔“ روزینہ اٹھ کھڑی ہوئی کیک کاٹنے کے لئے ٹیبل پر رکھا جا چکا تھا۔

”اٹھ جاؤ تم بھی کیونکہ رفید اسلسل ہمیں ہی دیکھ رہی ہے۔“ نیبو خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ایک اور دھوکہ ایک اور مفاد پرستی یہ سب لوگوں کو مشہور ہی کیوں نظر آئی تھی۔“ اس کے دل میں ایک شکوہ سا ابھرا۔

”اصل میں یہاں کوئی بھی سکندر کو رشتہ دینے پر آمادہ نہ تھا اور سچی بات تو یہ ہے کہ اسے بھی شادی کا کوئی خاص شوق نہ تھا وہ تو رفید اور اس کی ماں چاہتی تھیں کہ اسے ایک غیر اخلاقی اور گستاخانے فعل سے باز رکھا جائے جس کا بہتر حل اس کی شادی میں پوشیدہ تھا اس سلسلے میں ماں نے اپنے بھائی سے رابطہ کیا جنہوں نے اپنی بیوی بھرنے کے دکھ کو محسوس کر کے تمہارے رشتہ کے لیے کوشش کی اور خوش قسمتی سے وہ کامیاب بھی رہے اور سب کچھ تو چھوڑو مجھے صرف اتنا بتاؤ تمہارے ماں باپ کے تھے؟“ اس نے اپنی بات کے اختتام پر ہی نیبو سے سوال کیا۔ ایسا سوال جس کا جواب جانتی تھی لیکن اس سوال میں چھاپٹو نیبو کو زمین میں گاڑ گیا۔

”ہمیں تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کس طرح تمہارے گھر والوں نے بغیر کسی انکوائری اور چھان بین کے سکندر کو تمہارا رشتہ دے دیا؟“ ایک اور سوال جس کا جواب وہ بتائی نہ چاہتی تھی اسی لیے خاموشی سے آگے بڑھ گئی انکل صاحب کے پاس سے بنا سلام دے لے کر ٹیبل کی جانب آگئی جہاں کیک کاٹنے کے لیے اس کا انتظار ہو رہا تھا وہ پہلا دن تھا جب نور بلیز اس کی زندگی میں آئی لیکن پھر آنے والے دن میں اس کی حیثیت نیبو کی زندگی میں ایک لازمی کردار کی سی ہو گئی ایک ایسا کردار جو اس کی روزمرہ زندگی کا لازمی حصہ بن گیا۔

ابوزر جاگ گیا تھا اس کے رونے کی آواز سننے ہی نیبو بے چین ہوا اٹھی جلدی جلدی شاور بند کیا۔ ہاتھ گاڑیں لیٹا جب تک ہاتھ دھو کر روانہ کھول کر وہ کمرے میں آئی ابوزر کی آواز خاموش ہو گئی شاید حماد آ گیا تھا۔ ابوزر اسے پہچانتا تھا اکثر وہ بیشتر اسے سامنے دیکھ کر وہ روتا بھی بھول جاتا تھا اب بھی یقیناً ”ایسا ہی ہوا تھا لیکن کمرے میں موجود ابوزر کی کٹ خالی تھی غالباً“ فاطمہ اسے باہر لے گئی تھیں کیونکہ رفید اگر نہ تھی اور حماد کسی ایسی حرکت کا مرتکب نہیں ہو سکتا تھا یہ سوچ کر اس نے کپڑے بدل لیے اور اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر گائیڈ سے ہوتی ہوئی لاؤنج میں آگئی سامنے رکھے صوفے پر نور بلیز ٹانگ پر ٹانگ دھرے اپنے موبائل پر بڑی تھی اس کے قریب ہی ابوزر خاموشی سے لیٹا ہوا تھا قریب رکھی بے بسی چیز پر بیٹھا حماد مزے سے پراکھا ہوا تھا فاطمہ بھی اپنے سامنے پرا

اور کوک کائن لیے بیٹھی تھیں۔ نور بلیز کی وہاں موجودگی قطعی غیر متوقع تھی اسی لیے نیبو تھوڑی سی ندوس ہو گئی۔

”السلام علیکم۔“ اس نے بنا کسی کی جانب دیکھے سلام کیا جس کا جواب دینے کی زحمت کسی نے نہ کی۔ نور بلیز مسلسل موبائل پر بڑی تھی اور فاطمہ کھانے میں وہ تھوڑی سی شرمندہ ہو گئی۔

”لا میں اسے مجھے دے دیں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے نور بلیز کو مخاطب کرنا پڑا۔ نیبو کے پکارنے پر اس نے نگاہ اٹھا کر اک ذرا کی ذرا اس کی جانب دیکھا اور خاموشی سے ابوزر کو اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیا جسے نیبو نے فوراً سے پشتر تمام کیا۔

”جب نمازے جایا کرو تو اسے مجھے دے جایا کرو ابھی نور نہ دیکھتی تو یہ کٹ سے گر جاتا۔“ کھانے کا شغل جاری رکھتے ہوئے اس کی ساس نے حتمایا۔

”جی اچھا۔“ مختصر سا جواب دے کر وہ کچن میں آگئی تاکہ ابوزر کے لیے فیڈر تیار کر سکے سامنے سلب پر موجود فاسٹ فوڈ کے ڈبے اس امر کی نشاندہی کر رہے تھے کہ یہ سب نور بلیز لے کر آئی ہے کیونکہ اس کے علاوہ اس وقت گھر پر کوئی اور موجود نہ تھا۔ نیبو نے بنا کسی چیز کو ہاتھ لگائے خاموشی سے فیڈر تیار کیا کچن کی کھڑکی پر بڑنے والی بوندوں نے اسے احساس دلایا کہ باہر بارش ہو رہی ہے کھڑکی کے مزید قریب ہو گئی تاکہ باہر کا منظر دیکھ سکے۔

ہلکی ہلکی بوند باندی میں خوبصورت ہرے بھرے درخت اور بھی حسین و دل فریب لگ رہے تھے بے خیالی میں ہی اس کی نگاہ گھر کے گیٹ پر پڑی رفید اپنی سائیکل لے کر اندر آ رہی تھی وہ ہمیشہ سائیکل پر ہی آتس جاتی تھی نیبو نے کھڑکی پر ایک نظر ڈالی ابھی رفید کی واپسی میں پورا اگھنٹہ باقی تھا غالباً اس کی جلدی واپسی کا سبب بھی نور بلیز اسی تھی۔ نیبو تیزی سے کچن سے نکل کر اپنے کمرے میں آگئی اس وقت اس کا موڈ رفید کا سامنا کرنے کا بالکل بھی نہ تھا ابوزر فیڈر پیتے ہی سو گیا اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی پر دروازہ ہٹا کر باہر تھانکا بارش ابھی بھی جاری تھی سامنے ہی سکندر کی گاڑی کی موجودگی اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ بھی گھر آچکا ہے نیبو کا دل چاہا وہ سڑک پر دور تک اس بارش میں بھیکتی ہوئی جائے اس خیال کے آتے ہی اس نے پلٹ کر ایک نظر ابوزر پر ڈالی اور ایک ٹھنڈی آہ بھری عشاء کے بعد وہ ابوزر کو لے کر باہر نہ جاسکتی تھی یہ اس کی ساس کا حکم تھا جس پر عمل کرنا اس کی مجبوری تھی اس نے اپنے کمرے کے پیچھے کی جانب مٹھنے والے دروازہ کا لاک کھولا اور پہلی ہی سیڑھی پر بیٹھ گئی جانے لگتی دیر وہ اس طرح بیٹھی رہی جب اس کی توجہ کچھ لمبی چلی آوازوں نے اپنی جانب مبذول کروائی نور بلیز اگر جاری تھی رفید اسے چھوڑنے پر آمادہ تھی حماد بھی ان کے ساتھ تھا کچھ ہی لمبے میں سکندر کی گاڑی کے اشارت ہونے کی آواز نے واضح کیا کہ وہ نور بلیز کو اس کے گھر سید گا پور چھوڑے گیا ہے۔

اس کا بے ساختہ دل چاہا وہ بھی ساتھ جائے کیونکہ وہاں ریجہ رہتی تھی پچھلے کچھ دنوں سے اس کا دل ریجہ سے ملنے کو چاہ رہا تھا نہ چاہتے ہوئے بھی اپنی اس خواہش کو دل میں دبائے وہ اندھے میں سیڑھی پر بیٹھی رہی گاڑی کی دور تک معدوم ہوئی لاٹشیں دیکھ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی بیٹھ میں اٹھتی نہیں نے اسے احساس دلایا وہ بھوکے ہے اسی لیے خاموشی سے کچن میں رکھے ٹیبل پر آگئی جہاں دوپہر کا سالن اور چاول جوں کے توں موجود تھے اس نے پلٹ میں تھوڑا سا کھانا نکالا اور کمرے میں آگئی سکندر کی واپسی کب ہوئی اسے علم ہی نہ ہو سکا ویسے بھی وہ آج کل زیادہ تر دوسرے کمرے میں ہی سوتا تھا وہ ابوزر تھا بھول سکندر کے رات میں وقت و نقد سے ابوزر کے رونے کی آواز اسے ڈسٹرب کرتی تھی جس کی بنا پر وہ صبح اپنا کام صبح طور پر انجام نہ دے پاتا تھا جو بھی تھا سکندر کی اس روئین سے اب نیبو کو کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ وہ شمالی کی عادی ہو چکی تھی اس کی زندگی میں اب اگر کوئی احساس باقی تھا تو وہ یقیناً ”ابوزر تھا۔ اس کے علاوہ اسے اب کسی کی بھی کوئی پروا نہ رہی تھی۔ یہی وجہ تھی وہ بنا کسی احساس کے جلد ہی سو گئی۔“

جانے فون کے دوسری جانب کون تھا۔ وہ پچھلے چند منٹ سے سکندر کو اسی طرح فون پر بات کرتا دیکھ رہی تھی۔ اس کی آواز اس قدر دھیمی تھی کہ باوجود کوشش کے وہ سن نہ پا رہی تھی کہ فون کس کا ہے۔ فون پر اس کی پسندیدہ ملائی سیریل آر بی تھی جسے پوری توجہ سے دیکھتے ہوئے بھی اس کا دھیان بار بار ہٹک کر سکندر کی جانب جا رہا تھا۔ فون بند کرتے ہی اس نے اپنے قریب بیٹھی رفیدا سے کچھ کہا۔ جس نے فوراً "نیو پورنگا ڈالی۔"

"لگتا ہے بھابھی کے گھر مہمان داری کا رواج نہ تھا۔" ایک دم رفیدا کے با آواز بلند مخاطب کیے جانے پر وہ چونک اٹھی۔ رفیدا کی بات کا مقصد کیا تھا؟ سمجھ ہی نہ پائی اور نا سمجھی والے انداز سے اس کی جانب ٹکا۔

"وہاں تو شاید کسی بھی چیز کا رواج نہ تھا۔ مہمان داری تو بہت دور کی بات ہے۔" یہ طنزیہ فقرہ سکندر کی جانب سے آیا تھا۔ وہ اب بھی نہ سمجھ پائی تھی کہ کیا ہوا ہے؟

"تم مجھ سے کچھ کہہ رہی ہو؟" سکندر کی بات کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے اس نے بڑے تحمل سے رفیدا کو مخاطب کیا۔

"ظاہر ہے تمہارے علاوہ اور کون ہے یہاں کم ذات؟ جس سے کچھ کہا جائے۔" سکندر تنگ کر لولا، جبکہ رفیدا خاموشی سے ٹی وی اسکرین پر نظریں جمائے ٹانگیں ہلا رہی تھی۔ بالکل ایسے جیسے بات کو ہوا دینے کے علاوہ اس کا دوسرا مقصد نہ تھا۔ اس کی تو سمجھ میں ہی نہ آ رہا تھا کہ یکدم سکندر کو ہوا کیا ہے وہ ہونق بی بی اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

"جانتی ہو فون کس کا آیا تھا؟"

"نور بلیز کا۔" کچھ دیر نیو کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے اس نے خود ہی جواب بھی دے دیا۔

"کہہ رہی تھی تمہاری بیوی بہت جاہل عورت ہے اسے گھر میں آئے ہوئے کسی بھی مہمان سے سلام دعا لینے کی بھی تمیز نہیں ہے۔" سکندر کی آواز یکدم تیز ہو گئی۔ کمرے سے ایدھا اور حماد بھی باہر نکل آئے۔ جن پر نظر پڑتے ہی وہ جگر شرمندہ ہوئی۔ اسے سمجھ نہ آیا نور بلیز کی اس بے جا شکایت کا مقصد کیا ہے؟

"میں نے اسے سلام کیا تھا جس کا جواب اس نے خود ہی نہ دیا تھا۔ میری بات کا یقین نہ ہو تو ماں سے پوچھ لیں۔" اس نے شرمندہ سی آواز میں فاطمہ کی گواہی طلب کی جو اس سارے قصے سے لائق مزے سے ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ یہ تو اس گھر کا شروع سے رواج تھا۔ دونوں ماں بیٹیاں کوئی بھی بات شروع کرنے کے بعد بالکل اس طرح ظاہر کرتیں جیسے میاں بیوی کے کسی بھی مسئلے سے ان کا کوئی تعلق نہ ہو۔ ابھی ابھی فاطمہ کا انداز بھی ظاہر کر رہا تھا۔

"تمہارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں۔" وہ یکدم دھاڑا "نیو مخالف سی ہو گئی۔"

"میرا یہ مقصد نہ تھا۔"

"تو کیا نور بلیز جھوٹ بول رہی ہے؟ یہ مقصد تھا تمہارا۔" سکندر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے ہاتھ میں پکڑا موبائل دیوار پر دے مارا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ سکندر کے اس قدر غصہ کی وجہ کیا ہے؟ اس نے ایسا کیا کیا تھا جو سکندر اتنا انتہائی ری ایکٹ کر رہا تھا۔

"ماں یہ تمہارا لایا ہوا عذاب ہے جو میں بھگت رہا ہوں۔" قریب رکھی کرسی پر اس نے زور سے لات رسید کی۔ نیو ڈر کاٹھ کھڑی ہوئی۔ سکندر کی تیز آواز سننے ہی ابو ذر بھی ڈر گیا اور با آواز بلند روئے لگا، جسے فوراً "آگے بڑھ کر ایدھا لے گود میں لے لیا۔ یہ دیکھتے ہی نیو کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"چھوڑو اسے ہاتھ مت لگانا۔" سکندر کو بھول کر وہ غصہ کی کیفیت میں ایدھا کی جانب بڑھی اور اس کے ہاتھ

سے ابو ذر کو کھینچ لیا اور یہی شاید اس کی ایک بڑی غلطی تھی جس کا اندازہ اسے اگلے ہی پل ہو گیا۔ سکندر غصہ کی کیفیت میں تیزی سے آگے بڑھا اور اسے گلے سے دو بچ لیا۔

"ابھی میں نے تم سے کہا تھا تمہیں بالکل بھی تمیز نہیں ہے اور تم نے ایک ہی سیکنڈ میں میری بات کو بچ کر دکھایا۔"

"چھوڑو مجھے۔" اس کے ایک ہاتھ میں ابو ذر لٹکا رہا تھا۔ دوسرے ہاتھ سے بمشکل وہ خود کو چھڑواتی ہوئی بولی۔ اس کی آنکھوں کے آگے آنا اندھیرا اسے احساس دلا رہا تھا۔ اگر سکندر نے مزید اسے کچھ دیر اسی طرح دوپچے رکھا تھا۔ شاید وہ اپنے پاؤں پر مزید کھڑی نہ رہ سکے گی۔ "زندگی کتنی خوب صورت ہوتی ہے" اس احساس نے اسے مسلسل مزاحمت پر مجبور کر دیا۔

"چھوڑو اسے یہ تو مرنے کی اور تمہاری ساری جوانی جیل کی اندھیری کوٹھڑی میں گزر جائے گی۔" بھائی سے ہمدردی جتاتے ہوئے رفیدا نے اسے چھڑوانے کی کوشش کی، سکندر نے اسے دھکا دے کر صوفہ پر دے پھینکا۔

"یاد رکھنا جب تک میرے گھر میں ہو میرے گھر آئے ہوئے کسی بھی فرد کو تم سے شکایت نہ ہو ورنہ جان سے مار دوں گا۔" غصہ سے دندنا تا ہوا وہ لاؤنچ کا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ ایدھا حماد کو لے کر پہلے ہی وہاں سے جا چکی تھی۔

"آئے ہائے جلدی جاؤ رفیدا بھائی کو روکو، کہیں اس غصہ میں کچھ اور نہ کر لے، میرا یہ نصیب بچہ۔" فاطمہ نے دہائی دی، "رفیدا فوراً" سے پیچھے ہٹ کر سکندر کے پیچھے بھاگی نیو بمشکل اٹھی، روٹا ہوا ابو ذر ابھی بھی اس کی گود میں تھا۔ بے بسی کی شدت میں اس کا دل چاہا وہ دھاڑیں مار مار کر روئے اپنی اس خواہش کو بمشکل ضبط کرتی وہ کمرے تک آئی اور پھر نیچے کارپٹ پر بیٹھتی ہی پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ آج اسے احساس ہو گیا تھا کہ اس گھر میں اس کا وجود ایک فاضل برزے سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ سکندر اور اس کے گھروالوں کو اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی تک اس گھر میں اس کا قیام صرف اور صرف نیو کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔ لیکن آج یہ تمام کوششیں لا حاصل ہو گئیں۔

"آریا پار اب مجھے جلدی اپنی زندگی کا کوئی فیصلہ کرنا ہو گا۔" اس ساری رات روتی بلکتی نیو نے اپنے دل کو یہ سمجھاتے گزار دی کہ اب اسے جلد ہی کوئی فیصلہ کرنا ہو گا اور اس سلسلے میں وہ پہلے رعبہ کو اعتماد میں لینا چاہتی تھی، لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کے لیے اب ناگزیر ہو چکا تھا کہ وہ اپنے گھروالوں کو اپنے تمام حالات بتائے تاکہ اس کی روشنی میں کوئی نیا قدم اٹھایا جاسکے۔

اس سے قبل کہ وہ کسی کو کچھ بتاتی یک دم ہی حالات کچھ ایسے تبدیل ہوئے کہ وہ چاہتے ہوئے بھی کسی سے کچھ نہ کہہ سکی۔

باہر سے آتے تیز شوری کی آواز سے نیو کی آنکھ کھل گئی۔

"یہ صبح کون آیا؟" نیو نے بمشکل اپنی آنکھیں کھولتے ہوئے گھڑی پر ایک نظر ڈالی، ابھی صرف آٹھ بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔ سترے اٹھنے کی کوشش کے ساتھ ہی سر میں اٹھتی تھیں نے اسے گزرا ہوا کل یا دو دیا۔ جس کے ساتھ ہی گزرے ہوئے کل کے واقعے نے اس کی اذیت میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔ ابو ذر سو رہا تھا۔ وہ بمشکل اٹھی۔ منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ وہ جاننا چاہتی تھی صبح صبح ہونے والے اس شور کا پس منظر کیا ہے۔

"میں نیو کو آج اور ابھی لے کر جاؤں گا دیکھا ہوں مجھے کون روکتا ہے۔" یقیناً یہ تو انکل صلح کی تھی۔

”انہوں نے اپنی بیوہ بسن کی پریشانی دور کرنے کے لیے تمہارا اور سکندر کا رشتہ طے کروایا تھا۔“ کان کے قریب ہی روزینہ کی سرگوشی ابھری بیوہ کا دل یک دم ہی نفرت سے بھر گیا وہ تیزی سے آگے بڑھی لاؤنج کے دروازے پر پہنچنے ہی اس کے قدم ساکت ہو گئے سامنے ہی سارا گھر موجود تھا۔ عمر سیکنہ، سکندر اور رفیدہ کے علاوہ دیوار سے ٹیک لگائے ایدھا بھی کھڑی تھی۔ فاطمہ سامنے رکھی اونچی سی کرسی پر ارجمان تھیں عائشہ اور محمد صالح لاؤنج کے وسط میں کھڑے تھے لگتا تھا کسی نے انہیں بیٹھنے کے لیے بھی نہیں کہا بیوہ حیران تھی اس نے انکل صالح سے کوئی رابطہ نہ کیا تھا پھر وہ کیوں آئے تھے؟ کل والے واقعہ کی اطلاع انہیں کس نے دی؟ بے شمار سوالات ایک ہی پل میں اس کے دل غم میں آئے جن کا جواب اسے تھوڑی ہی دیر میں مل گیا۔

”آپ اسے بڑے شوق سے لے جاسکتے ہیں کیونکہ میں نے آپ کو بلوایا بھی اسی لیے تھا۔“ اس پر نظر پڑتے ہی سکندر چلا یا۔

”اے تو ان تمام لوگوں کو سکندر نے خود بلوایا ہے۔“ تذلیل کے ایک اور احساس نے اس کی آنکھوں میں مریضیں سی بھری دیں۔

”ہاں ہاں میں لے جائیں اسے اپنے ساتھ اب ہم سکندر کی شادی اس کی پسند سے کریں گے۔“ رفیدہ نے بڑے ٹھنڈے انداز میں اس پر وار کیا سیکنہ اور عمر خاموشی سے بیٹھے تھے حیرت کی بات یہ تھی کہ فاطمہ کا رد عمل بالکل ایسا تھا جیسے اس سارے مسئلے سے اس کا کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

”ٹھیک ہے یہ میرے ساتھ رہے گی ابھی تو فی الحال میں اسے اور ابوذر کو لے کر جا رہا ہوں لیکن یاد رکھنا جلد ہی حماد بھی ہمارے پاس ہو گا چلو بیوہ چندہ منٹ میں اپنا سامان لے کر باہر گاڑی میں آ جاؤ میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“ سکندر کو جواب دیتے ہی انہوں نے بیوہ کو بھی ہدایت دی اور خود تیزی سے باہر نکل گئے ان کی تھلید میں آئی عائشہ بھی باہر نکل گئیں اب یہاں مزید رکنا بیوہ کے لیے مشکل نہیں ناممکن بھی تھا اس بات کا فیصلہ رات ہی کر چکی تھی لہذا خاموشی سے اپنے کمرے میں آ گئی اس کے پاس کوئی دوسری جوان سن تھی اس وقت یہاں سے نکلنے کا واحد راستہ انکل صالح کے گھر تک کا تھا اپنی آگے کی زندگی کا فیصلہ یہاں سے جا کر ہی کر سکتی تھی خاموشی سے اپنا اور ابوذر کا سامان پیک کر کے وہ باہر آ گئی کسی نے بھی اسے روکنے کی کوشش نہ کی اس گھر میں اس کی کیا حیثیت تھی؟ اب مزید یہ جاننے کی خواہش اس کے دل میں نہ تھی تقریباً ”اُدھ ٹھنڈہ میں وہ انکل کے گھر پہنچ چکی تھی راستہ میں ہی انہوں نے ابوذر کے دودھ کے ٹن، ذلیہ اور دیگر سامان پیک کر لیا تھا وہ بالکل خاموش تھی وہ انکل صالح کے ساتھ ان کے گھر اس حالت میں آئے گی یہ تو اس نے سوچا بھی نہ تھا اسے تو امید ہی نہ تھی کہ سکندر اور اس کے گھروالے اسے اس طرح کھڑے کھڑے گھر سے نکال دیں گے وہ ابھی تک شاک کی حالت میں تھی شام ہوتے ہی ریحہ اور عبد الوہاب بھی وہاں پہنچ گئے اس کی اجڑی ہوئی حالت دیکھتے ہی ریحہ رونے لگی جبکہ اس کے آنسو خشک ہو چکے تھے اسے محسوس ہو رہا تھا اب وہ تھک گئی ہے اب جو بھی ہو وہ ہر حال میں پاکستان جانا چاہتی تھی چاہے دنیا کچھ بھی کہے اس کا دل یہاں سے اچاٹ ہو چکا تھا اس کے دل سے دنیا کی باتوں کا خوف اٹھن چھو ہو گیا تھا۔

”تم نے اپنے گھر اطلاع دی ہے۔“

ریحہ نے اسے کندھے سے تھام کر ہلایا۔

”تمہیں پہلے میں ذرا مولانا عبد الرزاق سے مشورہ کر لوں پھر اس کے گھر فون کریں گے۔“ مولانا عبد الرزاق کا نام بیوہ پہلے بھی سن چکی تھی یہاں اکثر کونسلنگ کے سلسلے میں ان سے ہی رابطہ کیا جاتا تھا۔

”پھر بات ہوئی آپ کی مولانا صاحب سے۔“ عبد الوہاب نے دریافت کیا۔

”ہاں وہ دن تک وہ مصروف ہیں پھر سکندر کی طرف جائیں گے اس سے بات کر کے بیوہ سے ملاقات کریں گے اس کے بعد کونسلنگ کروائی جائے گی پھر جو بھی فیصلہ ہو اس کی روشنی میں پاکستان رابطہ کیا جائے گا۔“ انکل نے ہر نقطہ کی وضاحت کرتے ہوئے سمجھایا۔

”انکل پلیز مجھے یہ سب کچھ نہیں کرنا مجھے ہر حال میں پاکستان واپس جانا ہے میں اب مزید یہاں نہیں رہ سکتی۔“ صالح کی بات ختم ہوتے ہی بیوہ تیزی سے بولی سب نے ایک ساتھ اس کی جانب دیکھا سختی سے اپنے ہونٹوں کو پیچھے دھک دھک اپنے ہاتھوں کی جانب تک رہی تھی شدید ضبط کے باوجود آنسو اس کے گال کو گیلا کر چکے تھے اس کا دکھ ریحہ کے دل کو چیر گیا گھر سے اس طرح نکالے جانے کی خواہش نہ ہو محسوس کر رہی تھی اس کا اندازہ کوئی چاہ کر بھی نہیں لگا سکتا تھا بے عزتی کے شدید احساس نے اسے ادھ موا کر دیا تھا۔ اپنوں سے دور پردیس کی یہ رسوائی اسے خون کے آنسو رلا رہی تھی ”اب مجھے یہاں نہیں رہنا“ یہ فیصلہ وہ سکندر کے گھر سے نکالے جانے سے قبل ہی کر چکی تھی پچھلے تین دنوں سے وہ جس کرب کا شکار تھی اس کا واحد حل اب سکندر سے علیحدگی میں نہیں تھا یہی وجہ تھی کہ اسے کسی بھی کونسلنگ سے کوئی سروکار نہ تھا۔

”مجھے اپنے گھر کال کرنی ہے میں اپنے والد سے ہر مسئلہ ڈسکس کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ حتیٰ اور اٹل لہجہ میں بولی۔ انکل صالح خاموشی سے اس کے چہرے پر نظریں جمائے جانے کیا سوچ رہے تھے جبکہ عائشہ ابوذر کو گود میں لیے اس کے قریب ہی بیٹھی تھیں۔

”یہ وقت جذباتی فیصلے کرنے کا نہیں ہے تمہیں جو بھی کرنا ہے سوچ سمجھ کر کرنا ہو گا کیونکہ تمہارا پاکستان کے کسی دوسرے شہر میں نہیں ہو جہاں سے ٹکٹ کروا کر میں تمہیں واپس بھیج دوں تم ایک دوسرے ملک میں موجود ہو جہاں کے اپنے کچھ قاعدے، قوانین ہیں جن پر عمل پیرا ہونا تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ بھنوس اچکا کر بولی۔

”مجھے اپنے ملک واپس جانے کے لیے آپ کے ملک کے کن قاعدے اور قوانین کو فالو کرنا ہو گا؟ پلیز انکل ذرا آپ مجھے وضاحت سے سب کچھ سمجھائیں میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں واپس کیوں نہیں جاسکتی۔“ وہ الجھ گئی تھی صالح انکل کی بات سمجھ ہی نہ پائی۔

”تمہارا پاسپورٹ کہاں ہے؟“ کسی بھی بات کی وضاحت سے قبل انہوں نے بیوہ سے صرف یہی ایک سوال کیا جسے سننے ہی وہ چونک اٹھی۔

”پاسپورٹ وہ تو شاید سکندر کے پاس ہے بلکہ یقیناً“ اس کے پاس ہی ہو گا آپ سنا لیں وہ دے دے گا۔“ اس کا لہجہ یقینی تھا۔

”اور ابوذر کے کاغذات مثلاً“ اس کا برتھ سرٹیفکیٹ اور پاسپورٹ وغیرہ کہاں ہیں۔“ وہ یہ سب تو اس نے سوچا ہی نہ تھا انکل نے صبح کما تھا وہ اتنی آسانی سے اس مصیبت سے جان نہیں چھڑوا سکتی تھی۔ مایوسی کی ایک شدید لہر نے اسے اپنی پلیٹ میں لے لیا۔

”لیکن جب سکندر نے مجھے رکھنا ہی نہیں ہے تو وہ میرے تمام پیچہ زبھی دے دے تاکہ میں واپس جاسکوں۔“ مایوسی میں امید کی ایک تھلک اسے نظر آئی۔

”ہاں تمہارے پیچہ ز تو وہ دینے کو تیار ہے لیکن کیا تم حماد کے ساتھ ساتھ ابوذر کو بھی سکندر کے حوالے کر دو گی؟“ انکل نے بیوہ سے دریافت کیا جو ہونٹوں کی ان کا منہ تنک رہی تھی۔

”مجھ کو بیٹا نام ابوذر کو اپنے ساتھ پاکستان نہیں لے جاسکتیں یہ یہاں کا قانون ہے۔“

”کیوں نہیں لے جاسکتی، میں اس کی ماں ہوں کوئی بھی قانون چند ماہ کے بچے کو اس کی ماں سے جدا نہیں

کر سکتا۔“
 ”یہ بی بات تو میں تمہیں سمجھا رہا ہوں دیکھو نیو اگر تمہیں پاکستان جانا چاہو گی تو ہمارے ملک کے قانون کے تحت تمہیں اکیلے واپس جانا ہو گا کیونکہ تم اس بچے کو دوسرے ملک نہیں لے جا سکتیں۔“
 ”لیکن ہمارے ملک کے قانون میں تو جویشہاں کا ساتھ دیا جاتا ہے خواہ اس کا تعلق کسی بھی ملک سے ہو۔“ اس نے حیرت سے ربیعہ کی سمت دیکھا اس کے چہرے پر بکھری حیرت یہ ثابت کر رہی تھی کہ وہ بھی اسی نقطہ سے اسی طرح جلا علم تھی جس طرح نیو۔
 ”لیکن یہاں ایسا نہیں ہے البتہ اگر تم سکندر سے علیحدگی اختیار کر کے یہاں رہنا چاہو تو اس سلسلے میں ہم سب تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔“

”کیسی مدد؟“
 ”جیسے میں کوشش کر کے تمہیں یہاں کوئی معقول سی جاب دلوا سکتا ہوں، تمہاری یہاں رہائش کا انتظام بھی ہو سکتا ہے بلکہ اگر تم چاہو تو تم ہمارے ساتھ ہمارے گھر پر بحیثیت بیٹی کے رہ سکتی ہو کیوں عائشہ ٹھیک کہہ رہا ہوں نا میں؟“ بات کرتے کرتے انہوں نے عائشہ کو مخاطب کیا جنہوں نے اثبات میں سر ہلا کر ان کی بات کی تصدیق کی۔
 ”یہاں رہائش اختیار کرنے میں تمہیں ایک فائدہ اور بھی ہو گا وہ یہ کہ میں کوشش کر کے حماد بھی تمہیں دلا دوں گا۔“ انکل کی یہ تمام گفتگو اس کے کسی بھی مسئلہ کا حل نہ تھی وہ یہاں شادی ہو کر سکندر کے ساتھ رخصت ہو کر آئی تھی اب اگر سکندر اس سے کوئی تعلق اور رشتہ نہ رکھنا چاہے تو وہ کس طرح یہاں رہ سکتی تھی کس حیثیت سے وہ اپنی زندگی و بار غیر میں گزار لیتی اپنے پیاروں سے دور عورت اپنوں سے دوری صرف ایک شخص کے لیے برداشت کرتی ہے جو اس کے شوہر کے منصب پر فائز ہوتا ہے اب اگر وہ شخص ہی اپنا نہ ہو تو پھر کس طرح ساری زندگی گزارا جاسکتی ہے انسان تو سارے معاشرے کے ایک ہی جیسے تھے جو ہاتھوں میں سنگ ریزے لیے جا بجا کھڑے نظر آتے ہیں جہاں کہیں موقع ملے اسے سامنے کھڑے فرد کو ہولمان کر دیں ایسے میں کس طرح وہ اپنی ساری جوانی تیاگ دے یہ سب اس نے سوچا ضرور مگر کما کچھ نہیں وہ جان چکی تھی جذباتی پن اس تمام مسئلے کا حل نہیں ہے بلکہ اب اسے جو بھی کرنا ہے بہت سوچ سمجھ کر کرنا ہے فی الحال ضروری تھا کہ انکل جو کچھ کہیں ان کی ہاں میں ہاں ملائی جائے۔

”ٹھیک ہے انکل آپ وہی کریں جو آپ کو مناسب لگے۔“ بولتے ہوئے اس کی آواز زندہ مٹی ربیعہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے اپنے ساتھ لگا لیا۔
 ”ہمت کر دے نیو، خدا پر بھروسہ رکھو جو بھی کرے گا بہتر کرے گا۔“ وہ اس کا سر تھپکتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

”ہمت ہی تو ہے جو یہ سب کچھ برداشت کر رہی ہوں ورنہ شاید کب کی مرگتی ہوتی۔“
 ”چھاپا یہ ابوذر کو لودھ کب سے بھوکا ہے پھر ہاتھ منہ دھو کر کپڑے تبدیل کر لو میں اور وہاں تمہیں ذرا بارگاہ لاؤں شاید اسی طرح تمہارا دل کچھ ہل جائے۔“ شاید ربیعہ نہیں جانتی تھی کہ وہ دل جو ٹوٹ کر بکھر جائیں وہ اس طرح نہیں ہلنے پھرنے کیونکہ چاہتے ہوئے بھی خاموشی سے تیار ہو کر ان کے ساتھ باہر آئی کم از کم وہ اپنا خیال رکھنے والے خود سے منسلک لوگوں کو باپوں نہ کرنا چاہتی تھی بوسے بھی وہ جان چکی تھی اچھی یا بری اپنی زندگی اسے خود جیتی ہے اب فیصلہ اس کے اپنے ہاتھ میں تھا کہ وہ کیسی زندگی گزارنا پسند کرتی ہے۔

”دیکھو بیٹا اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں کا ولی مقرر فرمایا ہے اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں جگہ جگہ فرماتا ہے کہ

اپنی بیویوں سے نیک سلوک کرو خاص طور پر سورۃ النساء میں اس بارے میں کچھ جگہ وضاحت کی گئی ہے۔“ مولوی صاحب سانس لینے کے لیے رکے اور پل کے بل سکندر کے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔
 ”جانتے ہو اللہ تعالیٰ میاں بیوی کے درمیان صلح کو مست پسند فرماتا ہے ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ ”اگر کوئی عورت اپنے شوہر کی جانب سے زیادتی یا بے رغبتی کا خوف رکھتی ہو تو دونوں (میاں بیوی) پر کوئی حرج نہیں کہ وہ آپس میں کسی مناسب بات پر صلح کر لیں اور صلح حقیقت میں) اچھی چیز ہے۔“ (سورۃ النساء)
 نیو سر پر ہونے والے خاموشی سے سر ہٹائے مولانا عبدالرزاق کی تمام گفتگو سن رہی تھی وہ دھکتے قبل ان کے ساتھ سکندر کے گھر آئی تھی کیونکہ مشاورت کے لیے سکندر نے انکل صالح کے گھر آنے سے صاف انکار کر دیا تھا اس کا کہنا تھا کہ یہ مشاورت لڑکی کے گھر ہوتی ہے جہاں دونوں فریقین کی جانب سے ایک فرد کی موجودگی ضروری ہے اب جبکہ نیو کا گھر یہاں نہیں ہے تو یہ معاملہ سکندر کے گھر پر طے پایا جانا چاہیے اس سلسلے میں مولانا صاحب نے دوبار اس سے ملاقات کی اور اسے سمجھانا چاہا لیکن وہ مسلسل اپنی بات پر اڑا رہا وہ صلح کو نیو کا سر پرست تسلیم کرنے پر رضامند ہی نہ تھا۔

”ٹھیک ہے اگر وہ یہاں نہیں آتا تو یہ بھی وہاں نہ جائے گی۔“ انکل صالح نے غصہ میں اگر اپنا فیصلہ ثابت کرنا چاہتا تھا۔
 ایک ہفتہ اسی کھینچا تانی میں گزر گیا اور بھی جانے کتنا تاؤم اسی طرح گزر جاتا اگر اسی رات پاکستان سے ردا کا فون نہ آ جاتا۔ رات کے ایک بجے سوئی جا کی کیفیت میں تھی جب پاکستان سے آنے والی کال نے اس کے تمام احساسات کو بے وار کر دیا عام طور پر کبھی بھی اسے اس وقت کوئی فون نہ کرتا تھا کسی انہونی کے احساس نے اس کے دل کی دھڑکن کو تیز کر دیا اس نے کانپتے ہاتھوں سے پس کاٹن دیا کر سیل اپنے کالوں سے لگایا۔
 ”السلام علیکم۔“ دھیمی آواز میں بولتے ہوئے اس نے ابوذر پر ایک نظر ڈالی جو اس کے پہلو میں بے خبر سو رہا تھا۔

”وعلیکم السلام۔“ ردا کی آواز اسے بھیگی ہوئی محسوس ہوئی۔
 ”شاید میری ماں میرے تمام حالات جان چکی ہے پہلا خیال۔“ اس کے ذہن میں یہ ہی آیا۔
 ”کیا بات ہے ممی سب خیریت تو ہے؟“
 ”خیریت کہاں بیٹا تمہارے پیپا آئی سی یو میں ہیں۔“ بغیر کسی تمہید کے ردا روتے ہوئے بولیں۔
 ”کیا ہوا پیپا کو؟“ وہ ایک دم شاک ہو گئی یہ بالکل ایک غیر متوقع خبر تھی۔ اس کا دل صبح سے گھبرا رہا تھا جس کی وجہ اب سمجھ میں آئی۔

”یا اللہ میرے پیپا کو صحت عطا فرما۔“ اس کے دل کی گمراہیوں سے آواز نکلی حالانکہ ابھی وہ یہ بھی نہ جانتی تھی کہ احتشام صاحب کو ہوا کیا ہے؟
 ”من کوو سر ہارٹ ایک کیا ہے ڈاکٹر ڈاکٹر کا کہنا ہے کہ بائی پاس کرنا پڑے گا ہم تمہیں پریس میں پریشان نہ کرنا چاہتے تھے بیٹا اسی لیے اطلاع نہ دی لیکن اب جب ڈاکٹر نے آپریشن بتایا تو میں صبر نہ کر سکی کیا تم کسی طرح پاکستان نہیں آ سکتیں۔“ بات کرتے کرتے ردا نے وہ سوال کیا جس کا جواب دل کی گمراہیوں سے سوائے ہاں کے کچھ نہ تھا۔

”بیٹا میں چاہتی ہوں تمہیں پاکستان آکر اپنے پیپا سے مل لو ویسے بھی وہ تمہیں بہت یاد کرتے ہیں ہمارا پروگرام تھا ایک ماہ تک وہاں آنے کا لیکن یہ بس اچانک ہی پر سول جانے انہیں کیا ہو گیا۔“ ردا بھرتی ہوئی آوازیں اسے تمام تفصیل سنارہی تھیں جسے وہ خالی الذہنی سے سن رہی تھی مصیبت ایک کے بعد ایک اس کی طرف لپک رہی تھی اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ ردا کو کیا جواب دے اس کا بس چلنا تو ابھی اڑ کر پاکستان چلی جاتی لیکن بناؤں میں پڑی

مجبوری کی زنجیریں اسے جکڑے ہوئی تھیں۔
 ”تم کو تو میں سکندر سے بات کروں نہیں پاکستان بھجوا دے بے شک چند دن کے لیے ہی سی۔“ روا اس کے دل کی کیفیت سے بے خبر پوچھے جارہی تھیں نہیں جانتی تھی کہ ان کی ملائی بیٹی کس اذیت سے دوچار ہے۔
 ”نہیں می پلیز آپ انہیں کچھ مت کہیں میں خود بات کر کے آپ کو کل تک بتا دوں گی اور آپ اپنا خیال رکھیے گا اللہ پایا کو جلد صحت عطا فرمائے گا۔“

اور پھر فون بند کرنے تک اس نے روا کو اپنے بارے میں کچھ بھی نہ بتایا یہ بھی نہیں کہ وہ انکل صالح کے گھر قیام پذیر ہے وہ نہیں چاہتی تھی کہ اس پریشانی میں انہی ماں کو مزید کوئی دکھ دے وہ ساری رات نیوٹے جانے نماز پر گزار دی وہ دو رو کر اپنے باپ کی صحت و سلامتی کے لیے دعائیں کرتی رہی باپ کی تکلیف نے اپنا رو بھی بھلا دیا۔

”پلیز انکل آپ سکندر سے کہیں میرا پاسپورٹ دے دے مجھے ہر حال میں پاکستان جانا ہے۔“ وہ روتے ہوئے صالح محمد سے التجا کر رہی تھی جو خاموشی سے اس کی ہر بات کو سن رہے تھے انہیں صبح ہی پتا چلا تھا کہ احتشام آئی سی یو میں ہیں۔ اس کے بعد امان اور روا کو فون کر کے انہوں نے تمام صورت حال معلوم کر لی تھی احتشام کے بالیاس کی خبر نے انہیں بھی پریشان کر دیا تھا اب ان کی سمجھ میں بھی نہ آ رہا تھا کہ فوری قدم کیا ہونا چاہیے؟
 ”ٹھیک ہے بیٹا تم خود کو سنبھالو میں سکندر سے بات کرتا ہوں۔“ اسے تسلی دیتے ہوئے گھر سے چلے گئے میٹام کو ان کی واپسی تک بیرو جیلے پیر کی بیٹی کی طرح گھر میں پھرتی رہی وہ پہلا دن تھا جب اسے ایوزر کا خیال بھی نہ آیا آج اگر اسے کچھ یاد تھا تو صرف اپنا باپ وہ مسلسل شفا سے رابطہ میں تھی جو پل پل کی خبریں اسے دے رہی تھی کتنے خوش نصیب تھے سب لوگ جو ایک ساتھ تھے ایک وہ ہی بد نصیب تھی جو اپنوں سے دور قید تھائی کاٹ رہی تھی شام تک انکل کے انتظار میں گزارے جانے والے چھ گھنٹے اسے چھ صدیوں کے برابر لگ رہے تھے۔

”انکل لے آئے آپ میرا پاسپورٹ؟“ انکل کے گھر میں داخل ہوتے ہی وہ بے قرار سی ان کی جانب بڑھی انہوں نے رک کر ایک نظر اس کے سنے ہوئے چہرے پر ڈالی۔
 ”تم نے آج کھانا نہیں کھایا؟“ یہ اس کے سوال کا جواب تھا اسے یاد آیا وہ صبح سے بھوکی تھی حالانکہ عاتشہ کئی بار اس کی منت کر چکی تھیں کہ وہ کچھ کھالے مگر جانے کیوں اس کا دل ہی نہ چاہا رہا تھا۔
 ”دل نہیں چاہا کھانا کھانے کو۔“ وہ جیسے سے بولی۔
 ”تو آؤ پہلے میرے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاؤ پھر بات کرتے ہیں“ بمشکل اپنے حلق سے چند نوالے اتارنے کے بعد وہ پھر سے اپنے عمار پر آئی۔

”انکل مجھے پاکستان جانا ہے اپنے باپ کے پاس۔“
 ”دیکھو نیوٹو میں نے تمہیں پہلے ہی کہا تھا کوئی بھی کام جذباتی ہو کر مت کرو بلکہ ہر بات سوچ سمجھ کر کرو۔“ انکل نے لباس رکھے برتن میں اپنے ہاتھ دھوئے اور انہیں ٹولہ سے خشک کرتے ہوئے نیوٹو کو سمجھایا۔
 ”دیکھو بیٹا میں تمہیں پہلے بھی سمجھا چکا ہوں فی الحال ان حالات میں تمہارا پاکستان جانا قطعی غیر مناسب ہے جب تک تمہارے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ نہ ہو تمہارا یہاں موجود رہنا اشد ضروری ہے۔“
 ”لیکن انکل میرے پیلا سیریس کنڈیشن میں ہیں۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے اگر تم چاہتی ہو پاکستان جانا تو بے شک جاؤ اس سلسلے میں سکندر کو بھی کوئی اعتراض نہیں ہے میں کل ہی تمہارے پیار سے جمع کروا دیتا ہوں لیکن یہ یاد رکھنا کہ تم یہ سفر تنہا ہی کرو گی ایوزر تمہارے ساتھ نہ ہو گا اور پھر یہ بھی سوچو نیوٹو اگر تمہیں وہاں پہنچنے ہی سکندر طلاق کے پیچھے بھجوا دے تو تم کیا کرو گی۔“ انکل کے آخری جملے

نے روتی ہوئی نیوٹو کو سر اٹھانے پر مجبور کر دیا طلاق کا خوف اس کے اعصاب کو جھنجھلا گیا وہ بھی اس وقت جب اس کا باپ اسپتال میں زندگی و موت کی کشمکش میں پڑا ہو اس کے دونوں بچے اس سے چلوں دور ہوں آج سے چار سال قبل شروع ہونے والا یہ کٹھن سفر اسے کئی دامن کر کے ایک جھٹکے میں ہی ختم ہو جانا وہ جہاں سے چلی تھی وہاں واپس پہنچ جاتی اپنی ذات کی نفی کر کے بھی اسے کچھ حاصل نہ ہوتا، خسارہ اس کا مقدر بن جاتا سکندر ہر ظلم کے بعد بھی فلاحی قرار دیتا تو دینیئے پندیدہ بیوی اور ہر طرح کی عیاشی اس کا نصیب بن جاتی اس کے ہاتھ کیا آنا سوائے ذلت اور رسوائی کے، انکل کیا کرنا چاہتے تھے وہ با آسانی سمجھ گئی ویسے بھی گزرتے ہوئے وقت اور حالات نے اسے اپنی عمر سے زیادہ سمجھ دار بنا دیا تھا آہستہ آہستہ وہ اپنے جذبات پر قابو پانے کا فن سیکھ گئی تھی۔

”ٹھیک ہے“ انکل گھر میں اپنی می کو کیا جواب دیں؟ ”وہ اپنی جذباتی کیفیت سے ایک دم ہی باہر نکل آئی۔
 ”گڈ نیوٹو تم کافی سمجھدار ہو بیٹا اور مجھے تمہاری یہ عادت بہت پسند ہے تم ہر بات جلدی مان جاتی ہو۔“ انکل نے اطمینان بھر اس اس لیتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔

”تم اپنی والدہ سے کہو کہ تمہارے پیارے زینبہ شعلی کے لیے جمع ہیں لہذا ان دونوں تمہارا دیرینہ لگنا نا صرف مشکل بلکہ ناممکن بھی ہے پھر بھی انہیں سمجھا دینا کہ تم کو شش کر رہی ہو جیسے ہی ممکن ہو تمہارا پاکستان ضرور آؤ گی۔“
 ”ٹھیک ہے انکل۔“ بات اس کی سمجھ میں آئی۔ اب وہ آسانی سے اپنے گھر والوں کو قائل کر سکتی تھی۔

”اور ہاں آج مجھے سکندر کا فون بھی آیا تھا۔“
 ”سکندر کا فون؟“ اس نے حیرت سے سوال کیا۔

”ہاں وہ تم سے ملنا چاہتا ہے اس سلسلے میں اس نے مولانا عبدالرزاق سے بھی رابطہ کیا ہے۔“
 ”ضروریہ اس کی کوئی چال ہو گی ورنہ میں نہیں سمجھتی کہ وہ اتنی آسانی سے آپ کو فون کر کے مجھ سے ملاقات کی بات کرتا۔“ وہ خاصی بد ظن تھی بد گمانی اس کے لہجہ سے جھٹک رہی تھی جسے صالح محمد نے محسوس ضرور کیا مگر کما کچھ نہیں۔

”اصل میں میں نے حماد کے لیے یہاں کی ایک شرعی عدالت سے رجوع کیا تھا جو قریبی اسلامک سینٹر میں موجود ہے، میرا مطالبہ حماد کی کسٹڈی کا تھانین سالہ بچہ کوئی بھی باپ اپنی تحویل میں نہیں رکھ سکتا وہ بھی اس صورت میں جب وہ دوسری شادی کرنا چاہتا ہو۔“

”وہ تو اس کا مطلب یہ ہو کہ اپنے بیٹے سے جدائی کے تصور نے اسے مجھ سے رابطہ کرنے پر مجبور کر دیا۔“
 بات اس کی سمجھ میں آئی۔

”ہاں۔ اور اب جب اس نے خود مجھ سے رابطہ کر لیا ہے تو میرا خیال ہے کہ تم مولانا صاحب کے ساتھ فاطمہ کے گھر چلی جاؤ سکندر تم سے مشاورت اپنے گھر میں ہی کرنا چاہتا ہے اس سلسلے میں وہ کوئی بات سننے پر تیار نہیں ہے۔“ اپنے باپ کی بیماری ماں کے دکھ، بہن بھائیوں کی پریشانی اور ان حالات میں ان سے دوری نے نیوٹو کو اندر سے توڑ دیا تھا ظاہر وہ مضبوط نظر آ رہی تھی لیکن جو کیفیت اس کے دل کی تھی وہی جانتی تھی اسی احساس شکست نے اسے مجبور کیا کہ وہ مولانا صاحب کے ساتھ واپس اس گھر میں جائے جہاں واپس نہ جانے کی قسم وہ دل ہی دل میں کئی بار کھا چکی تھی شاید ابھی اس کے نصیب کی مزید کچھ آنا تھیں باقی تھیں اسے لگتا کہ اپنے رب کی پسندیدہ بندی ہونے کا اعزاز حاصل کر چکی ہے یہ ہی وجہ تھی جو وہ آنا تھیں کے لیے منتخب کر لی گئی تھی اور جب وہ مشاورت کے لیے سکندر کے گھر آئی تو یہ سوچ چکی تھی سمجھوتا وہ واحد حل ہے جو اس کی زندگی کو تار یک ہونے سے بچا سکتا ہے اور یہ سمجھوتا اسے اپنے بچوں کے لیے کرنا تھا جنہیں لے کر وہ یہاں سے نہ جاسکتی تھی۔

”مولانا صاحب یہ بہت نا فرمان ہے میرے حکم کی روگردانی کرتی ہے۔“ وہ اپنی سوجھ میں گم تھی جب سکندر

کی آواز اس کے کانوں سے لگرائی وہ یکدم چونک اٹھی۔

”تو کیا تم نافرمان نہیں ہو؟“ مولانا صاحب نے الٹا سکندر سے سوال کیا۔

”کیا تم اپنے رب کے حکم کی روگردانی نہیں کرتے؟“ مولانا صاحب کے اس سوال کا بھی جواب سکندر کے پاس نہ تھا اس نے خاموشی سے سر جھکا لیا۔

”جب تم اپنے رب کی نافرمانی کرتے ہو تو کیا وہ تمہیں بے گھر کر دیتا ہے؟ تمہارے نصیب میں لکھا گیا رزق چھین لیتا ہے؟ یا تمہیں دنیا میں ذلیل و خوار کرتا ہے؟ تمہیں بیماریوں کے بوجھ سے لادیتا ہے؟ پتاؤ سکندر تمہارا رب تمہاری نافرمانیوں پر تمہیں کون سی سزا دیتا ہے؟ وہ نافرمانی جو تم اس کی دن رات کرتے ہو کیا وہ ان پر تمہیں معاف نہیں فرماتا؟ بے شک معاف فرماتا ہے جب ہم اس سے معافی طلب کرتے ہیں تو تمہارے خیال میں یہ عورت جو آج تمہارے سامنے سر جھکائے بیٹھی ہے تم سے معافی کی طلب گار نہیں ہے۔“ مولانا صاحب نے اسے ایک بار پھر جواب دیا۔

”اللہ تعالیٰ نے توبہ کار عورتوں کے لیے بھی معافی کی گنجائش رکھی ہے پھر تم کیوں اس کے حکم سے روگردانی کرتے ہوئے اپنی بیوی کو گھر سے نکالنے کے درپے ہو، کیوں اس سے دونوں بچے چھیننا چاہتے ہو کوئی بھی ظلم کرنے سے پہلے یاد رکھنا اللہ تعالیٰ ظالم سے حساب ضرور لیتا ہے۔“ بات کرتے ہوئے مولانا صاحب کے لہجہ میں اشتعال آگیا۔

”تم ایک نیک عورت کے ساتھ زیادتی کے مرتکب ہو رہے ہو وہ بھی صرف اس بنا پر کہ یہ تم کو ناپسند ہے۔“ نبیو نے ایک نگاہ سکندر کے چہرے پر ڈالی اپنی ناپسندیدگی کا اظہار وہ مولانا صاحب کے سامنے بھی کر چکا تھا۔ اس سوچ نے نبیو کے دل کو دکھ سے بھرا آج اس کے باپ کا بانی پاس تھا شاید آپریشن شروع ہو چکا ہو گا اس نے سامنے لگی دیوار گیر گھڑی پر ایک نظر ڈالی بے اختیار ہی سورہ فاتحہ کا ورد اس کی زبان سے جاری ہو گیا۔

”کیکھو بیٹا قرآن نے بیشہ عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کا حکم دیا ہے فرمان خداوندی ہے۔“ ان کے ساتھ اچھے طریقے سے برتاؤ کو پھر بھی اگر تم انہیں ناپسند کرتے ہو تو ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور اللہ اس میں بہت سی بھلائی رکھ دے۔“ مولانا صاحب نے اپنی گود میں رکھے قرآن شریف کو کھول کر سورہ النساء کی مذکورہ آیت کا صرف پڑھ کر سنائی بلکہ قرآن مجید کو سکندر کے سامنے بھی کر دیا۔

”کیکھو بیٹا تمہاری کوئی بھی شکایت ایسی نہیں ہے جسے بنیاد بنا کر تم اپنی بیوی سے علیحدگی اختیار کرنا چاہتے ہو یا د رکھو جائز کاموں میں طلاق اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسند کیا جانے والا فعل ہے تو کیا تم بلا سبب کوئی ایسا فعل سر انجام دینا پسند کرو گے جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ ہو۔“ مولانا صاحب نے اپنی بات کے اختتام پر سکندر پر ایک نظر ڈالی۔

”مولانا صاحب اس کے کسی غیر مروت سے تعلقات بھی ہیں جو پاکستان سے نا صرف اسے مہیج کرتا ہے بلکہ اکثر دہشت گردوں کے فون بھی آتے رہتے ہیں۔“ ایک اور نیا الزام کوئی اور وقت ہوتا تو وہ چلا اٹھتی مگر اس وقت وہ سوچتے سمجھتے کی تمام صلاحیتیں کھو چکی تھیں۔

”تمہارا شوہر جو الزام تم پر لگا رہا ہے کیا وہ درست ہے۔“ مولانا صاحب کی آواز اس کے کانوں سے لگرائی اس نے خالی خالی نظروں سے ان کی جانب نگاہ سمجھ ہی نہ پائی وہ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

”نیک عورتوں کے لیے نیک خرد اور بری عورتوں کے لیے۔“ جانے یہ آواز کس کی تھی اس نے چونک کر ایک نظر سکندر کی چہرے پر ڈالی۔

”تو کیا میں بد کردار عورت ہوں جو میرے مقدر میں سکندر جیسا مرد لکھ دیا گیا۔“ اسے سوچنے سے بھی یاد نہ آیا

اس کی زندگی کا کوئی ایسا پل جو یہ ثابت کر دے کہ نیرو احتشام ایک بد کردار عورت ہے۔

”کیکھو بیٹی شادی کے بعد عورت اپنے مرد کی امانت ہوتی ہے۔“ اس کی خاموشی سے جانے مولانا صاحب نے کیا نتیجہ اخذ کیا۔

”اگر تمہارے شوہر کی بات درست ہے تو اپنی اصلاح کرو، اگر یہ تم پر بہتان باندھ رہا ہے تو پھر اس کی پکڑ اللہ تعالیٰ کے ہاں ضرور ہوگی۔“

”یہ بہتان نہیں ہے، آپ پوچھیں اس سے کیا اس کے تعلقات کسی شان نامی شخص سے نہیں ہیں۔“ نبیو کی خاموشی نے سکندر کو مزید شہرہ دے دی۔

”سنن۔“ اس کے سونے ہوئے احساسات جھنجھلا اٹھے اس نام کے ساتھ ہی وہ سب کچھ بھول گئی وہ جسمانی طور پر یہاں تھی مافی طور پر وہ کراچی کے ایک کارڈیو اسپتال کے آئی سی یو کے باہر بیٹھی تھی جہاں اس کا باپ ایڈمٹ تھا اس کے آس پاس گھر کے تمام افراد موجود تھے بے اختیار سورہ فاتحہ کا ورد اس کی زبان پر جاری ہو گیا آنکھوں سے جاری آنسو اس کے گالوں کو بھگوتے جارہے تھے۔

”کیکھو بیٹا اللہ تعالیٰ معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے بہتر یہ ہے کہ تم دونوں سب کچھ بھلا کر آپس میں صلح کر لو کیونکہ یہ عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک نہایت پسندیدہ عمل ہے۔“ جو اب اسے سکندر نے کیا کہا وہ سمجھ نہ پائی عین اس وقت اس کے قریب رکھا موبائل فون بج اٹھا بے اختیار اس کی نگاہ سامنے لگی گھڑی پر پڑی شاید آپریشن مکمل ہو چکا تھا صرف تین گھنٹوں میں ایسا ہونا مشکل ہی نہیں ناممکن امر بھی تھا پھر یہ فون کس کا آ رہا تھا شاید انکل صالح کا ہو اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے فون اٹھا لیا جو بند ہو چکا تھا۔

”نبیو بہت احتشام کیا تمہیں اپنے شوہر کی تمام باتیں منظور ہیں وہ سب جو ابھی اس نے تم سے کہا؟“ اسے یاد ہی نہ آیا کہ سکندر نے اس سے کیا کہا تھا اس کا پورا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا وہ خوف زدہ تھی فون ایکس بار پھر بج اٹھا کمرے میں موجود دونوں افراد نے بھی بے اختیار اس کے زرد چہرے پر نظر ڈالی۔

”کس کا فون ہے؟“ سکندر کی آواز اس کے کانوں سے لگرائی اس نے اپنے ہاتھ میں تھامے سیل پر ایک نظر ڈالی اسکرین پر جگمگانے والا نمبر یقیناً ”شفا“ کا تھا وہ کپکپا اٹھی۔

”یا اللہ خیر کرنا مجھے کسی بھی بری خبر سے محفوظ رکھ میرے مالک میرے باپ کو صحت کاملہ عطا فرماتا۔“ دل ہی دل میں دعا کرتے ہوئے اس نے یس کا فون دیا کر سیل اپنے کانوں سے لگالیا اپنے دل کی دھڑکن کی آواز اسے اپنے کانوں میں سنائی دے رہی تھی اس وقت اس کی ذات کمرے میں موجود دونوں نفوس کی مکمل توجہ کا مرکز تھی دوسری طرف شفا کی آواز سنتے ہی اسے محسوس ہوا جیسے وہ بے ہوش ہو جائے گی اسے اپنی ناگواری سے جان نکلتی ہوئی محسوس ہوئی اس کا تمام جسم من ہو گیا سکندر نے کب اس کے ہاتھ سے سیل تھاما اسے ہوش ہی نہ رہا اس کا ذہن مکمل طور پر تاریکی میں ڈوب چکا تھا یقیناً ”وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔“

مجھے اتنا ہمارا نہ دیا باکل جانے مجھے نصیب ہو۔
میں جب بھی روتی ہوں تم آنسو پونچھا کرتے ہو۔
مجھے اتنی دور نہ چھوڑو آٹامیں روؤں اور تم قریب نہ ہو۔
میرے ناز اٹھاتے ہو بابا۔
میری چھوٹی چھوٹی خواہش پر تم جان لوٹاتے ہو بابا۔
کل ایسا نہ ہوا ک غم کی میں میں تنہا کو یاد کروں۔
اور رو رو کے فریاد کروں۔

اے اللہ کوئی میرے بابا جیسا نازا اٹھانے والا ہو۔

وہ جیت لیتی ایک ٹک کرے کی پھٹ پر لگے اشارہ کو دیکھ رہی تھی جو اندھیرے میں چمک رہے تھے وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ حالات اسے اس جج پر لے آئیں گے جہاں سے واپسی کا راستہ نہ صرف دشوار گزار بلکہ ناممکن ہوگا اس نے تو بھی سوچا بھی نہ تھا وہ دور دس میں اپنے پیاروں سے دور اس طرح کے دن بھی گزارے گی ان تمام مشکلات میں گھر کر بھی ایک اطمینان اس کے دل کو حاصل تھا وہ تھانہ بھی اس نے پلٹ کر اپنے پہلو میں دیکھا ابوذر گہری نیند سو رہا تھا سکندر اس کی تلاش میں کتنے کی طرح سارا شہر سو گھٹا پھر رہا تھا وہ جانتی تھی اس کے گھر والے بھی اس سے رابطے کے لیے بے قرار ہوں گے وہ مجبور تھی اسے حالات نے مجبور کر دیا تھا اس کے لیے بھی یہ ہی بہتر تھا کہ کسی سے رابطہ نہ رکھے اپنی تھائی اور بے بسی کے احساس سے اس کا دل بھر آیا بے اختیار آنسو اس کی گالوں کو بھگوتے ہوئے نکلیے پر گرنے لگے۔

کھانا کھاتے کھاتے اس کی نظر شیشے سے اس پار روڈ پر پڑی جہاں ہلکی ہلکی بارش میں فٹ پاتھر پر ایک نوجوان لڑکا اور لڑکی جا رہے تھے لڑکی نے ڈارک یوسٹ پین رکھا تھا جو اس امر کی نشاندہی کر رہا تھا کہ وہ ہندو تھی ویسے بھی یہاں عام طور پر اس طرح کے گہرے رنگ ہندو ہی پہنتے تھے لڑکا جانے اس کے کان میں کیا کہہ رہا تھا لڑکی کے چہرے پر پھیلی مسکراہٹ اسے دور سے بھی نظر آ رہی تھی۔

”کیا کھاؤ گی؟“ سکندر کی آواز سنتے ہی وہ چونک اٹھی ویٹران کے قریب ہی کھڑا تھا غلابا ”آؤ رہ لینے کے لئے“ چکن تنکہ ”یہ ایک پاکستانی ہوٹل تھا جہاں وہ سکندر سے خاص فرمائش کر کے آئی تھی ویسے بھی جب سے مولانا عبدالرزاق نے سکندر کو سنبھالیا تھا اس کے رویہ میں خاطر خواہ تبدیلی آئی تھی جو نیو کے لئے خوش آئند تھی آج بھی دونوں نے پہلے سینما میں لپکائی مووی دیکھی اور پھر اسی کی فرمائش پر سکندر اسے پاکستانی ریستورنٹ بھی لے آیا اور اب وہ مزے سے چکن تنکہ انجوائے کر رہی تھی اس کے دونوں بچے گھر کا فاطمہ کے پاس تھے جب وہ گھر آئے ابوذر بھی وادی کی پاس سوچکا تھا۔

”اسے ہمیں سونے دو ورنہ یہ ڈسٹرب ہو گا جاگ گیا تو تمہیں بھی نہ سونے دے گا۔“

سکندر کے کہنے پر وہ ابوذر کو چھوڑ کر اپنے کمرے میں آگئی تھی کمرہ ساری رات اس نے کانٹوں پر گزارا اسے آج اندازہ ہوا وہ ابوذر کے بنا ایک پل بھی نہیں بی سکتی شاید وہ حماد سے زیادہ ابوذر سے محبت کرتی تھی لیکن نہیں وہ تو حماد پر بھی جان دیتی تھی یہ اور بات تھی حماد کو اس سے انسیت بالکل نہ تھی وہ اگر کسی سے محبت کرتا تھا تو شاید وہ فاطمہ تھی ورنہ کبھی نیو کے اسے سکندر سے بھی بے جالاؤ کرتے نہ دیکھا تھا بے شک سکندر کا رویہ اس سے تبدیل ہو چکا تھا مگر دونوں کے درمیان جو تکلف کی دیوار شروع دن سے قائم ہوئی تھی وہ آج بھی برقرار تھی آج بھی سکندر پہلے دن والا وہی مرد تھا جس نے اسے شادی کی رات ہی بتا دیا تھا کہ عورت اس کی بھی ضرورت نہ تھی اپنی اس بات پر وہ کبھی قائم تھا نیو بھی شاید اس ماحول اور رویے کی عادی ہو چکی تھی نیو کو حیرت تو اس بات پر تھی کہ اس کی واپسی کے بعد سے نور بلیرا ابھی تک سکندر سے ملنے نہ آئی تھی ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ان دونوں کے درمیان موجود تعلق ختم ہو چکا ہو مگر یہ اس کی خام خیالی تھی ایسے تعلقات زمانے کی نظموں سے چھپ ضرور جاتے ہیں مگر کبھی ختم نہیں ہوتے جس کا اندازہ گزرتے وقت میں اسے بھی ہو گیا تھا۔

نور بلیرا اسپتال میں تھی اپنی جاب سے واپس آتے ہوئے ایک ٹیکو نے اسے لوٹنے کی کوشش کی تھی تو بلیرا

کی طرف سے معمولی مزاحمت پر وہ اسے بھرے روڈ پر بے دردی سے پیٹ کر پھینک گیا جب یہ خبر نیو نے سنی تو شاک رہ گئی۔

”ہمارے دس میں عورتوں کو اس طرح سرعام پیٹنے کی کوئی شخص جرات نہیں کر سکتا“

”وہ جو تمہارا میڈیا عورت کا استحصال دکھاتا ہے وہ کیا ہے؟“

رفید اسے کبھی بھی نیو کے منہ سے اپنے دس کی تعریف سنی نہ جاتی تھی اس لیے برداشت نہ کر سکی اور فوراً بول پڑی۔

”وہ چند ایک واقعات ہوتے ہیں گاؤں دیہات میں جہاں تعلیم کی کمی ہے اور کچھ ذاتی دشمنی کا شکار ہو جاتے ہیں لیکن عام طور پر بڑے شہروں کی چلتی ہوئی شاہراہ پر کوئی لیٹر ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔“ وہ ہر ممکن طور پر اپنے وطن کا دفاع کرتے ہوئے بولی۔ رفید اپنا جواب دینے اپنی جگہ سے اٹھ گئی وہ دونوں ماں بیٹیاں سکندر کے ساتھ ہسپتال جا رہی تھیں وہ خود بھی جانا نہ چاہتی تھی اس لیے خاموشی سے اپنے کمرے میں چلی گئی تاکہ کپڑوں والی الماری کی صفائی کر سکے ابھی اس کا کام ادھورا ہی تھا کہ روزینہ آگئی وہ اپنے آفس سے سیدھی یہاں آئی تھی۔

”چھا ہوا ابھی آپ آگئیں میں اکیلی پور ہو رہی تھی۔“

نیو اسے دیکھ کر خوشی سے گل اٹھی اس نے جلدی جلدی سارے کپڑے الماری میں ڈالے اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آئی اور رفید اتور بلیرا کو دیکھنے ہسپتال گئے ہیں“

”ہاں مجھے ایدہا نے بتایا میں نے رفید اسے کہا تھا کہ میرا انتظار کرے میں انہیں اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گی مگر وہ چلی گئیں ہر حال دونوں اپنی مرضی کی مالک ہیں تم سنو کیسی گزر رہی ہے زندگی غمزے میں تو ہو؟“ وہ اس کے بیڈ پر اطمینان سے بیٹھ گئی۔

”اللہ کا شکر ہے“ نیو نے آہستہ سے مختصر سا جواب دیا۔

”سکندر تمہارے ساتھ ٹھیک ہے؟“

روزینہ اسے ٹوٹتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر بولی

”جی۔“

”ایک بات پوچھوں نیو برا تو نہ مانو گی“

”نہیں پہلے میں نے آپ کی کسی بات کا پرانا ہے جواب مانوں گی“

وہ روم فرنیچر سے پیچھے کاٹن نکال لائی تھی ساتھ ہی کمرے میں رکھے کوکیز کے ڈبے سے کچھ کوکیز نکال کر اس نے پلیٹ میں رکھ دیئے۔

”تمہارے اور سکندر کے درمیان ازواجی تعلقات کب سے نہیں ہیں؟“

وہ ہنس کر تمہید کے بولی اس کے سوال نے نیو کو سن کر دیا۔

”یہ مت سمجھنا کہ میں تم سے کچھ اگلوانا چاہتی ہوں حقیقت یہ ہے کہ میں نے جب سے یہ بات سنی میں بہت شاک تھی اور آج جان بوجھ کر اس نام آئی ہوں جب تمہارے پاس کوئی نہیں عین چاہتی ہوں تم مجھے سب کچھ سچ سچ بتاؤ۔“

”آپ کو یہ سب کس نے بتایا؟“

اپنی انا کاخول ٹوٹے پر وہ سچی سچی جب بولی تو کچھوں کی چھین اس کے لہجہ میں تھی۔

”تور بلیرا“

حماد کا اسکول میں ایڈمشن ہو گیا تھا واپسی میں وہ سکندر کے ساتھ ڈھیروں شاپنگ کر کے آیا تھا نیا بیگ، جوتے، یونیفارم، پنچ بکس اور جانے کیا کیا اب یہ سارا سامان لاؤنج میں پھیلائے وہ سب کو دکھا رہا تھا نہ صرف یہ بلکہ سکندر اس کے بچ کے لیے بھی بہت کچھ لایا تھا جو فاطمہ رفیقہ پرنس میں رکھ رہی تھیں وہ بظاہر تو حماد کا وہ سب سامان دیکھ رہی تھی جو وہ اسے لالا کر دکھا رہا تھا مگر ذہنی طور پر وہ اس وقت وہاں نہ تھی روزیہ کی باتوں نے اسے داغی طور پر ابھی بھی الجھا رکھا تھا حماد کا کافی پر جوش تھا خوشی اس کے چہرے سے کھلی پڑی تھی نیو جیران ہوتی تھی یہاں کے رہائشی مقامی لوگوں کو تعلیم بالکل مفت دی جاتی تھی یہاں تک کہ ایروڈ جانے والے بچوں کو بھی گورنمنٹ اسکالر شپ دیتی جس کی واپسی ان کی ملازمت کے بعد شروع ہوتی ابھی بھی حماد کے ایڈمشن پر کوئی بھاری رقم خرچ نہ ہوئی تھی اس کا داخلہ شمر کے بہترین اسکول میں ہوا تھا جو سامان خرید کر لایا تھا وہ سب بھی نہایت قیمتی تھا جسے دیکھتے ہوئے نیو کے ذہن میں ایک ہی خیال آ رہا تھا اگر میں حماد اور ابوذر کے ساتھ اس گھر سے نکل کر لائیشیا میں ہی رہائش اختیار کرتی ہوں تو کیا یہ سب سہولیات میں اپنے بچوں کو دے سکوں گی؟ نہایت صاف گوئی سے اس نے خود سے ایک سوال کیا جس کا جواب یقیناً ”انکار میں ہی تھا ظاہر ہی بات تھی وہ یہاں کی شہری نہ تھی اس کے بچوں کے لیے تعلیم اور صحت کی سہولیات فری نہ تھیں بلکہ بے حد مہنگی تعلیم اور اسپتال غیر ملکی لوگوں کے لیے تھے بچ تو یہ تھا کہ یہاں رہائش کی صورت میں وہ کوئی معقول جاب بھی نہ کر سکتی تھی اس کی تعلیم کا معیار اتنا نہ تھا کہ اسے کسی اچھے ادارے میں جاب مل جاتی دیے بھی ابھی وہ ہنشلانڈ نہ تھی زیادہ سے زیادہ کوئی اسے اپنے گھر میں آیا یا میڈی رکھ سکتا تھا اور اس معمولی ملازمت میں وہ اپنے خور و نہر کو کرسکتی تھی۔

”مجھے حماد کو چھوڑنا ہو گا۔“

بیٹھے بیٹھے ہی اس نے ایک اور نیا فیصلہ کر لیا حماد کو جو لکھری سہولیات یہاں میسر ہیں میں وہ سہولیات اسے پاکستان لے جا کر بھی نہیں دے سکتی میرے بچے کی شخصیت مسخ ہو جائے گی مجھے اس کے اچھے مستقبل کے لیے قربانی دینا ہو گی جب بھی واپس گئی حماد کے بنائی جاؤں گی۔

”تمہارا فون بچ رہا ہے؟“

سکندر کے متوجہ کرنے پر اس نے فون اٹھا کر لیس کاٹن دیا دوسری طرف روا تھیں جن کی آواز میں ناراضی کا عنصر نمایاں تھا جو خیریت دریافت کرتے وقت ہی وہ محسوس کر چکی تھی۔

”ایک ہی بات تو بتاؤ نیو“

”جی پوچھیں“ حتی الامکان اس نے اپنا الجھ دھما کر لیا حالانکہ جانتی تھی سکندر میں دوسروں کی ٹھیلنے کی عادت بھی دوسری باتوں کے ساتھ بدرجہ اتم موجود تھی۔

”تمہیں سکندر نے گھر سے کیوں نکالا تھا؟“

ایک بالکل غیر متوقع سوال جس کی امید نیو کو کم از کم اس وقت نہ تھی جب اس واقعہ کو بتاتے ہوئے بھی کچھ ماہ گزر گئے تھے اسے سمجھ ہی نہ آیا وہ کیا جواب دے۔

”میری بات کا جواب دو نیو تمہیں سکندر نے گھر سے کیوں نکالا تھا اور تم نے یہ سب کچھ ہمیں کیوں نہ بتایا تم کوئی لاوارث تو نہ تھیں جس کے ساتھ کیسا ہی برا سلوک کیا جائے کوئی پوچھنے والا ہی نہ ہو“

روا کی غصہ بھری آواز کافی تیز تھی نیو نے گھبرا کر کچھ فاصلے پر موجود سکندر پر ایک نگاہ ڈالی وہ اسی کی طرف متوجہ تھا۔

”پلیز یہ کافی پرانی بات ہو گئی اب آپ اسے چھوڑ دیں“

ان الفاظ نے نیو کو لرزایا نور بلینز اس کے اور سکندر کے درمیان موجود تمام تعلقات کو جانتی تھی ورنہ کبھی بھی یہ بات اتنے وثوق سے آگے تک نہ پہنچائی وہ کیا کہہ سکتی تھی شرمندگی سے گردن جھکا لی اس کی آنکھیں لبالب پانی سے بھر گئیں۔

”اس کا مطلب یہ ہو اور بلینز نے جو کچھ مجھ سے کہا سب سچ ہے۔“

”اس نے آپ سے اور کیا کہا؟“

”بس یہی کہ اس نے سکندر کو پابند کر رکھا تھا وہ کبھی بھی تمہیں ہاتھ نہ لگائے گا اور یہ بھی کہ سکندر کوئی ایسا راستہ تلاش کر رہا ہے جس پر چل کر تمہیں واپس بھیجا جاسکے کیونکہ تمہاری یہاں رہائش سکندر کے لئے خطرہ ہے اگر وہ تمہیں طلاق دیتا ہے اور تم لائیشیا ہی رہ جاتی ہو تو سکندر اپنے بیٹے تمہیں دینے کا پابند ہو گا بصورت دیگر تمہارے وطن واپسی کی صورت میں تم بچے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتیں اور اب یہ دونوں مل کر تمہیں اس طرح یہاں سے نکالنا چاہتے ہیں کہ تمہارا پیاسا سواے پاکستان واپسی کے کوئی دوسرا راستہ نہ بچے۔“

روزیہ نے ایک ہی سانس میں ساری تفصیل اسے سنادی جسے سنتے ہی نیو کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ سر کے بل اونچائی سی نیچے آگئی ہو سکندر کے رویے کی تبدیلی کی وجہ وہ اب سمجھ پاتی تھی آج بھی روزیہ ہی اس کے کام آئی تھی اگر وہ اسے یہ سب نہ بتاتی تو جانے اس کا کیا حشر سکندر کے ہاتھوں ہوتا تو تھا۔

”بھائی میں تو سمجھ ہی نہ پا رہی تھی کہ سکندر اور نور بلینز کے تعلقات ایک دم ختم کیسے ہو گئے بہر حال آپ کا بہت بہت شکریہ جو آپ نے مجھے بروقت ہی سب کچھ بتا دیا اب میں ان شاء اللہ اپنے بچاؤ کی کوئی نہ کوئی راہ ڈھونڈ کر ہی رکھوں گی۔“

وہ اظہار تشکر میں روزیہ کے دونوں ہاتھ تمام کر لی۔

”میری اتنی مشکور ہونے کی ضرورت نہیں ہے تم میری بہنوں جیسی ہو بس میں صرف تمہیں خبردار کرنے آئی تھی اپنا خیال رکھنا۔“

وہ اس کے گال چھتیا کر اٹھ کھڑی ہوئی کیونکہ رفیقہ اور فاطمہ واپس آنے والی تھیں اور روزیہ ان کی واپسی سے قبل ہی وہاں سے نکل جانا چاہتی تھی روزیہ کے انکشاف نے دنیا کے ہر رشتے سے نیو کا اعتماد ختم کر دیا وہ سوچ نہ سکتی تھی لوگ اس طرح بھی دھوکا دیتے ہیں وہ ساری رات اس نے الجھتے ہوئے گزار دی سکندر کی تہہ در تہہ چھپی شخصیت کا جب بھی کوئی نیا پہلو اس کے سامنے آیا تو اسے شک ہی کر گیا تھا اسے حیرت ہوئی تھی دنیا میں سکندر جیسے موجد بھی موجود ہیں اس نے تو اشتہام صاحب، جنید اور امان کے بعد سنان اور حمزہ کو ہی دیکھا تھا مگر ان میں سے کوئی بھی سائب کی خصلت رکھنے والا مرنہ تھا مگر جو اب اس نے سکندر کی صورت میں دیکھا تھا اس نے دنیا کے تمام مردوں کو اس کی نظروں سے گرا دیا تھا وقت نے نیو کو بہت کچھ سکھایا تھا اب وہ کمزور نہ رہی تھی اپنا دفاع کرنا جان چکی تھی اب وہ خود کو کوئی طور پر آمادہ کر چکی تھی کہ اسے وطن واپس جانا ہے مگر اپنے بچوں کے ساتھ کس طرح؟ یہ ایک الگ مسئلہ تھا بہر حال طے تو یہ ہی ہوا تھا کہ وہ جب بھی واپس گئی حماد اور ابوذر کو لے کر ہی جائے گی اس سلسلے میں اسے کیا حکمت عملی تیار کرنا ہوگی، اب صرف یہ سوچنا باقی تھا ورنہ سکندر کے پلان کے مطابق وہ اس گھر سے خالی ہاتھ ہی واپس بھیجی جاسکتی تھی جو اسے کسی طور قبول نہ تھا جس جنگ کا آغاز سکندر کر چکا تھا اس کا اختتام نیو نے کرنا تھا مگر اپنی پسند کے مطابق اب یہ سوچنا تھا کہ یہ سب کس طرح ممکن ہو؟ پھر یہ بھی طے تھا اگر سکندر اسے گھر سے نہ نکالے طلاق نہ دے تو وہ سمجھو ناکی زندگی عمر بھر گزار سکتی تھی بصورت دیگر وہ اپنے بچے سکندر کے حوالے بالکل نہ کرے گی یہی سوچتے سوچتے رات تمام ہو گئی صبح نیند پوری نہ ہونے کے سبب اس کی طبیعت سارا دن بوجھل سی رہی۔

”کیسے چھوڑیں تم فون ڈور اسکندر اور اس کی ماں کو میں پوچھوں ان سے پرائی بیٹیوں کے ساتھ یہ سلوک کیا جاتا ہے غضب خدا کا ہم بھی ہموں والے ہیں اس طرح بلا سبب تو انہیں نکال باہر نہیں کرتے حد ہے میں تو سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ یہ لوگ اس قدر بیکور ڈھوں گے ہمیں تو بھائی صلح نے چھسایا دیا۔“

ردا جو لونا شروع ہوئی تو چپ ہونے میں ہی نہ آئیں۔

”تم فون ڈور اسکندر کو فون میں اس سے بات کرو۔“

”کوئی ضرورت نہیں ہے آپ کو کسی سے بات کرنے کی جو ہونا تھا ہو گیا اب آپ کیا چاہتی ہیں میں اپنا گھر مار چھوڑوں۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی آواز بلند ہو گئی ردا ایک دم چپ سی ہو گئیں۔

”میں نے یہ کب کہا؟“

”تو پھر اور کس لیے آپ یہ سب کہہ رہی ہیں؟ براہ مہربانی آپ مجھے میرے حال پر چھوڑیں میرے کسی معاملے میں اندر فیرت کریں میری زندگی ہے مجھے جینے دیں۔“ وہ پہلے ہی پریشان تھی ردا کی باتوں نے اسے مزید پریشان کر دیا نہ چاہتے ہوئے بھی وہ انٹرایسڈ ہاویل گئی اور پھر ردا کی کوئی بات سننے اس نے فون بند کر دیا۔

”ٹوبھلا یہ کیسی ماں ہے جو بیٹی کو طلاق دلوانا چاہتی ہے؟“

لاؤنج میں پھیلے سکوت کو فاطمہ کی آواز نے توڑا تبھی نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا کارپٹ پر کھیلنے ہوئے ابوذر کو اٹھایا اور اپنے کمرے میں چلی گئی پھر پہلی ہی فرصت میں اس نے ریجہ کو کال ملائی۔

”تم نے یہ سب کو ماما کو بتایا ہے؟“

ساری بات تفصیل سے اس کے گوش گزار کرنے کے بعد اس نے سوال کیا اس کے خیال میں ریجہ کے علاوہ یہ خبر پاکستان تک پہنچانے والا اور کوئی نہ تھا لیکن ریجہ کے جواب نے اسے حیران کر دیا۔

”میں میرے پاس تو صرف شفا کا نمبر تھا جو موبائل چیچ کرنے کے بعد گم ہو گیا ویسے بھی مجھے کیا ضرورت ہے یہ سب کچھ آئی کو بتا کر انہیں پریشان کرنے کی۔“ ریجہ کی بات کافی حد تک درست تھی۔

”پھر یہ سب کچھ پاکستان میں اس کی ماں تک کیسے پہنچا۔“ وہ سوچ میں پڑ گئی۔

”پتا نہیں کسی انجان نمبر سے ماما اور امان کو مسلسل مہسج آرہے تھے جس میں یہ سب کچھ اور بھی بہت کچھ بتایا جا رہا تھا تمہارے بارے میں کافی انفارمیشن اس نمبر کے ذریعے ہمیں دی گئی تھی۔“

شفا سے رابطہ ہوتے ہی اس نے ہر بات بڑی تفصیل سے بتائی ایسا کون ہو سکتا تھا جو اس طرح کے مہسج کر کے اس کی ماں کو بھڑکا رہا تھا۔

”نور ہلیز! وہ میرے خدا یا تو کیا نور ہلیز پاکستان مہسج کر رہی ہے؟ مگر اس کے پاس وہاں کے نمبر کیسے آئے؟“

اسکندر سے لیا ہو تو پھر اسکندر بجائے نور ہلیز کو نمبر دینے کے خود یہ سب کچھ تو نہیں کر رہا۔ ”وہ جتنا سوچتی اچھی جاتی ڈوری کا کوئی سرا اس کے ہاتھ میں نہ آ رہا تھا بظاہر تو لگتا تھا ہر چیز چھپتی جا رہی ہے۔“

”ہم تمہیں یہاں صرف ایک ماہ تک رکھ سکتے ہیں اس سے زیادہ کی ہمیں بالکل بھی اجازت نہیں ہے ایک ماہ تک تمہیں اپنی رہائش کا کوئی دوسرا انتظام کرنا ہو گا تم بغیر اجازت یہاں سے باہر بھی نہ جاؤ گی۔“

آئی فونے بات کرتے کرتے رک کر اپنے سامنے بیٹھی لڑکی پر ایک نظر ڈالی جو سر جھکائے مسلسل اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں کچھ تلاش کر رہی تھی انہیں پہلی ہی نظر میں یہ خوبصورت لڑکی اچھی لگی تھی۔

”دراصل ہماری مجبوری ہے یہاں کے قانون کے تحت ہم کسی بھی عورت کو ایک ماہ سے زیادہ نہیں رکھ سکتے مجھے امید ہے تم میری یہ مجبوری سمجھ گئی ہو گی۔“ آئی فون نے پھر سے اس پر ایک نظر ڈالی۔

”جی مجھے منظور ہے۔“ وہ آہستہ سے بولی۔ آئی فون نے دراز کھول کر ایک فارم نکالا۔

”اوکے پھر تم اسے فل کر کے جمع کراؤ۔“ اس نے خاموشی سے فارم تمام لیا اس کے اندر درج تمام ہدایات کو اچھی طرح پڑھنے کے بعد اسے فل کر کے آئی فون کے حوالے کر دیا۔ انہوں نے فارم پر ایک نظر ڈالی اور اپنے سامنے رکھی ٹھنٹی بجائی لگے ہی پل ایک ملائی لڑکی اندر داخل ہوئی۔

”سستی اسے دوم نمبر 25 میں پھوڑاؤ۔“

آئی فون کی بات سنتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی کوئی سالان اس کے پاس تھا نہیں صرف کندھے پر موجود بڑے سے بیک میں دو عدد جوڑے اور ضرورت کا کچھ سامان تھا اس کے علاوہ اس کے زیورات اور پیسے اسی بیڈ بیگ میں تھے جسے سنبھالتے ہوئے وہ بیڈریاں چڑھ کر دوم نمبر 25 کے دروازے کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

ابھی صرف چار ہی بجے تھے ابوذر کے رونے سے جو اس کی آنکھ کھلی تو دوبارہ نیند آئی محال ہو گئی کروٹیں بدل بدل کر اس کا جسم دکھ گیا اسکندر کمرے میں نہ تھا شاید وہ رات کے کسی پہرائی اسٹڈی میں چلا گیا تھا ایسا وہ اکثر پشتر ہی کرتا تھا اب نیو اس تمام صورت حال کی عادی ہو چکی تھی۔ نیند خراب ہونے کے سبب اس کا سر دکھنے لگا اور کافی کی طلب شدید ہو گئی وہ خاموشی سے اٹھی پاؤں میں چپل پہنی کمرے سے باہر آگئی شیشے کی دیوار سے پرے بڑے سے لان میں آم کا درخت جھوم رہا تھا شاید بارش ہو رہی تھی رات کے اس سے اسے یہ سب بہت ہی ہولناک لگا وہ یک دم ڈر سی گئی لکڑی کی دیوار سے اس پار ایک لمبا سا نیلوا کھڑا تھا رات کے اس پر جانے وہ کس سے فون پر باتیں کرنے میں مصروف تھا یہاں اکثر جو ریاں نیلوی کرتے تھے وہ جلدی سے کچن میں داخل ہو گئی کچن کے سامنے اسٹڈی دوم مکمل طور پر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا جبکہ اسکندر بیڈ سے ٹائٹ بلب روشن کر کے سوتا تھا اسے اندر میرے میں نیند ہی نہیں آتی تھی۔

”اسکندر کہاں ہے؟“ بے اختیار ہی نیو نے سوچا ”ایدا کا دروازہ بند تھا جانے اس کے من میں کیا آئی کافی کا کپ لے کر لاؤنج میں رکھے صوفے پر ہی بیٹھ گئی جو ایدہا کے کمرے کے عین مقابل تھا اسے زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا صرف آدھے گھنٹہ میں ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور اسکندر ایک دم باہر آگیا۔ نیو نے اندازے کی دھڑکی پر حیران رہ گئی اسکندر کو امید نہ تھی رات کے اس پر ایک بار پھر نیو اسے رگے ہاتھوں پکڑ لے گی۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو؟“ جی جینپ منٹانے کے لیے وہ اس پر چڑھ دوڑا۔

”ویسے ہی طبیعت ٹھیک نہ تھی اس لیے باہر آکر بیٹھ گئی۔“ آواز اس کے گلے میں پھنسی سی گئی آنسوؤں کا پھندا لگ گیا تھا

”دراصل میں فم کھلی بیمار ہوں ڈاکٹر سے علاج کروا رہا ہوں۔“

یہ جملہ ابوذر کی پیدائش کے فوراً بعد اسکندر نے اس سے کہا تھا۔ اس کا دل چاہا وہ اسکندر کا گریبان پکڑ کر سوال کرے تم اگر فم کھلی ان فٹ ہو تو پھر ایدہا کے کمرے میں آؤ گی رات کو چھپ کر کیا کرنے جاتے ہو مگر وہ صرف سوچ کر رہ گئی۔

”کیوں جھوٹ بولتی ہو صاف کو میری جاسوسی کرنے کے لیے تم یہاں بیٹھی ہو۔“ وہ اپنی آواز دہاتا ہوا غرایا۔

”آپ میری شکل کیلک کر رہی ہو انھوں یہاں سے دھج ہو جاؤ۔“ اس کی یہ دہلی دہلی سی آواز بھی ایدہا کے کمرے میں ضرور جا رہی تھی اس بات کا اندازہ نیو کو بخوبی تھا وہ فوراً ”کھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی شرمندگی سے اس کی ہتھیلیاں جھجک گئیں۔“

”آئندہ بھی زندگی میں میری اس طرح جاسوسی مت کرنا ورنہ زمین میں زندہ گاڑوں گا۔“

کمرے میں جاتے جاتے اسے اپنے پیچھے سکندر کی آواز سنائی دی وہ لڑکھڑاتے قدموں سے اپنے کمرے میں آئی اور بستر پر اوندھے منہ گر کر جو روٹا شروع کیا تو چپ ہونے میں ہی نہ آئی ویسے بھی یہاں کون تھا جو اس کا یہ روٹا دیکھتا اور اسے چپ کروا تا یہاں تو اپنے آنسو اسے خود ہی پونچھنے تھے اس احساس نے اس میں ہمت پیدا کی وہ خاموشی سے اٹھی ہاتھ دھو کر اپنے منہ پر پانی کے چھینٹے مارنے لگی۔

”یہ شہل ہے اس کا تعلق انڈیا سے ہے یہ فلہینا فرام اٹھو نیشیا حبیبہ بنگلہ دیش کی رہائشی ہے میری قلیاں کس۔“

سستی ہال میں موجود تمام عورتوں سے فردا فردا اس کا تعارف کروا رہی تھی مختلف رنگ و نسل سے تعلق رکھنے والی مختلف عورتیں جن کے مذہب بھی ایک دوسرے سے مختلف تھے مگر وہ سب کے یکساں تھے اور اسی یکسانیت نے ان سب کو ایک لڑی میں پرو دیا تھا اسے حیرت ہوتی تھی ہر معاشرے کے لیے عورت کی حیثیت ایک ہی جیسی تھی کبھی تو اسے یقین بھی نہ آتا وہ دنیا کے نقشہ پر تیزی سے ابھرتے ہوئے ایک ترقی یافتہ ملک میں موجود ہے اسے محسوس ہوتا وہ اپنے دیش کے کسی پسماندہ علاقے میں زندگی گزار رہی ہے۔

”ہمارے مذہب نے تو عورت کو وہ بلند مقام عطا کیا جو اس سے قبل کسی مذہب کی عورت کو حاصل نہ تھا پھر کیوں ہمارے معاشرے کا مرد آج بھی عورت کا اسی طرح استحصال کرتا ہے جس طرح دور جاہلیت کا مرد۔“ یہ حبیبہ تھی جو اس کے حالات جان دہی تھی۔

”یاد رکھنا مرد جو کچھ بھی کرتا ہے اسے اس کا جائز اور ناپسندیدہ کام پر اسے نوازی بھی عورت ہی ہوتی ہے چاہے وہ اس کی ماں ہو بہن یا محبوبہ۔“ شہل کے الفاظ تو بے فیصد سچائی پر مشتمل تھے اور اس کی اس بات سے وہاں موجود سب ہی عورتیں متفق تھیں۔

”یہ میرے دوست ہیں تم رکھ لو۔“ سستی جانتی تھی اس کے پاس پہننے کو صرف دوڑے ہیں۔

”اور یہ میری چیل بھی لے لو میں نے ابھی تک استعمال نہیں کی۔“

یہ فلہینا تھی جو شاید مقامی ہی تھی اور اپنی ساری گفتگو طائی میں ہی کر رہی تھی انکار کی گنجائش ہی نہ تھی اس نے خاموشی سے سارا سامان اٹھا لیا ان سب کی اس محبت پر اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں ان سب کے اظہار محبت نے اس کے دل پر چھائے غبار کو کچھ دیر کے لیے دھو دیا سب کے حالات جان کر اسے احساس ہوا دنیا میں واحد وہ دہی عورت نہیں ہے جس کے سر سے چھت چھینی ہو بلکہ دنیا تو ایسی عورتوں سے بھری پڑی ہے دنیا میں شاید ہر فرد ہی دہی ہے ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ ان کے دلوں کے اندر جھانک کر دیکھا جائے سچ ہے یہ دکھ ہی ہیں جو انسان کو انسان سے جوڑ دیتے ہیں اپنے زخم لگاتے ہیں اور ان کو بھرنے کے لیے غیروں کے ہاتھ آگے بڑھتے ہیں پچھلی دنیا کو چھوڑ کر وہ ایک نئی دنیا میں قدم رکھ چکی تھی جہاں قدم قدم پر موجود کانٹوں سے اپنا وجود بچاتے ہوئے اسے آگے کا سفر طے کرنا تھا پھر گزرے دن نے اسے زندگی گزارنے کا ایک نیا سبق دیا۔

”تمہیں پتا ہے سنان اور مرینہ کا بہت بڑا جھگڑا ہوا ہے۔ جس کے باعث وہ مرینہ کو چھوڑ کر پاکستان واپس آگیا“ یقین جانو رحاب بھائی اور ان کی امی تو اتنی پریشان ہیں کہ کیا بتاؤں۔“ شفا اسے سنان کے بارے میں سب کچھ تفصیل سے بتا رہی تھی جبکہ اسے سنان اور مرینہ کے کسی بھی مسئلے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

”چھوڑو ایک بات پوچھوں سچ بتاؤ گی؟“ شفا شاید اس کی عدم دلچسپی بھانپ چکی تھی اس لیے یہی بات کا رخ

موڑتے ہوئے بولی۔

”ہاں پوچھو۔“ وہ بے پروا بیانی سے بولی۔

”تمہیں سنان فون کرتا ہے؟“

”تمہیں کس نے کہا؟“ شفا کے سوال نے بیہوش کو اچھا خاصا پتا ڈالا۔

”اصل میں اس کی اور مرینہ کی۔“

”تم سے یہ کس نے کہا کہ وہ مجھے فون کرتا ہے؟“ بیہوش تیزی سے اس کی بات کاٹ کر بولی سنان اور اس کی بیوی کا قصد اس کے لیے غیر ضروری تھا اس کے اپنے مسئلے ہی کم تھے جو ان پر دھیان دیتی۔

”رحاب بھائی کا خیال ہے اور شاید مرینہ بھی یہی سمجھتی ہے۔“

”پتا نہیں کیوں لوگ اتنے فضول قیاس آرائیاں کر کے دوسروں کا بیٹا حرام کرتے ہیں تم اچھی طرح جانتی ہو میں نے سنان کا باب بند کرنے کے بعد بھی اس سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی میں اس قسم کی کوئی فضول خواہش اپنے دل میں محسوس کرتی ہوں۔ سنان نے جو میری انائی توہین کی بھی نہیں عمر بھر نہیں بھول سکتی اپنی بہن کا گھر آباد کرنے کے لیے اس نے مجھے برباد کیا میری تو سمجھ میں ہی نہیں آتا رحاب کیوں میرے پیچھے پڑی رہتی ہے کیوں ہر معاملے میں میرا نام لیتی ہے اسے بالکل بھی شرم نہیں آتی۔“ بات کے اختتام کے ساتھ ہی وہ غصہ میں آئی اس کی آواز غیر ضروری طور پر تیز ہو گئی۔

”کس کا فون ہے؟“ سکندر اس کے کان کے قریب بولا وہ یکدم گھبرا اٹھی اس سے قبل کہ وہ کوئی جواب دیتی سکندر اس کے ہاتھ سے فون لے چکا تھا اس کے ہاتھ پیر بالکل ٹھنڈے پڑ گئے۔

”اصل میں سنان نے مجھے ایک بار فون بھی کیا تھا تمہارے نمبر کے لیے مگر۔“

”مگر تو تم اپنی بہن کو ان کے یہاں کے مہیجہ دیتی ہو۔“ سکندر کی دھماکنے کی اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا کیا جواب دے۔

”صبر کرو میں ابھی تمہارے باپ کو فون کرتا ہوں جس نے تم جیسی گندی اولاد پیدا کی جو شادی کے بعد بھی کسی ایک کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔“ اس کے الفاظ شفا کی سماعتوں میں زہرین کرار ترے تھے وہ کبھی امید نہ کر سکتی تھی یہ سکندر جیسا قاتل اور پرحال لکھا شخص بول رہا ہے۔ سکندر کا انداز گفتگو اس قدر گھٹیا بھی ہو سکتا تھا تو سن کر ہی شاکند ہو گئی تھی۔

”میں تمہارے میاں کو بھی فون کروں گا تاکہ اسے تمہارے کالے کر توت بتا سکوں یقیناً“ تم بھی دیکھی ہو گی جیسی تمہاری بڑی بہن ہے بد چلن اور آوارہ۔“ اور پھر شفا کی کوئی بات سننے اس نے فون بند کر دیا۔

”تو تم ابھی بھی باز نہ آئیں اس سنان سے بات کرنے سے۔“

اس نے ہاتھوں سے چڑ کر نبیہ کی کوساٹنے دو بار پردے مارا اور پھر اس کے ساتھ ہی لالٹوں سے اس پر تاپڑ توڑ حملے کیے اس دھان پان سی لڑکی سے اپنا بچاؤ کھانا مشکل ہو گیا ابو زہرا کو ازباندہ روٹنے کا قاطعہ بھاگ کر کمرے میں آگئیں ان کے پیچھے ہی سیکنڈ اور کیر بھی تھے۔

”کیا وہاں سکندر بالکل ہو گئے ہو تم چھوڑو اسے۔“ قاطعہ اسے چھڑوانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بولیں۔

”ماں تم سب کو اہر متا میں اسے طلاق دے رہا ہوں یہ ایک بد چلن عورت ہے یہ میری وفادار نہیں ہے میں نے اسے طلاق دی۔“

شاید یہ سب تو اس کے مقدر میں بہت پہلے ہی لکھا جا چکا تھا وہ تو صرف اس کی کوشش تھی جو آج تک وہ اپنا گھر بچانے کے لیے کر رہی تھی گھر جو اس کا بھی تھا ہی نہیں سکندر کے منہ سے نکلنے والے الفاظ نے کمرے میں

سے اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گیا امان نے آگے بڑھ کر اپنی ہلکتی ہوئی ماں کو سینے سے لگالیا وہ خود بھی بہت پریشان تھا اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا وہ فوری طور پر ایسا کیا کرے جس سے نیو کی کھوئی ہوئی خوشیاں اسے واپس لوٹا سکیں۔

”اور اگر میں تمہیں نہ ملی تو۔۔۔“ وہ کھلکھلاتے ہوئے ہنس کر بولی۔
 ”تو شاید میں مری جاؤں گا مجھے وہ زندگی ہی نہیں چاہیے جس میں تم نہ ہو۔“
 ”جھوٹ سو فصد جھوٹ ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔“

”کیوں نہیں ہو سکتا؟ کیا تم مجھے اتنا ڈھیٹ سمجھتی ہو جو مجھ پر تمہاری دوری کا کوئی اثر ہی نہ ہو گا۔“ وہ ذرا اسی ناراضگی سے بولا۔

”تم ڈھیٹ نہیں ہو لیکن سچ تو یہ ہے کہ کوئی کسی کے بنا مرنے نہیں ہے یقین نہ آئے تو آنا لیتا، آنا نکل شرط ہے۔“ وہ پھر سے ہنسی اس نفرتی ہنسی کی آواز نے سنان کو بے چین کر دیا اس نے پٹ سے اپنی آنکھیں کھول دیں کمرے میں گرا سکوت طاری تھا وہ ایک گری سانس لیتا ہوا اٹھ بیٹھا تکیے کے نیچے سے سگریٹ اور لائٹر نکالا کھڑے ہوتے ہوئے اپنے بال دونوں ہاتھوں سے سنوارے، کمرے کا دروازہ کھول کر چاہا کہ باہر نکل جائے اسی دم رحاب کے الفاظ نے اسے ساکت کر دیا وہ بتالبا ”کچھ دیر قبل آئی تھی اور اس وقت مجھ کو اپنے سسرال میں پیش آنے والے کسی نامہ واقعہ کی بابت بتا رہی تھی جس کا تعلق شاید نیو کی ذات سے تھا یہ ہی وجہ تھی جو نیو کا نام سننے ہی سنان دواڑے میں ہی رک گیا۔“

”مجھے نہیں لگتا اس کا شوہر اب اسے رکھے گا۔“

”اللہ نہ کرے جو ایسا ہو ڈرا سوچ سمجھ کر بولا کرو۔“ مجھ نے ذرا سی خفگی سے رحاب کو ٹوکا جو لاٹکان اپنا تجزیہ پیش کر رہی تھی۔

”نہیں امی یہ سچ ہے سکندر بہت بد تمیز آدمی ہے جنید بتا رہے تھے اس نے فون پر شفا کے ساتھ بھی بہت بد تمیزی کی ہے۔“

”چلو اللہ جو کرے بہتر ہی کرے ہم کیوں کسی کے لیے برا سوچیں۔“

”بہر حال یہ تو کنفرم ہے کہ۔۔۔“ الفاظ رحاب کے منہ میں ہی رہ گئے سنان کمرے سے باہر نکل آیا تھا اس پر نظر پڑتے ہی رحاب نے جملہ ادھر اچھوڑ دیا۔

”امی مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“ وہ سگریٹ سلگاتا ہوا بولا کافی عرصہ سے وہ اسی طرح سرعام سگریٹ پیتا تھا حالانکہ ان کی فیملی میں سگریٹ پینا معیوب سمجھا جاتا تھا۔

”ہاں بیٹا بولو کیا بات ہے؟“ سنان کی کیفیت نے مجھ کو ذرا پریشان کر دیا بات ضرور کچھ غیر معمولی تھی اس کی حالت دیکھ کر یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا تھا۔

”مگر سکندر نیو کو طلاق دے دے تو میں اس سے شادی کے لیے تیار ہوں مجھے وہ اپنے بچوں سمیت قہر ہے۔“ یہ سب کہہ کر وہ رکانیں بلکہ حیرتیز چٹا کمرے سے باہر نکل گیا یہ دیکھتا کہ اس کی اس بات نے کمرے میں موجود رحاب اور مجھ پر کیا اثر ڈالا ہے۔

”اس کا داغ تو نہیں خراب ہو گیا جو اتنی بڑی بات کہہ کر چلا گیا اپنی بیوی کا ذرا احساس نہیں ہے نیو کی فکر ابھی بھی نہیں گئی۔“ رحاب بیڑا تے ہوئے بولی، ”مجھ نے کوئی جواب نہ دیا وہ اپنی ہی کسی سوچ میں گم تھیں۔“

کھل طور پر سکوت طاری کر دیا اسے بڑی مشکل سے فاطمہ نے قابو کیا تھا۔ ”طلاق“ کا لفظ عورت کے لیے کسی قدر اذیت ناک ہوتا ہے اس کا احساس آج نیو کو ہوا تھا ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا دل اندر سے کسی نے چیر ڈالا ہو وہ ماری اذیت بھول گئی سکندر کے الفاظ نے اس کو جلا کر بھسم کر ڈالا تھا وہ بے اختیار چیخ چیخ کر رونے لگی سکندر کمرے سے نکل گیا فاطمہ بھی اس کے پیچھے ہی چلی گئیں سیکڑہ کچھ دیر تو دواڑے پر کھڑی آتے ہی پکٹی رہی پھر جانے کیا دل میں آیا آہستہ آہستہ آگے بڑھی گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ کر اسے گلے سے لگالیا وہ بلک بلک کر رو دی شاید اس گھڑی اسے رونے کے لیے ایک کند حاور کار تھا جو سیکڑہ نے دے دیا۔

شفا زار و قطار رو رہی تھی کمرے میں روا اور احتشام صاحب کے علاوہ حمزہ امان اور جنید بھی موجود تھے۔ سکندر نے فردا فردا ”سب کو ہی فون کر کے شفا پر الزام عائد کیا تھا کہ وہ نیو کو سنان کے بیانات پہنچاتی ہے سکندر نے جو کچھ کہا وہ صرف جھوٹ کا پلندہ تھا یہ بات کمرے میں موجود ہر شخص جانتا تھا ان کی سمجھ میں ہی نہ آ رہا تھا کہ سکندر کی اس گھٹیا حرکت کا مقصد کیا ہے؟ احتشام صاحب کی صلاح مجھ سے بھی تفصیلی گفتگو ہو چکی تھی۔ انہوں نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ وہ نیو کے گھر جا کر ساری صورت حال معلوم کریں اور پھر انہیں بتائیں۔

”شفا پلیز تم تو چپ کر دیکھیں اس طرح ہلکان ہو رہی ہو۔“ آخر حمزہ سے برداشت نہ ہوا تو بولی ہی پڑا۔

”حمزہ تم سوچ نہیں سکتے سکندر بھائی نے میرے ساتھ کتنی بد تمیزی کی ہے۔“

”بات تم سے کی جانے والی بد تمیزی کی نہیں ہے سوچنے والی بات یہ ہے کہ جب وہ ہزاروں میل دور تم سے اس طرح کا گھٹیا لوجہ استعمال کر سکتا ہے تو اس کا اندازہ گفتگو نیو کے ساتھ کیا ہو گا؟“

”یہ ہی سوچ سوچ کر میری جان سولی پر لٹکی ہے جانے میری بچی کس حال میں ہو گی پلیز آپ کسی طرح امان کو بھیجیں وہ جا کر اسے واپس لے آئے۔“ حمزہ کی بات نے روا کی بے چینی میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔

”ہر مسئلہ اتنے جذباتی ہو کر حل نہیں کیا جاتا کام سوچ سمجھ کر کرنے والا ہے غیر ملک کا مسئلہ ہے سو طرح کے پراہم ہوتے ہیں میں نے بھائی صاحب سے کہا ہے ان شاء اللہ جو بھی ہو گا اللہ بہتر ہی کرے گا۔“

پریشان تو احتشام صاحب بھی تھے مگر یہ وقت دواڑا کرنے کا نہ تھا یہ ہی وجہ تھی کہ انہوں نے روا کو اپنی طرف سے کسی دینے کی ناکام کوشش کی۔

”میری معصوم بچی کی زندگی برباد ہو گئی آپ نے بغیر سوچے سمجھے پرانے دس بیاد دیا جانے کس گناہ کی سزا تھی جو سکندر جیسا شوہر اس کا مقدر ٹھہرایا گیا بھلا وہ اس گھٹیا آدمی کے قابل تھی۔“ روا رونے لگیں ان کا بس نہ چٹا تھا وہ ڈر کر نیو کی پاس چلی جائیں۔

”یہ سب نصیب کی بات ہوتی ہے خاتون دور نہ ماں باپ جو بھی فیصلہ کرتے ہیں اپنی اولاد کے بھلے کے لیے کرتے ہیں باپ یا ماں اپنی اولاد کے دشمن نہیں ہوتے۔“ احتشام صاحب نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولے ہوئے سمجھایا۔

”ماں باپ نہیں ہوتے تو کیا بھائی ہوتے ہیں؟“ روا نے جنید پر ایک نظر ڈالتے ہوئے تنہی سے سوال کیا۔

”صاف بات تو یہ ہے سگے بھائی نے اپنی جھوٹی انا کے لیے میری بچی کو سولی چڑھا دیا ایسی کیا برائی تھی سنان میں جس کی بنا پر آپ نے اسے رشو دینے سے انکار کیا تھا ذرا لا ابالی ہی تھا اذیت کے ساتھ خود ہی سمجھ جاتا ابھی اس کی عمر ہی کیا تھی بھلا کوئی اس طرح بھی کرتا ہے جو آپ لوگوں نے کیا وہ کون سی خلی ہے سکندر میں جو اسے سنان سے نمایاں کرتی ہے یہ صرف جنید نے اپنی ضد کے لیے میری بیٹی کے نصیب پر سیاہی مل دی۔“ لاوا جو روا کے دل و دماغ میں کئی عرصہ سے پک رہا تھا ابل کر باہر آ گیا روا کے الفاظ نے جنید کو بھی بھر کر شرمندہ کیا وہ کچھ کھے خاموشی

”نکل میں کوشش کروں گی عبدالوہاب کے ساتھ اگر تمہارا بیگ دے جاؤں۔“ رعبہ نے اسے فون پر بتایا۔
 ”حقاً طے سے آنا ایسا نہ ہو وہ تمہیں سرخ کرتا مجھ تک پہنچ جائے۔“
 ”تم نے فکر ہو میں مکمل طور پر احتیاط کروں گی کیونکہ مجھے تمہاری اتنی ہی پریشانی لاحق ہے جتنی تمہیں خود اور میں دن رات دعا کر رہی ہوں کہ تم کسی طرح بحفاظت اپنے گھر واپس پہنچ جاؤ۔“

”آمین۔“ وہ صدق دل سے بولی۔

”بولیس دیا رہ تو نہیں آئی تھی تمہارے گھر۔“

”نی الحال تو نہیں بہر حال تم فکر مت کرو وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا اور ہاں یاد آیا آئی کا فون آیا تھا وہ بہت پریشان ہیں تم کسی طرح ان سے رابطہ کر کے اپنی خیریت کی اطلاع دے دو۔“

”ٹھیک ہے۔“ اس کا انداز سرسراٹے والے تھا۔

”وہاب بھائی نے میرے پاسپورٹ کا پتا کیا؟“

”کیا تو ہے مگر میرا خیال ہے تمہیں اس مقصد کے لیے خود پاکستانی ایجنسی جانا ہو گا اس کے بغیر یہ ناممکن ہے“
 پھر بھی جو ہو گا تم سے مل کر تمہیں وہاں سمجھا دیں گے۔ اچھا اب میں فون بند کرتی ہوں۔ اپنا اور ابوذر کا بہت بہت خیال رکھنا اللہ تمہیں اپنے امان میں رکھے۔“ رعبہ نے ڈھیروں ڈھیروں دعاؤں کے بعد فون بند کر دیا۔

”دیکھو سکندر تمہارے پاس ابھی بھی وقت ہے تم اپنی بیوی سے رجوع کر سکتے ہو ایک طلاق کے بعد رجوع کی گنجائش موجود ہوتی ہے۔“ صالح محمد کا یہ کوئی تیسرا چکر تھا جو انہوں نے فاطمہ کے گھر پچھلے ہیں پچیس دنوں میں لگایا تھا۔ وہ جب بھی آتے اول تو سکندر انہیں ملتا ہی نہ تھا جو اگر مل جاتا تو خاموشی سے سب کچھ سننا رتا کوئی جواب دینا مناسب نہ سمجھتا۔

”اللہ تعالیٰ حلال کاموں میں طلاق کو سب سے زیادہ ناپسند فرماتا ہے۔“

یہ مولانا عبدالرزاق تھے جو آج صالح محمد کے اصرار پر وقت نکال کر ایک بار پھر سکندر کے گھر موجود تھے۔ نبیو سر پر دوپٹہ اوڑھے بالکل خاموش بیٹھی تھی ابوذر اپنے کمرے میں رعبہ کی بیٹی کے ساتھ کھیل رہا تھا رعبہ اور عبدالوہاب کے علاوہ وہاں سیکرے اور اس کا شوہر بھی تھے جبکہ فاطمہ بچن میں موجود کچھ کھڑکڑ کر رہی تھیں رفید ابھی انہی کے ساتھ تھی روزینہ اور عمر کو بھی صالح محمد نے بلوایا تھا مگر انہوں نے آنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

”دیکھیں مولانا صاحب میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں مگر یہ ہے کہ میں اب نبیو کے ساتھ ایک پل بھی نہیں رہ سکتا لہذا اصل کوئی گنجائش باقی نہیں چھٹی۔“ وہ دونوں لہجہ میں بولا۔

”پھر بھی بیٹا اگر تم چاہو تو سب کچھ ممکن ہے۔“

”نہیں مولانا صاحب اب کچھ بھی ممکن نہیں ہے یہ میری طرف سے آزاد ہے میں آپ سب کے سامنے اسے آج دو سری طلاق دے رہا ہوں اس کے بعد یہ مجھ پر حرام ہو گئی۔“ وہ بدردی سے بولا۔

”سکندر کچھ تو خدا کا خوف کرو کیوں اس معصوم کے ساتھ اتنا برا ظلم کر رہے ہو۔“ عائشہ سے نہ رہا گیا اور وہ بولی ہی پڑیں۔

”وہ عورتیں جو اپنے خاوند کے ہوتے ہوئے دوسرے مردوں سے تعلقات استوار کرتی ہیں معصوم کیسے ہو سکتی ہیں؟“ سکندر کا انداز استہزائیہ تھا۔

”بہر حال میں نے اسے طلاق دے دی ہے اب آپ لوگ جو بھی فیصلہ کریں مجھے منظور ہے یہ اگر پاکستان جانا

چاہے تو میں نکل کر آ کر دوں گا اپنے زیور کے ساتھ بری کا تمام زیور بھی یہ لے جاسکتی ہے مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا مگر میں اپنا کوئی بچہ اسے نہ دوں گا یہ نہ صرف حماوت بلکہ ابوذر کو بھی یہاں چھوڑ کر جائے گی۔“

”یہ کیسے ممکن ہے تمہارا ادعا تو نہیں خراب ہو گیا تم ڈیڑھ سال کا بچہ اس کی ماں سے چھین لینا چاہتے ہو“ سکندر کی بات سنتے ہی صالح محمد کو غصہ آ گیا۔

”دیکھیں ماموں میں اس کا پاسپورٹ اسی شرط پر واپس دوں گا جب یہ پاکستان بغیر بچوں کے جانے کی ہامی بھرے گی۔“

”میں پاکستان واپس نہیں جاؤں گی۔“ چائیک ہی نبیو نے سر اٹھا کر اپنا فیصلہ سنایا۔

”جھانٹو پھر یہاں کیا کرو گی کس کے گھر میڈ لگو گی۔“

”جو بھی کروں گی مگر میں اپنے بچے چھوڑ کر واپس نہیں جاؤں گی۔“

”بہر حال وہ تمہارا مسئلہ ہے تم جہاں چاہو رہو مگر تمہارا پاسپورٹ تمہیں صرف اس وقت ملے گا جب تم اکیلے واپس جانا چاہو گی۔“

”ٹھیک ہے اسے میں اپنے گھر لے جاتا ہوں تم ایک دفعہ پھر اچھی طرح سوچ لو۔“

”حد ہے بھائی صالح وہ وطلاق دے چکا اب اس نے کیا سوچتا ہے۔“

فاطمہ نے بچن کے دروازے پر کھڑے ہو کر یا آواز بلند کہا۔

”ماں ٹھیک کہہ رہی ہیں تیری طلاق اسے ایک ماہ بعد مل جائے گی اور اگر یہ پاکستان واپس جائے گی تو یہ سارا عمل میں مکمل طور پر کورٹ سے کروا کر تحریری شکل میں دوں گا تاکہ بعد میں کبھی اسے کوئی مسئلہ نہ ہو بصورت دیگر میں اسے طلاق کے پیپر ز بھی نہیں دوں گا اب اگر آپ اسے اپنے گھر رہنے کے لیے لے کر جانا چاہیں تو بے شک لے جائیں مگر ابوذر ساتھ نہیں جائے گا۔“ سکندر کی سفارشی پورے عروج پر تھی۔

”جب اس کے اور ابوذر کے تمام پیپر ز تمہارے پاس ہیں تو پھر تمہیں کیا خطرہ ہے جو اسے بغیر بچے کے گھر سے نکال دے ہو۔“

عبدالوہاب کو نہ چاہتے ہوئے بھی بولنا پڑا اور نہ اس وقت وہ غصہ کی کیفیت میں سکندر کے منہ نہ لگنا چاہ رہا تھا۔

”میں ابوذر کا باپ ہوں اور میرا بچہ درد رکھوں گے گھروں میں نہیں پھرے گا یہ اگر اپنی عدت میرے گھر اپنے کمرے میں رہتے ہوئے پوری کرنا چاہے تو مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا اس صورت میں یہ دونوں بچوں کے قریب بھی رہ سکیں گے مگر بعد از عدت اسے یہ گھر چھوڑنا ہو گا اس سے پہلے یہ فیصلہ کر لے اسے واپس جانا ہے یا یہاں رہنا ہے اگر یہ واپس جانا چاہے تو میری آفر اپنی جگہ برقرار ہے۔“ وہ سب کچھ طے کیے ہوئے تھا نبیو کے پاس کوئی

دوسرا راستہ باقی نہ تھا سوائے سکندر کی ہر بات ماننے کے۔

”ٹھیک ہے مجھے تمہاری ہر بات منظور ہے مگر میری آپ سب سے ایک درخواست ہے۔“ نبیو کے الفاظ نے سب ہی کو اس کی جانب متوجہ کر دیا۔

”جب تک میں اپنے گھر اطلاع نہ دوں میری طلاق کے بارے میں کوئی بھی میرے گھر خبر نہ دے گا۔“

”یہ تمہارا ذاتی مسئلہ ہے تم انہیں اطلاع دو یا نہ دو میری فیملی کو اس بات سے کچھ لینا دینا نہیں ہے۔“ سکندر کے جواب نے اسے کس قدر مطمئن کر دیا۔

”ٹھیک ہے انکل میں اپنی عدت اسی گھر میں کروں گی اپنے بچوں کے ساتھ اس کے بعد کاتب تقدیر نے جو میرے نصیب میں لکھا ہو گا اسے قبول کر لوں گی کیونکہ میں مشیتِ ایزدی سے لڑنے کی ہمت نہیں کر سکتی۔“

اپنے آنسوؤں کو پیتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ قدرت نے اسے خود

خود تا تم دے دیا تھا پانچ چھ ماہ کی مدت کم نہیں ہوتی اب اسے جو کچھ کرنا تھا اسی دوران کرنا تھا ورنہ ساری زندگی کی کوشش سے بھی اس کے ہاتھ کچھ آنے والا نہ تھا۔

ربیعہ اسے بیک پہنچا گئی تھی جس میں اس کی ضرورت کا کچھ سامان موجود تھا۔
 ”تم پاکستان اہمبسی جاؤ اور اپنے پاسپورٹ کے لیے کوشش کرو کیونکہ بغیر پاسپورٹ تم یہاں سے نہیں جاسکتیں اگر ممکن ہو تو پاکستان اپنے گھرانوں سے رابطہ کر کے انہیں بھی کہو کہ وہاں اہمبسی جا کر تمہارا مسئلہ بیان کریں شاید اس طرح تمہارے لیے کچھ آسانی ہو سکے۔“ عبد الوہاب جاتے جاتے اسے سمجھاتے ہوئے بولا۔
 ”تمہارے لڑن کا کتابا لکل ٹھیک ہے تم اپنی اہمبسی جاؤ اور ان کو تمام پھونٹاؤ وہ ضرور تمہاری مدد کریں گے۔“ عبد الوہاب کے جانے کے بعد آئی فوائے اسے سمجھایا۔
 ”مگر مجھے تو نہیں پتا اہمبسی کہاں ہے؟“ وہ تھوڑا سا شرمندہ ہو گئی۔
 ”وہ کوئی مسئلہ نہیں ہے میں تمہیں ٹیکسی بائیر کروں گی تم اس میں با آسانی آجاسکو گی، ٹیکسی والا ہمارا قاتل اعتبار بندہ ہے تمہیں اس سے کوئی پر اہم نہ ہو گا۔“
 ”ٹھیک ہے آپ ٹیکسی بلا دیں میں آج ہی جاؤں گی۔“ اس نے گھڑی پر ایک نظر ڈالی ابھی صرف گیارہ بجے تھے جبکہ عبد الوہاب نے بتایا تھا اہمبسی چار بجے تک کھلتی ہے۔
 ”اُس کے تم تیار ہو جاؤ ٹیکسی کے لیے کال کرتی ہوں۔“ آئی نے اپنے سامنے رکھے فون پر نمبر ڈائل کرتے ہوئے کہا۔

”تو کیا تم اپنے بچے چھوڑ کر پاکستان واپس چلی جاؤ گی؟“ ربیعہ اس کے پیچھے ہی کمرے میں آگئی تھی جہاں وہ اپنا سردوں ہاتھوں میں تھا بے بیٹھی تھی۔
 ”نہیں۔“ اس نے مختصر جواب دیا۔
 ”تو کیا تم مستقل ملایشیا میں ہی رہنا اختیار کرنا چاہو گی؟“
 ”پتا نہیں یا رب مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا اصل میں مجھے یہ امید نہ تھی کہ سکندر میرا پاسپورٹ منبٹ کر لے گا۔“
 ”پھر تم نے اب کیا سوچا ہے؟“ ربیعہ اپنی آواز کو دھیمے کر کے بولی۔
 ”فی الحال تو میں نے اپنی سم نکال کر بیٹھ کر دی ہے ہو سکے تو جب دوبارہ مجھ سے ملے آؤ میرے لیے ایک حدود ملتی آتا اور ابھی جاتے ہوئے میرا یہ زیور اور کچھ رقم اپنے ہینڈ بیگ میں چھپا کر لے جاؤ۔“ اس نے جلدی سے بیڈ کے گدے کا کونا الٹ کر ایک تھیلہ برآمد کیا جس میں زیورات کے علاوہ کافی تعداد میں ملائی کرنسی بھی تھی جو وہ پچھلے دو سالوں سے جمع کر رہی تھی۔
 ”یہ اپنے ہینڈ بیگ میں رکھ لو۔“

اس نے وہ تھیلہ جلدی جلدی ربیعہ کے بیگ کی زپ کھول کر اس میں ڈال دیا اس دوران اس کا پورا دھیان دروازے کی سمت تھا یہ وہ کوئی فیصلہ کر چکی تھی جو اس کے چرے پر درج تھا مگر کیا؟ یہ ابھی جانتا باقی تھا ربیعہ کو آج والی بیوہ اس بیوہ سے بہت مختلف لگی جسے وہ جانتی تھی بیوہ کے پر عزم چرے نے ربیعہ کو حیران سا کر دیا۔
 ”مگر تم کو تو میں تمہارے لیے کسی ملازمت کا بندوبست کر لوں۔“

”نہیں ربیعہ یہ تو طے ہے مجھے واپس جانا ہے اپنے وطن جو میرے تحفظ کا ضامن ہے میں اپنی زندگی ایک غیر

ملک میں نہیں گزار سکتی۔“

”تو کیا تم اپنے بچوں کے بغیر جاؤ گی؟“ اس نے اپنا سوال ایک بار پھر دہرایا۔

”میں ابوذر کو ساتھ لے کر جاؤں گی۔“ اس کے لہجہ میں مضبوطی جھلک رہی تھی۔

”کس طرح لے کر جاؤ گی تمہارے پاس تو اپنے کوئی پیپر نہیں ہیں ایسے میں تم کس طرح رسک لو گی ابوذر کو لے کر جانے کا جبکہ اس کی پیشین گوئی بھی یہاں کی ہے میری ماں تو بے کاری خند چھوڑو اور سکندر سے کہہ کر اپنا ٹکٹ لو پاکستان واپس جاؤ اگر تمہارے نصیب میں اولاد کی محبت ہوئی تو یہ بچے ایک دن تم سے ضرور آکر ملیں گے ورنہ میرا مشورہ مانو تم ابھی جوان ہو، خوبصورت ہو، واپس جا کر دوسری شادی کر لو جب وہاں بچے ہو جائیں گے تو سب کچھ بحال جاؤ گی۔“ ربیعہ پورے خلوص سے اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔

”مگر مجھ پر یہ تو طے ہے کہ میں ابوذر سکندر کو نہیں دوں گی اور نہ ہی میں اپنی جوانی اس ملک کی سرزمین پر جاہ کروں گی جس طرح میں اپنی باقی زندگی حواد کے لیے ترپتے ہوئے گزاردوں گی اسی طرح ابوذر کی جدائی سکندر کا مقدر ٹھہرے گی، ہر فیصلہ اس طرح نہ ہو گا جس طرح یہ لوگ چاہتے ہیں بہر حال اب اگر تم مجھ سے رابطہ کرنا چاہو تو سنو شوہا کو میرے لیے مسیح دے دینا جب دوبارہ آؤ تو ہم لیتی آتا ساتھ ہی کوئی ایسی جگہ کا بھی پتا کر کے آتا جہاں میں عدت کے بعد جا کر رہ سکوں۔“ عبد الوہاب ربیعہ کو بلا رہا تھا اس لیے نیوٹے جلدی جلدی ایک پیپر پر شوہا کا موبائل نمبر لکھ کر اس کے حوالے کر دیا۔

”تم اسے فون کر کے میرے بارے میں پتہ پتا اور کہنا کہ وہ مجھ سے آکر مل جائے مجھے اس سے بھی کام ہے۔“

”ٹھیک ہے۔“ ربیعہ پیچھے اپنے ہینڈ بیگ میں رکھتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں کوشش کروں گی کسی اچھی مسلم فیملی میں تمہیں جاب دلا دوں، جہاں تم ان کے فیملی ممبر کی طرح رہ سکو وہاں رہ کر تم اپنے لیے بہتر فیصلہ کر سکو گی۔“ ربیعہ نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔

”تم اگر چوری جیسے ابوذر کو یہاں سے لے جاؤ گی تو تمہیں کوئی بھی فیملی اپنے پاس ملازمت پر نہ رکھے گی کیونکہ اس طرح وہ فیملی بھی تمہارے ساتھ شریک جرم سمجھی جائے گی، جانتی ہو تم پر تمہارے بچے کے اغواء کا مقدمہ درج ہو جائے گا اور اس مقدمہ میں وہ لوگ بھی شامل کر لیے جائیں گے جو تمہیں انجیلے میں پناہ دینے کے لیے ایک بہت بڑا رسک ہو گا جسے لینے کا مشورہ میں تمہیں ہرگز نہ دوں گی ویسے بھی جہاں تک میں سمجھتی ہوں کوئی فیملی بھی تمہارے پورے کاغذات دیکھے بغیر تمہیں اپنے گھر پر ایک عدد میڈی کی جاب بھی نہ دے گی۔“

شوہا ربیعہ کا فون سنتے ہی اس سے ملنے آگئی تھی حالانکہ وہ کم ہی فاطمہ کی طرف آتی تھی کیونکہ اسے ان کے گھر کا ماحول پسند نہ تھا اور اب بیوہ کے تمام حالات جان کر وہ بھی ہوری تھی جب سے وہ آئی تھی فاطمہ اور ایدہا دو چار بار کمرے کا چکر لگا کر چاکلی چھین ویسے بھی نیوٹے نوٹ کیا تھا جس دن سے سکندر نے اسے طلاق دی تھی فاطمہ نے اس پر کڑی نگرانی شروع کر دی تھی اس کے کمرے اور لاؤنج کے درمیان موجود کھڑکی چوبیس گھنٹے کھلی رہتی تھی کہ فاطمہ نے گھر سے باہر جانا بھی بالکل چھوڑ دیا تھا یہاں تک کہ کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے حواد بھی اس کی نگرانی پر مامور ہو نیوٹے جو یہ سمجھ رہی تھی وہ ابوذر کے ساتھ با آسانی نہیں بھی اتار عرصہ گزار سکتی ہے جب تک پاکستان واپس کے لیے حالات اس کے موافق نہ ہو جائیں شوہا کی تمام باتیں سن کر پریشان ہوا بھی یہ سب تو اس نے سوچا ہی نہ تھا اور شاید اسے یہ سب پتا بھی نہ تھا یہاں کا قانون پاکستان کے مقابلے میں بہت مختلف اور کافی سخت تھا آزادی کا صحیح مفہوم آج نیوٹے سمجھ میں آیا۔

”پھر اب تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟“ اس نے ایک نظر سامنے صوفے پر بیٹھی ایدہ چا پر ڈالی اور پھر آہستہ سے

شوہا سے دریافت کیا شوہا اردو جانتی تھی اس لیے دونوں کے درمیان گفتگو اردو زبان میں ہی ہو رہی تھی۔ ایدھا اردو سے نااہل تھی یہ جانتے ہوئے بھی دونوں بہت آہستہ آواز میں بات کر رہی تھیں۔

”یہاں ایک ابن جی او ہے جو بے سارا عورتوں کو مکمل تحفظ فراہم کرتی ہے اور جہاں تک میرا خیال ہے انہیں قانونی طور پر بھی گائیڈ کرتی ہے میری ایک دوست اپنے شوہر سے علیحدگی کے بعد کچھ عرصہ وہاں رہی تھی میں اس سے بات کر کے پوری معلومات لیجی ہوں اور پھر تمہیں آگاہ کرتی ہوں۔“ شوہا جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی اس کے ساتھ ہی نیو بھی کھڑی ہو گئی۔

”میں تمہارے لیے سم لائی ہوں اب اس منحوس کے سامنے کس طرح دوں ایسا کہ تم مجھے باہر گیٹ تک چھوڑنے آؤ۔“

”اوکے۔“ نبیو نے ابوذر کو اٹھا کر باہر جانے کے لیے قدم آگے بڑھایا ہی تھا کہ یک دم حماد اس کے سامنے آگیا۔

”آپ ابوذر کو اپنے ساتھ نہیں لے جاسکتیں۔“

اس نے چونک کر اپنے سامنے کھڑے چار سالہ حماد پر ایک نظر ڈالی جو اپنے قد کاٹھ کی بنا پر کہیں سے بھی چار سال کا دکھائی نہ دیتا تھا اپنی عمر سے نکلے ہوئے قد کے ساتھ حماد اس کے راسے میں حائل تھا بالکل سکندر کا دوسرا روپ اس کے جیسی شکل و صورت اور ویسا ہی انداز گفتگو کسی نے سچ ہی کہا ہے سانپ کی اولاد بھی ہمیشہ سانپ جیسی ہی حصلت رکھتی ہے ماں ہوتے ہوئے بھی اس وقت اس کے ذہن میں سنپوں سے بہتر تشبیہ کوئی نہ آئی۔

نیکی کے رکتے ہی وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی ایک بالکل عام سی عمارت جو بڑے بڑے ناریل کے درختوں سے گھری ہوئی تھی اس پر لگا بورڈ پر ثابت کر رہا تھا کہ یہی پاکستان ایمبسی ہے بے اختیار ہی اسے اپنے ملک میں موجود غیر ملکی ایمبسیز اور ان کی بر شکوہ عمارات یاد آئیں گیٹ پر موجود گارڈ نے اس سے کوئی سوال نہ کیا وہ خاموشی سے اندر آئی ابوذر سوچا تھا، نیکی ڈرائیور نے کہا تھا کہ وہ اسے باہر گاڑی میں ہی چھوڑ دے مگر نیو اس وقت کسی پر اعتماد کرنے کی پوزیشن میں نہ تھی یہی وجہ تھی کہ اسے اپنے کندھے سے لگائے لگائے اندر آگئی جینز ٹی شرٹ پر اسکارف اور بڑے سے چشمے نے اس کے چلنے کو خاصا تبدیل کر دیا تھا سامنے موجود چھوٹے سے لان کا سوکھا گھاس پھوس دیکھ کر لگتا ہی نہ تھا کہ ایمبسی کی یہ عمارت ملائیشیا جیسے زرخیز ملک میں ہے وہ فقط ٹھنڈا سانس بھر کر سامنے موجود بڑے سے ہال نما کمرے میں داخل ہو گئی جہاں پہلے سے ہی کچھ موحضرات موجود تھیں جو شاید ویزے کے سلسلے میں آئے تھے اکثریت پاکستانی ہی تھیں مختلف کاؤنٹر پر بھی تقریباً تمام موی تھیں اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ کس سے بات کرے یہاں وہاں نظر ڈالنے پر اسے کاؤنٹر پر لکھا ”سپشمن“ دکھائی دیا وہ تیزی سے آگے بڑھی وہاں موجود نو جوان کپیوٹر پر بڑی تھا۔

”ایکس کیو زی سر۔“

”جی فرمائیے۔“ اس نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر نیو کا ملازما نہ جانے لیا۔

”وہ مجھے۔“ اسے سمجھ نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا بات کرے وہ کچھ کنفیوزی ہو گئی۔

”اصل میں مجھے کسی بڑے آفیسر سے ملنا ہے۔“ تھوک نکلنے ہوئے بمشکل اس نے اپنا جملہ مکمل کیا۔

”کس سلسلے میں؟“

”دراصل میرا پاسپورٹ گم ہو گیا ہے اس سلسلے میں ہی کچھ معلومات حاصل کرنی ہیں۔“

”اوکے آپ ایسا کریں اس گیٹ سے باہر نکل جائیں بالکل سامنے جو بنا سکا رہا ہے وہاں آپ کو سرفراز صاحب

ملیں گے آپ اپنا مسئلہ ان سے جا کر ڈسکس کریں ہو سکتا ہے اس سلسلے میں وہ آپ کی کچھ مدد کر سکیں۔“

جواب دے کر وہ نو جوان پھر سے اپنے کام میں مصروف ہو گیا نیو نے کچھ سیکنڈ وہاں کھڑے ہو کر سوچا پھر خاموشی سے بڑے سے دروازے سے باہر نکل آئی وہاں ایک چھوٹا سا گاڑن بنا ہوا تھا۔ چاروں طرف ہو کا عالم طاری تھا وہ اللہ کا نام لے کر گاڑن کو عبور کرتی سامنے موجود بڑے سے کمرے کے دروازے کے سامنے جا کھڑی ہوئی اس پاس نظر ڈوٹائی کوئی بھی ملازم یا گارڈ دکھائی نہ دیا وہ شش و پنج کی کیفیت میں مبتلا تھی جب پر وہ ہٹا کر اندر سے کوئی باہر آیا حلیے سے ہی وہ کوئی بیون دکھائی دے رہا تھا۔

”جی میڈم کس سے ملنا ہے آپ کو؟“ باہر آنے والا ٹھٹک گیا۔

”وہ سرفراز صاحب سے۔“ نو جوان نے ایک نظر اس کا جائزہ لیا اور واپس اندر کی طرف مڑ گیا تقریباً ”پانچ منٹ بعد وہ نمودار ہوا۔“

”اندر چلی جائیں سرفراز صاحب آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔“ دھڑکتے دل کے ساتھ وہ اندر داخل ہوئی۔

سامنے میز کے پیچھے ایک اوپریز عمر پاکستانی موجود تھا اس کے سامنے موجود ٹیبل پر رکھی تھیں اس کے عہدے کی نشاندہی کر رہی تھی وہ شخص نہ پورا حالت میں آرام سے کرسی پر بیٹھا تھا نیو کو دیکھتے ہی سیدھا ہوی بیٹھا۔

”جی آئیں تشریف رکھیں۔“ وہ خاموشی سے ٹیبل کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”جی بتائیں کیا مسئلہ ہے آپ کا جس سلسلے میں آپ مجھ سے ملنا چاہتی تھیں۔“

”مجھے اپنا پاسپورٹ بنوانا ہے۔“ وہ بھی آواز میں بولی۔

”پرانا کہاں ہیں؟“ اس شخص نے اپنا چشمہ درست کرتے ہوئے سوال کیا۔

”وہ دراصل میرا ہینڈ بیک چوری ہو گیا ہے اس میں میرے سارے کاغذات تھے اب مجھے وطن واپس جانا ہے جس کے لیے پاسپورٹ کا ہونا لازمی ہے۔“ وہ جانتی تھی کہ یہ سوال اس سے ضرور پوچھا جائے گا اسی لیے جواب سوچ کر آئی تھی۔

”اے اچھا ویسے آپ ملائیشیا کیوں آئی تھیں؟“ اسے اس سوال کی امید نہ تھی اب سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا جواب دے۔

”یہاں میری سرال ہے میں شادی کی بعد یہاں آئی تھی۔“

”آپ کی سرال کہاں ہے؟ اور آپ کے ہینڈ بیک کیوں نہیں آئے آپ کے ساتھ؟“

”وہ یہاں نہیں ہیں جاپان گئے ہیں میرے والد کی ناسازی طبع کے باعث میرا جلد از جلد پاکستان جانا بہت ضروری ہے اسی لیے مجھے تنہائی یہاں آنا پڑا۔“ اپنے مفاد کے لیے ایک کے بعد ایک جھوٹ اس کی زبان پر خود بخود ہی آنا چلا گیا۔

”سوری میڈم ہم آپ کے ہینڈ بیک سے ملے بغیر آپ کو پاسپورٹ بنوا کر نہیں دے سکتے ہمیں ان کی تصدیق درکار ہوگی۔“

”کیوں؟“ وہ حیرت سے بولی۔

”میں پاکستانی ہوں میرے پاس وہاں کا شناختی کارڈ موجود ہے۔“ وہ دہرائی ہو گئی اپنے ملک کی ایمبسی میں اس سے ایسا برتاؤ کیا جائے گا وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی اس نے تو اپنے پاسپورٹ کے حصول کو ہیچ ہی آسان سمجھا تھا ویسے بھی اسے احتشام صاحب نے یہ ہی بتایا تھا کہ وہاں موجود ایمبسی پاکستانیوں کے مسئلے حل کرتی ہیں تو ایک پاسپورٹ کے لیے اپنی ہم وطن سے زیادہ ملائی شری کو ترجیح دی جا رہی تھی جس کی تصدیق ضروری تھا۔

”بے شک آپ پاکستانی ہیں یقیناً“ آپ کے پاس شناختی کارڈ بھی ہو گا مگر ہماری بھی کچھ قانونی اور سفارتی مجبوریوں ہیں جن کی بنا پر ہم اپنی اگمال آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتے جب تک آپ کے ہینڈ آکر ہم سے نہ ملیں اس صورت میں بھی آپ کے پاس کانڈات کی کم شدگی کی ایف آئی آر کا ہونا ضروری ہے اور اگر وہ نہیں آتے تو آئندہ جب آپ یہاں آئیں ایف آئی آر درج کروا کر اس کی کاپی لیتی آئیے گا پھر شاید ہم آپ کے کچھ کام آسکیں ورنہ ہماری طرف سے معذرت خدا حافظ۔“

پوری تفصیل بتانے کے بعد سرفراز صاحب اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ وہ اب کوئی بات سننا نہیں چاہتے وہ خاموشی سے باہر نکل آئی اس کا دل بھر آیا پہلے ہی مرحلے پر ناکامی اس کا مقدر بن گئی وہ واپس سی ہو گئی۔

”میری اہم کہاں جاتا ہے۔“ اس کے ٹیکسی میں واپس بیٹھتے ہی ڈرائیور نے سوال کیا۔
”کہیں نہیں WAO واپس چلو اور ہاں جاتے ہوئے مجھے ایمبسی کے کاراستہ پبلک ٹرانسپورٹ سے سمجھا دیتا۔“

ٹیکسی ڈرائیور سے اس کے ایک دن کے تیس رنگیٹ ملے ہوئے تھے جو خاصی بڑی رقم تھی وہ اندازہ لگا چکی تھی کہ اسے اپنے پاسپورٹ کے حصول کے لیے بہت خوار ہونا پڑے گا۔ اس کے بعد شاید کہیں جا کر وہ اپنے مقصد کے حصول میں کامیاب ہو سکے اس ضمن میں وہ روڈانہ ٹیکسی افورڈ نہیں کر سکتی تھی لہذا اسے اپنا سفر پبلک ٹرانسپورٹ سے ہی شروع کرنا تھا جس کے لیے وہ خود کو ڈھنڈی طور پر تیار کر چکی تھی۔

”جائے کیوں میرا دل کئی دنوں سے بہت گھبرا رہا ہے نیو وہاں ضرور کسی مشکل کا شکار ہے اس کا فون بھی بند ہے اور سکندر کال ریسیو نہیں کرتا۔“

سکندر کی شفا سے ہونے والی گفتگو نے اب تک روا کو بے چین کر رکھا تھا۔

”تم خوا خواہ کے دوسو سال کا شکار ہو رہی ہو میری ابھی کل ہی بھائی صاحب سے بات ہوئی ہے انہوں نے بتایا کہ دونوں میاں بیوی کے مابین کچھ غلط فہمی ہو گئی تھی بہر حال اب وہ مسئلہ حل ہو گیا ہے نیو کا فون شاید چوری ہو گیا ہے جیسے ہی وہ نیا میل لے گی ہم سے جلد ہی رابطہ کرے گی۔“

اختشام صاحب خود بھی صاحب محمد کی گفتگو سے مطمئن نہ تھے ان کا دل بھی مختلف طرح کے خدشوں کا شکار تھا مگر وہ مودتے اور جانتے تھے کہ اس طرح کے مسائل جذباتی ہو کر حل نہیں کیے جاسکتے دوسری طرف اپنے کسی خدشے کا اظہار وہ ردا کے سامنے کر کے اسے مزید پریشان نہ کرنا چاہتے تھے۔

”اور امی ربیجہ نے بھی تو آپ کو یہ ہی سب کچھ بتایا تھا جو بیلا بتا رہے ہیں پھر آپ کیوں اتنی پریشان ہو رہی ہیں۔“

امان نے انہیں خود سے لگاتے ہوئے تسلی دی۔

”بس مجھے کچھ نہیں پتا آپ سکندر کو فون کر کے کہیں کہ وہ نیو کو کچھ عرصے کے لیے پاکستان بھیج دے میرا دیرا لگاؤ انہیں مجھے ملا کر لے جاتا ہے۔“

وہ کسی طور یہ باننے کو تیار نہ تھیں کہ نیو اپنے گھر میں خوش ہے وہاں انہیں اور ان کا دل انہیں کسی انہونی کی خبر دے رہا تھا جس نے انہیں بے چین کر رکھا تھا ایسے میں کوئی سلی دلاسا ان کے لیے اہمیت نہ رکھتا تھا۔

”ٹھیک ہے میں بھائی صاحب سے بات کرنا ہوں ان سے کہتا ہوں کہ وہ نیو سے تمہاری بات کروائیں یا پھر تم سکندر کے گھر کے نمبر پر فون کر لو نمبر تو ہے تمہارا پس پاس؟“

اختشام صاحب نے بات کرتے کرتے رک کر سوال کیا۔
”دو دفعہ تو میں کرچکا ہوں غالباً“ آئی فافٹھ تھیں انہوں نے کہا کہ نیو گھر میں نہیں ہے جیسے ہی آئے گی میں بات کروا دوں گی مگر پھر انہوں نے کال بیک بھی نہیں کی۔
”ہو سکتا ہے وہ گھر نہ ہو تم ایک دفعہ پھر کوشش کرو اگر بات ہو جائے تو اچھا ہے ورنہ ربیجہ سے کہو وہاں جا کر نیو کی اپنی ماسے بات کروا دے۔“ اختشام صاحب نے امان کو سمجھاتے ہوئے کہا۔
”ٹھیک ہے بیلا ایک دفعہ پھر کوشش کر لیتا ہوں ہو سکتا ہے اب بات ہو جائے۔“
وہ گھر کا فون اپنے قریب کرتے ہوئے بولا۔

”مجھے تم سے اس قدر بے وقوفی کی امید نہ تھی۔“

ربیجہ نے جیسے ہی یہ سنا کہ ایمبسی والوں نے نیو کی کسی بھی قسم کی مدد کرنے سے صاف انکار کر دیا ہے وہ بیوہ عبدالوہاب کے ساتھ WAO آئی اور اب آئی لومہ کے آفس میں بیٹھی وہ مسلسل نیو کو کتاڑ رہی تھی جو خاموشی سے سر جھکا کر اس کے سامنے بیٹھی تھی۔

”غضب خدا کا تم اتنا فاصلہ طے کر کے اور رسک لے کر ایمبسی گئیں اور اپنا مسئلہ حل کیے خاموشی سے واپس آگئیں۔“

”میں نے تمہیں بتایا تو ہے کہ سرفراز صاحب کا کہنا ہے کہ بغیر ایف آئی آر کے کچھ بھی ہونا ناممکن ہے اور تم جانتی ہو میرے لیے ایف آئی آر کا اندراج کس قدر مشکل کام ہے۔“

”بیوقوف لڑکی تمہیں وہاں اپنے تمام حالات بتانے چاہیے تھے تمہارا پاسپورٹ کس طرح تمہارے خفیہ میاں نے ضبط کر رکھا ہے یہ بتائیں تو یقیناً وہ تمہاری مدد کرتے اپنے بچوں کے بارے میں بھی سب کچھ کچ بچ بتاتا چاہیے تھا۔“

”دراصل میں وہاں جاتے ہی کچھ خوف زدہ ہو گئی تھی میں نے سوچا شاید سکندر نے میری وہاں کوئی کمپلیٹ نہ کر رکھی ہو کہ میں اس کا بچہ لے کر فرار ہو گئی ہوں اور ایسا نہ ہو کہ مجھے دھوکہ سے پولیس کے حوالے کر دیا جائے۔“

”اف خدایا نیو ہماری ملکی ایمبسی ہمارے مسائل کے حل کے لیے یہاں موجود ہے اور یاد رکھو ابوذر سکندر کا ہی نہیں تمہارا بھی بیٹا ہے اپنی اولاد کی مضفانیہ تقسیم تم خود کر چکی ہو تم نے حماد اس کے حوالے کیا تو کیا ابوذر تمہارا حق نہیں ہے؟“ ربیجہ نے اس کے ہاتھ تھپکتے ہوئے سمجھایا۔

”ٹھیک ہے میں کل ہی دوبارہ جاتی ہوں پھر دیکھتی ہوں مجھے کیا جواب ملتا ہے؟“ اور ہاں انکل نے کچھ رقم بھیجی ہے جو عبدالوہاب کے اکاؤنٹ میں ہے اور ساتھ ہی تمہارے لیے آئی کا ایک پیغام بھی ہے وہ یہ کہ تم ابوذر سکندر کے حوالے کر کے جلد از جلد پاکستان واپس پہنچو بہت پریشان ہیں۔“ اس کے گھر والوں کا مسلسل اس پر دباؤ تھا کہ وہ ابوذر سکندر کے حوالے کر دے اور خود خاموشی سے اپنے وطن واپس آجائے اسی سبب وہ ان سے رابطے میں نہ تھی۔

”اب جب تمہاری ماسے بات ہو تو بتا دینا میں کسی بھی حالت میں تمہارا پاکستان نہ آؤں گی اگر حماد کا دکھ ساری زندگی میرے ساتھ رہے گا تو سکون کی زندگی سکندر بھی نہ گزار سکے گا یہ میرا خود سے عہد ہے ربیجہ اور میں اپنے اس عہد کے لیے جان تو دے سکتی ہوں مگر ابوذر نہیں۔“ وہ اٹل لہجہ میں بولی۔

کو دے دوں گی بہر حال میری طرف سے پریشان مت ہوئے گا میں اب پہلی والی نیو نہیں رہی وقت نے مجھے بہت بدل دیا ہے اور ان شاء اللہ میں جہاں بھی رہوں گی اپنی حفاظت خود کر لوں گی اللہ حافظ۔“

دوسری طرف سے بنا کوئی جواب سننے اس نے فون بند کر دیا جس جذباتی کیفیت کا شکار اس کی طلاق کی خبر نے رہا کو آج کیا تھا وہ اس کیفیت سے بہت پہلے نکل چکی تھی اب یہ سب کچھ اس کے لیے کوئی معنی نہ رکھتا تھا اب تو اس کی زندگی کا مقصد صرف اور صرف ابوزر تھا جس کے حصول کے لیے وہ سرگرداں تھی صرف اپنی اولاد کی محبت نے ہی اسے تپتے صحرا میں تنگے پاؤں گھڑا کر دیا تھا ورنہ تو اس کے لیے بہت آسان ہوتا اس ملک پر وہ حرف بھیج کر اپنے وطن واپس لوٹ جاتا۔

”کاش وہ بے اولاد نہ ہوتی۔“ بے اختیار یہ سوچ اس کے ذہن میں ابھری۔

”اللہ نہ کرے جو ایسا ہوتا۔“ دوسرے ہی پل اس نے اپنی سوچ پر خودی لعنت بھیجی اس کے بچپنی تو اس کے جینے کا سبب تھے ورنہ تو شاید وہ مری گئی ہوتی۔

”چلو اچھا ہوا جو آج اس کی ہاں کا خودی فون آگیا اب جوان میں ذرا بھی غیرت ہوگی تو ضرور اس کی واپسی کے لیے کچھ کریں گے ورنہ تو یہ بے شرم طلاق کے بعد بھی ہم پر مسلط ہے۔“

ایہ حاسے کی جانے والی گفتگو یقیناً ”اسے بھی سنانے کے لیے تھی جس میں فاطمہ کامیاب بھی ہو گئی تھیں۔“ نیوہنا کوئی جواب دیے خاموشی سے اپنے کمرے میں آگئی جس کالے سی پچھلے دو تین دن سے صحیح طور پر کوئی لگنے نہ کر رہا تھا جبکہ یہاں چھت کے پنکھوں کا رواج بھی نہ تھا۔ اسے سی کے فین سے اسے بالکل بھی نیند نہ آتی تھی۔ ابوزر کے سرہانے وہ اس کا چھوٹا سا فین رکھ دیتی تھی خود میرا شکرے ساتھ دن گزار لیتی تھی ابھی بھی کمرے میں بے حد جھجھکیاں سننے پر ان میں ٹھنڈی والی کھڑکی کھول کر پردے ہٹا دیے باہر بارش ہو رہی تھی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں نے کچھ ہی دیر میں کمرے کے جس کو خاصا کم کر دیا۔



”دیکھیں سر میری پوری بات سن کر آپ اچھی طرح جان چکے ہوں گے کہ میرے لیے ایف آئی آر درج کروانا کس قدر مشکل کام ہے۔“

وہ آج تیسری دفعہ اہمبسی آئی تھی اب وہ یہ سفر آسانی ٹرین کے ذریعے کرتی تھی جو WAO سے کچھ فاصلے پر موجود اسٹیشن سے اسے مل جاتی پھر وہاں سے وہ ایل سی سی آئی جہاں سے تھوڑا ہی فاصلہ طے کر کے پاکستان اہمبسی پہنچ جاتی۔ دو تین بار گزرنے سے ہی اسے یہاں کام کرنے والا عملہ بھی پہچاننے لگ گیا تھا ایک بار جب وہ آئی تو سرفراز صاحب کسی میٹنگ میں تھے دو سری بار انہوں نے نیو کے تمام حالات سن کر اسے دو تین دن کا ٹائم دیا تاکہ وہ اس سلسلے میں اوپر بات کر سکیں اور آج وہ ان کے لیے ہوئے ٹائم کے مطابق پھر اہمبسی میں موجود تھی۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن پھر بھی قانونی طور پر یہ سب بہت ضروری ہے۔ دو سری اہمبیاں میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ اگر آپ کے شو پر اندازے آپ کے خلاف کوئی قانونی کارروائی کر دی تو ہم آپ کی کوئی مدد نہ کر سکیں گے۔“ سکندر تو اس کے خلاف قانونی کارروائی کا آغاز کئی عرصہ قبل کر چکا تھا مگر پولیس اسے تلاش کر رہی تھی مگر یہ سب کچھ وہ یہاں بتانا نہ چاہتی تھی۔

”آپ کو شش کر کے ایف آئی آر کی سلیپ لے آئیں پھر ہم کچھ کرتے مس۔“

سرفراز صاحب کا انداز سراپا نہ لگتا تھا وہ ابوزر کی انگلی تھا بے ہرنگل آئی جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا ابوی اس کے گرد ڈیرے ڈال رہی تھی وہ پولیس اسٹیشن جاتے ہوئے ڈر رہی تھی اور یہ بات یہاں تقریباً سب ہی

”تمہاری میرے گھر میں مدت رہائش ختم ہو چکی ہے اب بہتر یہ ہے کہ تم جلد از جلد اپنا کوئی دوسرا انتظام کر لو“ اگر میری شرط تمہیں منظور ہے تو میری آفر اپنی جگہ آج بھی برقرار ہے میں تمہیں ایک ہفتہ میں تمہارے دیس واپس بھجوا دوں گا بصورت دیگر ایک ہفتہ تک اپنا انتظام کر لو ورنہ تمہیں یہاں سے نکالنے کے لیے مجھے پولیس سے رابطہ کرنا ہوگا۔“

دروازے پر کھڑا فرعون سفاکی سے یہ سب زہر اس کے کانوں میں انڈیل کر زمین کو اپنے پاؤں تلے روندنا ایک شان بے نیازی سے باہر نکل گیا وہ اپنی جگہ ساکت بیٹھی رہ گئی۔

شوہانے پچھلے ایک ہفتہ سے اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا یہاں تک کہ وہ اس کے کسی مہیج کا جواب بھی نہیں دے رہی تھی اس نے ایک نسبتاً بڑا بینڈ بیک تیار کر رکھا تھا جس میں ابوزر کی ضرورت کا کچھ سامان موجود تھا جب کہ اس سے قبل اپنا اور ابوزر کا کچھ سامان وہ شوہانے کے ذریعے ریکہ تک پہنچا چکی تھی اب مسئلہ صرف یہاں سے نکل کر کسی محفوظ مقام تک جانے کا تھا اور اس محفوظ مقام کا راستہ اسے شوہانے ہی بتانا تھا جو جانے کہاں غائب تھی۔

”تمہارے گھر سے فون آیا ہے۔“ ایہ حاسے نے باہر سے ہی آواز لگائی۔

”اس وقت کسی کا فون آگیا۔“ اس نے بے زار ہو کر سوچا اس کا بالکل دل نہ چاہ رہا تھا کہ وہ کسی سے کوئی بات کرے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ خاموشی سے اٹھ کر باہر آگئی فاطمہ ریسیور ہاتھ میں لیے جانے آہستہ آہستہ کیا بات کر رہی تھیں اسے دیکھتے ہی ریسیور ٹیبل پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں اس نے آگے بڑھ کر ریسیور اٹھایا اور دھڑکتے دل سے اپنے کان سے لگا لیا۔

”السلام علیکم۔“ مری مری آواز اس کے حلق سے برآمد ہوئی۔

”نیو یہ تمہاری ساس کیا ہو اس کر رہی ہے۔“ دوسری طرف یقیناً ”رہا تمہیں جنہیں شاید فاطمہ نے سب کچھ بتا دیا تھا۔“

”کیا کہہ رہی ہیں؟“ ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

”کہہ رہی ہے تمہارے کسی مودے ناجائز تعلقات تھے اور تمہیں سکندر نے رٹکے ہاتھوں پکڑنے کے بعد طلاق دے دی اب وہ تمہیں واپس بھیجنا چاہتا ہے اور تم آنا نہیں چاہ رہیں بلکہ عدت کے بعد کسی اور شخص سے نکاح کرنے والی ہو اور بھی جانے کیا کیا انٹرنٹ سنٹ بک رہی ہے پچاگل تو نہیں ہے یہ عورت۔“

”وہ جو کہہ رہی ہیں بالکل ٹھیک ہے مگر جو الزام انہوں نے مجھ پر لگایا ہے وہ کڑوت خود ان کے اپنے بیٹے کے تھے جسے میں نے رٹکے ہاتھوں پکڑا تھا۔“

اب کچھ بھی چھپانے کا کوئی فائدہ نہ تھا آخر ایک نہ ایک دن تو انہیں یہ سب بتانا ہی تھا تو پھر کب تک وہ اکیلی سب کچھ برداشت کرتی۔

”نیوہنا نے سب کچھ ہمیں خود کھول نہیں بتایا۔“ رواہری طرح رو رہی تھیں۔

”پلیز ممداد کر مجھے مزید پریشان مت کریں میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔“

”تم فوراً پاکستان واپس آؤ میں تمہارے ٹکٹ کے پیسے بھیج رہی ہوں۔“ رواہنے فیصلہ کن انداز میں کہا۔

”فی الحال میں واپس نہیں آسکتی اس لیے آپ مجھے فورس مت کریں۔“

”کیوں؟“ رواہنا بھول کر حیرت سے پوچھیں۔

”وہ میں آپ کو نہیں بتا سکتی اور پلیز اب آپ اس گھر کے نمبر پر دوبارہ مجھ سے رابطہ کے لیے فون مت کیجئے گا بلکہ میرے بارے میں کچھ بھی جاننا ہو تو ریکہ سے بات کر کیجئے گا اگر ممکن ہو تو میں جلد ہی اپنا کانٹیکٹ نمبر آپ

جانتے تھے یہ ہی وجہ تھی جو اس پر ایف آئی آر کے لیے اس قدر دباؤ ڈالا جا رہا تھا وہ تھک چکی تھی لہذا باہر نکلتی سوکھی ہوئی گھاس پر بیٹھ کر رونے لگی۔

”کیا بات ہے کیوں رو رہی ہو پیپل کی ضرورت ہے کیا؟“

اس نے دوتے دوتے سر اٹھایا سامنے شلوار قمیض میں بلبوس شخص یقیناً ”پاکستانی تھا جس کے دیکھنے کا انداز سراسر لورڈز تھا وہ اپنی آنکھیں رگڑتی اٹھ کھڑی ہوئی ایوزر کو گود میں لے لیا۔

”ارے ڈر مت میرے پاس جگہ ہے آجاؤ تمہاری مرضی کے پیسے ہوں گا۔“ اس شخص کی بات سن کر نیو کے تن بدن میں آگ لگ گئی ایک غیر ملک میں مصیبت میں کھری اپنی ہم وطن لڑکی کے ساتھ کوئی اس طرح کی گھٹیا گفتگو بھی کر سکتا ہے وہ سوچ نہ سکتی تھی۔

”بے غیرت آدمی تمہیں شرم نہیں آتی۔“

وہ حلق کے بل چلائی اس کا پس جو چلتا اپنے سامنے کھڑے شخص کو گولی بھی مار دیتی۔

”آہستہ بولو آہستہ۔“ نیو کے چلاتے ہی وہ شخص گھبرا سا گیا۔

”کیا ہوا؟ کیا کہا ہے تم نے اس کو؟“

اندر سے آنے والے نو جوان لڑکے نے اس شخص کو گردن سے پکڑ کر دو تین جھٹکے دیے جبکہ نیو وہیں زمین پر بیٹھ کر پھر سے رونے لگی۔

”وہ چلا گیا ہے اب تم بھی اٹھ جاؤ رونادھونا بند کرو دیکھو تمہارا بچہ کتنا پریشان ہو رہا ہے۔“ وہ اپنی پریشانی میں کچھ دیر کے لیے ایوزر کو بھی بھول گئی تھی جو شاید اس وقت بہت بھوکا ہو رہا تھا جس کا اندازہ اس کے چہرے پر چھائی مروٹی سے لگایا جاسکتا تھا۔ اس نے خاموشی سے ایوزر کو پھر سے گود میں اٹھالیا۔

”میرا نام شمرز خان ہے اگر مناسب سمجھو تو مجھ پر بھروسہ کرتے ہوئے تم اپنی ہر بات مجھے بتا سکتی ہو۔“ اس کی مجبوری تھی اب اسے کسی نہ کسی پر تو اعتماد کرنا ہی تھا وہ چلتے چلتے رک گئی ایک پل رک کر سوچا پھر پلٹ کر شمرز کی جانب آئی۔

”مجھے اپنا پاپا سپورٹ ہونا ہے اس سلسلے میں ایمبسی میری کوئی مدد نہیں کر رہی اب بتاؤ تم میرا یہ کام کر سکتے ہو؟“

”ہاں مگر یہ کام میں نہیں کروں گا البتہ میرا ایک دوست ایجنٹ ہے جو یہاں پھنسے ہوئے کئی لوگوں کو پہلے بھی پاکستان واپس بھیج چکا ہے اس کام کے لیے وہ ایک مناسب فیس بھی لے گا مگر تمہیں زندہ سلامت یہاں سے نکال دے گا اگر یوں تو میں تمہاری اس سے بات کروا دوں۔“

نیو کے تن مروہ میں جان سی پڑ گئی اسے محسوس ہوا شاید شمرز کا اس تک اتنا مدد داندی ہے۔

”میں اس کی منہ مانی فیس دوں گی تم کسی طرح میری اس سے بات کروادو۔“ وہ جان چکی تھی ایمبسی میں اس کی کوئی شمولی نہیں ہے اس لیے ضروری تھا کہ شمرز کی بات پر یقین کرتے ہوئے اس ایجنٹ سے رابطہ کرے جس کا وہ ذکر کر رہا تھا اس کے ہاں کرتے ہی شمرز نے فون پر کوئی نمبر دیا کچھ دیر آہستہ آہستہ بات کی پھر فون بند کر کے اس کی جانب متوجہ ہوا۔

”ابھی فردوس خان یہاں نہیں ہے وہ پاکستان گیا ہوا ہے تم میرا فون نمبر لے جاؤ اپنا کانٹیکٹ نمبر مجھے دے دو ایک ہفتہ کے بعد میں تم سے رابطہ کرلوں گا پس تم پیپل کا انتظام کر کے رکھنا۔“

”ان شاء اللہ وہ میں کر لوں گی مگر تم کو شش کرنا میرا کام جلد از جلد ہو جائے کیونکہ میں اب WAO میں بھی زیادہ وقت نہیں رہ سکتی۔“

اس نے جلدی جلدی ایک کانٹیکٹ کے ٹکڑے پر اپنے سیل نمبر کے ساتھ ہی WAO کا نمبر بھی تحریر کر کے شمرز کی جانب بڑھا دیا۔

”میں تم سے جب بھی کانٹیکٹ کروں گا تمہارے سیل پر ہی کروں گا اور ہاں میری آج کی اس گفتگو کا ذکر تم کسی سے مت کرنا خاص طور پر WAO میں رہائش پذیر کسی خاتون سے اور نہ ہی ایمبسی میں اس بات کا کوئی حوالہ دینا کیونکہ ہم لوگ یہ کام غیر قانونی طور پر کرتے ہیں اور ہمارا مقصد صرف اور صرف اپنے ملک کے لوگوں خاص طور پر خواتین کو بحفاظت یہاں سے نکالنا ہوتا ہے اور تم کوئی پہلی پاکستانی لڑکی نہیں ہو جس کے گھر والوں نے بنا سوچے سمجھے اسے دیار غیر رخصت کر کے بھیج دیا ہمیں آئے دن اس طرح کے کئی کیس ملتے ہیں لہذا اب تم ریلیکس ہو جاؤ اللہ نے چاہا تو تم جلد ہی اپنے وطن واپس پہنچ جاؤ گی۔“

وہ اس کے ساتھ پیپل ہی چلتا ہوا امنی اسٹیشن کی جانب جا رہا تھا جو وہاں سے تقریباً ”دس منٹ کے فاصلے پر موجود تھا۔

”ایک منٹ تم کو میں ابھی آیا۔“

جائے شمرز کو کیا یاد آگیا بات کرنا کتنا تیزی سے وہ ایک جانب بڑھ گیا وہ فٹ پاتھ سے ہٹ کر ایک ڈیپ پارٹنٹل اسٹور کی دیوار کے پاس آکھڑی ہوئی یوں ہی بے خیالی میں کھڑے کھڑے اس کی نظر روڈ پار موجود فٹ پاتھ پر جا پڑی جہاں چینی قوم کا ایک عدد عبادت خانہ موجود تھا اگلے ہی بل اس عبادت خانہ سے ایک بندر برآمد ہوا جس کے ہاتھ میں کیلے کے علاوہ ایک اور نم بھی تھا جسے لے کر وہ کچھ فاصلے پر جا بیٹھا نیو کو بے اختیار ہنسی آگئی اسے کچھ عرصہ قبل کی ہوئی شو بھا کی گفتگو یاد آئی جب اس نے مکمل یقین کے ساتھ یہ کہا تھا ”اگر منت پوری ہوئی ہو تو یہ سب پھل بھگو ان آکر کھا جاتے ہیں۔“ نیو نے بے اختیار ہی ایک بار پھر سامنے فٹ پاتھ پر موجود بھگو ان کو دیکھا جو بڑے مزے سے کیلا چھیل کر کھا رہا تھا۔ اسے وہاں رکھنے والا آج کے دن یقیناً ”بہت خوش ہو گا یہ سوچ کر کہ اس کی منت پوری ہونے والی ہے۔“

”یہ لو۔“ ایک دم اسے اپنے قریب سے شمرز کی آواز سنائی دی اس نے پلٹ کر دیکھا دو عدد کولڈ ڈرنک کے ساتھ ایک بڑا سا لفافہ اس کی جانب بڑھا رہا تھا۔

”یہ کیا ہے؟“ وہ پاتھ بڑھاتے ہوئے تھوڑا سا جھجکی۔

”تمہارا بچہ اور تم دونوں بھوکے ہو شاید تمہیں تو پریشانی میں بھوک نہیں لگتی مگر اس معصوم کو تو وقت پر خوراک چاہیے نا اس کا خیال رکھا کرو۔“

”بہت بہت شکریہ۔“ نیو کی آنکھیں تھکرے جھج گئیں۔ اسٹیشن پر اس کی مطلوبہ ٹرین کھڑی تھی وہ خاموشی سے جا کر بیٹھ گئی صبح ایمبسی کے لیے نکلے وقت اس نے سوچا تھا کہ واپسی میں سیانگ جائے گی کیونکہ اسے ریجہ سے ملے ہوئے کافی دن ہو گئے تھے۔ WAO کے قانون کے مطابق وہ کسی سے ملنے نہ جاسکتی تھی اس لیے آج اس کا ارادہ یہاں سے ہی سیانگ جانے کا تھا لیکن اپنا یہ ارادہ اسے صبح آنے والے عبدالوہاب کے فون کے سبب ملتوی کرنا پڑا اس نے نیو کو بتایا کہ رات سکندر پولیس کے ساتھ ان کے گھر آیا تھا اس کا کہنا تھا کہ نیو اور ایوزر کو تم لوگوں نے اپنے گھر چھپا رکھا ہے اور شاید عبدالوہاب کے گھر کے نمبر پر بھی آرزویشن لگا ہوا تھا لہذا اس نے نیو کو سختی سے ہدایت کی کہ وہ خود ریجہ سے رابطہ نہ کرے۔ اسی سبب وہ چاہتے ہوئے بھی ریجہ سے ملنے نہ جاسکی اور واپس WAO کی جانب چل دی جہاں آئی نو ماہ کے مشکل اسے ایک ہفتہ مزید رہنے کی اجازت دی تھی۔

سکی کی آواز پر آیت کریمہ پڑھتی ہوئی جہنم نے سر اٹھایا، روا ہاتھ میں تسبیح لیے بری طرح سسک رہی تھیں، جہنم کے دل کو جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا وہ تیزی سے آگے بڑھیں اور روٹی ہوئی روا کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

”صبر کرو اللہ جو کرے گا بہتر کرے گا اس سے اچھے کی امید رکھو ان شاء اللہ اچھا ہی ہو گا وہ غفور الرحیم جلد ہی ہماری بجلی کو ہم سے ملائے گا۔“

ردا کی کمر سلاتے ہوئے انہوں نے آہستہ آہستہ سمجھایا۔

”ای بی بی پانی پلائیں انہیں۔“

رحاب پانی کا گلاس لیے آن کھڑی ہوئی بڑی مشکل سے روانے دو تین گھونٹ حلق سے نیچے اتارے، آج تیسرا دن تھا جب سے انہیں سکندر نے فون کر کے اطلاع دی تھی کہ نبیو اس کا بچہ لے کر گھر سے بھاگ گئی ہے اس دن سے ان کا کھانا پینا سب چھٹ گیا تھا یہاں تک کہ انہیں خوف کے سبب رات بھر نیند بھی نہ آتی تھی ”جانے نبیو دیا غیر میں کس حال میں ہوگی؟“ اس خوف نے ان کی بھوک پیاس سب ختم کر دی تھی۔

”پتا نہیں میری بچی کہاں اور کس حال میں ہوگی کسی کو اس کے بارے میں کوئی علم نہیں نہ بھائی صاحب لکچھ جانتے ہیں اور نہ ہی ریحہ، مجھے تو لگتا ہے اس غبیث سکندر نے ہی اسے کہیں غائب کر دیا ہے اللہ میری بچی کی حفاظت فرمائے۔“

”افو ای کیوں ایسی باتیں منہ سے نکال رہی ہیں آنٹی ٹھیک کہہ رہی ہیں اچھے کی امید رکھنے سے بھی اچھا ہوتا ہے۔“ ان کا آخری جملہ سننے ہی شفا تڑپ کر پڑی۔ روا پتا کوئی جواب دے اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے پھر سے آیت کریمہ کے ورد میں مشغول ہو گئیں اچانک نبیو کی گم شدگی کی خبر نے ان کے گھر پر جو قیامت ڈھائی تھی اس کے اثرات آج چار دن گزر جانے کے بعد بھی موجود تھے۔

”تم کسی بھی طرح آن بچہ بچھ شہل ڈار ٹینٹل اسٹور پر مجھ سے ملاقات کرو۔“ شوہا کے اس مہم سچ نے نبیو کے جسم میں زندگی کی لہر دوڑادی انہی صرف سارے بچے تھے ویسے بھی ابو ذر کے بغیر تمامہ گھر سے کہیں بھی جاسکتی تھی اس پر صرف ابو ذر یا حماد کو باہر لے جانے پر پابندی تھی اور حماد کو اس سے اس قدر بدظن کر دیا گیا تھا کہ کبھی بھی اس کے ساتھ باہر نہ جاتا تھا۔ البتہ ابو ذر تھوڑا روڈ ہو کر اپنی دادی کے پاس رہ جاتا ٹھیک باچ بچے جب وہ تیار ہو کر باہر نکلنے لگی تو یک دم فاطمہ حماد کے ساتھ اس کے سامنے آن کھڑی ہوئیں وہ ٹھٹھک کر گر گئی۔

”میں ذرا سامنے مار کیٹ تک جا رہی ہوں، کچھ سلمان لیتا ہے اپنے لیے۔“

”میری طرف سے تم جہاں مرضی جاؤ ہمیں کیا لینا دینا۔“ انہوں نے نکت سے ناک چڑھاتے ہوئے کہا۔

”بس یہ ابو ذر مجھے دے جاؤ یہ تمہارے ساتھ باہر نہ جائے گا۔“ یہ وقت بحث کرنے کا تھا لہذا اس نے خاموشی سے ابو ذر کا ہاتھ چھوڑ دیا جسے فوراً سے پشتر حماد نے تمام لیا وہ خاموشی سے باہر نکل آئی جب اسے حماد نے پکارا۔

”آپ مار کیٹ جا رہی ہو؟“ چلتے چلتے اس نے پلٹ کر دیکھا حماد ابو ذر کا ہاتھ تھا اسے سوال کر رہا تھا فاطمہ غالباً اندر جا چکی تھیں۔

”ہاں کیوں نہیں کچھ چاہیے؟“ وہ بے اختیار واپس پلٹ آئی۔

”ایک مہینہ آگے کریم لے آئیے گا۔“ یہ کہہ کر وہ رکائیں بلکہ تیزی سے اندر کی جانب بھاگ گیا باچ بچہ سال میں پہلی کوئی فرمائش تھی جو حماد نے اس سے کی تھی اور وہ بھی اس وقت جب وہ اسے چھوڑ کر جانے والی تھی نبیو

کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں، اپنے ذہن سے تمام خیالات کو جھٹکتی وہ اگلے پانچ منٹ بعد ”شہل“ بچ بچکی تھی جہاں شوہا پہلے سے ہی موجود تھی۔

”ٹھیک گاؤ تم آگئیں ورنہ میں تو سمجھی تھی پتا نہیں تمہاری منحوس ساس تمہیں نکلنے بھی دے یا نہیں۔“ اسے دیکھتے ہی شوہا تیزی سے اس کے قریب آئی۔

”میں نے تمہاری رجسٹریشن WAO میں کروادی ہے۔“ بنا تمہید کے اس نے بتایا۔

”واقعی میں۔“ اسے یقین بھی نہ آیا۔

”ہاں اور یہ سب تمہیں بتانے میں تمہارے گھر اس لیے نہیں آ رہی تھی کہ کل کو جب تم یہاں سے نکلو تو یہ گھٹیا لوگ مجھے تنگ نہ کریں بہر حال میں نے آئی نوٹا کو تمہارا نمبر دے دیا ہے وہ جلد ہی تمہیں کال یا مہم سچ کریں گی خیال رکھنا اور یہ پیپر رکھو اس میں وہاں کا نمبر اور ایڈریس سب لکھا ہوا ہے تم جب یہاں سے نکلو تو کسی ٹیکسی کو ہائیر کر لینا وہ تمہیں اس ایڈریس پر با آسانی پہنچا دے گی، یہ پیپر بہت سنبھال کر رکھو نہیں مرنے کو دینا ایسا نہ ہو تمہارے جانے کے بعد اس کے ذریعے یہ لوگ تم تک پہنچ جائیں۔“ نبیو نے کانغذ کے ٹکڑے کو کھول کر دیکھا، اس پر دو رجسٹرڈ ایڈریس پر نظر ڈالی اور اسے اپنے ہینڈ بیگ کی اندر دینی جیب میں تہ کر کے رکھ دیا۔

”شوہا میں تمہارا یہ احباب ساری زندگی یاد رکھوں گی۔“ شوہا کے ہاتھ تمام کر اس نے اپنے لبوں سے لگا لیے

”شوہا ایک آوارہ لڑکی ہے اس سے ذرا دور رہا کرو۔“ سکندر کے الفاظ اس کے کانوں میں گونجے۔

اسے اچھی طرح یاد تھا جب اس کی شادی کو صرف دس سے بارہ دن ہی ہوئے تھے اور وہ بارش انجوائے کرنے کے لیے اپنے کمرے کی کھڑکی میں کھڑی تھی اسی سے اس کی نظر سامنے گھر کے ٹیرس پر بڑی جہاں ایک لڑکی بالکل مختصر سے کپڑوں میں کھڑی برستی بارش میں بھگ رہی تھی اس لڑکی کی نظر جیسے ہی نبیو پر پڑی اس نے دور سے ہی ہاتھ ہلا دیا ”جو یا“ نبیو نے بھی ہاتھ ہلا دیا جسے فوراً سے پشتر سکندر نے ٹوکس میں لے لیا اور شوہا کو ایک آوارہ لڑکی قرار دیتے ہوئے اس کی صحبت سے دور رہنے کی ہدایت بھی کر دی اور آج ہی تو آوارہ لڑکی اس کے لیے فرشتہ رحمت ثابت ہوئی سچ ہے انسانیت کسی مذہب کی محتاج نہیں ہوتی اور یہ بات آج شوہا نے ثابت کر دکھائی تھی۔

”تم اپنے بچے کے ساتھ صحیح سلامت یہاں سے نکل جاؤ میرے لیے یہ ہی کافی ہے اور ہاں مجھے ہمیشہ اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا۔“ شوہا نے اسے گلے سے لگایا اور پھر وہاں سے نکلتے نکلتے وہ حماد کے لیے اس کی فیورٹ آئس کریم لیتا نہ بھولی تھی۔

”تمہیں آئی نوٹا یاد رہی ہیں۔“ سستی دروازے سے ہی اطلاع دے کر واپس چلی گئی اس نے جلدی جلدی ابو ذر کا لچ ٹیم کروایا اور اس کے پاؤں میں شوز پہنا کر آئی نوٹا کے آئس کی جانب چل دی اسے بہت منت سماجت کے بعد WAO میں مزید دس دن رکنے کی اجازت مل گئی تھی اس دوران شمر زخان نے اس کے ذاتی سیل پر رابطہ کر کے بتا دیا تھا کہ فردوس خان ابھی تک واپس نہیں آیا اس کے گاؤں میں ان کی آبائی زمین کا ٹکڑا چل رہا تھا جس کا فیصلہ جرگہ نے کرنا تھا اسی سبب فردوس خان کی واپسی میں زیادہ تاخیر ہو گئی تھی سوائے اس کے کہ مہر و خٹ کے ساتھ خدایا برکمل یقین رکھتے ہوئے فردوس خان کی واپسی کا انتظار کرے ابھی بھی شاید آئی نوٹا نے اسے اپنا انتظام کہیں اور کرنے کا الٹی ٹیم دینا تھا یہ ہی سوچتے ہوئے وہ ان کے آئس کے دروازے پر پہنچ گئی۔

”میں اندر آ جاؤں؟“ دروازے پر رک کر اس نے اجازت طلب کی۔

”ہاں ہاں آؤ نیو میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔“ انہوں نے خوشدلی سے جواب دیا ان کے سامنے والی کرسی پر ایک دراز قد سالو سی خاتون ٹانگ پر ٹانگ دھرے بڑی لاپرواہی سے بیٹھی تھی بالکل ایسے جیسے اسے کمرے میں کسی دوسرے شخص کی آمد کا علم بھی نہ ہوا ہو۔

”سنسنیکڈونفلڈ یہ بیوی جس کا میں نے آپ سے ذکر کیا تھا۔“

شاید وہ کوئی سماجی کارکن بھی یہاں جب سے نیو آئی تھی روزانہ ہی کسی نہ کسی سماجی تنظیم کی طرف سے کوئی نہ کوئی خاتون وزٹ کرنے آتی ہوتی۔ اس وزٹ کے ساتھ وہ یہاں رہائش پذیر خواتین اور ان کے بچوں کو بے شمار تحائف بھی دے کر جاتی جن میں زیادہ تر ان کی ضرورت کا سامان ہوتا۔

”میرا نام پایا ہے اور مجھے اچھا لگے گا اگر آپ مجھے میرے ہی نام سے پکاریں۔“ اس حرامی میکڈونفلڈ سے میں نے اپنی جان چھڑوا لی ہے۔

اپنے بالوں کو اسٹائل سے جھٹکتے ہوئے اس نے گردن موڑ کر نیو کا بھرپور انداز سے جائزہ لیا۔

”واؤ۔“ اس نے اپنے ہونٹ گول دائرے کی شکل میں سکڑے۔

”یہ تو بہت ہی خوب صورت ہے۔“ ہونٹوں کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں میں بھی نیو کے لیے ستائش ابھر آئی تعریف کے اس اظہار نے نیو کو تھوڑا سا کنفیوز کر دیا۔

”دیکھو نیو مجھے اپنے گھر کے کام کاج کے لیے فوری طور پر ایک عورت کی ضرورت ہے کیونکہ کل رات میرا اپنے میاں سے جھگڑا ہو گیا تھا اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا میں نے اسے پولیس کسٹڈی میں دے دیا اب مجھے اپنے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے گھر پر ایک کل وقتی ملازمہ کی ضرورت ہے تو میں نے مجھے تمہارے تمام حالات بتا دیے ہیں اب اگر تم میرے ساتھ چلو تو میں تمہیں اپنے گھر میں مکمل قانونی تحفظ فراہم کروں گی، رہائش کے ساتھ تمہارے کام کا تمہیں معقول معاوضہ بھی دوں گی۔“ بنا تمہید اس نے اپنی آمد کا مقصد نیو پر واضح کر دیا۔

”اصل میں تمہیں اس وقت رہائش کے ساتھ ساتھ تحفظ بھی درکار ہے یہ ہی وجہ تھی جو میں نے پایا کو تمہارے بارے میں بتایا۔“ آئی نو نے وضاحت دیتے ہوئے کہا۔

”دوسری بات جو تمہارے لیے دلچسپی کا باعث ہوگی یہ ہے کہ میں تمہیں تمہارے وطن بھی واپس بھجوا سکتی ہوں کیونکہ میرے تعلقات بہت اوپر تک ہیں۔“ اس کی ساری آغوشیں یہ آخری جملہ نیو کے لیے باعث کشش تھا۔

”جلدی سے ہاں بیاں میں جواب دو مجھے دیر ہو رہی ہے۔“

بات کرتے کرتے وہ یکدم اٹھ کھڑی ہوئی۔

”دیکھو نیو پایا ایک انڈین مسلم ہے اس نے شادی ایک نیکو سے کی تھی جس سے اس کی طلاق کا کیس کورٹ میں زیر سماعت ہے یہ یہاں کی ایک باور فل لیڈی ہے اور جب تک تم اس کے گھر رہائش پذیر رہو گی مجھے امید ہے کوئی تمہارا بال بچا نہ کر سکے گا۔“ آئی نو نے نیو کو مزید سمجھاتے ہوئے کہا۔

”تمہیک ہے میں ان کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوں۔“

”مٹل میں باہر گاڑی میں بیٹھ رہی ہوں تم جلدی سے اپنا بیگ لے کر آ جاؤ۔“ یہ کہہ کر وہ اپنا بیگ اٹھا کر باہر نکل گئی۔

”بھی تو میرا سارا سامان بکھرا رہا ہے ابھی میں کیسے جاسکتی ہوں؟“

ایک دم ہی کسی انجان عورت کے ساتھ جانے کا سوچ کر وہ تھوڑا سا گھبرا گئی اسے سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔

”تم جلدی جلدی اپنی ضرورت کی چیزیں کسی چھوٹے بیگ میں رکھ کر باقی سامان کے ساتھ کمرالاک کرو میں

مایا سے کہہ دیتی ہوں تمہیں ڈرائیور کے ساتھ کل کسی وقت بھیج دے گی تم اگر سارا سامان لے جانا، کیونکہ تمہارا کمرہ میں کسی اور کورجسٹر کر چکی ہوں وہ بھی تمہاری طرح ایک مجبور لڑکی ہے جو تقریباً ”دون لینڈ“ میں آنے والی ہے۔“

اسے شش و پنج میں مبتلا دیکھ کر آئی نو نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”اگر چاہو تو تم اپنی کزن کو اطلاع کر سکتی ہو۔“ آئی نو بار بار یہ سے اچھی طرح واقف تھیں۔

”آئی نو میں اسے خود سے فون نہیں کر سکتی اگر اس کا فون آئے میرے سلسلے میں تو پلیر آپ اسے سب کچھ بتا دیجئے گا اور یہ میرا نیسیل نمبر بھی اسے دے دیجئے گا۔“

اس نے جلدی جلدی اپنا سیل نمبر لکھ کر پیر نو کی جانب بڑھایا۔

”اٹس اوکے اب تم جلدی سے جا کر اپنا سامان سمیٹو ایسا نہ ہو پایا ناراض ہو جائے۔“ اگلے چند منٹ میں نیو اپنا سامان ایک چھوٹے سے بیگ میں ڈال کر WAO کے گیٹ سے باہر نکل آئی اسے باہر تک چھوڑنے سستی بھی اس کے ساتھ آئی، سامنے کھڑی بڑی سی مرسیڈز کا دروازہ کھول کر ڈرائیور باہر آیا اور جلدی سے بچھلا دروازہ کھول دیا وہ تھوڑا سا جھجکتی ہوئی اندر جا کر بیٹھ گئی گاڑی بے حد مہنگے ایئر فریشر سے مہک رہی تھی جو اس کے بیٹھنے ہی اشارت ہو گئی۔

”ایک بات پوچھوں؟“ پایا نے اپنے ہاتھ میں موجود سگار کو جلاتے ہوئے سوال کیا یہ سوال اتنا اچانک تھا کہ وہ کچھ کنفیوزی ہو گئی۔

”جی پوچھیں۔“ جواب دیتے ہوئے اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ پایا کی شخصیت سے خاصی مرعوب ہو چکی ہے۔ ایئر فریشر کے ساتھ ساتھ سگار کی دھیمی دھیمی مہک بھی اس کے تھنوں میں داخل ہوئی اس نے ایک گہری سانس کے ساتھ یہ خوشبو اپنے اندر اتاری۔

”تم اتنی خوب صورت اور بھرپور جوان لڑکی ہو پھر کیوں تمہارے میاں نے تمہیں در بدر رسوا ہونے کے لیے اس دنیا میں تنہا چھوڑ دیا تمہاری فیملی سے اس کی کوئی دشمنی تھی کیا؟“

”پتا نہیں شاید یہ سب کچھ میرے نصیب میں اسی طرح لکھا ہوا تھا جس طرح ہو رہا ہے۔“ وہ نالتے ہوئے بولی کیونکہ پایا کے سوال کا کوئی بھی جواب نیو کے پاس نہ تھا اس نے تو کبھی یہ سب کچھ اس طرح سوچا بھی نہ تھا وہ تو صرف اتنا جانتی تھی کہ سکندر کے لیے وہ ایک غیر عورت تھی بالکل اتنی ہی غیر جنسی روڈ پر چلتی پھرتی ہوئی عام سی عورتیں ایسے میں بھلا اسے کیا ضرورت پڑی تھی جو وہ اس کے سلسلے میں کوئی ہمدردی اپنے دل میں پالتا سکندر کو اس سے کبھی بھی کوئی انیت یا محبت نہ تھی اور یہ بات وہ پہلے دن سے ہی اچھی طرح جانتی تھی۔

آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد گاڑی ایک سرسبز و شاداب علاقے میں داخل ہو گئی جو غالباً ”شہر سے کچھ باہر تھا چاروں طرف پھیلی ہوئی ہریالی اور پھولوں کی مہک نے نیو کے ذہن کو تھوڑی سی دیر کے لیے سہی پر سکون سا کر دیا ابوذر اس کی گود میں ہی سوچا تھا چند منٹ کے بعد ہی گاڑی رک گئی باہر نکلنے ہی وہ گھر کی خوب صورتی دیکھ کر مبہوت سی رہ گئی سفید مٹی پتھر سے بنا ہوا انمایت خوب صورت گھر جو چاروں طرف سے بڑے بڑے ناریل اور پام کے درختوں سے گھرا ہوا تھا اندر داخل ہو کر نیو کو اندازہ ہوا یہ گھر جتنا باہر سے خوب صورت تھا اس سے کہیں زیادہ حسین اندر سے تھا وہ کسی محرکے زیر اثر پایا کے پیچھے پیچھے چلتی ایک کمرے میں داخل ہو گئی۔

”یہ تمہارا کمرہ ہے نماودھو کر فرش ہو جاؤ پھر میں تمہیں اپنے بچوں سے ملوا دوں۔“ وہ جلدی میں تھی مگر نیو کے جواب کا انتظار کیے ہی واپس پلٹ گئی، نیو نے اندر داخل ہو کر ابوذر کو بیڈ پر ڈالا کمرانہ صرف صاف تھرا بلکہ خوب صورت فرنیچر سے بھی مزین تھا اس نے کمرے کا بھرپور جائزہ لینے کے بعد اپنا چھوٹا سا بیگ اٹھایا اور سامنے

موجودہ ہی سی دیوار گیر الماری کا ایک پٹ کھول کر اس کے اندر رکھ دیا اور پھر شام تک وہ اس گھر کے ماحول میں کافی حد تک ایڈجسٹ ہو چکی تھی مایا کے بچے بھی اسی سے مل کر خاصے خوش ہوئے تھے جس کا اندازہ ان کے تعریفی جملوں سے نبیو کو ہو چکا تھا مایا جب سے آئی تھی مسلسل فون پر مصروف تھی۔

اس گھر میں اگر کوئی چیز نبیو کے لیے الجھن کا باعث بنی تھی تو وہ گھر کے ایک کونے میں بیٹا ہوا چھوٹا سا مندر تھا مایا اگر ایڈجسٹ مسلم تھی تو اس کے گھر میں مندر کا کیا کام اس کے علاوہ لاؤنج کے ایک کونے میں چھوٹا سا باروم بھی تھا مایا کثرت سے شراب نوشی کی عادی تھی جس کا اندازہ ایک ہی رات میں نبیو کو ہو گیا اگلی صبح کا سورج طلوع ہونے کے ساتھ ہی نبیو کو ایک نئی پریشانی نے گھیر لیا پریشانی کے ساتھ ساتھ اسے حیرت بھی یہ دیکھ کر کہ مایا کی قیمتی جیولری پورے گھر میں بکھری پڑی تھی جگہ جگہ پھیل کر اس کی ڈائمنڈ رنگ رکھی ہوئی تھیں یہاں تک کہ نبیو کے کمرے کی الماری کی دراز میں ملانی کر سی بغیر کسی لاک کے موجود تھی وہ چاہتی تھی کہ اس سلسلے میں مایا سے بات کرے مگر اسے موقع ہی نہیں مل رہا تھا مایا اپنے شوہر کے کیس کے سلسلے میں بری طرح مصروف ہونے کے سبب اسے اپنے WAO بھی نہ بھیج پائی تھی اس کے موبائل کا چارجر بھی وہیں رہ گیا تھا جس کے سبب بیٹری ڈاؤن ہوتے ہی موبائل آف ہو گیا تھا اس لیے اسے وہ رہ کر ریبیجہ کا خیال آ رہا تھا جو اس سے رابطہ نہ ہونے کے سبب یقینی طور پر بہت پریشان ہوگی اس کے علاوہ اسے اپنے سامان کی بھی پریشانی تھی جو بہت زیادہ قیمتی تو نہ تھا مگر ضرورت کا ضرور تھا البتہ اس کی جیولری وغیرہ ریبیجہ کے ہی پاس رکھی ہوئی تھی ابھی بھی وہ اس پریشانی میں مبتلا تھی جب کسی نے اس کے کمرے پر دستک دی۔

”کون ہے؟“ وہ اپنا دوشہ درست کرتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔

”سوری میں نے اتنی رات کو تمہیں ڈسٹرب کیا۔“ مایا اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے بولی۔

”اصل میں ایسا ہے کہ میری ابھی ابھی ایک ایجنٹ سے بات ہوئی ہے جو تمہارا اور تمہارے بے بی کا پاسپورٹ بنا کر دینے کو تیار ہے۔“ اپنی بات ادھوری چھوڑ کر اس نے سگار سلگالیا۔

”تنتے دن لگیں گے اسے اس کام میں۔“ کچھ دیر تک اس کے آگے بولنے کا انتظار کے بعد نبیو نے بے چینی سے دریافت کیا کہ اس سے نظر آنے والی امید کی اس نے کتنی سی کرن نے اس کے اندر جیسے زندگی بھری۔

”ہول۔“ وہ تھوڑا سا سوچتے ہوئے بولی۔

”ایسا ہے تم کل صبح ڈرا جلدی تیار ہو جانا ڈرائیور کے ساتھ جا کر WAO سے اپنا سامان لے لیتا اور ساتھ ہی جاتے ہوئے راستہ میں فوٹو اسٹوڈیو سے اپنی اور اپنے بے بی کی تصاویر بنوا لیتا یہ تصاویر میں نیٹ کے ذریعے ایڈیٹر کو بھیج دوں گی وہ میرا اسکول فیلو ہے اور مجھے امید ہے صرف بارہ سے چوبیس گھنٹوں کے اندر وہ تمہارا پاسپورٹ بنا کر بھجوا دے گا تم بے منت کی فکر بھی مت کرنا وہ سب میں کرلوں گی اس کے۔“

اپنی بات کے اختتام پر رک کر اس نے نبیو پر ایک نظر ڈالتے ہوئے موبائل پر تیزی سے کوئی نمبر لیس کیا پھر چند سیکنڈ میری طرف لائن پر موجود کسی شخص سے کوئی بات کر کے اس نے فون بند کر دیا اس کی یہ ساری گفتگو عجرائی میں تھی جس کا ایک بھی لفظ نبیو کے لیے نہ پڑا جب تک وہ فون پر بات کرتی رہی نبیو کا وہاں مسلسل اس کے کھلے گریبان سے جھانکنے بیٹھ رہی رہا اسی طرح کا ایک بڑا سا بیڈروم کے بازو پر بھی بیٹا ہوا تھا کبھی کبھی نبیو کو محسوس ہوتا ان بیڈروم کے اس کی شخصیت میں ایک عجیب سی پراسرانت سی بھری تھی جس کی وجہ نبیو کی سمجھ میں نہ آ رہی تھی لیکن سچ تھا وہ مایا کی شخصیت سے تھوڑی تھوڑی سی خوفزدہ ضرور تھی۔

”تمہارا پاسپورٹ ابھی کے ٹکٹ کے لیے کچھ رقم ہے؟“ فون بند کرتے ہی اس نے نبیو سے سوال کیا۔

”ہے تو سہی مگر مجھے پتا نہیں ہے کہ وہ پوری بھی ہوگی یا نہیں البتہ میرے پاس زیور بھی ہے جسے بیچ کر میں سب خرچہ اؤڈر کر لوں گی۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے اب ایسا کرو تم جب کل WAO جاؤ تو واپسی پر اپنی رقم اور زیور بھی لیتی آنا۔“ اس کی رقم اور زیور ریبیجہ کے پاس تھا مگر غلط ہے اسے یہ سب اس لینا تو تھا ہی تو پھر کیوں نہ مل واپسی پر وہ سیانگ سے یہ سب لیتی آئے جس کے لیے ضروری تھا کہ یہ سب بات مایا کو بتائی جائے یہ سوچ کر اس نے اپنا گلا کھنکارا اور بولی۔

”اصل میں میرے پیسے اور زیور WAO میں نہیں ہیں بلکہ یہ سب سامان سیانگ میں مقیم میری کزن کے پاس ہے اب آپ کہیں تو میں کل واپسی میں یہ سب سامان اس کے گھر سے پک کر لوں۔“

”ٹھیک ہے مگر اس سلسلے میں تمہیں میری ایک شرط ماننا ہوگی۔“

”وہ کیا؟“ جانے وہ کیا کہنا چاہتی تھی لفظ ”شرط“ نے نبیو کو الجھا سا دیا۔

”شرط یہ ہے کہ تم اپنی کزن سے میرا کوئی ذکر نہ کرو گی اور نہ ہی اسے یہ بتاؤ گی کہ میں تمہارا پاسپورٹ بنا کر تمہیں وطن واپس بھیج رہی ہوں جب تم واپس اپنے گھر پہنچ جاؤ پھر بے شک اسے اطلاع دے دینا مگر ابھی نہیں اور یہ سب کچھ میں تمہاری بہتری کے لیے ہی سمجھا رہی ہوں ایسا نہ ہو پاسپورٹ بننے سے پہلے ہی بات باہر نکل جائے اور قانون کے ہاتھ تمہاری گردن تک پہنچ جائیں کیونکہ تم جانتی ہو میرا کوئی کچھ نہیں رکا سکتا۔“

اپنی شرط کی اچھی طرح وضاحت کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی اپنا سگریٹ کیس اور موبائل اٹھا لیا۔

”صبح جلدی تیار ہو جانا۔“ نبیو کو بدایت دیتی وہ باہر نکل گئی کیا بات تھی نبیو کا دل بجائے خوش ہونے کے کچھ بجھ سا گیا تھا اس کی چھٹی جس اسے کبھی انسوئی کا احساس دلای تھی کوئی ایسی بات ضرور تھی جو اس کے دل میں کھٹک رہی تھی اور یہ ہی کھٹک اور بے چینی اسے سوئے نہ دے رہی تھی کیوں بدلتے بدلتے اس کی ہلکی سی آنکھ ہی گلی تھی جو کسی غیر محسوس آواز سے کھل گئی رات کے سنانے میں باہر آ کر کھنے والی گاڑی کی آواز نے اسے چونکا کر دیا وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اس کمرے کی کھڑکی سے باہر کا لان بالکل واضح طور پر دکھائی دیتا تھا وہ کھجواں کا بیٹ پر چلتی کھڑکی کے قریب آئی اور آہستہ سے اس کا پردہ تھوڑا سا سر کا ہر جھانکا روش پر ایک بڑی سی کالی گاڑی کھڑی تھی جس کی ساری لائٹس آن تھیں لان میں گلی مدھم سی لائٹ میں سامنے کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا گاڑی سے ٹیک لگائے دو لیے تڑنگے ٹیکو کھڑے جانے مایا سے کیا بات کر رہے تھے مایا نہایت مختصر سے سلیڈنگ سوٹ میں ملبوس تھی بات کرتے کرتے مایا نے اپنا موبائل نکال کر اس میں سے کچھ سرچ کیا اور اسکرین کو ان ٹیکو کے سامنے کر دیا۔

وہ ان ٹیکو کو دکھا کر دیکھ رہی تھی؟ ایک دم نبیو کے ذہن میں جھماکا ہوا وہ دھند جرات سے اس کے دماغ پر سوار تھی ایک دم نکل گئی اسے یاد آیا مایا نے رات کو باتوں کے دوران اپنے موبائل سے اس کی کچھ تصاویر لی تھیں یہ تصاویر اس نے نبیو کو بتائے بغیر لی تھیں اس کی ناراضی کے ڈر سے نبیو نے اس سے اس سلسلے میں کوئی وضاحت طلب نہ کی مگر وہ ذہنی طور پر کچھ اپ سیٹ سی ہو گئی تھی اور اب اسے پتا لگتا یہ تصاویر ان آدمیوں کو دکھانے کے لیے لی گئی تھیں مایا نے یہ حرکت کیوں کی؟ اس کی اس حرکت کا مقصد کیا تھا؟ یہ سب نبیو کو جاننے کی ضرورت نہ رہی تھی وہ سکندر کے گھر سے نکل کر جب سے WAO آئی تھی اس نے بہت کچھ دیکھا اور سیکھا تھا وہاں موجود عورتوں کے حالات نے اسے ساری دنیا کا سبق پڑھا دیا تھا عورت کہاں اور کس طرح استعمال کی جاتی ہے اب یہ باتیں اس کے لیے الجھنے کا باعث نہ رہی تھیں ان حالات نے اسے اپنی حفاظت کرنا بھی سکھا دیا تھا مایا کی شخصیت کا سارا اسرار اس کے سامنے کھل کر آ گیا تھا وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ صبح یہاں سے نکل جانے کے بعد

اسے واپس نہیں آتا۔ مگر کیا مایا اسے اس قدر آسانی کے ساتھ یہاں سے نکلنے دے گی۔ اگر صبح وہ بھی اس کے ساتھ WAO چلی گئی تو پھر کس طرح ممکن ہو گا کہ وہ اس سے اپنا پیچھا چھڑائے اور ان ساری باتوں نے نیو کی آنکھوں سے نیند کو مکمل طور پر بھگا دیا۔

اسے WAO سے فون آچکا تھا اب کس طرح جلد از جلد اسے اس گھر سے نکلنا تھا پہلے تو اس نے سوچ رکھا تھا وہ رات کے اندر میرے میں یہاں سے نکل جائے گی مگر جانے کیوں بچھے کچھ دنوں سے سکندر رات کو ابور کے اپنے ساتھ سلائے لگا تھا اور ظاہری بات تھی وہ کسی بھی حال میں ابور کو چھوڑ کر نہ جاسکتی تھی اس دوران اس نے گھر کی ممکنہ جگہوں کی تھوڑی بہت تلاشی بھی لی تھی کہ شاید کہیں سے اس کے با ابور کے کاغذات مل جائیں وہ تو نہ ملے البتہ اس تلاشی کے دوران سکندر کی رکھی ہوئی کچھ کرنسی ضرور ہاتھ لگ گئی تھی جو نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے اٹھالی کیونکہ وہ جانتی تھی اس گھر سے نکلنے کے بعد اسے قدم قدم پر روپے کی ضرورت پڑے گی انکل صاحب اسے روز فون کر کے پریش ڈال رہے تھے کہ وہ ان کے گھر آجائے جبکہ سکندر اور روز نے بھی یہی بی چاہتی تھیں کہ وہ سکندر کا گھر چھوڑ کر ان کے ساتھ آکر رہ لے نیو جانتی تھی کہ ملائیشیا جیسی جگہ پر کام والی افورڈ کرنا خاصا مشکل کام ہے روز نے کیونکہ خود جواب کرتی تھی اس لیے وہ نیو کو آفر کر رہی تھی کہ وہ اس کے ساتھ چل کر رہے اس کے گھر کا کام کاج کر دیا کرے جس کے بدلے میں وہ اسے ایک معقول رقم دے گی اور ساتھ ہی ساتھ ہر ہفتہ اس کی ملاقات دونوں بچوں سے کروا دیا کرے گی اگر اسے یہاں رہنا ہو تو یقیناً ”یہ ایک اچھی آفر تھی مگر اصل مسئلہ یہ تھا کہ وہ اس ملک میں رہنا ہی نہیں چاہتی تھی اسے ہر حال میں اپنے وطن واپس جانا تھا اور اپنی یہ پلاننگ وہ کسی سے بھی ڈسکس نہ کر سکتی تھی یہی وجہ تھی کہ وہ سب کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی خاص طور پر روز نے کو تو اس نے مکمل طور سے یقین دہانی کروا رکھی تھی کہ وہ اس کے ساتھ ہی جا کر رہے گی اور اب جبکہ شبہا کے طفیل اس کی رجسٹریشن WAO میں ہو چکی تھی اصل مسئلہ یہاں سے نکلنے کا رہ گیا تھا اور یہاں سے نکلنا بھی صرف اس لیے دشوار ہو گیا تھا کہ وہ ابور کے بغیر یہ گھر نہ چھوڑ سکتی تھی رفیدا آج کل کسی ٹریننگ کے سلسلے میں اپنے آفس کی طرف سے جاپان گئی ہوئی تھی۔ فاطمہ دھیر دہجے کے قریب کھانا کھانے کے بعد اپنی بلڈریشر کی ٹیبلٹ کھا کر تقریباً ”ایک گھنٹہ ضرور سوتی تھیں اور یہی وہ ٹائم ہوتا تھا جب ایدھا بھی حمار کو لے کر ایک گھنٹہ آرام ضرور کرتی تھی یقیناً ”دھیر دہجے کا وقت ہی وہ بہترین وقت تھا جب کوشش کر کے نیو اس گھر سے نکل سکتی تھی اپنی پلاننگ کے وقت اسے اپنے گھرے کا پچھلا دروازہ استعمال کرنا تھا جہاں سے نکل کر وہ ساتھ والے گھر کو علیحدہ کرتی ہوئی لکڑی کی باڑ چلا لیتی اور پھر انٹی بائی کے گیٹ سے با آسانی باہر نکل جاتی۔ اس سلسلے میں وہ اپنی بیوی سن انٹی بائی کو مکمل طور پر اعتماد میں لے سکتی تھی اور یہ سب اس لیے ضروری تھا کہ سونے سے قبل فاطمہ اپنے گھر کے مین گیٹ کو بند کر دیتی تھیں حالانکہ اس سے قبل اس نے بھی اس دروازے پر کڑی لگی ہوئی تھی نہ دیکھی تھی اس لاک کی وجہ یقیناً ”نیو تھی جس کا اسے بخوبی علم تھا آج صبح سے ہی وہ بہت مینشن میں تھی سکندر کے جانے کے بعد اس نے ابور کو نملا کر نشانہ کر دیا جبکہ خود بڑی مشکل سے اس نے چائے کا کپ حلق سے اتارا اس کی نظر مسلسل گھڑی کی سوئیوں کا طواف کر رہی تھی لمحہ لمحہ آگے بڑھتا ٹائم اس کے کھل کی دھڑکنوں کو تیز کر رہا تھا اسے شدت سے اس وقت کا انتظار تھا جب ایدھا اور فاطمہ اپنے اپنے کمروں میں چلی جائیں فاطمہ کھانا کھا کر اپنی ٹیبلٹ اٹھا چکی تھیں اپنے کمرے کی گھڑی سے مسلسل نیووان پر نظر رکھے ہوئے تھی اس نے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

فاطمہ باہر کا گیٹ لاک لگانے جا رہی تھیں جب کسی گاڑی کے تیز مارنے نے نیو کے حواس کو منتشر سا کر دیا

اس نے چونک کر لکڑی کی دیوار سے پار دوڑ کر جھانک گیٹ کے عین سامنے کھڑی ہونے والی سفید گاڑی نے اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا ”یہ گاڑی یقیناً ”روز نے کی تھی روز نے اس بھری دھیر میں وہاں کیلئے آئی تھی؟ اسے آج کا یہ دن بھی ضائع ہوتا محسوس ہوا اس نے ہاتھ میں اٹھایا چھوٹا سا بیگ بیڈ کے نیچے کر دیا نہایت ہی مایوسی کے عالم میں وہ خاموشی سے بیڈ پر جا کر لیٹ گئی ظاہر ہے اب فاطمہ نے کہاں سوتا تھا یہ ہی سوچ کر نیو نے اپنی آج کی پلاننگ کو فیل ہوتا محسوس کیا اس کے مزید چوبیس گھنٹے اسے اس گھر کے حقوق خالیے میں گزارنے تھے جہاں ایک ایک گزرتا ہوا اس کے لیے صدیوں کے عذاب کی مانند تھا آج کی دن گزر جانے کے بعد بھی اس کے کمرے کا اسے سی بند تھا ابور سکندر کے ساتھ سو جانا جبکہ وہ اپنے بیڈ کے سرہانے ابور کا چھوٹا پنگھان لگا دیتی ایک ایسا گھر جہاں کا ہر کمرہ اسے سی ہو وہاں اسے ایک نیچے کی سہولت بھی میسر نہ تھی اور وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ سب اسے ذلیل کرنے کے لیے کیا جا رہا تھا مگر کیا کرتی وہ خود اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھی جس کے سبب وہ اس گھر میں ذلت کے زندگی گزار رہی تھی اس امید کے ساتھ کہ اسے اس گھر کے ہر فرد سے اپنا انتقام لینا تھا اور یہ انتقام وہ ابور کی صورت میں ہی لے سکتی تھی اتنی باتوں کے باوجود ابور کو یہاں سے نکال کر لے جانا ایک ایسا طمانچہ تھا جو وہ پورے اور بھرپور انداز سے سکندر اور فاطمہ کے منہ پر مارنا چاہتی تھی۔

اسے اپنے رب سے پوری امید تھی کہ وہ اسے اس عمل کا موقع ضرور فراہم کرے گا وہ اللہ کی رحمتوں سے مایوس ہونا نہ چاہتی تھی اب ایک اور نئی کل کے انتظار میں وہ خاموشی سے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر لیٹ گئی جب کمرے کا دروازہ کھول کر کوئی اندر داخل ہوا اس کا دل ہی نہ چاہا کہ وہ دیکھے کمرے میں کون آیا ہے وہ اسی طرح خاموشی سے ساکت و صامت بیٹھی رہی۔

”نیو سو گئی ہو؟“ خوشبو کے تیز جھونکے کے ساتھ بھی روز نے کی آواز بھی اس کے کانوں سے ٹکرانی اس نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔

”نہیں بھابی آجائیں آپ“ وہ آہستہ سے کتی اٹھ بیٹھی۔

”اے سی کیوں بند ہے تمہارا گرمی نہیں لگ رہی تمہیں۔“

روز نے جو چوبیس گھنٹہ اسے سی میں گزارنے کی عادی تھی ایک دم ہی کمرے کی گرمی سے گھبرا اٹھی جبکہ نیو پچھلے کئی دنوں سے اسی طرح زندگی بسر کرنے کی عادی ہو چکی تھی یا شاید مجبوری انسان سے وہ سب کچھ کو الٹی ہے جو عام حالات میں اسے ناممکن دکھائی دیتا ہے۔

”اے سی خراب ہو گیا ہے۔“ نیو اٹھ کر بیٹھتے ہوئے بولی۔

”وہ۔“ روز نے نے ہونٹ سکڑائے۔

”اگر خراب ہو گیا تھا تو کسی کو دکھا دیتیں گیس کا مسئلہ ہو گیا مجھ سے کہیں میں ٹھیک کروا دیتی ہر حال میں تمہیں اسی لیے کہتی ہوں میرے ساتھ چلو خواہ میں کیوں ایک تیسرے درجے کے شہر کی طرح اس گھر میں زندگی گزار رہی ہو بلکہ میرا خیال ہے کہ ابھی چلو میرے ساتھ ویسے بھی رات میں میرے کچھ مہمان آرہے ہیں تمہاری مدد سے مجھے کام میں آسانی ہو جائے گی۔“ وہ ایک کے بعد ایک تمام تفصیل بتاتی چلی گئی اس کی اس ساری تفصیلی وضاحت سے نیو کو کوئی دلچسپی نہ تھی اس کا دھیان تو مکمل طور پر گھڑی کی جانب مرکوز تھا جس کی لمحہ بہ لمحہ آگے کی جانب بڑھتی سوئیوں اسے احساس دل رہی تھیں کہ آج کا ایک اور دن بھی ضائع ہو گیا۔

”پھر کیا سوچا تم نے چل رہی ہو آج میرے ساتھ میرے گھر۔“ اسے مسلسل خاموش دیکھ کر روز نے زور سے پکارا۔

”نہاں۔“ وہ یک دم چوکی۔

”بھابھی آج تو بہت مشکل ہے اصل میں آج میری طبیعت خراب ہے شاید مجھے فوڈ پوزن ہو گیا ہے جس کے سبب میرے پیٹ میں سخت تکلیف ہے۔“ وہ اپنی آوازیں ممکنہ حد تک تقاضت بھرتے ہوئے بولی۔

”اوہ گاڈ تمہیں تو فوراً سے ہسپتال کی ڈاکٹر کو کھانا چاہیے۔“ نبیو کا بروقت بتایا ہوا بہانہ اس کے کام آئی گیا۔
”تم ایسا کرو جلدی سے اٹھ کر تیار ہو جاؤ میں تمہیں کلینک لے جاتی ہوں۔“ روزینہ کی یہ آفر بالکل غیر متوقع تھی۔ نبیو فوراً اٹھ کھڑی ہوئی اپنا دپٹہ اوڑھا اور ہینڈ بیگ کندھے پر ڈال لیا ابوزر کی انگلی تھام کر باہر نکلتے ہوئے وہ مسلسل دل ہی دل میں آیت کریمہ کا ورد کر رہی تھی۔

”ہامی میں اس کو ڈاکٹر کے پاس لے جا رہی ہوں۔“ روزینہ نے لاؤنج کے دروازے پر کھڑے ہو کر فاطمہ کو اطلاع دی۔

”اچھا۔“ فاطمہ شاید نیند کے زیر اثر تھی ویسے بھی وہ روزینہ سے تھوڑا سادہتی تھیں یہ ہی وجہ تھی جو وہ اس سے کسی بھی قسم کا بحث مباحثہ کرنے سے گریز کرتی تھیں۔

”ابوزر کہاں ہے؟“ اگلے ہی پل فاطمہ کے آنے والی آواز نے نبیو کی سانس بند کر دی اسے اپنا منصوبہ ایک بار پھر کاٹ کر مٹا نظر آیا۔

”وہ بھی ساتھ ہی ہے میں دوانی دلا کر ابھی دونوں کو چھوڑ جاؤں گی۔“ فاطمہ خاموش ہو گئیں مگر جانے کیوں وہ اٹھ کر روزینہ کے ساتھ ساتھ چلتی باہر کے مین گیٹ تک آگئیں حالانکہ وہ ایک بار لیٹ جاتی تو پھر ایک گھنٹہ بعد ہی اٹھتی تھیں۔

”ماں میرے لیے ایک ریفیو آؤس کریم لے کر آنا۔“
حماد کو باہر آیا اسے پتا ہی نہ چلایا شاید اپنی پریشانی میں اس نے دھیان بھی نہ دیا تھا اب جو اس کی آواز سنی تو یکدم جاتے جاتے واپس پلٹ آئی۔

”ہاں بیٹا ضرور۔“ اس نے جھک کر حماد کے گال پر بوسہ دیا۔
”جلدی آؤ نبیو مجھے بچوں کو ان کے اسکول سے پک کرنا ہے دیر ہو جائے گی۔“ روزینہ کی آواز سننے ہی وہ جلدی جلدی مین گیٹ عبور کر کے باہر گاڑی میں جا بیٹھی اس نے گاڑی کو پورن لے کر واپس موڑا فاطمہ ابھی بھی گیٹ میں ہی کھڑی تھیں گاڑی کے قفل کے سرے پر جھکتی ہی نبیو نے گردن موڑ کر دیکھا فاطمہ ابھی بھی وہیں اپنی جگہ پر کھڑی تھیں نبیو کو محسوس ہوا وہ کچھ پریشان سی تھیں شاید وہ نبیو کے ساتھ ابوزر کو بھیج کر پچھتا رہی تھیں موڑ مڑتے ہی تھوڑا سا آگے ایک مقامی ڈاکٹر کا کلینک تھا روزینہ نے وہاں پہنچ کر گاڑی مین روڈ پر ہی روک دی اور جلدی جلدی اپنے پرس میں ہاتھ ڈال کر کچھ رقم نکالی۔

”تم یہ پیسے رکھ لو اندر ڈاکٹر شافریز ہو گا سے چیک کرو اگر گھر واپس چلی جانا میرے بچوں کی چھٹی کا ٹائم ہو رہا ہے مجھے دیر ہو جائے گی۔“ اللہ تعالیٰ اس کے لیے اس قدر آسانیاں فراہم کرے گا یہ تو اس نے سوچا بھی نہ تھا روزینہ کی یہ آخر شاید خدا کی طرف سے ہی کوئی مدد تھی اس نے ہاتھ بڑھا کر خاموشی سے پیسے تھام لیے اور دروازہ کھول کر گاڑی سے باہر نکل آئی اس کا جسم ہولے ہولے لرز رہا تھا وہ خوف زدہ تھی اسے چاروں جانب سکندر کا بیولہ دکھائی دے رہا تھا۔

”تم یہاں سے واپس گھر جا سکتی ہو نا صرف سوس منٹ کی واک پر ہے۔“
”جی بھابھی میں اس مارکیٹ تک ہمیشہ اکیلی ہی آتی ہوں آپ بے فکر ہو کر جائیں۔“ اس نے روزینہ کو یقین دہانی کروائی اور خود ابوزر کا ہاتھ تھامے فٹ پاتھ پر چڑھ گئی روزینہ زوردار آواز کے ساتھ گاڑی بھگاتی ہوئی لے گئی۔

نبیو تیزی سے سامنے نظر آنے والی مارکیٹ کے اندر داخل ہو گئی وہ سخت گھبرائی ہوئی تھی اسے خدشہ تھا کہیں

فاطمہ اسے ڈھونڈتی ہوئی وہاں تک نہ آجائیں اپنی اپنی مصروفیات میں مگن کسی بھی فرد نے نبیو پر دھیان نہ دیا وہ تقریباً بھگتی ہوئی مارکیٹ کے دوسرے دروازے سے باہر نکل آئی سامنے ہی ٹیکسی کھڑی تھی وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھی۔

”ہانگ جاپا چلو گے؟“ اس نے اپنی آواز کو حتی الامکان دباتے ہوئے کہا اسے خدشہ تھا کہیں اس کے ہونٹوں سے نکلا ہو کوئی لفظ فاطمہ یا سکندر کے کانوں سے نہ جا کر اے اسی سبب اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی تھی۔

”پچیس رنچھٹ لوں گا۔“ ٹیکسی ڈرائیور نے پچھلا دروازہ کھولتے ہوئے کہا وہ خاموشی سے اندر بیٹھ گئی ساتھ ہی اس نے اپنے پرس پر ہاتھ ڈال کر دس رنچھٹ ڈرائیور کی سمت بڑھا دیے جو کرایہ کی ایڈوائس رقم بھی باقی پیسے اسے ہانگ جاپا پہنچ کر دینے تھے جو یہاں سے تقریباً ”ایک گھنٹہ کے فاصلے پر تھا۔

”یہ وہ ایڈریس ہے جہاں تم نے مجھے پہچانا ہے۔“ اس نے ڈرائیور کی سمت WAO کے ایڈریس والی پرچی بڑھائی جسے خاموشی سے اس نے تھام کر اپنے سامنے رکھ لیا۔ گاڑی کے کنڈکشن میں چالی لگا کر اسے اشارت کر دیا اگلے ہی پل دھیرے دھیرے ریٹیکٹی گاڑی مین روڈ پر آگئی اس نے بے اختیار گردن موڑ کر پیچھے کی جانب دیکھا۔

لحہ بہ لحہ آگے کی جانب بڑھتی ٹیکسی اس کے ماضی کو پیچھے چھوڑ رہی تھی اس نے ان گزیدوں پر دیر تک الوداعی نظر ڈالی جہاں اس کی زندگی کے بدترین سات سال گزرے تھے اس کے ساتھ ہی حماد کی یاد ایک ٹیکس بن کر اس کے دل میں ابھری جو یقیناً ”اپنی ریفیو آؤس کریم کے انتظار میں لاؤنج کے دروازے پر ہی موجود ہو گا اے کاش میں ایک آخری بار اسے آؤس کریم دے سکتی اسی سوچ کے ساتھ ہی آنسو قطرہ قطرہ بن کر اس کی آنکھوں سے بہنے لگے جانے وہ کب تک اسی طرح روتی رہتی کہ ایک دم ہی موبائل کی واٹس ایپشن نے اسے چونکا دیا وہ دنگنی اس نے جلدی جلدی اپنے ہینڈ بیگ میں ہاتھ ڈال کر سیل ڈھونڈا اسکرین پر ریجہ کا نمبر تھا اسے یاد آیا اس کا یہ نمبر سوائے ریجہ اور شوہا کے کسی کے پاس بھی نہ تھا کئی دیر سے رکا ہوا اپنا سانس بحال کر کے اس نے ٹیکس کاٹن دیا اور فون کان سے لگالیا۔

”ہیلو۔“ سرگوشی کی مانند آواز اس کے ہونٹوں سے نکلی۔
”کہاں ہو تم؟“ دوسری طرف ریجہ کی آواز کی بے قراری بتا رہی تھی کہ اسے نبیو کے گھر سے ابوزر کو لے کر فرار ہونے کی خبر پہنچ چکی ہے۔

”کہیں کیا ہوا؟“ جواب دینے کے بجائے اس نے ٹیکسی ڈرائیور پر ایک نظر ڈالتے ہوئے مختاط انداز میں سوال کیا دونوں کے درمیان ہونے والی یہ گفتگو مکمل اردو زبان میں تھی جو یقیناً ”ملانی ڈرائیور نے جانتا تھا پھر بھی احتیاط اس کی اولین ترجیح تھا۔

”تمہاری ساس اور سکندر کا فون آیا تھا تمہارا پوچھ رہے تھے۔“
ریجہ کے جواب دیتے ہی اس نے بے اختیار اپنی ریسٹ وایج پر نظر ڈالی ابھی اسے گھر سے نکلے تقریباً

پینتالیس منٹ ہوئے تھے اور اتنی دیر میں ہی اس کی تلاش کا عمل شروع بھی ہو گیا یقیناً ”اس کی سہیلہ ساس اس کے گھر سے نکلتے ہی ڈاکٹر شافریز کے کلینک آئی ہوگی جہاں اسے موجود نہ پا کر فوراً ”سکندر کو اطلاع دی گئی پھر اپنے طور پر بھی اسے یہاں وہاں تلاش کرنے کے بعد ریجہ سے رابطہ کیا گیا۔

”میں WAO پہنچ کر تم سے رابطہ کروں گی تم پریشان مت ہونا ابوزر میرے ساتھ ہے اور ہم دونوں ان شاء اللہ خیر خیریت سے اپنی منزل تک پہنچ جائیں گے۔“

ریجہ کو تسلی دینے کے ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا گاڑی WAO کے گیٹ پر پہنچ چکی تھی بڑی سی اونچی اونچی دیواروں والی عمارت جس کا دروازہ اس کی شناخت کے بعد کھول دیا گیا اندر داخل ہوتے ہی اس کا استقبال

ایڑانے کیا، جو اسے آئی ٹی کے آفس لے گئی، آئی ٹی نے سب سے پہلے اسے WAO کے تمام قوانین سے آگاہ کیا، جس کے بعد اس سے رجسٹریشن فارم فل کروایا گیا، رجسٹریشن کے بعد اس کے حوالے کرے کی چابی دی گئی، ساتھ ہی انہوں نے اپنے سامنے رکھی تھیں، سب کر سنی کو بلا یا جو ایک دہلی جی ملانی لڑی تھی۔

”پہلے تمہیں ہال لے کر جانے کی جہاں WAO کی رہائش پذیر تمام خواتین تم سے ملاقات کریں گی اور ہاں تم جتنا عرصہ یہاں رہو گی تمہیں ان سب کے ساتھ مل جل کر رہنا ہو گا کیونکہ تم سب کی انچارج ہے اس کے ساتھ مل کر فیصلہ کر لینا کہ تم یہاں کون سا کام کر سکتی ہو کیونکہ یہ سب یہاں کے کام آپس میں مل بانٹ کر کرتی ہیں یہاں کوئی کام والی نہیں ہے۔“ آئی ٹی نے اسے تمام تفصیل سے آگاہ کیا۔

”ٹھیک ہے آئی۔“ وہ اثبات میں جواب دیتی سہتی کے ساتھ باہر آگئی اور پھر اس دن سے اس نے دوسرے کھانے کی ذمہ داری سنبھال لی جبکہ اپنے اپنے کمرے کی صفائی وہ سب خود کرتی تھیں۔



صبح جب وہ اٹھی تو اس کا سارا جسم دکھ رہا تھا ساری رات اسے ٹینشن سے نیند بھی نہ آئی تھی لیکن اپنی یہ ٹینشن وہ مایا کے سامنے ظاہر نہ کرنا چاہتی تھی یہ ہی وجہ تھی کہ نہادو کھڑا اچھی طرح تیار ہو گئی، ساتھ ہی اس نے ابوور کو بھی تیار کر لیا، اس کے بعد مایا کے ڈیڑھ سالہ بیٹے کو پیچ کر کے فیڈ تیار کر کے دیا جبکہ اس کی بیٹی سیرا ابھی تک سو رہی تھی، نبیو نے الماری کھول کر اپنا تمام سامان بھی ہینڈ بیگ میں رکھ لیا اس کا یہ ہینڈ بیگ عام سائز سے خاصا بڑا تھا جس میں وہ اپنی ضرورت کی تمام اشیاء آرام سے رکھ لیتی ابھی بھی اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ WAO سے نکلے ہوئے اپنے ساتھ تمام سامان لے کر نہ آئی تھی ورنہ یہاں آکر مشکل میں پھنس جاتی اس تمام عمل کے مکمل ہونے کے بعد اس نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی تو دیکھنے والے تھے اور مایا نے اسے یہی بتا دیا تھا۔

اللہ کا نام لے کر وہ کمرے سے باہر آگئی کارڈور سے باہر نکلتے ہی اس کی نظر سامنے صوفے پر بیٹھی مایا پر پڑی جس کی تک سبک سے کی گئی تیار یہ بتا رہی تھی کہ وہ بھی ساتھ چلنے کو تیار ہے ورنہ عام طور پر اس وقت وہ بیچہ تائی میں ہی بلبوس نظر آتی تھی، نبیو تو ڈا سا پریشان ہو گئی اگر یہ اس کے ساتھ WAO جاتی تو پھر بہت مشکل تھا کہ نبیو اس سے اپنی جان چھڑائی، بہر حال اسے یہاں واپس تو نہ آنا تھا یہ تو طے تھا اب یہ کس طرح ممکن بنانا تھا یہ سب اسے وہاں جا کر سوچنا تھا اسے امید تھی اس سلسلے میں آئی ٹی نو ضرور اس کے کام آئیں گی۔

”اوہ گڈ۔“ اس پر نظر پڑتے ہی مایا نے ستائشی انداز میں ہونٹ سکڑے یہ اس کا مخصوص اشارہ تھا۔

”میں تو سمجھی تھی کہ تم وہی روٹی دھوتی شکل لے کر باہر آ جاؤ گی مگر تمہیں اتنا اچھا تیار دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی، بہر حال میں نے ٹیکسی کے لیے فون کر دیا ہے ڈرائیور آنے والا ہو گا، میرے اعتماد کا بندہ ہے راستہ میں جاتے ہوئے کدائی کا مہا (فوٹو شاپ) سے تمہاری کچھ فوٹوز بھی بنوا کر مجھے سینڈ کروے گا اور بحفاظت تمہیں واپس بھی لے آئے گا۔“

”کیوں آپ میرے ساتھ نہیں جا رہیں؟“

اپنی خوشی کو اندر ہی دبا تے ہوئے اس نے سرسری سا انداز اختیار کیا۔

”تمہیں اصل میں آج صبح میری ایک آئی کا انتقال ہو گیا ہے لہذا مجھے جنازے کے ساتھ قبرستان جانا ہے۔“

اس نے اپنی گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے جواب دیا۔

”اوہ۔ اچھا۔“ نبیو جانتی تھی کہ یہاں کی تمام خواتین مردوں کے ساتھ قبرستان جاتی اور تدفین کا مکمل عمل اپنی آنکھوں سے دیکھتیں، جب کہ اتنے سالوں کی یہاں رہائش کے باوجود وہ کبھی بھی خود کو اس لمحہ میں قبرستان جانے کے لیے تیار نہ کر سکی تھی اور اس سلسلے میں کبھی سکندر نے اس پر دباؤ بھی نہ ڈالا تھا۔

”ٹھیک ہے ڈرائیور آ گیا ہے تم جاؤ لیکن اس کے ساتھ ہی واپس آ جانا میں نے تمہارے پاسپورٹ کے لیے ایڈوانس رقم دے دی ہے اب مجھے کوئی دھوکہ مت دینا۔“

شاید مایا کی چھٹی حس اسے کسی بات کے غلط ہونے کا احساس دل رہی تھی۔ جس کی بنا پر وہ نبیو سے یقین دہانی چاہتی تھی کہ وہ واپس پلٹ کر آئے گی۔

”لیکن مجھے اپنے زیور اور رقم کے لیے سیانگ جانا پڑے گا۔“

”وہ بھی تمہیں ڈرائیور لے جائے گا میں نے اسے چند رہن گھٹ ایڈوانس دے دیے ہیں باقی یہ بیس رہن گھٹ تم رکھ لو، دس واپس آ کر ڈرائیور کو دینا اور دس تمہارے فوٹو شوٹس کے لیے ہیں۔“

نبیو کے ساتھ ساتھ چلتی وہ باہر آگئی، کچھ دیر کھڑے ہو کر ڈرائیور کے ساتھ آہستہ آہستہ جانے کیا گفتگو کی جو نبیو کو سمجھ ہی نہ آئی ایک ٹو اس کی آواز بہت دھیمی تھی دو سرادھ ڈرائیور کو لے کر ڈرائیور جا گھڑی ہوئی تھی۔

”میں نے اسے سب کچھ سمجھا دیا ہے تمہیں کسی بھی قسم کی کوئی پریشانی نہ ہو گی اور ہاں تم WAO میں زیادہ وقت مت لگا نا جلد ہی وہاں سے نکل کر سیانگ چلی جانا۔“

مایا نے اپنے مسلسل بچے موبائل پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اسے پھر سے سمجھایا۔

”ٹھیک ہے۔“ نبیو اسے جواب دے کر ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئی ڈرائیور نے گاڑی اشارت کر دی ابھی وہ سیٹ سے باہر بھی نہ نکلی تھی کہ اس کا فون بج اٹھا اسکرین پر نظر آنے والا نمبر مایا کا تھا جو کچھ دور پیچھے روش پر کھڑی تھی۔

”اب کیا مصیبت ہو گئی۔“ اس نے جھنجھلاہٹ سے سوچتے ہوئے ٹیکس کاٹن دیا۔

”جی بولیں۔“ وہ اپنی بیزارت کو چھپاتے ہوئے بولی۔

”جاتے ہوئے یاد سے اپنی فوٹوز لے کر مجھے سینڈ کر دینا میں انتظار کروں گی اور ہاں جلد ہی واپس آنے کی کوشش کرنا تم سے ملے ایجنٹ نے آنا ہے۔“

”اوکے۔“ مختصر سا جواب دے کر اس نے فون بند کر دیا وہ جانتی تھی کہ یہ مایا کا اسے اپنے جال میں پھنسانے کے لیے پھنکا جانے والا دانا ہے لیکن شاید مایا یہ نہ جانتی تھی کہ نبیو جیسے پرندے کو مایا کے دانے کے اب ضرورت نہ رہی تھی۔

اس کا میل دو دن بند رہنے کے بعد رات ہی مایا نے چارج کر کے دیا تھا جس پر دھڑا دھڑ رعبہ کے کئی مسیج آ چکے تھے جنہیں ابھی تک اس نے کھول کر بھی نہ پڑھا تھا۔ ابھی وہ یہ تمام مسیج WAO جا کر ہی پڑھنا چاہتی تھی لہذا خاموشی سے اس نے اپنے ہینڈ بیگ میں فون رکھ کر ابوور کو بسکٹ کا پکٹ کھول کر دیا اور خود گھڑی سے باہر بھاگے دوڑتے نظاروں پر نظر ڈالتے گئی جب گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رک گئی اس نے بے اختیار سامنے دیکھا ایک چھوٹی سی مارکیٹ تھی یقیناً ”یہاں کوئی فوٹو اسٹوڈیو تھا جس کی بنا پر ڈرائیور نے ٹیکسی روکی تھی۔“

ڈرائیور کے باہر نکلتے ہی وہ بھی خاموشی سے باہر نکل کر اس کے پیچھے اس مارکیٹ میں داخل ہو گئی جہاں سامنے ہی ”فری کدائی کا مہا“ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ ڈرائیور کے ساتھ ہی وہ اندر داخل ہو گئی وہاں شاید پہلے ہی اس کی آمد کے متعلق علم تھا جاتے ہی اسے اندر ڈارک روم لے جایا گیا تقریباً ”چند رہن منٹ مختلف زاویوں سے اس کی کچھ تصاویر لی گئیں وہ جانتی تھی کہ پاسپورٹ کے لیے ایسی تصاویر کی ضرورت نہیں ہوتی مگر اس وقت وہ کسی سے بھی جواب طلبی کی پوزیشن میں نہ تھی یہ ہی وجہ تھی کہ خاموشی سے اپنا فوٹو سیشن کروا کر وہ باہر آگئی۔

”تمہیں تنگ روم میں بیٹھو میں ابھی تمہاری فوٹوز لے کر میڈم کو سینڈ کروں۔“

اسے اندر وینٹ روم میں بٹھا کر ڈرائیور فوراً ”باہر نکل گیا“ نبیو خاموشی سے کرسی پر بیٹھ کر آیت الکرسی کا ورد

کرنے لگی اس کا دل گھبرا رہا تھا وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتی تھی تقریباً "دس منٹ بعد ہی ڈرائیور واپس آ گیا۔ اس نے ہاتھ میں لب ٹاپ اٹھا رکھا تھا۔
"آجائیں میم۔"

دروازے پر کھڑا ہو کر اسے پکارتے ہوئے وہ باہر کی جانب چل دیا نیو بھی اس کی تقلید میں باہر آگئی گاڑی میں بیٹھتی ہی اس نے سکھ کا سانس لیا ٹیکسی کے اشارت ہوتے ہی مایا کا فون پھر سے آگیا جانے کیوں نیو کو گھر سے WAO کے لیے بھیج کر مایا کچھ بے چین سی ہو گئی تھی۔

"ایسا کرو تم جہاں بھی ہو وہاں سے واپس آ جاؤ WAO کل چلی جانا آج فوراً" واپس میرے گھر آؤ تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔ "فون کان سے لگاتے ہی مایا کی بے قرار آواز اس کی سماعت سے غمرا گئی۔
"لیکن کیوں؟" نیو نے حیرت سے دریافت کیا۔

"دراصل تم سے ملنے اینڈریو آ رہا ہے تم آج اس سے مل لو ہو سکتا ہے وہ ایک دونوں میں ہی تمہیں پاسپورٹ بنوادے۔" تپ کا ایک اور رہتا۔

"اوکے۔۔۔" مختصر سا جواب دے کر اس نے فون بند کر دیا مگر اس کا ارادہ قطعی واپس جانے کا نہ تھا یہی سوچ کر وہ خاموشی سے گاڑی کی سیٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی، کچھ ہی دیر بعد وہ WAO کے دروازے سے گیٹ کے سامنے تھی اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے ابوزر کو ہاتھ سے تھام کر نیچے اتارا۔

"میم آپ کتنی دیر میں واپس آ رہی ہیں؟" ابھی وہ گیٹ تک ہی پہنچی تھی جب اسے اپنے پیچھے ٹیکسی ڈرائیور کی آواز سنائی دی وہ واپس پلٹی۔

"یہ تم اپنے باقی دس رنگٹ لے کر یہاں سے جاؤ مجھے فی الحال واپس نہیں جانا اگر میڈم تمہیں فون کریں تو انہیں بتا دینا کہ میں سیانگ سے ہو کر خود ہی واپس آ جاؤ گی وہ بے فکر رہیں۔" ڈرائیور کی پھٹی پر دس رنگٹ رکھ کر وہ تیزی سے WAO گائیڈ پارکر کے اندر آگئی جہاں آتے ہی اسے تحفظ کے احساس نے اپنے حصار میں لے لیا بے شک یہاں اسے کام کے ساتھ ساتھ سب کی باتیں بھی سننا پڑتی تھیں مگر پھر بھی یہاں وہ محفوظ تھی وہ آئی نوما کے آفس کی جانب چل دی۔

"تم نے اپنی کرنل سے کوئی رابطہ نہیں کیا۔" آئی نوما کے آفس میں داخل ہوتے ہی انہوں نے پہلا سوال یہی کیا۔

"نہیں آئی دراصل مجھے ٹائم ہی نہیں ملا۔" وہ جواب دے کر وہیں بیٹھ گئی سب سے پہلے ضروری تھا کہ وہ انہیں مایا کی تمام حقیقت بتاتی پھر کوئی دوسرا کام کرتی۔

"تو ٹھیک ہے تم ابھی اس سے بات کر لو وہ بے حد پریشان ہے پہلے اسے تسلی دو پھر مجھے بتاؤ تم خود اتنی پریشان کیوں ہو؟"

آئی نوما غالباً "اس کے چہرے سے ہی اس کے دل کی کیفیت بھانپ چکی تھیں نیو نے بتا کوئی جواب دے لیا اپنا فون نکالا وہاں کوئی دس مایا کی مس کالز تھیں یقیناً "وہ اسے مسلسل فون کر رہی تھی اور اب کچھ بعید نہ تھا جو وہ کچھ ہی دیر میں یہاں آجانی لہذا ضروری تھا کہ جلد از جلد یہاں کو اپنی خیمہ جتا کر آئی نوما سے بات کی جائے، وہ ان پر واضح کرنا چاہتی تھی کہ اسے اب دیا رہایا کے ساتھ واپس نہیں جانا۔

"تم کسی بھی طرح کی پونگ پنچو فروس خان آگیا ہے اور وہ تم سے ابھی ملنا چاہتا ہے۔" شمرز کے اس پیغام نے نیو کو کے جسم میں بجلی سی بھری اس نے جلدی جلدی ابوزر کو تیار کر کے اس کے لیے بالوں کی دو پونیاں بنائیں

شمرز خان کی ہدایت کے مطابق اس نے ابوزر کے حلیے کو مکمل طور پر لڑکیوں والے حلیے میں تبدیل کر دیا تھا، اپنے لیے بالوں کی پونی اور فراک کے ساتھ وہ لڑکی ہی نظر آتا آگے تیس منٹ کے اندر ٹرین کے ذریعے وہ کی پونگ پنچو چکی تھی جہاں ایک پاکستانی ہوٹل کے برے سے ہال میں شمرز کے ساتھ فروس خان بھی موجود تھا پھر اسے دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا احترام کا یہ انداز نیو کو اچھا لگا۔
"آؤ بہن بیٹھو ہم تمہارا انتظار کر رہے تھے۔"

وہ ابھی ٹیبل کے قریب پہنچی ہی تھی کہ بنا تعارف کے ہی فروس خان اسے پہچان گیا وہ خاموشی سے اس کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

"تمہیں شمرز نے یقیناً "میرے بارے میں سب کچھ بتایا ہو گا میں یہیں قریب میں ہی رہتا ہوں یہاں میرے ساتھ میری بیوی اور چار عدد بچے بھی ہیں، میری بیٹھ سے یہ کوشش ہوتی ہے کہ تم جیسے پریشان اور بیباک روہدہ گار ہم دونوں کے کام آسکوں اور مجھے بہت خوشی ہوتی ہے جب بھی کبھی میں اپنی کسی ایسی کوشش میں کامیاب ہوتا ہوں اور یقیناً "اب بھی ایسا ہی ہو گا کیونکہ میں بھی ابھی اپنے رب کی رحمت سے ناامید نہیں ہوتا۔" بیو خاموشی سے سر جھکائے اس کی تمام گفتگو سن رہی تھی۔

"اب ایسا ہے کہ وطن واپسی کے لیے تمہارا پاسپورٹ بننا بہت ضروری ہے جس کے لیے تمہیں پرانے پاسپورٹ کی کم شدگی کی ایف آئی آر بھی لازمی طور پر چاہیے ورنہ اس کے بغیر کچھ بھی ممکن نہیں ہے۔"
"مگر۔۔۔" نیو نے گلا کھنکھار کر کچھ کہنے کی کوشش کی۔

"میں سب کچھ جانتا ہوں۔" فروس خان نے ہاتھ اٹھا کر اسے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔
"مجھے شمرز نے تمہارے بارے میں سب کچھ بتا دیا ہے تمہارے پاسپورٹ کی ایف آئی آر کے لیے میں ابھی خود تمہارے ساتھ چل رہا ہوں۔"

بات کے اختتام پر ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا اس کے ساتھ ہی شمرز بھی اٹھ گیا، ان دونوں کی تقلید میں نیو بھی آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوٹل سے باہر آگئی اور پھر اگلے ہی دس منٹ بعد وہ فروس خان کی گاڑی میں مقامی پولیس اسٹیشن پہنچ گئی جہاں اندر داخل ہوتے ہوئے وہ تھوڑا سا گھبراہٹ رہی تھی۔

"ڈرومٹ ایف آئی آر کا اندراج تمہارا قانونی حق ہے جو تم سے کوئی نہیں چھین سکتا، باقی رہے تمہارے اور تمہارے اس خبیث مرد کے اختلافات وہ سب بعد کی باتیں ہیں جس کا تعلق یہاں اس علاقے کی پولیس سے نہیں ہے۔" فروس خان کی تسلی کے بعد وہ اندر داخل ہو گئی۔

"تم یہاں بیٹھو اگر تمہاری ضرورت پڑی تو میں تمہیں اندر بلوالوں گا۔" فروس خان کی ہدایت کے عین مطابق وہ باہر رکھی کرسی پر ہی بیٹھ گئی اسے حیرت ہوئی جب صرف چند رہے پس منٹ کے اندر اس کے پاسپورٹ کی ایف آئی آر درج ہو گئی جس کے لیے وہ کچھلنے کی ماہ سے خواہ ہو رہی تھی ایف آئی آر کی فیس سات رنگٹ تھی جو فروس خان نے خود ادا کی یہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہو جائے گا نیو کو یقین ہی نہ آ رہا تھا۔

"اب تم یہ ایف آئی آر لے کر سفارت خانے جاؤ وہاں درخواست جمع کرواؤ کہ تم کو نیا پاسپورٹ جلد از جلد جاری کیا جائے۔"

فروس نے پرانے پاسپورٹ کی ایف آئی آر اس کے حوالے کرتے ہوئے سمجھایا نیو نے خاموشی سے اس کے ہاتھ میں تھما کاغذ کا ٹکڑا لے لیا اس کی سمجھ میں نہ آیا وہ فروس خان کے اس احسان کا شکریہ کس طرح ادا کرے۔

"بھائی آپ کا بہت بہت شکریہ۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

”بھائی بھی کہتی ہو اور شکر یہ بھی ادا کرتی ہو یاد رکھو بھائیوں کو صرف دعاؤں کی ضرورت ہوتی ہے۔ بس ایک بن کی طرح میرے لیے ہوشہ دعا کرنا کہ میں تمہیں تمہارے اپنوں کے پاس پہنچانے میں کامیاب ہو سکوں۔“

”ان شاء اللہ۔“ قریب کھڑے شمرنے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”بس اب تم جاؤ کل صبح سفارت خانے چلی جانا پھر مجھے بتانا کہ انہوں نے کتنا وقت دیا ہے یہ میرا کارڈ رکھ لو اب جب بھی ضرورت پڑے مجھ سے ہی رابطہ کرنا۔“

وہ کارڈ دے کر ہار نکل گیا، نیو اسے پشت کی جانب سے کھڑی دیکھتی رہی یقیناً ”فردوس خان ایک ایسا فرشتہ تھا جسے شاید قدرت نے اس کا نجات دہندہ بنا کر بھیجا تھا۔“

”تم جانتی ہو تم نے بایا کے ساتھ جا کر کتنا خطرناک کام کیا تھا وہ تو تمہاری قسمت اچھی تھی جو حق گنیں ورنہ آج شاید قتالی لینڈ کے کسی بار میں دل رہی ہوتیں اور تمہارا بیٹا کسی چوراہے پر بھیک مانگ رہا ہوتا۔“ عبدالوہاب غصے سے چیخا ہوا بولا۔

آج بایا نے اس سے ملنے WAO آتا تھا جس کی بنا پر نوا آئی نے صبح ہی اسے سیانگ بھیج دیا تھا جانے وہ کیوں نیو کا پیچھا نہیں چھوڑی تھی، اسے مسلسل فون کرتی اس کا کہنا تھا وہ نیو کے کام کے سلسلے میں ایڈز پر ایک خطیر رقم دے چکی ہے اور اب نیو کے اس طرح مکرے پر یہ رقم ضائع ہو جائے گی جبکہ نیو اسے بتا چکی تھی کہ اب اسے کسی پاسپورٹ کی ضرورت نہیں ہے مگر پھر بھی وہ باز نہیں آ رہی تھی یہ ہی وجہ تھی جو آج اس کا فون آئے ہی وہ ٹیکسی لے کر سپانگ آگئی۔ اور یہاں آتے ہی عبدالوہاب نے اسے آڑے ہاتھوں لیا وہ ان دونوں میاں بیوی کی بے لوث محبت سے واقف تھی اسی سبب اسے عبدالوہاب کی کوئی بات بری نہیں لگ رہی تھی اپنے اتنے سالہ تعلقات میں اس نے آج پہلی بار عبدالوہاب کو اس قدر غصہ میں دیکھا تھا اور وہ جانتی تھی کہ اس کا یہ غصہ جائز تھا اسی بنا پر وہ خاموشی سے سب کچھ سن رہی تھی۔

”اس نے فیٹ کے ذریعے تمہاری تصاویر یقیناً کسی دلال کو بھیجی ہوں گی جس سے وہ تمہارا ایڈوانس بھی پکڑ چکی ہے یہ ہی وجہ ہے جو وہ اس قدر تمہارے پیچھے خوار ہے ورنہ اس تیز رفتار زبانی میں کسی کے پاس اتنا وقت نہیں ہے جو وہ لوگوں کے پیچھے بھاگنے میں ضائع کرے۔ بہر حال آئندہ اگر تم نے کوئی ایسی حرکت کی تو میں ابوذر سکندر کے حوالے کر کے جنہیں تن تو ہمارا پاکستان واپس بھیج دوں گا۔“

”ایک منٹ ذرا خاموش ہوں۔“ ریحہ نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کروایا اور اپنا سیل نیو کی طرف بڑھایا۔

”تمہاری امی کا فون ہے بات کرلو۔“ اس کے کوئی جواب دینے سے قبل ہی ریحہ اس کے کان سے فون لگا چکی تھی اس نے خاموشی سے سیل تمام لیا۔

”السلام علیکم ماما۔“ وہ گہری سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔

”یہ تم کہاں غائب ہو کوئی امانہ پتا تم نے تو ہم سب کو پریشان کر کے رکھ دیا۔“ اس کے سلام کے جواب میں روا کی متوجہ آواز سنائی دی۔

”میں ریحہ کے گھر ہوں اور اس سے قبل جہاں تھی خدا کا شکر ہے خیریت سے تھی۔“

”دیکھو نیو خدا کے واسطے ابوذر کو اس کے باپ کے حوالے کر دو اور خود خاموشی سے وطن واپس آ جاؤ تم نہیں جانتیں تمہاری اس طرح گم شدگی نے ہمیں کس قدر پریشان کر رکھا ہے اور یہ دنیا والے طرح طرح کی باتیں بتا رہے ہیں ایک جوان اور خوب صورت لڑکی کا یوں تن تنہا پھرنا کتنی بدنامی کا باعث ہوتا ہے جنہیں کچھ اندازہ بھی ہے؟ اوپر سے سکندر نے ہمیں فون کر کر کے ہلکان کر رکھا ہے، بس بہت ہو گیا تم آج ہی سانپ کی اولاد اس کے

باپ کے حوالے کر دو اور اس سے اپنے کاغذات واپس لو، یہاں آتے ہی ہم تمہاری شادی ستان سے کر دیں گے۔“

”ستان۔“ وہ چونکی اسے سوچنے پر بھی یاد نہ آیا کہ یہ نام اس نے پہلے کہاں سنا ہے۔

”مما یہ ستان کون ہے؟“ اس نے غائب دماغی سے دریافت کیا۔

”کیا مطلب تمہارا کون ستان کو نہیں جانتیں۔“

دوسری طرف روا کو ایسا محسوس ہوا جیسے نیو اپنے حواسوں میں بھی نہ ہو اس کے اس سوال نے روا کو تھوڑا سا پریشان کر دیا۔

”میں ممما میں صرف اور صرف ابوذر کو جانتی ہوں اس کے علاوہ میں دنیا کے کسی اور مرو کے نام سے واقف نہیں لہذا بہتر ہو گا آج کے بعد آپ مجھ سے کبھی بھی زندگی میں ستان کا ذکر نہ کر دیں۔“

”میری بات سنو نیو یہ سب ڈرامہ ختم کرو سکندر کا بیٹا اس کے حوالے کر کے خود پاکستان واپس آؤ جانتی ہو تمہاری اس حرکت نے سکندر اور اس کی ماں کو کتنا پریشان کیا ہے آئی فاطمہ ابوذر کے غم میں ہاسٹل ٹرڈ ہیں۔“

عالمبا ”جینے نے روا کے ہاتھ سے فون لے لیا تھا اور اب وہ نیو کو خوب لٹا رہا تھا نیو نے اپنے کان سے فون ہٹا کر حیرت سے دیکھا اسے یقین ہی نہ آیا کہ وہ دوسری طرف اس کا اپنا سا بھائی بول رہا ہے جسے نیو سے زیادہ سکندر اور اس کی ماں کی فکر تھی یہ اس کا ماں جایا تھا جو ہر مقام پر اس کے راستے میں حائل ہونے کی کوشش کرتا جانے اس کی یہ کوشش دانستہ ہوتی یا نادانستہ یہ بات آج تک وہ سمجھ نہ پائی تھی مگر اس وقت جینے کی اس گفتگو نے اس کی طبیعت کو خاصا مدد کر دیا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تھوڑی سی سچ ہو گئی۔

”جینے بھائی ابوذر میرا بیٹا ہے آئی فاطمہ کا نہیں اگر میں حماد کے بغیر زندہ ہوں تو سکندر کو بھی ابوذر کی جدائی سہی پڑے گی، مرو ہونے کی خود ساختہ برتری اسے ”ماں“ کے رشتے پر فوقیت نہیں دیتی میں دہچے جنم دے کر صرف ایک کی حق دار ہوں تو وہ کس بل بوتے پر مجھ سے میرا یہ حق چھیننا چاہتا ہے اور معاف کیجئے گا کبھی میری جگہ رحاب بھانجی کو رکھ کر سوچئے گا تو آپ کو بتا چلے گا اولاد کا دکھ کیا ہوتا ہے۔“ وہ بات کرتے کرتے رو پڑی۔

”دیکھو نیو میری بات سمجھنے کی کوشش کرو میں جو کچھ کہہ رہا ہوں تمہارے ہی بھلے۔“ جینے کی بات درمیان میں ہی رو گئی جب بالکونی کے دروازے سے گھبرایا ہوا عبدالوہاب اندر داخل ہوا وہ خاصا حواس باختہ تھا۔

”جلدی سے فون بند کرو۔“

اس کی گھبراہٹ دیکھ کر نیو پہلے ہی فون بند کر چکی تھی اسے اپنے آس پاس خطرے کی گھنٹی کی آواز سنائی دے رہی تھی وہ ہڑپڑا کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی ”جلدی یہاں سے نکل کر کسی محفوظ مقام پر پہنچو ابھی ابھی مجھے عبدالرحمن (سیکنڈ کاشوہر) نے فون پر اطلاع دی ہے کہ سکندر پولیس کے ساتھ ہمارے گھر ہی کی طرف آ رہا ہے۔“

عبدالوہاب کی بات ختم ہونے سے پہنچتے ہی نیو نے اپنا ہنڈ بیگ اٹھایا اور تیزی سے آگے بڑھ کر ابوذر کو گود میں لے لیا جو اس اچانک افتاد سے گھبرا کر رونے لگا اس کے فرائز بھی ٹھیل پر ہی بکھر گئے۔

”ایک منٹ عبدالوہاب اسے کچھ کھا تو لینے دس صبح سے صرف چائے ہی پی رہی ہے۔“ ریحہ جو ٹھیل پر کھانا لگا رہی تھی اسے اس طرح جاننا دیکھ کر برداشت نہ کر سکی اور فوراً ہی عبدالوہاب کو نوک بیٹھی۔

”میں اس خبر نے میری بھوک کو بالکل ختم کر دیا ہے یہاں سے نکل کر کچھ کھانوں کی کیونکہ زندہ رہنے کے لیے کھانا ضروری ہے پہلے مجھے یہاں سے نکلنے دو۔“

اسے وہ رہ کر یہ محسوس ہو رہا تھا کہ سکندر کو اس کی ریحہ کے گھر موجودگی کی خبر جینے نے دی ہے جانے اس نے ایسا کیوں کیا؟ شاید بہن کی محبت میں یا اس احساس کے تحت کے پردیس میں جانے وہ کہاں کہاں خوار کی گئی پھر

رہی ہے جو بھی تھا جنید نے یہ اچھا نہ کیا تھا اور بات تو یقیناً ”ریجہ اور عبد الوہاب بھی جان چکے تھے کیونکہ اس کی یہاں موجودگی کی خبر صرف اور صرف اس کے گھر والوں کو ہی تھی جو یہ چاہتے تھے کہ وہ ابوذر سکندر کے حوالے کر دے۔

”رکوبہ ایک منٹ میری بات سنو۔“

باہر نکلتے نکلتے اسے دروازے پر ہی عبد الوہاب نے روک دیا۔

”تم ریحہ کے ساتھ جاؤ یہ تمہیں بلڈنگ کے پچھلے گیٹ سے نکالے گی اور پھر تمہیں کسی شاپنگ مال یا پبلک پارک میں چھوڑ دے گی جہاں سے پولیس کی تلاشی کے بعد یہ تمہیں پھر سے واپس یک کر لے گی۔“

اسے بدایات دے کر عبد الوہاب کوئی نمبر نہیں کرتا واپس بالکونی کی جانب چلا گیا شاید وہ پھر سے عبد الرحمن سے رابطہ کر رہا تھا، کچھ عرصہ قبل تک تو سکندر اسے خود بھی فون کر لیتا تھا لیکن پچھلے دنوں کسی بات پر عبد الوہاب نے اسے بری طرح تارڑا تھا جس کے باعث اب ان دونوں کے درمیان بات چیت بالکل بند تھی ریحہ گاڑی کی چابی لے کر اس کے ساتھ ہی باہر آئی اور لفٹ کے ذریعے نیچے سسٹنٹ میں چلی گئی جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی جبکہ نیو نے نیچے اترنے کے لیے بیڑھیاں استعمال کیں وہ جانتی تھی کہ سکندر اوپر جانے کے لیے بیڑھ لفٹ استعمال کرتا تھا بیڑھیاں اتر کر وہ پچھلے گیٹ سے باہر آئی جہاں پہلے ہی ریحہ گاڑی لیے اس کا انتظار کر رہی تھی تھوڑی دیر بعد ہی ریحہ اسے ایک شاپنگ مال پر اتار کر واپس چلی گئی وہ ابوذر کو لیے اندر داخل ہوئی ریحہ نے گھر سے نکلتے ہوئے ابوذر کے فرائز اور اس کے لیے چکن بریانی بیک کر کے بیک میں رکھ دی تھے۔

لیکن یہاں مال میں پھرتے ہوئے وہ کچھ کھانہ سکتی تھی اور نہ ہی ابوذر کو دے سکتی تھی جگہ جگہ وارنگ کے تحت یہاں کھانے پینے کی اشیاء اندر لانے کی سخت ممانعت تھی اس نے کچھ دیر وینڈو شاپنگ کی پھر ابوذر کی ضرورت کی ایک دو چیزیں خریدنے کے علاوہ اپنے لیے بھی ایک پرفیوم خریدا، کسی زمانے میں وہ پرفیوم بڑے شوق سے استعمال کرتی تھی مگر اب دیگر دوسرے کاموں کی طرح اس کا یہ شوق بھی اپنی موت آپ مر گیا تھا مال کے تیسرے فلور پر بھی جب اسے ریحہ کی کال آئی۔

”مال سے باہر آ جاؤ میں تمہیں لینے آ رہی ہوں۔“

”سکندر واپس چلا گیا؟“

”وہ نہیں آیا تھا صرف پولیس تھی بہر حال عبد الوہاب نے فون کر کے اس کی بے حد بے عزتی کی ہے غیرت مند ہوا تو اب کبھی بھی اس طرف نہ آئے گا۔“ وہ غیرت مند نہیں تھا یہ بات نیو سے زیادہ کون جان سکتا تھا آخر اسے سات سال تک اس کی بیوی ہونے کا عظیم اعزاز حاصل رہا تھا۔

”نہیں ریحہ اب مجھے لینے مت آنا میں WAO واپس جا رہی ہوں کیونکہ مجھے یقین ہے کہ سکندر تمہارے ابار منٹ کے نیچے ہی کہیں موجود میرا انتظار کر رہا ہے اسے یقین ہے کہ میں باہر سے اندر یا اندر سے باہر ضرور نکلوں گی۔“

”یہ تو میں نے سوچا بھی نہ تھا وہو سکتا ہے تمہاری بات درست ہو۔“ ریحہ اس کے خیال سے فوراً ہی متفق ہو گئی۔

”چلو اللہ حافظ میں اب واپس WAO جا رہی ہوں دعا کرنا خیریت سے پہنچ جاؤں۔“

باہر نکل کر وہ دیرے دیرے فٹ پاتھ پر چلنے لگی، ہلکی ہلکی بارش نے موسم کو خاصا خوشگوار بنا دیا تھا ساتھ ہی ساتھ تیز چلتی ہوائیں اسے احساس دلارہی تھیں کہ شاید کچھ ہی دیر میں بارش تیز ہو جائے اس نے روڑے کے ساتھ ہی بنی ایک چھوٹی سی دکان سے چھتری خریدی اور اپنے اوپر تان کر ابوذر کو گود میں لے لیا اور فوراً ہی پاس سے

گزرتی ٹیکسی کو ہاتھ دے کر روک لیا پہلے اس کا ارادہ ٹرین سے واپس جانے کا تھا مگر ایک تو سارے دن کی خوری اور بھوک پیاس کے علاوہ تیزی سے بدلتے اس موسم نے اس کے ارادے کو ڈانوا ڈول کر دیا ویسے بھی احتشام صاحب نے اس کے لیے خاصی بڑی رقم عبد الوہاب کے اکاؤنٹ میں بھیج دی تھی جو یہاں کی کرنسی میں تبدیل ہو کر کم ضرور ہوتی تھی مگر پھر بھی اس کی کئی ضروریات کے لیے کافی تھی۔

شناخت گایا کے طے کر کے کرایہ کے مطابق اس نے آدھی رقم ایڈوانس کے طور پر ڈرائیور کے حوالے کی اور خود سیٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں اس سے قبل وہ بیگ سے فرائز نکال کر ابوذر کے حوالے کرنا نہ بھولی کیونکہ جانتی تھی کہ ابوذر بھوکا ہے مگر شاید یہ کچھ قدرتی عمل تھا یا وقت کا تقاضا اس نے شروع دن سے ہی ابوذر کو خاصا صابرو شاکر کر دیا تھا وہ دوسرے بچوں کی مانند کھانے پینے یا کھلونوں کے لیے بھی ضد نہ کرتا تھا ابھی بھی اس کے ہاتھ سے باکس لے کر وہ خاموشی سے اندر موجود فرائز کھانے لگا جبکہ اس کے ذہن میں وہ رہ کر ایک ہی خیال آتا رہا کہ آج اگر عبد الرحمن بروقت عبد الوہاب کو فون نہ کرتا تو کیا ہوتا؟ شاید ابوذر اس کے ساتھ نہ ہوتا اور اگر ایسا ہوتا تو یقیناً ”وہ مر چکی ہوتی کیونکہ ابوذر کے بغیر وہ زندگی کا ایک لمحہ بھی نہ گزار سکتی تھی ابوذر اس کی رگوں میں خون بہن کر دوڑ رہا تھا۔

”تم واپس آ جاؤ ہم تمہاری شادی شان سے کریں گے، کوئی اس کے کان کے قریب بولا اس نے پٹ سے آنکھیں کھول دیں ٹیکسی تیزی سے ہائی وے پر اپنا سفر طے کر رہی تھی اس کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ خود بخود ابھر آئی۔

”جائے تمہیں اس بکھے ستان میں کیا نظر آ رہا ہے جانتی ہو پچھلے دو سالوں میں وہی اے نہیں کر سکا جبکہ ماشاء اللہ امان انبی تعلیم مکمل کرنے والا ہے۔“ یہ آواز بھی اس کی ماں ہی کی تھی آواز تو آج بھی وہی تھی مگر الفاظ تبدیل ہو چکے تھے اور یہ تضاد گزرتہ وقت نے پیدا کیا تھا۔

”جانتی ہو ستان آج کل ڈرگنز رہا ہے۔“ کافی عرصہ قبل کہا گیا تھا کہ یہ جملہ اسے آج بھی من و عن یاد تھا، اس جملے کو وہ جب بھی یاد کرتی اس کا احساس دل دکھ سے بھر جاتا تھا اگر سسکی وہ نہ تھی تو خوش ستان بھی نہ تھا یہ ہی سوچتے ہوئے اس نے بیک میں ہاتھ ڈالا ”اندرو کی زپ کھول کر ایک سم برآمد کی، کچھ سال پرانی سم میں پرانے والے ستان کے پیغامات نے سکندر کو اس سے جان چھڑانے کے لیے ایک نئی راہ دکھائی تھی اس نے الٹ پلٹ اس سم کو دیکھا اور پھر اپنے موبائل میں موجود سم کی جگہ اسے لگا دیا کچھ دیر بعد موبائل آن کر کے اس نے ایک باکس کھولا جہاں آج بھی ستان کے کچھ ٹیکسٹ موجود تھے اس نے کاغذ ہاتھوں سے پہلے ٹیکسٹ کو کلک کیا۔

ہم نے کہا اگر بھول جائے ہمیں تو کمال ہو جائے

ہم نے تو فقط بات کی اور اس نے کمال کر دیا

اس نے بار بار کا پر دھا ہوا یہ شعر پھر سے پڑھا اور پھر اگلے مسیج پر آ گئی۔

یہ میرا خود سے عہد ہے زندگی میں دو بار کبھی کسی سے محبت نہ کروں گا یقین نہ آئے تو کبھی پلٹ کر دیکھنا ضرور۔“

اس کی آنکھیں غم ہو گئیں، اس سے زیادہ کی اس میں تاب نہ تھی اس نے موبائل آف کر کے پھر سے بیک میں رکھ دیا ویسے بھی WAO چھپنے والی تھی وہ سفر جو ٹرین سے تقریباً پینتالیس منٹ کا تھا، ٹیکسی سے صرف پچیس منٹ میں ہی طے ہو گیا۔

وہ پاکستان الیمپسی اپنی درخواست جمع کروا آئی تھی ساتھ ہی اس نے پاسپورٹ کی گمشدگی کی ایف آئی آر بھی لگا دی تھی وہاں سے اسے ایک ماہ کا ٹائم دیا گیا تھا اب یہ ایک ماہ اسے جیسے تیے WAO میں ہی گزارنا تھا، مایا کے

گھر سے واپسی پر اس کا کمر الٹا اکوڑے دیا گیا تھا جو ایک اینڈو نیشن طالبہ تھی ملائیشیا اپنی تعلیم مکمل کرنے آئی تھی مگر جانے کن چلوں میں پھنس گئی اب وہ اٹھارہ سالہ لڑکی ایک دو ماہ کے بیٹے کی ماں تھی جانے کن وجوہات کی بنا پر وہ WAO میں پناہ لینے پر مجبور ہوئی تھی اس کے بارے میں نیوونے کبھی جاننے کی کوشش نہ کی البتہ اسے یہ ضرور علم تھا کہ وہ یہاں اپنے امتحانات تک میٹیم ہے جن کے ختم ہوتے ہی اس نے واپس اینڈو نیشیا چلے جانا تھا۔ اب وہ خود سستی کے ساتھ اس کا کمر اٹھائے ہوئے تھی اور نہ صرف اپنا بلکہ سستی کے حصہ کا کام بھی اسے ہی کرنا پڑتا جس پر اسے کوئی اعتراض نہ تھا پھر بھی وہ چاہتی تھی کہ جلد از جلد اسے پاسپورٹ مل جائے تاکہ وہ اپنے وطن واپس کی راہ لے سکے اس کی یہاں موجودگی اسے کسی بھی وقت ابوزر سے جدا کر سکتی تھی جو وہ نہ چاہتی تھی۔

”تم ابوزر کو لے کر یہاں سے نہیں جاسکتیں۔“

اس کے بالکل سامنے سکندر کسی پتھر کی مانند اڑا کھڑا تھا وہ گھبرا کر واپس پلٹی پیچھے پولیس کی موبائل تھی۔ اس نے اپنے بچاؤ کے لیے یہاں وہاں نظروں ڈالی مگر اسے کوئی راستہ دکھائی نہ دیا وہ بری طرح پھنس چکی تھی ابوزر سے دوری کے خوف نے اسے اپنے پاؤں پر کھڑا رہنا مشکل کر دیا وہ لڑکھڑا کر گرنے ہی لگی تھی۔ جب اسے کسی نے قہام لیا اور ساتھ ہی سستی کی آواز اس کے کان سے ٹکرائی۔

”نیوونو تمہاری وکیل سوزان آئی ہے اور تم سے فوراً ملنا چاہتی ہے۔“

اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں، شکر ہے کہ کوئی خواب دیکھ رہی تھی مگر اس قدر ڈر ڈرنا تو ناخوابہ ایک بار پھر سوچ کر وہیل اٹھی، سکندر کو پتا چل گیا تھا کہ وہ WAO میں رہائش پذیر ہے اسی سلسلے میں پچھلے دو دنوں سے اس کا وکیل آئی لویا کو فون کر کے ابوزر کی تحویل کا مطالبہ کر رہا تھا یہاں کے قانون کے مطابق سکندر یا اس کا وکیل WAO کی عمارت میں داخل نہ ہو سکتے تھے یہ ہی وجہ تھی کہ وہ جب بھی آئے گیٹ سے باہر ہی کھڑے ہو کر آئی لویا سے بات کرتے جو کسی بھی طور ابوزر کو حوالے کرنے کے حق میں نہ تھیں ان دو دنوں میں نیوونے نے بارہا فردوس خان کو فون کیے جس نے خود بھی اس کے پاسپورٹ کے حصول کے لیے اجماعی رابطہ کیا تھا مگر ابھی بھی اس کام کے لیے کچھ وقت درکار تھا۔

عام حالات میں تو اسے کوئی مسئلہ نہ تھا مگر اب سکندر اور اس کے وکیل نے اسے ہراساں کر دیا تھا اسے محسوس ہو رہا تھا کہ WAO میں اس کا مزید قیام مشکل ہو تا جا رہا ہے سستی اسے جگا کر سوزان کی آمد کی اطلاع دے کر واپس چلی گئی وہ خاموشی سے اٹھی ہاتھ منہ دھویا ابوزر ابھی سو ہی رہا تھا اس پر چادر ٹھیک کر کے وہ آئی لویا کے آفس کی جانب چل دی جہاں اس کے انتظار میں سوزان بیٹھی تھی۔

”تم زرا جلدی سے تیار ہو کر آؤ تمہیں ابھی میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنا ہو گا۔“

”پولیس اسٹیشن مگر کیوں؟“ وہ اذہد گھبرا اٹھی۔

”تمہیں اپنے بچے کا پروفیکشن آرڈر لینا ہو گا جس کے بعد تمہارا بیوی بیٹا اور اس کا وکیل تمہیں کبھی بھی تنگ نہ کر سکیں گے۔“ سوزان اسے قانونی تھانے سمجھاتے ہوئے بولی۔

”مگر آئی آپ اچھی طرح جانتی ہیں میں پولیس اسٹیشن نہیں جاسکتی۔“ وہ بے بسی سے بولتی ہوئی آئی لویا کی طرف پلٹی۔

”دیکھو نیوونو تمہارا پروفیکشن آرڈر کے لیے جانا خود تمہاری اپنی فلاح کے لیے بہت ضروری ہے تم جانتی نہیں ہو صبح سے سکندر کا وکیل ہمیں دو دفعہ فون کر چکا ہے وہ مسلسل ہمیں دھمکا رہا ہے کہ ابوزر اس کے کلائنٹ کے حوالے کیا جائے“ اب یہ اذہد ضروری ہے کہ تم اپنے بچے کے لیے آئی پی آر حاصل کرو یہ تو وہ وکیل یہاں

اندر داخل نہیں ہو سکتا مگر ان کے ساتھ اگر پولیس آگئی تو تمہاری لیے مشکل کھڑی ہو جائے گی کیونکہ اس صورت میں ہمیں لازمی طور پر ابوزر ان کے حوالے کرنا ہو گا۔“ آئی لویا نے اسے تمام تفصیل سے آگاہ کرتے ہوئے سمجھایا۔

”ٹھیک ہے میں تمہانے چلنے کو تیار ہوں مگر ایسا نہ ہو وہاں میرے ساتھ کوئی مسئلہ کھڑا ہو جائے۔“ ساری تفصیل جاننے کے باوجود وہ اندر ہی اندر گھبرا رہی تھی۔

”کوئی مسئلہ نہیں ہو گا سوزان تمہاری قانونی وکیل ہے اور یہ تمہارے ساتھ ہی جائے گی تم بالکل بھی گھبرانا مت، پروفیکشن آرڈر تمہارے بیٹے کی کسٹڈی کے لیے بہت ضروری ہے اس آرڈر کے مل جانے سے تم دونوں ماں بیٹا بالکل محفوظ ہو جاؤ گے اور سکندر تم دونوں کو بھی بھی ہاتھ نہ لگا سکے گا اور یہاں سے نکلنے سے قبل تم اپنے ایجنٹ کو بھی تمام تفصیل سے آگاہ کر دینا کیونکہ اس کے لیے بھی ہر بات کا جاننا بہت ضروری ہے۔“

فردوس خان کی ہدایت کے عین مطابق اس نے فردوس خان کا کانٹیکٹ نمبر آئی لویا کو دے دیا تھا تاکہ اس کے یہاں سے جانے کے بعد اگر کسی دوسری لڑکی کو ایسی سفارتی مدد درکار ہو تو فردوس خان اس کی مدد کر سکے۔

”تم ایک دفعہ میرے ساتھ تمہانے چلو پھر میں سکندر کے وکیل سے خود ہی میٹ لوں گی۔“ سوزان ٹیبل سے اپنی گاڑی کی چابیاں اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

”تم ابوزر کو ہمیں چھوڑ جاؤ سستی اسے سنبھال لے گی ان حالات میں تمہارے ساتھ ابوزر کا تھانے جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔“

آئی لویا کی بروقت تاکید اس کے کتنا کام آئی اس کا احساس اسے تھانے جا کر ہوا، جب سوزان کی ہمراہی میں پولیس اسٹیشن داخل ہوئی تو خاصی گھبرائی ہوئی تھی سوزان اسے اپنے ساتھ لیے ایک بڑے سے کمرے میں داخل ہوئی۔

”تم یہاں بیٹھو میں پہلے کسی پولیس آفیسر سے بات کر لوں پھر تمہیں بلاتی ہوں۔“ سوزان کی ہدایت کے مطابق وہ دروازے کے پاس ہی رہی کرسی پر بیٹھ گئی تھوڑی ہی دیر میں سوزان واپس آئی۔

”میرے ساتھ آؤ تمہیں لیڈی پولیس آفیسر کو اپنا بیان ریکارڈ کروانا ہے اور وہ کھویا بالکل بھی ڈرنے یا گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے۔“

وہ اسے سمجھاتے ہوئے ایک دوسرے کمرے کی جانب چل دی۔

”تم اندر جاؤ میں باہر تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔“ دروازے کے پاس پہنچ کر وہ رک گئی۔

”میں اکیلی کیسے اندر جاؤں آپ بھی چلیں میرے ساتھ۔“ اس کا خوف زہل دل کسی بچے کی مانند لرز رہا تھا، باوجود کوشش کے وہ اپنی لہجہ کی لڑکھڑاہٹ پر قابو نہ پاسکی۔

”کم آن نیوونو تم تو ایک بہادر لڑکی ہو جہاں اب تک اتنا سب کچھ فیس کیا وہاں تھوڑی سی ہمت اور کرو تمہاری آج کی یہ ہمت ساری زندگی تمہارے کام آئے گی اور یہی بھی اپنا بیان ریکارڈ کروانے تمہیں اکیلے ہی اندر جانا ہے قانون کے مطابق میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکتی اور ہاں اپنا اور اپنے بچے کا پروفیکشن آرڈر لے کر ہی باہر آنا۔“

”اوکے۔“ وہ آہستہ سے کہتی ہوئی کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی سامنے ٹیبل کے پیچھے کرسی پر ایک لمبی تڑنگی پولیس آفیسر موجود تھی جس نے دروازہ کھلنے کی آواز پر سر اٹھایا نیوونو کا مکمل طور پر ایک طائرانہ جانتہ لیا اس کے دیکھنے کے انداز میں جانے ایسا کیا تھا جس نے نیوونو کو کھلا دیا اس کا دل چاہا وہ یہیں سے واپس پلٹ جائے۔

”نیو احتشام الدین۔۔۔“ اپنے سامنے رکھے پیر پر نظر ڈال کر اس نے ایک زوردار آواز سے اس کا نام پکارا یقیناً ”نیو کی آمد کی اطلاع اسے دے دی گئی تھی جس کی بنا پر وہ اس کے نام سے تجویز دانت تھی۔“

”نیو نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بمشکل آواز نکالی۔“

”تمہارا بچہ کہاں ہے؟“ لیڈی پولیس آفیسر نے کسی قدر کشتی سے سوال کیا اس کا یہ سوال اس قدر اچانک تھا کہ نیو ایک دم ڈر سی گئی۔

”بچہ میرے پاس ہی ہے اور مجھے اس کا رونیٹشن آرڈر چاہیے تاکہ میرا ہینڈ مجھے مزید تنگ نہ کر سکے۔“ غالباً سوزان اس کے بچے کے حوالے سے تمام تفصیلات تھانے میں دے چکی تھی اسی بنا پر اس نے تھوڑا سا ریلیکس ہو کر جواب دیا ویسے بھی یہ سب تفصیل یہاں بتانا اذہد ضروری تھا۔

”جھجھکتے ہوئے بھی کہ بچہ ملائی نشنہ ملی کا حامل ہے تم اسے یہاں سے لے جانا چاہتی ہو۔“ پولیس آفیسر کرسی چھین کر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور نیو کے مد مقابل آکر اس کے کندھے پر زور سے دباؤ ڈالتے ہوئے بولی۔

”تم بیچ انجنک (کتیا) ایک ملائی بچے کو پاکستان لے جانا چاہتی ہو؟ جانتی ہو اس بچے کو اپنے پاس رکھ کر تم نے کتنا بڑا قانونی جرم کیا ہے تمہاری بھلائی اسی میں ہے بچہ فوراً سے پیشتر مسٹر سکندر کے حوالے کرو۔“ سکندر کا نام سننے ہی وہ ساری کہانی سمجھ گئی یقیناً ”سکندر اس کی آہ سے قبل ہی یہاں رابطہ کر چکا تھا اور ظاہر ہے وہاں کا قانون اپنے شہری کے دفاع کو زیادہ اہمیت دیتا تھا اسے ایک دم اپنا ملک یاد کیا جہاں کسی غیر ملکی عورت سے ہونے والی ذرا سی زیادتی پر تمام میڈیا سڑکوں پر آجاتا تھا اور یہاں کسی دوسرے ملک کے شہری کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی چاہے وہ ایک عورت ہی کیوں نہ ہو۔

”ہم سب جانتے ہیں تم ایک بد چلن اور آناک (آوارہ) عورت ہو غیر مردوں سے تعلق رکھتی ہو اپنی چانتے (خوب صورتی) کو استعمال کر کے مردوں کو الواتی ہو۔“ اس کے منہ سے نکلنے والے الفاظ نیو کے کانوں میں آگ لگاتے ہوئے اتر رہے تھے پولیس کسی بھی ملک کی ہو ایک ہی جیسی زبان استعمال کرتی ہے جس میں تہذیب اور اخلاق کا گزر کہیں نہیں ہوتا اس لیڈی آفیسر کی زبان سن کر نیو کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ پاکستان کے کسی پولیس اسٹیشن میں موجود ہو۔

”اب تم جو چاہو کرو مگر تم ایک ملائی بچہ یہاں سے لے کر نہیں جا سکتیں اب بتاؤ تم یہاں کیا لینے آئی ہو۔“ اسے ذہنی تارچ کرنے کے بعد وہ پولیس آفیسر اپنی کرسی پر واپس جا کر بیٹھ گئی۔ اس کے دیکھنے کا انداز ابھی بھی اس قدر ہنک آمیز تھا کہ نیو کے منہ سے کچھ نکل ہی نہ پایا اور وہ بے اختیار رونے لگی۔

”اب اپنا روئے دھونے والا ڈرامہ بند کرو ہم پر تمہارے یہ آنسو کوئی اثر نہیں کرتے کیونکہ ہمیں دن رات تمہارے جیسی بد معاش عورتوں سے سابقہ پڑتا ہے۔“ وہ ٹھنڈے ٹھار لہجہ میں اسے لفظوں کی مار مارتے ہوئی بولی۔

”اب بتاؤ تمہیں کس کارپوریشن آرڈر چاہیے ویسے مسٹر سکندر کو علم ہے کہ تم یہاں اس وقت موجود ہو۔“

اس نے اپنے سامنے رکھی فائل کو کھولتے ہوئے پوچھا۔

”کسی کا بھی نہیں۔“ بمشکل اپنی ہچکیاں روکتے ہوئے نیو نے جواب دیا۔

”گڈ اس کا مطلب ہے تم خاصی سمجھ دار ہو تمہارے لیے بہتر یہ ہی ہو گا کہ سکندر کا بچہ جلد از جلد اس کے حوالے کر کے وطن واپس لوٹ جاؤ ورنہ تمہارے لیے اچھا نہ ہو گا۔“ وہ ٹیبل پر دونوں کہنیاں ٹکا کر آگے آتے ہوئے رازداری سے بولی۔

نیو کو ایسا محسوس ہوا کہ اگر اس نے اس آفیسر کی بات نہ مانی تو اسے اس تھانے میں ہی دھرا لیا جائے گا اسے خدشہ تھا کہ اسے گرفتاری نہ کر لیا جائے اور اگر اس وقت یہاں سکندر آگیا تو اسے آگے سوچتی ہی وہ خوف زدہ ہو گئی اس کی ہتھیلیاں پسینے سے جھجک گئیں۔

”بس آپ مجھے یہاں سے جانے دیں مجھے کچھ نہیں چاہیے۔“ وہ ایک دم ہلٹی اس کے پیچھے دو پولیس کاؤنٹیبل کھڑی تھیں۔

”یہ جو کچھ تم کہہ رہی ہو ہمیں تحریر میں لکھ کر دو۔“

پولیس آفیسر نے اس کے سامنے ٹیبل پر ایک پیپر اور پین رکھتے ہوئے اسے حکم دیا نیو نے خاموشی سے دونوں چیزیں اٹھا لیں۔

”اپنا بیان لکھ کر دو کہ تمہیں اپنا اپنا بچے کا کوئی پروفیکشن آرڈر نہیں لینا۔“

اس نے پولیس آفیسر کی ہدایت کے مطابق بیان لکھ کر اس کے سامنے رکھ دیا جسے اس نے اٹھا کر دیکھنے کے بعد سامنے رکھی فائل میں لگا دیا۔

”اب یہی بیان ہمیں ملائی زبان میں بھی لکھ کر دو۔“

لیڈی آفیسر نے مزید ایک پیپر اس کے سامنے رکھ دیا جانے وہ کیا چاہتی تھی نیو بوجھ نہائی مگر خاموشی سے اس کی ہدایت کے مطابق اپنا بیان ملائی زبان میں بھی تحریر کر دیا اور پیپر اس کے سامنے ٹیبل پر رکھ دیا۔

”تمہیں ملائی لکھنا بھی آتی ہے؟“ آفیسر نے ٹیبل پر رکھا پیپر اپنے سامنے سرکا کر دیکھا اور حیرت سے ابرو اچکاتے ہوئے بولی۔

”یعنی تم مکمل طور پر ایک فراڈ عورت ہو اور کون کون سی زبان جانتی ہو؟ شاید اپنی ان ہی خوبیوں سے مرو پھنساتی ہو؟“

”پلیز میں نے آپ کے کہنے کے مطابق اپنا بیان لکھ دیا ہے اب مجھے واپس جانے دیں۔“ وہ اپنے لرزتے ہاتھوں کو چھپا کر تیز تیز بچے میں بولی۔

”ٹھیک ہے تم جا سکتی ہو مگر یاد رکھنا تمہیں بہت جلد اپنا بیٹا اس کے باپ کے حوالے کرنا ہو گا ہم تمہیں ایک ملائی بچہ یہاں سے سیر لے جانے دیں گے۔“

نیو نے اس کی کئی بھی بات کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اس کے لیے اتنا کافی تھا کہ اسے تھانے میں روکا نہ گیا وہ چیز سی سے کمرے سے باہر نکلی اور تیز چلتی سوزان کے پاس جا پہنچی جو باہر کاؤنٹر پر کھڑی کسی سے کوئی بات کر رہی تھی۔

”نل گیا پروٹیکشن آرڈر؟“ سے دیکھتے ہی سوزان نے سوال کیا۔

”آپ چلیں یہاں سے میں آپ کو سب کچھ بتاتی ہوں۔“

وہ خاصی گھبرائی ہوئی تھی ”آنسو مسلسل اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔“

”تمہیں کیا ہوا ہے؟“ سوزان نے حیرت سے دریافت کیا مگر نیو نے کوئی جواب دیے گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر جا بیٹھی۔

”پروفیکشن آرڈر کہاں ہے؟“ سوزان کی سوئی ابھی بھی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

”جہنم میں کیا پروٹیکشن آرڈر مجھے نہیں چاہیے پلیز آپ جلد از جلد یہاں سے نکلیں۔“ وہ بولتے بولتے رو پڑی سوزان نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی اور خاموشی سے کارڈ اسٹیکو کرنے لگی اور پھر سارے راستے اس نے نیو سے کوئی سوال نہ کیا نیو کی حالت دیکھ کر اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ یہ پروفیکشن آرڈر کے بغیر ہی آگئی ہے مگر

کیوں اس کا جواب اسے WAQ کے افسر جاتے ہی مل گیا جب نبیو نے ردود کو آنٹی لونا کو تمام تفصیل سنائی۔
 ”جو بھی ہے تمہیں کوئی بھی تحریری بیان مجھ سے پوچھے بغیر نہیں دینا چاہیے تم وہاں پوٹیکشن آؤر لینے
 کہیں نہیں تمہیں اسی کے متعلق بات کرنی چاہیے تھی۔“
 ”مگر اس لڑی آفسر نے مجھے اتنا ذہنی تارح کیا کہ میں گھبرا گئی۔“

”جو بھی تھا سوزان تمہارے ساتھ تھی تمہیں کمرے سے باہر آکر اس سے ملنا چاہیے تھا میں تمہیں اتنا
 بیوقوف نہیں سمجھتی تھی نہیں جانتیں تم نے یہ سب کر کے کتنی بڑی غلطی کی ہے۔“ آنٹی لونا نے بڑی مشکل سے
 اپنے غصے کو دباتے ہوئے کہا جبکہ یہ سب سن کر سوزان کا چہرہ غصے کی زیادتی سے سرخ ہو گیا تھا اسے امید نہ تھی کہ
 نبیو اس قدر کمزور ثابت ہوگی۔

”تم شاید نہیں جانتیں وہ پولیس آفسر تمہیں صرف دھمکیاں دے رہی تھی ورنہ وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتی
 تھی کیونکہ میں وہاں تمہارے ساتھ تھی اور تم نے مجھے کوئی اہمیت دینے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی۔“ سوزان
 نے غصے سے کہا۔

”آپ نہیں جانتیں سکندر وہاں میننگ کر کے میرے بارے میں ساری بات کر چکا ہے اس کے لگائے گئے
 الزامات کی روشنی میں میری کی ہوئی ہر بات ان کے نزدیک جھوٹ اور فراڈ تھی وہ آفسر مکمل طور پر سکندر کے غور
 میں تھی۔“

”جو بھی تھا نبیو تمہیں وہاں سے پوٹیکشن آؤر لے کر ہی آنا چاہیے تھا اب اگر یہ آؤر لے کر تمہارا ہر پینڈ
 یہاں آجاتا ہے تو یقینی طور پر تم کسی بڑی مصیبت میں پھنس جاؤ گی جس سے نکلنے میں ہم بھی تمہاری کوئی مدد نہ کر
 سکیں گے۔“

”سوزان بالکل درست کہہ رہی ہے۔“ آنٹی لونا نے بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائی جب کہ نبیو کا دھیان اس
 وقت ان کی کسی بات کی طرف نہ تھا وہ اندازہ لگا چکی تھی کہ اسے اب جلد از جلد یہاں سے نکلنا ہو گا کیونکہ
 WAQ اب اس کے لیے محفوظ نہ رہی تھی اس نے دل ہی دل میں حساب لگایا فردوس خان کے مطابق اگلے
 ایک ہفتہ تک اس کا پاسپورٹ مل جانا چاہیے تھا اس کے بعد یقیناً آگے کی منزل اس کے لیے آسان ہو جاتی مگر
 مسئلہ اس ایک ہفتہ کا تھا جو اسے لگ رہا تھا کہ وہ WAQ میں نہ گزار سکے کی اور جلد ہی اس کا یہ بدترین خدشہ
 درست ثابت ہو گیا۔

مسلل بچے موبائل کی رنگ ٹون نے اس کی نیند کو خراب کر دیا اس نے بمشکل آنکھیں کھول کر سائیڈ ٹیبل
 پر رکھی ٹائم پڑا نظر ڈالی مچ کے چھ بجے تھے جانے کون تھا جو اتنی صبح میں اس سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔
 ”الٹی حیرت صبح میں کیسے یاد آگیا؟“ جنید نے بے ساختہ سوچتے ہوئے تکیے کے پاس رکھا موبائل اٹھا لیا جو
 ایک بار پھر پوری شدت سے بج رہا تھا۔

”یہ اتنی صبح کون ہے؟“ رحاب نے کڑوٹ بدلتے ہوئے سوال کیا۔
 ”سکندر؟“ اسکرین پر نظر ڈال کر اس نے لیس کاٹن دیا دیا، فون کان سے لگائے وہ باہر لکونی میں آگیا تاکہ
 رحاب کی نیند خراب نہ ہو صبح بچے کا مطلب ملائیشیا میں نوبے جے تھے اتنی صبح یقیناً کوئی ایسی ہی خبر تھی سکندر
 کے پاس جس نے اسے دن چڑھنے کا انتظار بھی نہ کرنے دیا اس سوچ نے جنید کو پریشان سا کر دیا۔

”ہیلو۔“ وہ اپنی بے چینی پھپھاتے ہوئے مدھم آواز میں بولا۔
 ”نبیو کہاں ہے؟“ دوسری طرف سے بلا تمہید پوچھتے جانے والے اس سوال نے ایک سیکنڈ کے لیے جنید کے

دماغ کو ٹھک سے اڑا دیا اور وہ اپنے غصے پر قابو نہ پاسکا۔

”واٹ ڈویوین نبیو کہاں ہے؟ تم ہوش میں تو ہو وہ سوال جو ہمیں تم سے کرنا چاہیے الٹا تم ہم سے کر رہے ہو؟
 مسٹر سکندر، ہم نے نبیو یہاں سے تمہارے ساتھ بھیجی تھی اس کا پاسپورٹ ابھی بھی تمہارے پاس ہے میرا خیال
 ہے کہ تم نے زیادہ بات نہیں بتا ہوئی چاہیے کہ نبیو اس وقت کہاں ہے؟“
 ”زیادہ ڈرامہ مت کرو میرے ساتھ؟“ سکندر نے پچھتے ہوئے کہا۔

”تم اچھی طرح جانتے ہو تمہاری بد چلن بہن میرا بچہ اغوا کر کے غائب ہو گئی ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ تم
 لوگوں کے پاس پاکستان پہنچ گئی ہے اور اگر ایسا نہ ہوا وہ میں کہیں ہوئی تو خدا کی قسم کبھی میرا بچہ لے کر یہاں سے
 زندہ سلامت نہ پاسکے گی۔“

”مگر تمہارا تو کہنا تھا کہ وہ کسی این جی او کے پاس ہے۔“

سکندر کی باتوں نے جنید کو بھی تھوڑا سا پریشان کر دیا ورنہ اس سے قبل وہ سب یہ سن کر مطمئن ہو چکے تھے کہ
 نبیو وہاں کسی سوشل ویلفیئر والوں کے پاس محفوظ ہے جہاں سے سکندر قانون کے ذریعے اپنا بچہ حاصل کر کے اسے
 وطن واپس بھیج دے گا مگر آج سکندر بالکل ہی ایک نئی کہانی سنا رہا تھا جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہ تھا کہ نبیو
 اب وہاں نہیں ہے جہاں کا سکندر نے بتایا تھا۔

”وہاں تھی مگر اب نہیں ہے اور وہاں میں نے جو کچھ تم سے وعدہ کیا تھا کہ میں اپوزر کو حاصل کر کے اسے وطن
 واپس بھیج دوں گا اب اسے بھول جاؤ اب وہ جب بھی مجھے ملی میں اپنا بچہ لے کر اسے پولیس کے حوالے کر دوں
 گا۔“

نفرت اور حقارت سے کہتے ہوئے سکندر نے فون بند کر دیا۔

”کیا ہوا اب نبیو کہاں گئی؟“ رحاب جانے کب اس کے پیچھے آکھڑی ہوئی اسے سکندر سے بات کرتے ہوئے
 پتہ ہی نہ چلا۔

”پتا نہیں کہاں گئی مگر اس لڑکی نے ہمیں ذلیل کر کے رکھ دیا ہے کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا، ہر
 جاننے والا شخص ایک ہی سوال کرتا ہے تم لوگ اسے جا کر واپس پاکستان کیوں نہیں لا رہے اب ہم کس کس کو
 بتائیں ہمیں تو یہ بھی علم نہیں ہے کہ وہ ہے کہاں۔“ جنید غصے سے بولتے ہوئے اکھڑے بھی باہر نکل گیا رحاب جانتی
 تھی کہ اب وہ یہ خبر کھر کے دیگر افراد کو دینے لیا ہے اس نے گھڑی پر ایک نظر ڈالی ابھی صرف سات بجے تھے وہ
 خاموشی سے چادر اوڑھ کر ایک پار پھرے سوئے کی کوشش کرنے لگی نبیو کہاں گئی اسے اس مسئلے سے کوئی
 سروکار نہ تھا کیونکہ یہ اس کی درد مری نہ تھی۔

”دیکھو نبیو تم نے اب تک جو بھی پریشانی دکھ اور تکلیف برداشت کی صرف اور صرف اپنے بیٹے کی خاطر مگر
 اگر تمہارا شوہر یہاں سے تمہارا بچہ واپس لے جاتا ہے تو تمہاری ساری جدوجہد بے کار جانے کی قسم خود سوچو اس
 صورت میں تمہارے پاس کیا بانی بچے گا۔“ آنٹی لونا کی بات ختم ہونے پر اس نے سر اٹھا کر ان کے چہرے پر ایک
 نظر ڈالی جہاں نبیو کے لیے ہمدردی نمایاں طور پر نظر آرہی تھی ساتھ ہی اس نے کمرے میں موجود دیگر افراد پر بھی
 ایک ایک نظر ڈالی سوزان اور سستی کے علاوہ وہاں WAQ کی انچارج میڈم سرما بھی موجود تھیں اور ان کی یہاں
 موجودگی بھی معاملے کی سنگینی کا احساس دلانے کے لیے کافی تھی وہ جانتی تھی کہ سکندر نے اپنے ذلیل کے ذریعے
 آئی بی آؤر لے لیا ہے جس کے تحت بچہ اس کی کسٹڈی میں جانا تھا اس کوار کے حصول کے بعد اس کے وکیل
 کا رویہ کافی تبدیل ہو گیا تھا پچھلے بار گھنٹوں میں وہ کئی فون WAQ کر چکا تھا اب اس کے ہر فون میں وارننگ اور

دھمکیاں تھیں فی الحال وہ WAO والوں کی اجازت کے بغیر اندر داخل نہیں ہو سکتا تھا۔
 ”ہاں نیبو نو مادرست کہہ رہی ہے ابھی کچھ دیر قبل یہاں سکندر کا فون آیا تھا۔“ یہ خبر نیبو کے لیے نئی تھی اس نے چونک کر سوزان کی جانب دیکھا۔

”وہ کچھ دیر میں پولیس لے کر WAO آنے والا ہے اور اگر اس کی بات درست ثابت ہوئی اور وہ پولیس کے ساتھ یہاں آیا تو پھر یقیناً اس کا لڑا اندر داخل ہو جائے گا اور اس صورت میں شاید ہم تمہاری کوئی مدد نہ کر سکیں۔“

سوزان کی بات ختم ہوتے ہی وہ بوکھلاہٹ میں اٹھ کھڑی ہوئی یہاں سے سکندر ایک گھنٹے کی مسافت پر موجود تھا اور اگر وہ فون کرنے کے بعد بھی وہاں سے نکلتا تو کچھ ہی دیر میں یہاں پہنچنے والا تھا اور اگر وہ یہاں پہنچ گیا تھا۔
 اس سے آگے سوچنا بھی نہ چاہتی تھی۔

”آئی کچھ مجھے سمجھ نہیں آ رہا میں کہاں جاؤں؟ رعبہ اور انکل صالح میں سے کوئی بھی مجھے پناہ نہیں دے سکتا۔“ گبر اہٹ سے اس کی ٹانگیں لرزنے لگیں۔

”تم ایسا کرو فردوس خان کو فون کر مجھے امید ہے وہ تمہاری ضرورت مدد کرے گا کیونکہ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس نے اپنے آخری فون میں تم سے کہا تھا کہ کسی بھی ایسی صورت حال میں تم اس سے رابطہ کر سکتی ہو۔“
 سستی کے یاد کروانے پر اسے فردوس خان یاد آ گیا اور نہ اپنے باؤف داغ کے ساتھ وہ سب کچھ بھول چکی تھی اس نے لشکر بھری نگاہ سے سستی کی جانب دیکھا اور جلدی سے اپنے ہاتھ میں موجود موبائل سے فردوس خان کا نمبر ڈائل کیا دوسری ہی منٹ پر اس نے فون اٹھایا۔

”السلام علیکم۔“ میریپس میں اس کی آواز بھری۔
 ”بھائی میں سخت پریشانی میں ہوں سکندر آئی بی آرڈر لینے کے بعد اپنے وکیل اور پولیس کے ساتھ یہاں آنے والا ہے اور آپ جانتے ہیں میریپس WAO کے علاوہ کوئی دوسری جگہ نہیں جہاں میں سکندر نامی شیطان سے محفوظ رہ سکوں۔“ بات کرتے کرتے وہ روڑی۔

”تم ایسا کرو یہاں سے نکل کر ٹرین گئے ذریعے سنبھون پہنچ جاؤ وہاں میرا چھوٹا بھائی تمہیں ریسیو کر لے گا کیونکہ میں فی الحال تھائی لینڈ میں ہوں واپس آتے آتے مجھے دیر ہو جائے گی تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ سنبھون میں اسٹیشن پر ہی تمہیں فرازل جائے گا اس کے ساتھ چلی جانا وہ تمہیں میرے گھر بحفاظت پہنچا دے گا وہاں میری بیوی اور بچے تمہارا استقبال کریں گے ریشان مت ہو اور جلد از جلد یہاں سے نکلو۔“

فردوس خان کے ان الفاظ نے اس کے جسم میں توانائی بھری سج ہے دنیا میں صرف سکندر جیسے لوگ ہی نہیں پائے جاتے بلکہ فردوس خان اور شمر جیسے لوگ بھی اسی دنیا کا ایک حصہ ہیں اور شاید ایسے ہی لوگوں کی بدولت دنیا اپنے محور پر چل رہی ہے ورنہ کب کی ملیا میٹ ہو چکی ہوتی۔ اس نے جلدی جلدی اپنا سامان سمیٹا اور سب سے باری باری گھلے لی وہاں موجود ہر عورت کی آنکھ میں اس کے لیے آنسو تھے نیبو کے دکھ اور تکلیف نے سب کو اپنا دکھ بھلا دیا تھا سب کی یہی خواہش تھی نیبو اپنے بچے سمیت وطن واپس پہنچ جائے۔

”آپ سب لوگ میرے لیے دعا بھیجے گا میں خیر وعافیت کے ساتھ اپنے گھر واپس چلی جاؤں۔“ گیٹ سے باہر نکلتے نکلتے وہ ایک بار پھر واپس پلٹ آئی۔

”ہماری دعا میں تمہارے ساتھ ہیں“ یہ تم میرا فون نمبر بھی رکھ لو باقی سب کے تمہارے پاس ہوں گے تم جب واپس پہنچ جاؤ تو ہمیں ضرور اطلاع دینا کیونکہ تمہاری کامیابی ہم سب کی کامیابی ہو گی جسے ہم فخر کے ساتھ ان لوگوں کو بتائیں گے جو تمہارے بعد یہاں آئیں گی۔“

میڈم سرنائے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اپنا کارڈ اس کے ہاتھ میں تھما دیا اس نے خاموشی سے سر ہلایا اور تیزی سے گیٹ عبور کر گئی۔

باہر ٹیکسی موجود تھی جس میں بیٹھ کر اسے اپنا نیا سفر شروع کرنا تھا وہ خاموشی سے دروازہ کھول کر پیچھے بیٹھ گئی ٹیکسی اشارت ہو کر اسٹیشن کی جانب رواں دواں ہو گئی لمبی روڈ پر مڑتے ہوئے سکندر کی گاڑی کے ساتھ پولیس موبائل تیزی سے اس کے قریب سے گزر گئیں اس نے بے ساختہ اللہ کا شکر ادا کیا جس نے بروقت اسے WAO سے نکلنے کا موقع فراہم کیا ورنہ آج یقیناً اس کی ہار اور سکندر کی جیت کا دن ہوتا۔

”کہاں ہو تم؟“ فون کان سے لگاتے ہی رعبہ کی بے چین آواز سنائی دی۔
 ”کیوں خیریت کیا ہوا تمہیں؟“ اس نے کھڑکی سے باہر بھاگتے دوڑتے نظاروں پر ایک نظر ڈالی۔

”مجھے ابھی بھائی عبدالرحمن کا فون آیا تھا۔“ رعبہ کی سانس پھولی ہوئی تھی۔
 ”انہوں نے بتایا ہے کہ سکندر WAO پولیس کے ساتھ گیا ہے۔“

”میں وہاں نہیں ہوں۔“ وہ رعبہ کی بے چینی کی وجہ شروع میں بھی جان چکی تھی۔
 ”اوپر تھینک گاڑ۔“ اس نے سکون بھر ایک سانس خارج کیا۔

”وہاں نہیں ہو تو پھر کہاں ہو؟“ فوراً ہی اسے ایک نئی پریشانی نے گھیر لیا۔
 ”بھائی کے گھر جا رہی ہوں۔“ اس نے جان بوجھ کر فردوس خان کا نام نہیں لیا۔

”شکر ہے ورنہ میں توڑ رہی ہوتی۔“ بھائی کا حوالہ فردوس کے لیے یہ بات رعبہ جانتی تھی۔
 ”سنو رعبہ میرا ایک کام کرنا اگر کبھی بھی پاکستان سے کسی کا بھی فون آئے میرا پوچھو مجھے تو پلیز کسی کو مت بتانا میں

کہاں ہوں کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ میری ہمدردی میں کسی شریف انسان کو کوئی نقصان پہنچے۔“
 ٹرین رک چکی تھی۔ سنبھون آ گیا تھا وہ بیگ اور ابوذر کو سنبھال کر باہر پلیٹ فارم پر آگئی باہر نکل کر اس نے

یہاں وہاں نظر دوڑائی سامنے کچھ دور ایک اٹھارہ انیس سالہ پٹھان نوجوان کھڑا تھا جس کی شکل فردوس خان سے خاصی ملتی تھی یقیناً وہ ہی فراز تھا۔

”ٹھیک ہے میں کسی کو کچھ نہیں بتاؤں گی اور تم مجھ سے ملنے اب کب آؤ گی۔“ اسے دیکھ کر فراز بھی اس کے قریب آ گیا حالانکہ ملائی روایتی لباس نے اس کے حلیے کو خاصا تبدیل کر دیا تھا اور وہ دیکھنے میں ایک ملائی لڑکی ہی دکھائی دے رہی تھی لیکن چونکہ اس ٹرین سے نکلنے والی واحد عورت تھی جس کے ساتھ بچہ تھا یہی سبب تھا جو فراز نے اسے دور سے ہی پہچان لیا۔

”میں جب بھی اچھی سی آئی تم سے ملوں گی کیونکہ مجھے تم سے اپنا سامان بھی لینا ہے اور اب میں فون بند کر رہی ہوں کیونکہ میں اپنی منزل تک پہنچ گئی ہوں۔“ رعبہ سے خدا حافظ کر کے وہ فراز کی جانب متوجہ ہوئی جو اس کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

”آپ نیبو ہیں؟“
 اس کے متوجہ ہونے پر وہ دیر سے اس کے کان کے قریب بولا۔

”اور تم یقیناً فراز۔“ اس کا اندازہ درست نکلا۔
 ”جی بالکل گناہیں یہ بیگ مجھے دے دیں۔“

فراز نے اس کے ہاتھ سے بیگ اور ابوذر دونوں کو ہی لے لیا وہ خاموشی سے اس کے پیچھے چلتی باہر بارکنگ میں آ گئی جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی اس نے پچھلا دروازہ کھول کر بیگ رکھا وہ بھی پچھلی سیٹ پر ہی بیٹھ گئی جبکہ فراز

نے ابوذر کو اگلی سیٹ پر بٹھا کر گاڑی اشارت کر دی۔

”یہاں سے نمن جایا چندہ منٹ کے فاصلے پر ہے جہاں ہماری رہائش ہے۔“ اس نے پیچھے مڑ کر نبیو کو اطلاع فراہم کی جس کے لیے اس بات کی کوئی اہمیت نہ رہی تھی کہ اسے یہاں سے آگے کہاں جانا ہے اس نے خود کو حالات کے دھارے پر چھوڑ دیا تھا اسے ہر حال میں اپنے خدا سے پوری امید تھی کہ وہ کبھی بھی اسے سبک دینے نہ کرے گا اس کی یہاں تک کی کامیابی نے خدا پر اس کا یقین اور ایمان پہلے سے کئی گنا مضبوط کر دیا تھا۔

وہ خیالوں ہی خیالوں میں سکندر کا تصور کر رہی تھی جو یقیناً ”WAO“ میں نہ پا کر بے حد تھلا یا ہو گا وہ یہ سوچ کر بڑی مطمئن ہوئی کہ وہ جب سے سکندر کے گھر سے نکلی تھی اس نے اس کی ہر اینٹ کا جواب پتھر سے دیا تھا قاطعہ یقیناً ”اس وقت کو سوتی ہوں گی جب انہوں نے نبیو کو روزینہ کے ساتھ ابوذر کو لے جانے دیا اور روزینہ وہ ضرور مطمئن ہوگی کیونکہ وہ تو خود سل سے چاہتی تھی کہ نبیو یہاں سے نکل جائے ان ہی سوچوں میں گھری وہ اپنی منزل تک پہنچ گئی گاڑی کے ایک جھٹکے سے رکتے ہی اس نے باہر جھانکا ایک چھوٹا سا علاقہ جہاں اکثریت چھوٹے چھوٹے مکانوں کی تھی۔

”تو فردوس خان یہاں رہتا ہے۔“ یقیناً ”ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے والے فرد کا دل ان لوگوں سے کئی گنا بڑا تھا جو بڑے بڑے محلوں میں رہتے تھے یہی سوچتی ہوئی وہ دروازہ کھول کر باہر نکل آئی۔

”یا اللہ میری بہن کی عزت و ناموس کی حفاظت فرما اس کو بحفاظت ہم تک پہنچا دے۔ تیرا یہ احسان ہم زندگی بھر نہ بھولیں گے۔“

حرم شریف کے احاطے میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنی بند آنکھیں کھول دیں اور خانہ کعبہ پر پڑنے والی پہلی نظر کے ساتھ ہی نبیو کی خیر و عافیت کی دعا اس کے لبوں سے پھسل پڑی اس کے بعد عمو کی ادائیگی اس نے بڑے مصروفیت کے ساتھ کی مگر جیسے ہی باب رحمت کے سامنے دو نفل پڑھ کر فارغ ہوئی خود پر اختیار کھو بیٹھی اور یک دم ہی بلک بلک کر رونے لگی اس کی سسکیوں کی آواز سن کر خشم و خضوع سے دعا کرتے حمزہ نے پلٹ کر اس کی جانب دیکھا اپنی دعا ختم کی اور اس کے قریب آگیا۔

”کیا بات ہے شفا کیل اس قدر رو رہی ہو؟“ وہ اس کے قریب ہی دوڑا توں ہو کر بیٹھ گیا۔

”حمزہ۔۔۔ نبیو۔۔۔“ بچکوں کے دوران اس کے منہ سے نکلنے والے ان دو لفظوں نے ہی حمزہ کو سب کچھ سمجھا دیا شفا پاکستان سے نبیو کی پریشانی اپنے ساتھ لے کر آئی تھی۔

”خوصلہ کرو شفا اللہ تعالیٰ سب کچھ اچھا کر دے گا۔“

سمجھانے کے ساتھ ساتھ حمزہ نے اسے بازو سے پکڑ کر کھڑا بھی کر دیا زیادہ رش کے سبب دیگر لوگ بھی اپنے اپنے نفل کی ادائیگی کے لیے جگہ کے منتظر تھے۔

”جانتے ہو حمزہ گھر میں اس نے کبھی اٹھ کر پانی بھی نہ پیا تھا اپنی چائے تک خود نہ بناتی تھی۔“ حمزہ کے ساتھ چلتے ہوئے وہ آہستہ آہستہ بول رہی تھی۔

”سب کچھ جانتا ہوں یہ بھی کوئی ایسی بات ہے جو میں بھول سکتا ہوں بہت شکمی لڑکی ہے وہ۔“ حمزہ نے اس کی ٹینشن دور کرنے کے لیے ہنستے ہوئے کہا ”حرم شریف کے احاطے سے باہر نکل آئے اب ان کا رخ اپنے ہوٹل کی جانب تھا۔“

”نکمی تھی ہے نہیں۔“ شفا نے فوراً اس کے جملے کی تصحیح کی۔

جانتے ہو ریجہ بتا رہی تھی WAO میں باہر دوم کی صفائی تک کرتی رہی ہے۔ اپنی بہن کی محبت اور اس کا

دکھ شفا کے لمبے میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔

”اور اب وہ جس پاکستانی فیملی کے ساتھ رہ رہی ہے ان کے گھر کا سارا کام خود کرتی ہے تم سوچ نہیں سکتے ریجہ سے یہ سب کچھ سننے کے بعد میں کس قدر اذیت میں ہوں۔“

”یہ سب بے کار اور فضول باتیں ہیں جنہیں سوچ سوچ کر تم اپنا خون جلا رہی ہو۔“ حمزہ نے اسے ایک بار پھر سمجھایا۔

”جہاں انسان رہتا ہے وہاں کام تو کرنا پڑتا ہے اور پروہ لڑکی جو اپنے والدین کے گھر کوئی کام نہیں کرتی سسرال جا کر سب کچھ کرتی ہے اسے اتنا بڑا الیٹو مت بناؤ ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنا ہر کام خود اپنے ہاتھ سے کرتے تھے کام کرنا کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے اصل مسئلہ تو اس کی اپنے بچے سمیت گھری رہی ہے دعا کرو اس کی یہ تکلیف جلد دور ہو اور شکر ادا کرو اپنے رب کا جس نے اسے فردوس خان جیسے فرشتے تک پہنچا دیا۔ فردوس خان جیسے لوگ زہابی بہن کہہ کر اسے نبھانے کا حوصلہ بھی رکھتے ہیں اور جہاں اسے ایک محفوظ پناہ گاہ نصیب ہوئی ہے وہاں وہ اس کے لیے اپنے وطن واپسی کا بھی کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکل آئے گا اگر فردوس خان نے اسے بغیر کسی لالچ کے اپنے گھر رکھا ہے تو کیا حرج ہے جو وہ اس کے گھر کا کام کر دیا کرے اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں کو اپنے اعصاب پر سوار مت کرو سبقت سیکھو نبیو سے جو اتنے نقص اور مشکل حالات میں بھی ہمت اور حوصلہ کا دامن نہ ہٹا ہے جو بے جس پر گزر رہی ہے اتنا وہ نہ رو رہی ہوگی جس قدر تم رو رہی ہو۔“ نبیو فردوس خان کی فیملی کے ساتھ تھی یہ ریجہ نے کل اسے بتایا تھا حمزہ کی بات بالکل درست تھی شفا کو اندازہ تھا نبیو بہت بدل چکی ہے اور یقیناً ”سکندر کے گھر سے نکلنے کے بعد وہ روٹا دھونا بھول گئی ہوگی اس کا مقصد صرف سکندر اور اس کی فیملی سے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینا تھا جو وہ ابوذر کو وہاں سے نکال کر لے چکی تھی پاکستان بخیریت پہنچ کر وہ سکندر کی نام نہاد عزت کے نابوت میں آخری کیل بھی ٹھونک دے گی۔ حمزہ کی باتوں نے شفا کو خاصا حوصلہ دیا چ تھا جب نبیو کو یہ سب کرنے میں کوئی عار نہ تھا تو پھر وہ کیوں اس قدر پریشان ہو رہی تھی اسے تو صرف یہ ہی دعا کرنی چاہیے تھی کہ نبیو کی تمام مشکلات آسان ہوں اور وہ ہر مرحلہ سے غریب گزر کر اپنے دیس واپس پہنچ جائے۔

زرگونہ کے رونے کی تیز آواز پر نبیو نے کچن کی کھڑکی سے باہر جھانکا اس کا خدشہ درست ثابت ہوا ابوذر زرگونہ کے ہاتھ سے چپس کا پیکٹ چھین چکا تھا جائے ابوذر کو کیا ہو گیا تھا جب سے یہاں آیا تھا ہر وقت کھانے کو کچھ نہ کچھ مانگتا اور پھر اپنے حصہ کا کھا کر دوسروں سے بھی چھیننے کی کوشش کرتا ”نبیو نے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ چلدی سے سبک میں رکھی نفل کھول کر ہاتھ دھوئے اور تیزی سے باہر نکلے باوجود کوشش کے اس کے پچھنے سے قبل ہی اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر زین بھا بھی بھی باہر نکل آئی اور اب اپنی نیند خراب ہونے پر عین دروازے کے درمیان کھڑی ابوذر کو بری طرح گھور رہی تھی نبیو شرمندہ سی ہو گئی فوراً ”ابوذر کے ہاتھ سے زرگونہ کے چپس کا پیکٹ واپس لے کر اس کے حوالے کیا اب ابوذر نے روٹا شروع کر دیا زین کی بڑی بیٹی نے ہند کو زبان میں اپنی ماں سے کچھ کماہ بڑبڑاتی ہوئی واپس اندر کمرے میں چلی گئی ”نبیو دوتے ہوئے ابوذر کو اپنے ساتھ ہی کچن میں لے آئی جو بھی تاز زین اور فردوس خان کے اس پر بے شمار احسانات تھے جن کا بدلہ شاید ہر مگر بھی نہ دے سکتی تھی۔

چھلے اٹھاہ دین سے وہ اس دو کمروں کے چھوٹے سے گھر میں مقیم تھی جہاں پہلے ہی سات افراد رہتے تھے۔ اس کے باوجود اس کے کھانے پینے اور سونے کا پورا خیال رکھا جاتا یہاں تک کہ وہ دو دفعہ پاکستانی سفارت خانے گئی اپنے پاسپورٹ کے سلسلے میں تو ابوذر کو زین نے بخوشی اپنے پاس رکھا ترین کے ذریعے سفارت خانے کا ایک

گھنٹہ کا سفر وہ ابوزر کے بغیر ہٹا کسی پریشانی کے کرتی اسے یقین تھا فردوس خان اور اس کی فیملی ابوزر کی حفاظت اپنی جان سے بھی بڑھ کر کرے گی البتہ وہ جتنی دفعہ بھی سفارت خانے گئی وہاں موجود پاکستانی مردوں نے اسے بہت زنج کیا، اپنے ویزے اور پاسپورٹ کے سلسلے میں آئے ہوئے اکثر اس کے ہم وطن اس کے پیچھے پیچھے اسٹیشن تک آجاتے کھانے اور جگہ کالاج دے کر ساتھ لے جانے کی کوشش کرتے ان میں بیس سالہ نوجوان سے لے کر پچاس سالہ مرد تک شامل ہوتے ایسے میں بیوی کو سخت شرمندگی ہوتی اس کا دل چاہتا وہ اپنے سامنے کھڑے ان مردوں کے منہ نوج لے جنہیں اپنا ہم وطن بھائی کہتے ہوئے بھی اسے کھن آتی تھی۔

آج صبح گھر سے جاتے ہوئے اسے فردوس خان نے بتایا تھا کہ سفارت خانے سے شمرز کا فون آیا ہے اس کا پاسپورٹ کل صبح گیارہ بجے مل جائے گا لہذا کل فردوس خان اسے خود سفارت خانہ لے کر جائے گا وہاں سے پاسپورٹ لے کر وہ سیانگ جائیں گے جہاں سے ریبجہ کے پاس سے نیرو کو اپنی رقم اور زیور لیتا تھا وہ خود بھی ایک آخری بار ریبجہ سے ملنا چاہتی تھی پھر جانے کب دوبارہ ملاقات ہو، چاہتی تھی کہ سیانگ جا کر ریبجہ اور عبدالوہاب کا شکریہ ادا کرے جنہوں نے ہر مشکل گھڑی میں اس کا ساتھ دیا شکریہ تو اسے شویہا کا بھی ادا کرنا تھا اس سلسلے میں اس نے سوچ رکھا تھا جانے سے قبل ایک دفعہ شویہا سے مل کر اس کا شکریہ ضرور ادا کرنے کی کوشش کرے گی آخری بار وہ گھر بھی ضرور دیکھے گی جہاں سکندر کے ساتھ اس نے اپنی زندگی کے بدترین چھ سال گزارے شاید وہ ایک آخری بار حما کو بھی دیکھ سکے یہ سب اس کی سوچ تھی جس پر عمل ہونا یا نہ ہونا آئے والے وقت پر منحصر تھا۔

برٹن دھو کر اس نے سنک صاف کیا ابوزر سلپ پر ہی لیٹ کر سو گیا تھا، نیرو نے جلدی جلدی پکن کا باقی کام ختم کیا، ابوزر کو گود میں اٹھا کر اس کمرے میں آگئی جہاں وہ فردوس خان کی بیٹیوں کے ساتھ رہتی تھی، صوفہ کم بید کو سیدھا کر کے ابوزر کو اس پر ڈال دیا خود بھی ساتھ ہی لیٹ گئی ابھی بھی درمیان میں بیس گھنٹہ بانی تھے، بیس گھنٹہ بعد اس کے ہاتھ میں اس کا پاسپورٹ ہو گا اس پاسپورٹ کے حصول کے ساتھ ہی اس کا گلا سفر بھی آسان ہو جائے گا ابوزر کے بعد نئے پاسپورٹ کا حصول سکندر کے منہ پر لگنے والا دوسرا طمانچہ تھا اپنی تلاش میں کتنے کی طرح در در پھرتے سکندر کا تصور ذہن میں ابھرتے ہی وہ پرسکون ہو گئی اور اس کی نیند سے بوجھل آنکھیں جلدی بند ہو گئیں۔

”پاپا۔۔۔ پاپا۔۔۔“ وہ مسلسل سسک رہی تھی۔
 ”بھولو میرا بچہ، میری جان میں سن رہا ہوں۔“

احتشام صاحب کو محسوس ہوا وہ کئی صدیوں بعد نیرو کی آواز سن رہے ہیں وہ بھی اس وقت جبکہ ہر طرف سے مایوس ہو چکے تھے ایسے میں نیرو کی آواز نے ان کے جسم کے رومیں رومیں کو سر ہٹا پاؤش کر دیا وہ چاہتے تھے کال بند ہونے سے قبل نیرو انہیں اپنے نرے میں کچھ نہ کچھ ضرور بتا دے یہ کہ وہ کہاں ہے؟ کیسی ہے؟ کس حال میں ہے؟ مگر دوسری طرف سوائے نیرو کی سسکیوں کے کوئی دوسری آواز سنائی نہ دے رہی تھی ہرگز نہ تاہل ان کی بے چینی میں اضافہ کا سبب بن رہا تھا۔

”نیرو مجھے بتاؤ بیٹا تم ٹھیک تو ہونا۔“

دل کا خدشہ ان کے بول پر آئی گیا۔

”ہاں پاپا شکر الحمد للہ میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

جانے کتنے عرصہ بعد اپنے باپ کی آواز سن کر وہ خود پر کنٹرول کھو بیٹھی تھی اسے تو دے ہوئے بھی زبانے گزر گئے تھے کیونکہ رونے کے لیے کسی اپنے کے کندھے کا ہونا ضروری ہے اور اس کے پاس تو کوئی اپنا تھا ہی نہیں، آج

”پاپا میں جس نمبر سے بات کر رہی ہوں یہ میرا ہے اسے اپنے پاس محفوظ کر لیں۔“

”تم کہاں ہو اس وقت۔“ احتشام صاحب جلد از جلد اس سے سب کچھ جان لینا چاہتے تھے۔

”پاپا میرے پاس نا تم بہت کم ہے یہ سب باتیں میں آپ کو وطن واپسی پر بتاؤں گا کافی الجھل میرا نمبر محفوظ کر لیں جب بھی مجھ سے رابطہ کرنا ہو آپ اس نمبر پر کریں اور ہاں یہ نمبر سوائے آپ کے کسی کے پاس نہیں ہونا چاہیے اس کا علم ہاں کو بھی نہ ہو ورنہ میں آپ سے بھی دوبارہ رابطہ نہ کروں گی۔“

وہ جلدی جلدی بولی اسے خدشہ تھا کارڈ ختم نہ ہو جائے دوسرے کارڈ کے لیے اسے پھر بازار جانا پڑتا، وہ جانتی تھی اس وقت احتشام صاحب آفس ہوں گے اس لیے بھی اس نے یہ وقت منتخب کیا تھا۔

”اگر آپ کو کبھی میرا نمبر بند ملے یا میں کال ریسیو نہ کروں تو سمجھ لیجئے گا میں اس دنیا میں نہیں ہوں یا کسی بڑی مشکل میں پھنس گئی ہوں۔“

”خدا نہ کرے بیٹا کیوں اتنی خوفناک باتیں کر رہی ہو۔“ احتشام صاحب دہل گئے۔

”مجھے یہ تو قاتلہ تم ہو کہاں۔“

”یہ میں نہیں بتا سکتی مگر اتنا ضرور کہوں گی میں جہاں ہوں اپنے بھائی کے گھر ہوں اور بالکل خیریت سے ہوں مگر اب بہت جلد مجھے یہاں سے نکلتا ہے اگر مجھے کسی وجہ سے نمبر تبدیل کرنا پڑا تو اس کی اطلاع میں یا میرا بھائی آپ کو دے دیں گے آپ میری طرف سے بے فکر ہو جائیں میں ان شاء اللہ جلد ہی آپ لوگوں سے آملوں گی۔“

تفصیل کے ساتھ ہی کارڈ بھی ختم ہو گیا، جو بھی تھا احتشام صاحب کے لیے اتنا کافی تھا۔ نیرو خیریت سے ہے ورنہ دنیا کی طرح طرح کی باتوں اور بے بنیاد خدشات نے انہیں کئی عرصہ سے پریشان کر رکھا تھا آج اتنے عرصہ بعد نیرو کی آواز سن کر انہیں دلی سکون حاصل ہوا مگر اس کی آواز سے بھی انہیں احساس ہو گیا تھا کہ وہ پریشان ہے۔

”اللہ میری بچی کی تمام پریشانیاں دور کرے۔“ تنی دور سے وہ صرف دعائی تھی جو نیرو کے حق میں بھیج سکتے تھے

سو انہوں نے دل کی گہرائیوں سے بھیج دی ویسے ہی اتنے کٹھن حالات میں نیرو کو اپنے حوصلہ کے ساتھ اپنوں کی دعاؤں کی ضرورت تھی۔

اپنے ہاتھ میں پکڑے اس سبز پاسپورٹ کو اس نے کئی بار الٹ پلٹ کر دیکھا، کوئی دس بار اندر سے کھول کر اپنی تصویر دیکھی، نیرو احتشام جانے کتنی بار اس نام کو دل ہی دل میں دہرایا پھر بھی اسے یقین ہی نہ آیا یہ اس کا اپنا پاسپورٹ ہے جو آج دو ماہ کی خواری کے بعد اس کے ہاتھ میں تھا جس کے خاطر اس نے پتا نہیں کتنے دھکے کھائے تھے، کیسی کیسی نظروں کا سامنا کیا تھا بے یقینی کی اس کیفیت میں اس نے اپنے ہاتھ پر چنگی بھی کاٹ کر دیکھی، یقیناً

”یہ پاسپورٹ اس کا اپنا ہی تھا۔“

”تم اگر دیس واپس جانا چاہو تو میں ٹکٹ اور ویزا لگوادوں گا بصورت دیگر تمہیں تمہارا پاسپورٹ بھی نہیں ملے گا اور میں دیکھوں گا بغیر پاسپورٹ کے تم ہمارے ملک میں کس طرح رہ پاؤ گی میں یہاں تمہارا اجینڈا شوار کروں گا۔“

بڑے کدفر کے ساتھ بولے گئے فرعونی الفاظ اس کی سماعت میں تازہ ہو گئے۔

”کاش سکندر حیات آج تم میرے سامنے ہوتے اور میں تمہیں بتا سکتی کہ کس طرح میں نے تمہارے منہ سے نکلتے ہوئے تمہارے الفاظ کو جھوٹ ثابت کر دیا آج میں ابوزر کے ساتھ تمہاری ہی سرزمین پر موجود ہوں اور بالکل صحیح سلامت، تمہارے کمرے کے کسی لاک میں رکھا ہوا میرا پاسپورٹ اب کانغہ کے ایک حقیر ٹکڑے سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔“

اپنے پاسپورٹ کو مضبوطی سے تھام کر وہ کھڑی ہوئی، باہر گاڑی میں فردوس کے ساتھ شریز بھی موجود تھا۔ نیو نے بنا کوئی بات کیے اپنا پاسپورٹ فردوس کے ہاتھ میں دے دیا۔ پاسپورٹ کا حصول کامیابی کی طرف بڑھنے والے راستے پر رکھا جانے والا پہلا قدم تھا اسی سوچ سے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں بے شک ایک طویل جدوجہد کے بعد وہ سبز پاسپورٹ کی مالک بن چکی تھی اس پاسپورٹ نے اسے پاکستانی ہونے کی شناخت عطا کر دی تھی وہ شناخت جو اس کے لیے باعث فخر بھی پورے نام نشان تھی۔

”پاسپورٹ اچھی طرح اپنے پنڈ بیگ میں رکھو میں تمہیں اسٹیشن چھوڑ دیتا ہوں تم وہاں سے سانگ جلی جاؤ کیونکہ مجھے ابھی ایک ضروری کام سے کہیں اور جانا ہے شام کو واپسی میں تمہیں عبدالوہاب کے گھر سے پک کر لوں گا اپنی رقم اور زیور یاد سے لے لیتا اب تمہارا پیسہ خرچ کرنے کا وقت آگیا ہے۔ تمہیں قدم قدم پر پیسوں کی ضرورت پڑے گی اور ہاں اپنے زیور کے ساتھ وہاں سے اکیلی مت نکلتا تم جانتی ہو یہاں نیلے جگہ جگہ عورتوں کو زبردستی کر کے لوٹ لیتے ہیں اس لیے فارغ ہوتے ہی میں تمہیں پک کر لوں گا۔“ فردوس خان اسے ہر بات اچھی طرح سمجھاتے ہوئے بولا چونکہ آج اس نے ربیعہ کے گھر جانا تھا اس لیے ابوذر اس کے ساتھ ہی تھا۔

منٹ بعد وہ ربیعہ کے اپارٹمنٹ کے باہر کھڑی کال بیل بج رہی تھی۔
 ”کون؟“ ملائی میں سوال کرتے ہی ربیعہ نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا، ہیکنگ کی خوشبو اس کے پورے گھر میں پھیلی ہوئی تھی یہاں ہیکنگ کا رواج بہت زیادہ تھا جس کے سبب ربیعہ بھی اچھی خاصی ہیکنگ کرنے لگی تھی۔

”آپ کون۔۔۔“ ربیعہ نے حیرت سے اپنے سامنے کھڑی ملائی عورت کو دیکھا دھوٹی، لمبی سی شرٹ سر پر اسکارف بڑے سے چہرے نے اس کا اوجھڑا چھپا رکھا تھا ساتھ ہی ایک تقریباً ”دو سالہ“ بچی کسی سے ملتا ہے وہ پھر بولی۔

”دروازے پر ہی سب سوال کر لو گی یا اندر بھی آئے دو گی۔“
 نیو اسے اپنے سامنے سے ہٹاتی اندر داخل ہو گئی۔
 ”او میرے خدا یا یہ تم کو مائی گاؤ مجھے تو یقین ہی نہیں آ رہا۔“
 ربیعہ نے بمشکل اپنی آواز کو دہرایتے ہوئے کہا وہ نیو کے اندر داخل ہوئی دروازہ لاک کر چکی تھی اگر وہ نیو کی آواز نہ پہچانتی تو کبھی یقین نہ کرتی کہ سامنے کھڑی ملائی عورت حقیقت میں نیو ہے۔
 ”دوبارہ سکندر نے تنگ تو نہیں کیا تم لوگوں کو۔“

نیو اس سے مل کر اپنا اسکارف اتارتی صوفے پر بیٹھ گئی ربیعہ اس کے لیے جوس لے آئی تھی ابوذر ربیعہ کی بیٹی کیپاس تھا جب اسے سکندر کا خیال آیا جس نے ان دونوں میاں بیوی کو نیو کے مسئلے میں بہت تنگ کیا تھا۔
 ”ارے ہاں یاد آیا دونوں قبل ہی اس نے عبدالوہاب کو فون کیا تھا۔“ ربیعہ اس کے قریب ہی بیٹھ گئی بیوہ کا دل تیزی سے دھڑک اٹھا۔

”کہہ رہا تھا کہ تمہاری اس سے صلح کروادی جائے۔“
 ”واٹ۔۔۔“ ربیعہ کی بات بالکل ہی غیر متوقع تھی بیوہ یوں کر شاک سی رہ گئی۔
 ”واٹ نان سہنسس طلاق کے بعد صلح بہت ہی بے غیرت آدمی ہے۔“ بیوہ کی سمجھ میں نہ آیا وہ سکندر کے لیے کون سا ایسا لفظ استعمال کرے جو اس کے گھنایاؤں کی درست نشاندہی کر سکے۔
 ”وہ کہتا ہے اس نے تمہیں طلاق ہی نہیں دی۔“ ربیعہ ہنستے ہوئے بولی۔
 پہلی بات کی طرح یہ بھی بالکل ناقابل برواشت بات تھی جسے سنتے ہی نیو ایک دم غصے میں آ گئی۔

”چھ نہیں لوگوں نے مذہب کا اس قدر مذاق کیوں بنا رکھا ہے اور تم لوگ تو اچھی طرح جانتے ہو اس الو کے منجھے نے مجھے ایک ایک ماہ کے وقفہ سے تین طلاقیں دی جس کے گواہ اس کی ماں، ابا، حاکم، صلیح، عمر، روزینہ، عم، عبدالوہاب سب ہی لوگ ہو میں نے اس کے گھر اپنی عدت کے سوا چار ماہ پورے کیے اب جب میں اس کے منہ پر جو تمار کر ابوذر کو لے آئی ہوں تو اسے مجھ سے صلح کرنا یاد آگیا بہت خوب کیا بات ہے۔“

”دراصل یہ یہ سمجھتا ہے کہ تم ہمارے پاس ہو اس لیے عبدالوہاب اور مجھے رام کرنے کے لیے وہ یہ چاہیں چل رہا ہے سمجھتا ہے اس طرح ہم تمہیں اس سے ملوا دیں گے یہ اس کی گھنیا ترین چال ہے جس سے ہم سب بھی واقف ہیں تم خواہناؤ اتنے جوش میں مت آؤ۔“ ربیعہ نے پیار سے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

اس کا بیان کر کے تجزیہ سو فیصد درست تھا صرف ابوذر کے حصول کے لیے سکندر یہ سب چاہیں چل رہا تھا اپنی ان چالوں سے اسے اب کوئی فائدہ پہنچنے والا نہ تھا کیونکہ نیو واقعی ناجسم نہ تھی جو طلاق کے مذہبی تقاضے نہ سمجھتی ہو۔

”دراصل اس نے طلاق مجھے لکھ کر کورٹ کے ذریعے نہیں دی مجھے لگتا تھا وہ یہ یکم اپنی کسی چال میں ضرور کھیلے گا میں جانتی ہوں اگر آج میں ابوذر اس کے حوالے کر دوں تو وہ مجھے طلاق کے پیچہ زمی دے دے گا بہر حال مٹی والو سکندر اور اس کی کھنٹی چالوں پر یہ بتاؤ تم اس وقت میرے ساتھ کے ایل سی سی چل سکتی ہو مجھے شوہا سے ملنا ہے اور ساتھ ہی ایک آخری بار حماد کو بھی دیکھ لوں پھر تائیں زندگی میں دوبارہ اسے دیکھنا نصیب ہو یا نہ ہو۔“

”ناگل ہو گئی ہو اگر وہاں تمہیں کسی نے دیکھ لیا تو پولیس کے حوالے کر دے گا تمہاری ایف آئی آر درج ہے وہاں گئے تھا نے میں ہوش کے ناخن لو زیادہ جذباتی مت بنو شوہا کا نمبر میرے پاس ہے اس سے فون پر رابطہ کر لو اور ہاں کل شفا کا فون آیا تھا وہ عمو کر کے گئی ہے تمہارے لیے بہت پریشان تھی میں نے اسے بتایا ہے کہ تم خیریت سے ہو یہ نہیں بتایا کہ کس شہر میں ہو بہر حال فردوس خان کے بارے میں بھی بتا دیا ہے ساتھ ہی یہ ہدایت کر دی تھی کہ وہ یہ سب کچھ کسی تیسرے شخص سے شیئر نہ کرے۔“ ربیعہ نے اسے سب کچھ تفصیل سے بتا دیا شام میں نیچے فردوس خان آگیا اس کا فون آتے ہی نیو اٹھ کھڑی ہوئی ربیعہ نے تمام رقم اور زیور اس کے حوالے کر دیا جسے وہ اپنے بیگ میں محفوظ رکھ چکی تھی عبدالوہاب بھی گھر آگیا تھا ان دونوں سے ملے ہوئے وہ آبدیدہ ہو گئی۔
 ”تم دونوں نے ہر مشکل گھڑی میں میرا ساتھ دیا خدا تمہیں اس کا اجر ضرور دے گا اور اب دعا کرنا میں خیر خیریت کے ساتھ یہاں سے نکل جاؤں۔“ جاتے سے اس نے ربیعہ کے گلے لگتے ہوئے اس کا شکریہ ادا کیا۔

”تمہاری دعا میں ہر وقت تمہارے ساتھ ہیں۔“ عبدالوہاب نے اس کے سر پر دست شفقت رکھا۔
 ”یہ بہت زیادہ تو نہیں مگر کچھ رقم ہے جو ہو سکتا ہے تمہارے کسی کام آجائے ایک بھائی کی طرف سے تحفہ سمجھ کر اپنے پاس رکھ لو۔“

نیو نے عبدالوہاب کے ہاتھ میں تھما لافافہ خاموشی سے لے کر اپنے پنڈ بیگ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا دونوں میاں بیوی اسے نیچے چھوڑنے آئے جہاں فردوس خان پہلے سے موجود تھا اور پھر روڈ کے آخری سرے تک نیو نے کئی بار پیچھے مڑ کر دیکھا دونوں اپنے اپارٹمنٹ کی عمارت کے باہر روڈ پر کھڑے تھے جب تک گاڑی موڑ نہ مڑ گئی وہ دونوں اسے ہاتھ ہلاتے رہے۔ ربیعہ اور عبدالوہاب اس کے ملائشی قیام کی چند اچھی یادوں میں سے ایک تھے وہ ان ہی کے خیالوں میں گم تھی جب اسے فردوس خان کی آواز سنائی دی۔

”تمہارا پاسپورٹ تو بن چکا مگر ابوذر کا ابھی باقی ہے اور یقیناً تمہارے پاس اس کا برتھ سرٹیفکیٹ بھی نہیں ہو گا اور وہ ہے جی ملائی شہری۔“

گاڑی ہائی وے پر آگئی تھی جب فردوس خان نے اپنے سامنے والا مرسیٹ کر کے اس پر ایک نظر ڈالی، وہ جو پچھلی سیٹ پر بہت ہی آرام دہ حالت میں بیٹھی تھی فردوس خان کے مخاطب کرتے ہی ایک دم سیدھی ہو بیٹھی۔ ابوذر کے پاسپورٹ کا تو اس نے سوچا بھی نہ تھا وہ تو اپنے پاسپورٹ کو بیٹھ کر کامرانی کی نشانی سمجھ بیٹھی تھی ایک دشوار ترین مرحلہ تو ابھی باقی تھا جس کا احساس اسے ابھی ابھی فردوس خان کی زبانی ہوا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں میرے پاس اس کا کوئی بھی کاغذ نہیں ہے یہاں تک کہ میں کسی کورٹ میں یہ بھی ثابت نہیں کر سکتی کہ وہ میرا سا بیٹا ہے۔“ وہ بے بسی سے بولی۔

”در اصل میں سفارت خانے سے سیدھا اپنے ایک جاننے والے کے پاس گیا تھا، جنہیں نہ سہی مگر مجھے پتا تھا کہ اگلا قدم ابوذر کا پاسپورٹ ہے اس کے بغیر تمہارا ویزا تو لگ جائے گا مگر تمہارے بیٹے کا نہیں میرا یہ جاننے والا پاسپورٹ ایجنٹ ہے میں اس سے ساری بات کر آیا ہوں بغیر ہر تھ سرٹیفکیٹ کے پاسپورٹ بنانے کی فیس وہ 2000 رنگیٹ لے گا اگر تم انفرڈ کر سکتی ہو تو میں اس سے رابطہ کر لوں گا کہ وہ ابوذر کا پاسپورٹ بنا دے ضرورت ہوئی تو وہ ہر تھ سرٹیفکیٹ بھی بنا دے گا۔“

اپنی بات ختم کر کے فردوس خان نے اس کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھا اس نے دل ہی دل میں حساب لگایا 2000 رنگیٹ کا مطلب پاکستانی تقریباً بیس تالیس ہزار روپے اتنی رقم تو ابھی بھی شاید اس کے پرس میں تھی جو اسے احتشام صاحب نے پیسے بھیجتے تھے وہ تو اس نے آج تک ریبیو سے لیے بھی نہ تھے باقی اپنی جمع کردہ رقم وہ اب تک خرچ کر چکی تھی، احتشام صاحب کی بھیجی ہوئی رقم کے علاوہ عبدالوہاب کا دیا ہوا کالفاٹہ بھی اس کے پرس میں ہی تھا اور اگر نہ بھی ہو تا تو ابھی وہ اپنا زیورینچہ دیتی کیونکہ اسے واپس تو ہر حال میں جانا تھا اور اس کا کوئی بھی زیور ابوذر سے زیادہ قیمتی نہ تھا۔

”کیا سوچتے گلیں؟“ اسے خاموش دیکھ کر فردوس خان نے پھر سے پکارا۔

”کچھ نہیں پیٹل کا حساب لگا رہی تھی آپ اپنے دوست کو فون کریں میں اس کی منہ مانی فیس دوں گی بس وہ کسی بھی طرح مجھے ابوذر کا پاسپورٹ بنا دے۔“

”ٹھیک ہے ابھی گھر آنے والا ہے تم چلی کر کھانا وغیرہ کھاؤ میں اس سے بات کرتا ہوں تاکہ وہ جلد از جلد ہمیں ابوذر کا پاسپورٹ بنا دے میں چاہتا ہوں جتنی جلدی ممکن ہو تمہیں یہاں سے نکال دیا جائے اور یہی ہم سب کے لیے بہتر ہے۔“

گاڑی فردوس خان کے گھر کے سامنے رک گئی، اندر جاتے ہی اس نے پرس سے بیس ہزار رنگیٹ نکال کر اسے اپنے اپنی پیس میں رکھ کر لاک کر دیا کیونکہ اس پرس میں نہ صرف رقم بلکہ کل زیور بھی تھا جو جانے کس کس جگہ اس کے کام آئے والا تھا بیس ہزار رنگیٹ لے کر وہ فردوس خان کے پاس پہنچ گئی جو کھانا کھانے کے بعد کسی سے فون پر مصروف گفتگو تھا وہیں قریب رکھی کر سی پر بیٹھ کر اس کے فارغ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

”یہ آپ کی مطلوبہ رقم۔“ اس کے فون بند کرتے ہی بیوی نے رقم کا کالفاٹہ اس کی سمت بڑھایا۔

”گن لیں پورے بیس ہزار ہیں پلیز اپنے دوست سے کہیں جیسے بھی ہو جلد از جلد میرا کام کروے تاکہ ہم یہاں سے نکل سکیں۔“ وہ جتنی کہنے لگی۔

”میری بات ہو گئی ہے تم کل صبح تیار رہنا فراز اور شمرز تمہیں ملائشین امحبسی لے جائیں گے جہاں سے ابوذر کا پاسپورٹ بننا ہے۔“

”ملائشین امحبسی۔“ وہ خوف زدہ ہو گئی۔

”مگر وہاں کسی نے مجھے پکڑ لیا تو۔“

کوئی نہیں پکڑے گا۔ ایسے کیس روز جانے کتنے ہوتے ہیں امحبسی والوں کا کیا لیٹا رہنا ہر حال تمہارا بیٹا یہاں کا شہری ہے اس کا پاسپورٹ بھی اسی ملک سے جاری ہو گا کل تمہارے ساتھ اس کا جانا بھی ضروری ہے اسے لڑکوں والے پکڑے پٹانیا اور یاد سے جاتے ہوئے اس کے بال بھی چھوٹے کر دینا تاکہ وہ لڑکا نظر آئے ان دونوں کے علاوہ میرا ایک دوست بھی تم لوگوں کے ساتھ ہو گا میں خود پارکنگ میں موجود رہوں گا کسی بھی خطرے کو محسوس کرتے ہی وہاں سے نکل آنا اس کے آگے جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“

فردوس خان نے تمام باتیں اسے تفصیل سے سمجھا دیں۔

”اب تم جاؤ جا کر آرام کرو اور صبح ناٹم پر ہی اٹھ جانا تم یہاں سے فراز اور شمرز کے ساتھ نکل جانا میں اپنے ایک دوست کے ساتھ تم سے پہلے ہی وہاں پہنچ جاؤں گا پارکنگ میں موجود رہوں گا تاکہ خدا نا خواستہ اگر کوئی خطرے والی بات ہو تو تمہیں وہاں سے نکالنا آسان رہے اور ہاں وہ پاسپورٹ ایجنٹ بھی جنہیں مل جائے گا اس نے اپنا مرتب کردہ پروگرام اسے اچھی طرح سمجھا دیا۔“

فردوس خان کی دی ہوئی اتنی تسلی کے باوجود وہ ساری رات خوف زدہ رہی خوف کے سبب وہ سو بھی نہ پائی فجر کی نماز پڑھتے ہی تیار ہو کر شمرز اور فراز کا انتظار کرنے لگی ابوذر کو اس نے سوئے میں ہی تیار کر دیا تھا اب وہ فراز اور شمرز کے انتظار میں ایک ایک بل کن کر گزار رہی تھی 9 بجے شمرز گاڑی لے کر پہنچ گیا پچھلی سیٹ پر فراز کے ساتھ ایک اجنبی شخص موجود تھا جسے اس نے آج پہلی بار دیکھا تھا وہ خاموشی سے گاڑی کا فرنٹ ڈور کھول کر شمرز کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئی، راستہ میں وہ تینوں آپس میں کچھ اپنی ہی باتیں کرتے رہے جس پر بیوی نے کوئی دھیان نہ دیا اس وقت وہ مکمل طور پر ٹینشن میں تھی اور دل ہی دل میں آیت الکرسی کا ورد کر رہی تھی کچھ دیر بعد گاڑی رک گئی اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا بالکل سامنے ملائشین امحبسی کی پر شکوہ عمارت کھڑی تھی۔

”تم اندر چلو ہم تینوں تمہارے ساتھ ہی ہوں گے اگر کہیں خطرو محسوس کرو تو فوراً وہاں سے نکلنے کی کمر۔“

شمرز نے عمارت کے اندر داخل ہونے سے قبل اسے ہدایت کی اس نے صرف اثبات میں سر ہلا دیا اس کا حلق خشک ہو گیا کچھ بولا ہی نہ گیا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتی ایک بڑے سے ہال نما کمرے میں داخل ہو گئی، شمرز اور اس کا دوست کچھ فاصلہ رکھتے ہوئے اس کے ساتھ تھے جبکہ فراز جانے کہاں تھا گیٹ کے قریب ہی جینزری شرٹ میں چھوٹی داڑھی والا نوجوان کھڑا تھا، جو انہیں دیکھتے ہی تیزی سے ان کی جانب لپکا غالباً وہ ہی پاسپورٹ ایجنٹ تھا اسے اپنی طرف آنا دیکھ کر بیوی رک گئی۔

”بیوی احتشام۔“ وہ اس کے قریب آکر آہستہ سے بولا بیوی نے صرف اثبات میں سر ہلا کر اس کے اندازے کی تصدیق کی اس کے رکتے ہی شمرز بھی اپنی جگہ ختم کیا۔

”آج تمہارے بچے کا یہاں آنا بہت ضروری تھا کیونکہ اس کی تصویر چاہیے تھی ایک دفعہ تم سب کام کروا جاؤ پھر تمہیں دیاواہ نہیں آنا پڑے گا“ آگے کے سب کام میں خود ہی کر لوں گا صرف اس کی تصویر کا مسئلہ تھا جس کے لیے تمہیں آنا دراصل مکمل اعتماد کے ساتھ کاؤنٹر پر جاؤ گھر لے کر ضرورت نہیں ہے اوکے“ وہ آہستہ سے کہہ کر دھڑکتے دل کے ساتھ کاؤنٹر کی جانب بڑھ گئی۔

”مجھے اپنے بیٹے کا پاسپورٹ بناوانا ہے۔“ کاؤنٹر پر موجود نوجوان سے اس نے ملائی زبان میں اپنا مدعا بیان کیا راستے میں آتے ہوئے وہ ابوذر کے بال بھی چھوٹے کر دلائی تھی نوجوان نے بنا کوئی جواب دیے خاموشی سے اس کے ہاتھ میں نمبر کاٹو کن تمھارے لئے کر دیا اندر انتظار گاہ میں رکھی کر سیوں میں سے ایک پر جا بیٹھی شمرز نے فراز دونوں میں سے کوئی بھی اس کے آس پاس موجود نہ تھا جانے کہاں تھے تقریباً پندرہ منٹ بعد اس کا نمبر کال ہوا وہ

جلدی سے اٹھی اور نمبر کال کرنے والی لڑکی کے کاؤنٹر کے قریب جا پہنچی لڑکی نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”کس کا پاسپورٹ بنوانا ہے؟“ اس کا یہ سوال ملائی میں ہی تھا وہاں کہیں انگلش نہیں بولی جاتی تھی۔

”اپنے بیٹے کا۔“ تبھی بولے ابو ذر کو اس کے سامنے کر دیا۔

”اوکے آگے جا کر سامنے سے اس کی ایک تصویر بنوا لاؤ۔“ لڑکی کی ہدایت سنتے ہی اس نے کاؤنٹر چھوڑ دیا اور تیزی سے باہر کی جانب چل دی۔

”کیا ہوا؟“ باہر نکلتے ہی جانے کہاں سے شمرزید دم اس کے سامنے آگیا۔

”کچھ نہیں ابو ذر کی تصویر بنوانے جا رہی ہوں۔“ وہ سامنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے آگے کی جانب بڑھ گئی۔

”کچھ ہی دیر بعد تصویر بنوا کر واپس پہلے کاؤنٹر پر آگئی جہاں موجود لڑکی کپیوٹر پر مصروف تھی۔

”تصویر۔“ اس نے نیو کی طرف دیکھ کر اپنا ہاتھ آگے بڑھایا تبھی نے تصویر تھما دی۔

”بچے کا نام۔“ اس کی انگلیاں کی بورڈ پر چل رہی تھیں۔

”ابو ذر۔“ تبھی نے حلق سے ٹھوک نکلا غالباً لڑکی ابو ذر کا کپیوٹر ڈیٹا چیک کر رہی تھی۔

”پاپ کا نام۔“ ظاہر ہے یہ سوال تو پوچھا جانا تھا۔

”سکندر حیات۔“ جواب دیتے ہوئے نیو کا حلق اندر تک کڑوا ہو گیا۔

”ماں کا نام۔“ لڑکی مسلسل کپیوٹر پر مصروف تھی۔

”نبیو احتشام۔“ اس نے آہستہ سے جواب دیا۔

”برتھ سرٹیفکیٹ۔“ بالا خر لڑکی نے وہ سوال بھی کر دیا جس سے نبیو خوف زدہ تھیں۔

”اوہ وہ تو میں بھول آئی۔“ پرس میں ہاتھ ڈال کر چیک کرنے کے بعد اس نے فردوس خان کی ہدایت کے مطابق جواب دیا۔

”ضروری ہے تو کل لیتی آؤں گی۔“ لڑکی نے کوئی جواب دیے کپیوٹر پر مصروف رہی۔

کچھ سیکنڈ بعد اس نے اپنا سر اٹھا کر نیو کے چہرے پر ایک نظر ڈالی جانے اس نظر میں کیا تھا جس نے نبیو کو تھوڑا سا خوف زدہ کر دیا، لڑکی نے پاس رکھے فون سے کوئی نمبر ملایا اور صرف ایک سیکنڈ کوئی بات کی جو نبیو کو سن نہ سکی وہ یہ سب کام بظاہر لا پرواہی سے کر رہی تھی مگر اس کی ہر حرکت نبیو کو کچھ غلط ہونے کا احساس دلا رہی تھی اس کی چٹھی جس اسے خطرے کا سگنل دے رہی تھی۔

اسے محسوس ہوا جیسے کچھ ہونے والا ہے وہ تھوڑی سی الرٹ ہو گئی یہاں وہاں نظروں ڈالتی شمرزید انتظار گاہ میں ہی موجود تھا اس کی تھوڑی سی تسلی ہو گئی لڑکی کے فون رکھتے ہی کچھ سیکنڈ میں ہی کمرے میں دو تین افراد داخل ہوئے اور تیزی سے چلتے ہوئے سیدھے اس کاؤنٹر پر چلے آئے جہاں نبیو پہلے سے موجود تھی اسے اپنے آپس پاس خطرے کی گھنٹیوں صاف سنائی دے رہی تھیں یقیناً ”وہ شخص چکی تھی ان دونوں مردوں کے چہرے پر چھائی غرختگی نے اس کی سانس بند کر دی رفتہ رفتہ اس کے پاؤں تلے سے زمین سرک رہی تھی وہ سمجھ گئی کچھ دیر قبل کاؤنٹر پر موجود لڑکی کی کال کے نتیجے میں یہی مرد کمرے میں داخل ہوئے ہیں۔

ان کے تیز دیکھتے ہی نبیو کو احساس ہوا کچھ غلط ہو گیا ہے وہ دونوں افراد کاؤنٹر کے دوسری جانب چلے گئے لڑکی کے ہاتھ سے تصویر لے کر کپیوٹر سے دو تین بار چیک کیا ساتھ ہی ساتھ وہ آپس میں کچھ ڈسکس بھی کر رہے تھے۔

”تمہارا پاسپورٹ کہاں ہے؟“ ان میں سے ایک مرد سیدھا ہوا اور ڈائریکٹ نبیو سے سوال کیا وہ اس اچانک

سوال کے لیے تیار نہ تھی فوراً ”یہی گھبراہٹ۔“

”میرے پاس کیوں؟“ نبیو گھبراہٹ پر قابو پاتے ہوئے اس نے جواب دیا۔

”تمہارے خلاف کوئی پولیس وارنٹ نکلے ہیں کیا؟“

دوسرے مرد نے کپیوٹر سے نگاہیں ہٹا کر اس سے سوال کیا۔

”تمہارا کوئی پولیس کیس بھی چل رہا ہے نبیو احتشام زوجہ سکندر حیات۔“ ابو ذر کے ساتھ ساتھ یقیناً ”اس کا ریکارڈ بھی چیک کیا گیا تھا اب مزید کوئی بات کرنا بے کار تھی۔“

”تمہارے بیٹے کے برتھ سرٹیفکیٹ کی سیریل بلاک ہے اس کا پاسپورٹ نہیں بن سکتا۔“ اب اس کے لیے وہاں کھڑا رہنا اپنی موت کو آپ دعوت دینے کے مترادف تھا وہ پیچھے کی طرف ہلٹی شمرزید اس کے عین پیچھے تھا۔

”مجھے کسی بات کا علم نہیں ہے جو کچھ پوچھنا ہے ان سے پوچھو یہ میرے ساتھ ہیں۔“ بدحواسی میں کہتی ہوئی وہ باہر کی جانب بھاگی۔

اور تیز تیز دھریاں اترتی یار رنگ میں داخل ہو گئی فردوس خان گاڑی اشارت کر کے اندر ہی بیٹھا تھا اسے گھبراہٹ میں آتا دیکھ کر اس نے پھللا دوڑا نہ بھول دیا وہ تیزی سے اندر جا کر خوف کمارے اس کی آواز بند ہو گئی۔

”یہاں سے نکلو فوراً۔“ وہ حلق کے بل چلائی اسے خطروں تھا کہیں اس کے پیچھے پولیس نہ آجائے گاڑی ایک جھپکے سے میں روڈ پر آگئی غالباً ”فردوس خان اور اس کے ساتھی ایسی کسی بھی صورت حال سے بچتا جانتے تھے“

اسے ابھی بھی خطروں تھا کہیں پولیس ان کا پیچھا نہ کر رہی ہو فردوس خان مختلف راستوں سے گاڑی گزارنا پالا خر گھر پہنچ گیا سارے راستے پولیس کا خوف ان کے ساتھ رہا مگر ایسا کچھ نہ ہوا نبیو نے راستے میں ہی فردوس کو ساری بات بتا دی وہ شمرزید کے لیے بھی پریشان تھی۔

”تم شمرزید کی فکر نہ کرو ان شاء اللہ وہ خیریت کے ساتھ وہاں سے نکل آئے گا اس کے ساتھ میرا دوست ملک نواز بھی ہے اس کی کافی جان بچان ہے سفارت خانے میں اصل مسئلہ تمہارا اور تمہارے بچے کا تھا تم خیریت کے ساتھ وہاں سے نکل آئی ہو اب کوئی اور مسئلہ ہمارے لیے اتنا بڑا نہیں ہے۔“ فردوس خان کی بات درست ثابت ہوئی مگر تینچے کے ایک ٹخنہ تنک شمرزید اور فراز بھی آگئے اس ایک ٹخنہ میں فردوس خان مسلسل اپنے فون پر مصروف رہا وہ کسی شخص کو تلاش کر رہا تھا ان کے آتے ہی نبیو جانا چاہتی تھی کہ شمرزید ہاں سے کس طرح نکلا۔

”پانچ منٹ تک میں ان دونوں کو یہ تاثر دیتا رہا جیسے تم میرے ساتھ ہو پھر وہاں ملک صاحب آگئے انہوں نے بتایا کہ میں پاکستان سے کچھ دن قبل آیا ہوں اور مجھے ملائی بالکل بھی سمجھ نہیں آتی آج بھی میں ان کے بیٹے کے دیرے کے مسئلے میں ملک صاحب کے ساتھ ہی اہم بیسی آیا تھا اب جانے وہ انجان لڑکی میرا نام لے کر مجھے وہاں کیل پھنسا کر دیغور فوریہ سب سنتے ہی دونوں آفریز نے مجھ سے معذرت کی اور تمہاری تلاش میں اپنے بندے دوڑا دیے میں جانتا تھا اتنے نام میں تم لوگ وہاں سے کافی آگے نکل چکے ہو گے۔“ شمرزید نے اس کے وہاں سے نکلنے کے بعد کے واقعات تمام جزئیات کے ساتھ بیان کر دیے فردوس خان فون بند کر کے شمرزید کی جانب متوجہ ہوا۔

”یہ یہاں سے قانونی طور پر نہیں نکل سکتی۔“

”میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا اس سلسلے میں کاشف سے بات کر لیں مگر آپ ہی نہ مانے۔“

”ہاں تم نے ٹھیک کہا تھا مگر نہ صرف یہ خود تمہارا نوجوان اور ایک خوب صورت لڑکی ہے بلکہ اس کے ساتھ ایک چھوٹا بچہ بھی ہے ان ہی حالات کو دیکھتے ہوئے میں نے کوشش کی تھی یہ ناکا کی دشواری کے آسانی کے ساتھ یہاں

233

سے نکل جائے مگر میری یہ کوشش چونکہ ناکام ہو چکی ہے اس لیے اب مجھے دو سراسر اختیار کرنا ہو گا جو ہے تو غیر قانونی اور مشکل مگر اس کے سوا کوئی اور چارہ بھی نہیں ہے۔
نبیو کو مسلسل نظر انداز کیے وہ دونوں آپس میں ہی گفتگو کر رہے تھے۔

”اور چونکہ یہ کام کاشف سے بہتر کوئی نہیں کر سکتا اسی لیے میں اس سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جیسے ہی میری اس سے بات ہو اگلا لمحہ عمل تیار کرتے ہیں۔ وہ مجھ سے جاکے ہوئی تھی سوائے ناشتے میں وہ بریڈ کے سلاخ اور ایک کپ چائے کے اس نے اب تک کچھ نہ کھایا تھا مگر خوف اور ذہنی پریشانی نے اس کی بھوک و پیاس کو یکسر ختم کر دیا تھا البتہ ابوزر مسلسل ریں کر رہا تھا جس کا صاف مطلب تھا کہ اسے بھوک لگی ہے۔“

فردوس خان نے اپنی مصروفیت کے باوجود ابوزر کے اس مسلسل آہستہ آواز میں رونے کو محسوس کر لیا۔
”تم باہر جا کر کھانا وغیرہ کھاؤ اور اسے سلا دو۔“ اس کا اشارہ ابوزر کی طرف تھا تبھی فردوس خان کی بات سنتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اور تم کھانا کھاؤ، ہی کمرے میں واپس آؤ تمہارا جو کچھ کرنا ہے اب جلد از جلد کرنا ہے ایسا نہ ہو پولیس تمہیں تلاش کرتی یہاں تک آجائے حالانکہ ایسا ممکن نہیں ہے پھر بھی احتیاط بہت ضروری ہے ویسے بھی اب مزید دیر تمہارے سارے راستہ بند کر دے گی۔“ وہ اثبات میں سر ملاتی باہر نکل گئی۔ ابوزر کو کھانا کھلا کر سلاتے ہی وہ واپس اسی کمرے میں آئی جہاں فردوس خان اور شمرین موجود تھے وہ کرسی پر جا کر بیٹھی تھی کہ فردوس خان کا فون بج اٹھا۔

پاک سرزمین شادباد۔ ”قومی ترانے کی خوب صورت دھن کمرے میں پھیل گئی۔

”السلام علیکم۔“ فردوس خان فون پر ہمیشہ سلام ہی کرتا تھا۔

دوسری طرف جو بھی تھا اس کی آواز سنتے ہی فردوس خان کا چہرہ خوشی سے دھک اٹھا کچھ دیر بات کر کے اس نے فون بند کر دیا اس کی ایک طرفہ گفتگو سے نبیو اندازہ لگا چکی تھی دوسری جانب یقیناً ”کاشف“ تھا جس کا ذکر ابھی کچھ دیر قبل ہی فردوس خان نے کیا تھا اور جس سے وہ پچھلے آدھے گھنٹے سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور بالاخر اپنی اس کوشش میں کامیاب بھی ہو گیا تھا۔

”اتفاق کی بات دیکھو کاشف آج ہی تھائی لینڈ واپس جا رہا ہے وہ پچھلے تین دنوں سے ملائیشیا میں ہے اب وہ منبھون کے باہر کسی ہوٹل میں ہے جہاں ہمیں دس منٹ تک اس کے تمام کاغذات پہنچانے ہوں گے دس منٹ بعد وہ تھائی لینڈ کے لیے نکل جائے گا پھر اتنا تو کاغذات وہاں جا کر دینے ہوں گے یا پھر انتظار کرنا ہو گا کہ وہ دوبارہ ملائیشیا کب آئے اس لیے بہتر یہ ہے کہ ہم یہ کاغذات اسے آج اور ابھی پہنچا دیں۔“ بات کرتے کرتے وہ اٹھ کھڑا ہوا شمرین بھی اس کی تقلید میں اپنی جگہ سے اٹھ گیا نبیو کا پاسپورٹ فردوس خان کے پاس ہی تھا۔

”کاشف کا کہنا ہے کہ ہمارا کام ہو جائے گا اس سلسلے میں وزیر کے فیس بائیس سو روپے اور کرایہ 2000 روپے کا اور یہ رقم وہ کام کرنے بعد ہم سے لے گا۔“ یہ تفصیل اس نے نبیو کو بتائی تاکہ وہ رقم کا انتظام کر سکے فردوس خان کی بتائی ہوئی رقم اس کی اور ابوزر کی زندگی سے زیادہ قیمتی نہ تھی اس کے ہاں بھرتے ہی فردوس خان اور شمرین تیزی سے گاڑی نکالنے کاشف سے ملنے اس کے بتائے ہوئے چرچہ پہنچ گئے اس دوران وہ مسلسل دعا کرتی رہی کہ کاشف انہیں مل جائے کیونکہ اس کی تھائی لینڈ واپسی کی صورت میں اس کا کام مزید لیٹ ہو جا تا جو وہ بالکل نہ چاہتی تھی اس کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی دعا قبول ہوئی کاشف اور فردوس خان کی ملاقات ہو گئی وہ نبیو کا پاسپورٹ اس کے حوالے کر آیا اب ان سب کو انتظار تھا کاشف کے فون کا جس کے ذریعے انہیں پتا چلتا کہ نبیو کا کام کہاں تک پہنچا اور اسے ملائیشیا سے کب نکلتا تھا۔“

نبیو نے جب سے احتشام صاحب کو اپنا نمبر دیا تھا وہ ہفتے میں ایک بار اس سے بات کر لیتے تھے صرف چند سیکنڈ کی گفتگو میں وہ انہیں اپنی خیریت ہی سے آگاہ کرتی اس کے علاوہ وہ کہاں ہے؟ کس حالات میں گھری ہوئی ہے؟ پاکستان کب تک واپس پہنچے گی؟ ان میں سے کسی بھی سوال کا جواب ابھی تک انہیں نہ ملا تھا یہ گفتگو بھی ان کی صرف دوبار ہی ہوئی تھی تیسری بار فون کرنے پر اس کا نمبر آف ملا احتشام صاحب گہرا گئے، وقفہ وقفہ سے انہوں نے کئی بار نمبر ملایا مگر دوسری طرف شاید آئسٹریک مشین لگی تھی تین چار تیل جانے کے بعد ہی کسی پونڈ آپریشن کی زبان میں کچھ کہنے لگی آخر کار احتشام صاحب تھک گئے، آفس میں بیٹھنا ان کے لیے مشکل ہو گیا وہ سارا کام امان کے حوالے کر کے گھر چلے آئے وہ تخت پریشانی میں جلا تھے اور اپنی اس پریشانی کو وہ کسی سے بیان بھی نہ کر سکتے تھے یہاں تک کہ رات سے بھی نہیں، دونوں اسی پریشانی میں گزرے جب تیسرے دن انہیں کسی انجان نمبر سے ایک پیغام موصول ہوا یہ پیغام ان کے سیل فون پر آیا تھا۔

”نبیو بحفاظت تھائی لینڈ پہنچ گئی ہے وہاں سے وہ جلد ہی پاکستان پہنچ جائے گی آپ اس کے لیے زیادہ سے زیادہ دعا کریں اس وقت اسے آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔“ نیچے فردوس خان کا نام اور نبیو کا نمبر بھی درج تھا جس کا کوڑھیلے والے سے مختلف تھا احتشام صاحب سمجھ گئے اس کی پرانی سم تھائی لینڈ کی حدود میں داخل ہوتے ہی بے کار ہو گئی تھی اس لیے ہی اس کا فون بند تھا انہوں نے اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرنے کے ساتھ ہی اپنی بیٹی کے بحفاظت گھر پہنچنے کی دعاؤں کی گہرائیوں سے کی۔

نبیو فردوس خان کے ساتھ جا کر اپنی گولڈ کی چوڑیاں اور سونے کا ایک عدد سیٹ بیچ آئی اسے تقریباً 5000 روپے کاشف کو دینا تھے اس کے علاوہ ابھی اس نے فردوس خان کی فیس کا ایک روپیہ بھی ادا نہ کیا تھا یہ رقم بھی تھائی لینڈ پہنچ کر اس نے فردوس خان کو دینا تھی تھائی لینڈ میں بھی اسے کافی رقم کی ضرورت پڑ سکتی تھی جس کی بنا پر اس نے اپنا زور بیچنے کا فیصلہ کیا کاشف کے تھائی لینڈ جانے کے تیسرے دن اس کا فون آگیا ان تین دنوں کا ایک ایک پل نبیو نے جس طرح امید و ناامیدی کے درمیان لٹک کر گزارا وہ ہی جانتی تھی کاشف کے فون نے اس کے جسم میں زندگی کی لہر دوڑا دی۔

”تم لڑکی کو لے کر فوراً تھائی لینڈ پہنچو اس کے ویزے کا کام ہو گیا ہے۔“ کاشف کی بات سن کر فردوس خان تھوڑا سا پریشان ہو گیا فون بند کرنے کے بعد وہ کچھ دیر سوچتا رہا پھر اس نے شمرین کو فون کر کے فوراً اپنے گھر پہنچنے کی ہدایت کی اس کے بعد وہ بچن میں مصروف نبیو کے پاس آیا۔

”سب کام چھوڑو اپنا سامان پیک کر لو اپنی تمام رقم بینڈ بینک میں رکھ لو ہمیں ابھی کچھ دیر میں یہاں سے تھائی لینڈ کے لیے نکلتا ہے تمہارا ویزا لگ گیا ہے۔“

یہ خبر سنتے ہی نبیو کے اندر توانائی سی بھر گئی وہ جلدی سے اس کمرے میں گئی جہاں اس کا سامان رکھا تھا اپنے سامان کی پیکنگ کرتے ہوئے کافی ایسی چیزیں جو اس کے استعمال میں نہ تھیں اس نے زرین اور اس کی بچیوں کو دے دیں مختلف این جی او کے دیے ہوئے بے تحاشا گفٹ پیک اس کے پاس جوں کے توں رکھے تھے اس نے وہ سب بھی زرین کے حوالے کر دیے اس کے واپسی کی خبر نے زرین کو اداس کر دیا تھا آخر اس نے ڈھائی ماہ کا عرصہ اس گھر کے ٹینوں کے ساتھ گزارا تھا جنہوں نے اسے بغیر کسی رشتہ ناتنے کے سبکی بہن کا مان دیا جہاں اپنے گھر اپنے دیس اور اپنے پیاروں کے پاس واپس پہنچنے کی خوشی وہ محسوس کر رہی تھی وہاں بہت کچھ کھونے کا وہ بھی اس

کے ساتھ تھا۔

حماد کی یاد آنسو بن کر اس کی آنکھ سے بہہ نکلی، زمین ایکساں تھی اس کا دکھنا کسی جان مٹی اسے گلے لگا کر تسلی دی اس لمحہ اسے رعبہ، عبد الوہاب، شہباز، آنٹی، نانا، ہستی غرض ہر وہ شخص یاد آیا جن سے اس کا کوئی نہ کوئی واسطہ رہا تھا یہاں تک کہ اسے مایا بھی یاد آئی جو اس کے پیچھے جانے لگتا تھا WAO اگر خوار ہوئی رہی اس کا کہنا تھا ”تمہارے بچے زنا رہ گئے ہیں تم میرے ساتھ چلو میں تمہیں تمہارے دیس بھیج دوں گی۔“ مگر اس عورت کی تمام حقیقت نبیرہ جان چکی تھی۔

اس نے اپنے رب کا شکر ادا کیا جس کی بدولت اس کا یہاں تک کا سفر آسان ہوا تھا زین نے بھی اسے ایک جوڑا گفٹ کیا جو اس نے اپنے سالان کے ساتھ پیک کر لیا فردوس خان باہر گاڑی میں بیٹھا اس کا ہنسنے کا سب سے مل کر باہر نکلی اگلی سیٹ پر فردوس اور شمرزادہ دونوں تھے، ملائیشیا سے تھائی لینڈ کا سفر خاصا طویل تھا جس کے بارے میں اسے زین نے بتایا تھا بھول اس کے یہاں سے تھائی لینڈ مارا یا تھو گھنے کی مسافت پر تھا اس بنا پر اس نے ابوذر کے کھانے کا کچھ سالان اپنے ساتھ رکھ لیا اس کے بیٹھے ہی گاڑی اشارت ہو گئی بے اختیار اس نے اپنے موبائل فون پر ٹائم چیک کیا شام کے تقریباً پانچ بجے تھے اگر زین کی کئی ہوئی بات درست تھی تو اسے آج کی ساری رات درمروں کے ساتھ تنہا سفر کرنا تھا وہ درمروں سے اسے اپنی بہن مانتے تھے مگر پھر بھی وہ دل ہی دل میں خوف زدہ ہو گئی شیطان کہیں بھی، کسی بھی جگہ آسکتا ہے اس سوچ نے اس کے حواس مکمل طور پر بحال کر دیے اور وہ خاصی الرٹ ہو کر بیٹھ گئی فردوس شمرزادہ سے کچھ کہہ رہا تھا وہ گاڑی سے باہر ہاتھ دے دوڑتے منظر دیکھنے میں مصروف تھی جب اسے شمرزادہ نے پکارا۔

”نبیرہ جاتی ہو فردوس بھائی کیا کہہ رہے ہیں۔“ وہ گردن موڑ کر پوچھ رہا تھا۔

”نہیں۔۔۔“ ظاہر ہے نبیرہ نے ان کے درمیان ہونے والی گفتگو نہ سنی تھی۔

”یہ ڈرا رہے ہیں کہیں تم کسی مصیبت میں نہ پھنس جاؤ جب کہ میرا کہنا یہ ہے کہ مصیبتیں تم جیسی بہادر اور دلیر عورتوں کے لیے نہیں ہوتیں اس کا عملی مظاہر میں اس دن سفارت خانے میں دیکھ چکا ہوں تمہاری جگہ کوئی عام لڑکی ہوتی تو ضرور اسی دن دھلی جاتی مگر تم جس کمال ہو ساری سے وہاں سے نکلی تھیں وہ قابل تحسین ہے اب جتاؤ فردوس بھائی کوش درست کہہ رہا ہوں یا ان کا خدشہ صحیح ہے۔“

ظاہر ہے وہ درست کہہ رہا تھا کہ فردوس خان کا خدشہ بھی اپنی جگہ صحیح تھا وہنا کوئی جواب دیے مسکرا دی شمرزادہ اور فردوس پھر سے گفتگو میں مصروف ہو گئے ابوذر پیس کھا کر اس کی گود میں سو گیا وہ کھڑکی سے سر نکالتے باہر بھاگتے دوڑتے نظارے دیکھ رہی تھی لمحہ لمحہ آگے بڑھتی گاڑی کے ساتھ باہر اندھیرا اترتا آیا تھا رنگ و روشنی کا سیلاب چاروں طرف اڑا رہا تھا مسافر رو رو جل اٹھے تھے ہمارے زندگی کی دو نقیب اپنے عروج پر تھیں، آہستہ آہستہ یہ ساری دو نقیب پیچھے رہ گئیں اب کہیں کہیں عثمانی روشنی دکھائی دے رہی تھی مائلا ”رات بہت زیادہ ہو چکی تھی یادہ شہر کی حدود سے باہر نکل آئے تھے اس نے کھڑکی کا شیشہ ہٹا کر باہر جھانکنے کی کوشش کی شاید اس وقت وہ کسی ہائی وے پر سفر کر رہے تھے اب گاڑی میں بھی مکمل سا ناٹاری ہو چکا تھا شمرزادہ سو گیا تھا فردوس خان نہایت خاموشی سے سامنے دیکھتا ہوا ڈرائیو کر رہا تھا فیروز اسے بھی آری تھی مگر رات کی تاریکی سانپ کی طرح کھنڈی مارے اس کے گل میں بیٹھ گئی رات کی اس عثمانی کے خوف نے اس کی آنکھوں سے نیند کو بیکرا ڈالا تھا اسے فردوس خان اور شمرزادہ کی شرافت پر کوئی شک نہ تھا اگر رات کے وقت نے اسے بہت محتاط کر دیا تھا اور سکندر جیسے رشتوں نے درمروں سے اس کا اعتبار ختم کر دیا تھا اس نے اپنے مفاد کی خاطر رنگ بدلتے ہوئے جگہ دیکھے تھے مگر پھر بھی دنیا میں عبد الوہاب اور فردوس خان جیسے لوگ بھی موجود تھے اور شاید اسی لیے دنیا ابھی تک بھائی تھی ورنہ کب کی فنا ہو چکی

ہوتی۔

گاڑی ایک جھٹکے سے رک گئی، اپنی سوچوں کے سمندر سے ابھر کر باہر نکل آئی کھڑکی سے جھانکا سامنے ایک چھوٹا سا ڈھابا نما ہوٹل تھا ہوٹل کے باہر کئی کرسیوں پر لمبے لمبے پاؤں والے دو جوان بیٹھے مٹار بجارہے تھے ان میں سے غالباً ”ایک لڑکی تھی جب اس نے مٹار کی دھن پر کسی اجنبی آواز میں گانا شروع کیا تو نبیرہ کو کچھ چلا ورنہ ان دونوں کے حلقے میں اس قدر مماثلت تھی کہ فرق کرنا مشکل تھا گاڑی کے رکتے ہی شمرزادہ بھی جاگ گیا، دونوں گاڑی سے باہر نکل کر ہوٹل کی طرف بڑھ گئے نبیرہ گاڑی میں بالکل تنہا گئی کچھ ہی دیر میں شمرزادہ پیس آیا اس کے ہاتھ میں کھانے کی ایک پلیٹ اور کوک کاٹن تھا جو اس نے کھڑکی سے ہی نبیرہ کی سمت پھینکا تھا توڑے سفید چاول، چنے چھوٹی چھوٹی مچھلیاں اور لال مرچوں کی چٹنی اس نے شمرزادہ کے ہاتھ سے پلیٹ تھام لی۔

”دراصل میں اور فردوس بھائی جب بھی تھائی لینڈ جاتے ہیں اسی ہوٹل سے کھانا کھاتے ہیں جس کی وجہ حلال کھانا ہے ہمیں اس ہوٹل پر پرانا اعتبار ہے یہاں مسلمانوں کے لیے حلال غذا کا انتظام ہوتا ہے اس کے علاوہ دیگر ہوٹل ٹیڈوز چلا رہے ہیں، کہیں کچھ انڈین بھی ہیں، کچھ تھائی بھی پورے پورے ہائی وے پر یہ واحد ہوٹل ہے جسے ایک مسلمان پاکستانی چلا رہا ہے، آج اتفاق کی بات ہے کھانا تقریباً سارا ہی ختم ہو گیا ہے بس تھوڑا بہت جو کچھ تھا اس نے ہمیں دے دیا اب ظاہر ہے اس سے ہی گزارش کرنا رہا ہو گا۔“

شمرزادہ نے سگریٹ سلگاتے ہوئے اسے تمام تفصیل سے آگاہ کیا۔

”کئی بات نہیں شمرزادہ میرے لیے یہ بھی بہت زیادہ ہے۔“

ابوذر بھی تھی تھا اس صورت حال میں کھانا اس کے حلق سے اترنا ناممکن نہیں تو خاصا مشکل امر ضرور تھا، تھوڑا تھوڑا کر کے کھانا زہر مار کرنے لگی شمرزادہ پیس چلا گیا اس نے ایک بار پھر کھڑکی سے جھانکا وہ دونوں سامنے بیٹھے ہوئے جوڑے کے گالوں سے خوب لطف اندوز ہو رہے تھے فردوس خان کی فرمائش پر وہ لڑکی کوئی گانا گاتی رہی تھی جس کے بول فاصلے کے سبب نبیرہ کو سنائی نہ دے رہے تھے گانے کے اختتام پر فردوس خان نے نہ صرف تالیاں بجا کر اس کی حوصلہ افزائی کی بلکہ کچھ نقد رقم بھی جیب سے نکال کر اسے دی، تھوڑی دیر میں ہی وہ دونوں واپس آگئے شمرزادہ کے ہاتھ میں اس کے لیے ایک کٹلی کا پیچہ تھا جسے اس نے شمرزادہ کے ساتھ تمام لیا اسے واقعی اس وقت شدت سے کافی کی طلب ہو رہی تھی اب ڈرائیو تک سیٹ شمرزادہ نے سنبھال لی فردوس اپنی سیٹ کو آرام دہ حالت میں کر کے نیم دراز ہو گیا گاڑی کا سفر ایک بار پھر شروع ہوا وہ بیٹھے بیٹھے تھک سی گئی مگر پھر بھی لیٹنا نہ چاہتی تھی نیند کو اپنی آنکھوں سے بھاگنے کے لیے اس نے پرس کی زپ کھول کر اندر کپڑے میں لپٹی چھوٹی سی بیسین شریف نکال لی وہ گھر سے بلا وضو نکلی تھی اس لیے بغیر کسی قیاحت کے خاموشی سے بیسین شریف پہننے لگی تھوڑی دیر میں ہی منج کی مسجد ہی دور سے نمودار ہونے لگی شاید دن نکل رہا تھا۔

”کیا ناٹم ہوا ہے؟“ اس نے شمرزادہ کو مخاطب کیا۔

”پانچ بجتے والے ہیں بس اب ہم کچھ ہی دیر میں ترنگا لو پہنچ جائیں گے وہ تھائی لینڈ کی اشارت اور ملائیشیا کی انتظامی حد ہے یوں سمجھ لو ترنگا لومائیا اور تھائی لینڈ کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے اور یہ دونوں بھی ملکوں کا پلاز بھی ہے۔“

”اچھا۔۔۔“ وہ شمرزادہ کی بات سمجھ گئی ترنگا لومہ سرحدی مقام تھا جس کے بعد تھائی لینڈ شروع ہو جاتا ہے۔ پندرہ منٹ بعد گاڑی ترنگا لومہ کی حدود میں داخل ہو گئی فردوس خان بھی بے دار ہو گیا اپنے پاس مسجد دیوالی کی بوٹ سے اس نے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور کھلی کی ترنگا لومہ داخل ہونے کے کچھ دیر بعد ہی گاڑی رک گئی سامنے ایک ہوٹل تھا شمرزادہ اور فردوس خان کے باہر نکلتے ہی وہ بھی باہر آگئی شمرزادہ اس کا سالن نکال رہا تھا اس نے

پلٹ کر ایک نظر اس دور جاتی سڑک پر ڈالی جو ملا نکلا ہے ہوئی ہوئی ترنگا نودا داخل ہوئی تھی پیچھے دیکھتے ہی اس کا دل لرز اٹھا، وہ ملا نکلا کی سرزمین کو بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی اس کے ساتھ ہی اور بھی بہت کچھ پیچھے رہ گیا تھا جسے سوچتے ہی خوف کی ایک سرد لہر اس کے وجود کو چیر گئی ان پیچھے رہ جانے والی اذیت ناک یادوں میں حماد بھی تھا جس کے خوب صورت تصور نے اس کے دل کو کھلنے کھلنے لگا دیا۔

شمرز اس کا سامان لے کر ہوٹل میں داخل ہو گیا، فردوس خان باہر گاڑی کے پاس تھا دس بارہ گھنٹوں کے مسلسل سفر سے اس کا جسم اکڑ گیا تھا اس وقت اسے آرام کی شدید ضرورت تھی ہوٹل میں اس کا کمر ایک تھا، شمرز نے کاؤنٹر سے چابی لی اور اس کے ساتھ بیڑھیاں چڑھ کر فرسٹ فلوور پر آگیا اس کا سامان اس کے روم میں رکھا اور قریب آکر بیٹھا۔

”کاشف تمہیں اسی ہوٹل میں پہنچانے کا کہا تھا، تم تھوڑی دیر تک کچھ کھلاؤ اور فردوس بھائی کسی ضروری کام سے جا رہے ہیں ان شاء اللہ جلد ہی تم سے دوبارہ ملاقات ہوگی، سہرا لاپنا دروازہ اچھی طرح لاک کر لیتا۔“

اسے ہدایات دے کر شمرز باہر نکل گیا، نیو نے دروازہ اچھی طرح لاک کر لیا ابوزر سو رہا تھا وہ بھی اس کے ساتھ لیٹ کر سو گئی جانے وہ کتنی دیر تک سوئی جب اس کی آنکھ کھلی سامنے لگے وال کلاک میں ابھی صرف دس بجے تھے وہ اٹھ بیٹھی اس کی سمجھ میں نہ آیا فردوس خان اسے یہاں کیوں چھوڑ گیا ہے اسی کشمکش میں اس نے اپنی بیگ سے موبائل نکالا صبح ہوٹل میں داخل ہوتے ہوئے اس نے باہر کھڑے تھائی لڑکے سے ایک سم خریدی تھی جسے اس نے فوراً ”نہی اپنے موبائل میں لگا لیا اس وقت وہ ریجہ سے بات کر کے اسے تمام صورت حال بتانا چاہتی تھی اچھی دیس اور ہوٹل کی تھائی نے اسے پھر سے خوف زدہ کر دیا تھا تیسری یا چوتھی بتل پر ریجہ نے فون ریسیو کر لیا نیو کی آواز سننے ہی وہ خوشی سے چیخ پڑی۔

”کہاں ہو تم، کچھ دن سے تمہارا نمبر بند تھا جانتی ہو یہ وقت میں نے کتنی پریشانی اور دوسو سوں میں گھر کر گزارا ہے۔“ ریجہ کی سچائی اس کے لہجے سے چمک رہی تھی۔

”تم نے اپنا پہلا نمبر کیوں آف کیا ہے؟“ جواب میں نیو نے اسے ملائی سفارت خانے کی پوری کہانی سنائی۔

”دراصل جب میں افرا تفری میں وہاں سے نکلی تو مجھے شک ہوا شاید میں نے اپنا سبیل نمبر کاؤنٹر پر موجود لڑکی کو لکھوا دیا ہے بس اس خیال کے آتے ہی میں نے فوراً اپنی سم نکالی اور تو کو بھیج دیا اور پھر اپنی پریشانی میں تم سے رابطہ بھی نہ کر سکی۔“

”وہ اچھا مگر اس وقت تم کہاں ہو؟“

”ترنگا نو میں۔۔۔“ وہ بیڑے سے اٹھ کر کمرے کی واحد کھڑکی کے قریب آگئی اور ذرا سا پارہ سر کا کپڑا ہر تھاٹکا جہاں دن کی روشنی پورے عروج پر تھیں۔

”ترنگا نو؟“ ریجہ نے حیرت سے دہرایا۔

”تم ترنگا نو تک پہنچی؟“ اب وہاں کس کے ساتھ ہو؟“

”میں صبح ساڑھے پانچ بجے یہاں پہنچ گئی تھی فردوس اور شمرز کے ساتھ اور اب یہاں کے کسی ہوٹل میں بالکل تنہا ہوں وہاں لوگوں نے مجھے چھوڑ کر جانے کہاں چلے گئے ہیں۔“

”بے وقوف لڑکی تم نے ان سے پوچھا نہیں وہ تمہیں یہاں کیوں چھوڑ کر جا رہے ہیں نیو کہیں ایسا تو نہیں وہ تمہیں یہاں پہنچ گئے ہوں؟“

اس کا لہجہ خدشوں سے پر تھا نیو اس کی بات سن کر خوف سے لرز اٹھی مگر ریجہ کا کامدار دست ہوا تو۔۔۔

”پھر اب بتاؤ میں کیا کروں؟“ وہ بے بسی کے آخری صدموں پر تھی۔

”کسی طرح یہاں سے نکل جاؤ۔“ ریجہ نے اپنی سمجھ کے مطابق مشورہ دیا۔

”کیا کروں گی یہاں سے نکل کر کہاں جاؤں گی میرا تو پاسپورٹ بھی فردوس بھائی کے پاس ہے اب اگر میرے نصیب میں رہنا ہی لکھا ہے تو میں کیسے اپنا نصیب بدل سکتی ہوں سہرا لاپنا جو بھی ہو اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار مجھے اسی کمرے میں رک کر ہی کرنا ہے کیونکہ میرے آگے بھی خندق ہے اور پیچھے بھی اس لیے بہتر یہ ہے کہ جہاں ہوں وہیں رک کر دیکھوں ہو سکتا ہے کچھ بہتری ہی ہو جائے۔“

ریجہ سے چند ایک باتوں کے بعد اس نے فون بند کر دیا، تقریباً ”دن کے گیارہ بجے اس کے کمرے میں موجود فون پر بیل ہوئی نمون اٹھا تھی دوسری طرف شمرز خان کی آواز سن کر اس کے تن مروہ میں جان پڑ گئی۔

”تم خیریت سے تو ہونا؟“ اس کے حلق سے نکلی مری مری سی آواز نے شمرز کو اس کی خیریت دریافت کرنے پر مجبور کر دیا۔

”جی بالکل خیریت سے ہی ہوں۔“

”وہ کہ اب ایسا ہے کچھ دیر تک کاشف تمہارے پاس پہنچ جائے گا، تمہیں وہاں سے اس کے ساتھ ہی نکلنا ہے اپنے روم کی بے منت اور چابیاں کاؤنٹر پر دے دینا نکلتے سے کل روم نمون سے ناشتا منگوا کر کرلو ساتھ ہی انہیں حلال کی تاکید ضرور کرنا۔“ اس نے شمرز خان کی تمام ہدایات دھیان سے سنیں۔

”اگر اپنی سم فون میں نکالی ہو تو اس کا نمبر میرے نمبر پر سینڈ کر دو۔“ اس ہدایت کے ساتھ ہی شمرز نے اسے اپنا نمبر لکھوا دیا۔

”آپ فردوس بھائی سے کہہ دیں کہ وہ میرا نمبر لیا تو بھی دے دیں۔“

اسے یاد آیا آج کئی دنوں سے اس نے اشتیاق صاحب سے رابطہ نہیں کیا تھا وہ یقیناً ”پریشان ہوں گے۔“

”ٹھیک ہے میں کہہ دوں گا تم ناشتا کر کے اپنا تمام سامان بیگ کر لو۔“

سامان تو بیگ ہی تھا، اس نے روم نمون سے اپنے لیے بلیک کافی منگوائی اس کے ہینڈ بیگ میں کچھ کوکیز اور سینڈویچ رکھے تھے جو اس کے اور ابوزر کے لیے کافی تھے، شمرز کے فون بند کرنے کے تھوڑی دیر بعد ہی اس کے کمرے کا دروازہ کسی نے بجایا اس نے کی ہول سے دیکھا باہر ایک لمبا سا مرد کھڑا تھا جو اپنے حلیے سے ہی پاکستانی دکھائی دے رہا تھا نیو نے دروازہ کھول دیا ”بیوہ اشتیاق“ اس کے دروازہ کھولنے ہی سامنے کھڑے مرد نے پوچھا۔

”جی اور آپ؟“

”میرا نام کاشف ہے مجھے فردوس خان نے تمہارے پاس بھیجا ہے، فردوس کی طرح تم مجھے بھی بھائی کہہ سکتی ہو۔“ اس کے ساتھ ہی آگے بڑھ کر اس نے نیو کا اپنی تمام لیا اور بیگ کندھے پر ڈال لیا، نیو ابوزر کی انگلی تھامے اپنا ہینڈ بیگ لیے اس کے پیچھے پیچھے بیڑھیاں اتر کر کاؤنٹر پر آگئی، جہاں پہنچ کر اس نے روم چھوڑنے کی اطلاع کے ساتھ ساتھ حساب کتاب کر کے اس کمرے کے ایک دن کا رايہ ان کے حوالے کیا اور کاشف کے ساتھ ہی ہوٹل سے باہر آگئی۔

باہر نکلتے ہی کاشف نے ایک ٹیکسی لی جس میں بیٹھ کر وہ اس کے ساتھ ایک مارکیٹ آگئی راستہ بھر کاشف نے کوئی بات نہ کی مارکیٹ کے سامنے پہنچ کر اس نے ٹیکسی چھوڑ دی نیو کا سامان اٹھا کر وہ مارکیٹ میں داخل ہو گیا نیو بھی خاموشی سے اس کی تقلید میں چلتی ہوئی اندر داخل ہو گئی، سامنے ہی ایک ایشیائی کی دوکان تھی جہاں سے اس نے ایک پیڑ اور کالی سیاہی خریدی نیو خاموشی سے اسے یہ سب کاروائی کرتا دیکھ رہی تھی اپنا مطلوبہ سامان خرید کر کاشف مارکیٹ سے باہر آگیا وہ ابھی بھی مکمل طور پر خاموش تھا وہ پیدل ہی فٹ پاتھ پر اس کے آگے چلتا

یہاں کچھ دیر بعد وہ ایک بڑے اور بارونق بازار پہنچ گئے جہاں اس کے کسی رشتہ دار کی الیکٹرونکس کی دکان تھی ”جلال الیکٹرونکس“ نام دیکھ کر ہی نبیو اندازہ لگا چکی تھی اس کا مالک نہ صرف مسلمان بلکہ پاکستانی بھی ہے۔ ”تم یہاں بیٹھو۔“ اندر داخل ہوتے ہی کاشف نے سامنے رکھی کرسیوں کی سمت اشارہ کیا اس سارے سفر میں یہ پہلا جملہ تھا جو کاشف کے ہونٹوں سے ادا ہوا نبیو دینا کوئی جواب دے ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

کاؤنٹر پر کھڑا ڈھمی والا شخص بھی ان کے قریب آگیا ”وہ ہی غالباً“ کاشف کا رشتہ دار تھا کاشف نے اس سے کوئی بات کی اس نے کاشف کو ایک چھوٹا سا کالے رنگ کا چرمی بیگ تھما دیا جس کے اندر کچھ اسٹیمپ تھیں کاشف نے اپنی جیب سے ایک پیڑ نکالا ”سامنے رکھے“ پھر اسٹیمپ لگا کر کچھ چیک کیا پھر آپس میں کوئی بات کی اور اگلے ہی بل کاشف نے اپنی قبض کی جیب سے نبیو کا پاسپورٹ نکالا اس کے ساتھ ہی ایک اسٹیمپ بھی نکالی ”اسٹیمپ ہاتھ میں لے کر بسم اللہ الرحمن الرحیم پاؤز لیند پڑھا اسٹیمپ پر انگ لگائی اور اسے پاسپورٹ پر لگا دیا نبیو یہ تمام کاروائی بڑی حیرت سے دیکھ رہی تھی اسے سمجھ نہیں آیا کہ کاشف کیا کر رہا ہے۔ اسٹیمپ لگا کر اس نے ہاں سائن بھی کر دیے ”سامن کرنے سے پہلے اس نے دو تین بار سامنے رکھے پھر پرانے سائن کو چیک کر کے بھی دیکھا۔“

”یہ تو تمہارا دیرالگ کیا ہے“ تمہارے ساتھ ہی تمہارے بیٹے کا دیر ابھی ہے اسے الگ سے پاسپورٹ کی ضرورت نہیں ہے۔“

ابنی تمام کاروائی سے فارغ ہو کر اس نے نبیو کی جانب اس کا پاسپورٹ بڑھایا جسے اس نے بے یقینی کی کیفیت میں تمام لیا۔

”حیران مت ہو یہ کام میں کوئی پہلی بار نہیں کر رہا تم سے پہلے بھی جانے کتنے لوگوں کو میں یہاں سے اسی طرح نکال چکا ہوں انشاء اللہ تم بھی ضرور نکل جاؤ گی ویسے مجھے حیرت ہوتی ہے ان پاکستانی والدین پر جو بتا سوچے کچھ اپنی ہیرے جیسی بیٹیوں کو بے غیرت مردوں کے حوالے کر دیتے ہیں ایسے مرد جنہیں عورت کے عزت و احترام کا بھی ہمتا نہیں ہوتا“ میرا بس چلے تو میں سکندر جیسے تمام مردوں کو سول پر لٹکاؤں جو تم جیسی جوان عورتوں کو دنیا کی اس بھڑ میں برباد ہونے کے لیے تیار چھوڑ دیتے ہیں اور آفرین ہے تم جیسی عورتوں پر جو دنیا کی اس گندگی میں خود کو بچا کر چلتی ہیں۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے سکندر کو دو تین گالیاں بھی دیں کاشف کے خراج تحسین نے اسے ایک عجیب سا غور بخش دیا اس کا سر خمر سے بلند ہو گیا یقیناً ”عورت کی عظمت کو محسوس کرنے والے مرد ابھی اس دنیا میں موجود ہیں۔“

”چلو اب تم اندر جا کر ہاتھ منہ دھو لو میں نے کھانا منگوایا ہے آجانے پر کھا کر نکلتے ہیں۔“ کاشف کی بات ختم ہوتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی ہاتھ دھو کر کھانا منگوا کر کھانے پر کھانا موجود تھا کھانے میں ”ٹاسی آٹم“ دیکھ کر اس کی ہموک چمک اٹھی ٹاسی آٹم کھانا انشیا کی دوا حدوش تھی جو نبیو کو بے حد پسند تھی چکن کی مٹنی میں بنے ہوئے چاول ساتھ ہی خرائی کیا ہوا چکن اور نہایت مزے کی کھٹی میٹھی چٹنی ”کج کج دین بعد نبیو نے خوب ڈٹ کر کھانا کھایا کھانے کے بعد کاشف نے چائے منگوایا جسے نبیو کو کافی اچھا لگا۔

”مذہب ہمیں تھائی لینڈ انٹری پوسٹ جانا ہے یہاں تمہارا پاسپورٹ جمع ہو گا وہاں بالکل بھی گھبرانا نہیں ان کے ہر سوال کا جواب احمق سے دینا۔ چائے پینے کے دوران اس نے نبیو کو سمجھایا چائے پی کر وہ اٹھ کھڑا ہوا نبیو کا سامان اٹھا کر دکان سے باہر نکل گیا نبیو بھی اس کے ساتھ چلتی ہوئی باہر میں روڈ پر آگئی جہاں سے ایک ٹیکسی کے ذریعہ تھائی انٹری پوسٹ پہنچ گئے۔

انٹری پوسٹ تھائی لینڈ کے ہڈ پر تھی نبیو کاشف کے ساتھ وہاں پہنچی تو دل ہی دل میں گھبرائی ہوئی تھی وہاں

کافی لوگ کاشف کو جانتے تھے وہ سب ہی سے ملائی میں خیریت دریافت کرتا ایک ٹیکس کی جانب بڑھ گیا وہاں موجود تھائی آفیسر کے حوالے نبیو کا پاسپورٹ کیا اور خود کرسی پہنچ کر تھوڑا دیر بیٹھ گیا۔

”تمہاری یہاں کچھ تصویریں وغیرہ نہیں کی گھبرانا مت۔“ کاشف کی ہدایت سن کر اس نے صرف اثبات میں سر ہلایا اور آہستہ آہستہ چلتی اس کاؤنٹر پر چلی گئی جہاں اس کا پاسپورٹ جمع ہوا تھا۔

”تمہاری تصویر بننے کی اپنے بیٹے کو لے کر سامنے کمپیوٹر کے پاس چلی جاؤ۔“ کاشف نے اسے پیچھے سے پکارا وہ فوراً ”ہی سامنے موجود ٹیکس کی جانب بڑھ گئی جہاں کمپیوٹر کے ساتھ ایک چھوٹا سا کمپیوٹر موجود تھا۔ وہ کمرے کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئی، کمپیوٹر آپریٹر نے اس کی مختلف زاویوں سے تصاویر لیں، پھر اس کرسی پر اوپر کو بٹھایا گیا اور یہی عمل اس کے ساتھ بھی دہرایا گیا اس عمل کے مکمل ہونے کے بعد وہ واپس اس کاؤنٹر پر آگئی جہاں اس کا پاسپورٹ جمع ہوا تھا۔

”تمہارا نام؟“ ٹیکس کے دوسری طرف موجود مرد نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

”یہ ملائی نہیں جانتی۔“ اس سے قبل کہ وہ جواب دیتی اسے اپنے عقب سے کاشف کی آواز سنائی دی نبیو نے اپنی رکی ہوئی سانس کو بحال کیا کاشف کی بروقت مداخلت نے اسے مزید سوالوں سے بچایا ایک بار اگر وہ اس آفیسر سے ملائی میں بات کر لیتی تو یقیناً ”اس کی تفتیش کا دائرہ کار وسیع ہو جاتا اس کے بعد اس آفیسر نے مزید کچھ سوالات کیے جن کا جواب کاشف نے ہی دیا وہ بالکل اس طرح خاموش کھڑی تھی جیسے اس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آ رہا ہو کچھ دیر بعد کاشف سے ہونے والی گفتگو کے بعد اس آفیسر نے ایک سب پر کچھ لکھ کر اسے کاشف کے حوالے کر دیا کاشف کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا، آفیسر کے ہاتھ سے سب لے کر کوئی بات کی اور پھر نبیو کو لیتا ہوا ہر کی جانب بڑھ گیا وہ نبیو کا زبانی بیگ گھسیٹا ہوا دائیں جانب مڑ گیا، نبیو بھی خاموشی سے اس کی تقلید میں چلتی گئی، کچھ ہی فاصلے پر ٹیکسی اسٹینڈ تھا جہاں سے اس نے ٹیکسی لی اور نبیو کے ساتھ پچھلی سیٹ پر ہی بیٹھ گیا، نبیو نے دیکھا وہ جب بھی کسی ٹیکسی والے یا مقامی فرد سے گفتگو کرتا تھا تو زبان میں ہی کرنا جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ یہاں کا پرانا رہائشی ہے، ٹیکسی کے چلتے ہی اس نے نبیو کو مخاطب کیا۔

”ہم یہاں سے پانی کے راستے کو لو جائیں گے کہ تھائی لینڈ کا پہلا گاؤں ہے جہاں پچھلے چند سالوں سے میں اپنی فیملی کے ساتھ رہتا ہوں گولو داخل ہوتے ہی تمہارا واسطہ ملائیشیا سے ختم ہو جائے گا۔“ اس کی رہائش کے متعلق لگایا گیا نبیو کا انداز درست نکلا۔

”اور وہاں ان شاء اللہ کل شام تک تمہارا پاسپورٹ تصدیق ہو کر پہنچ جائے گا پھر میں تمہیں بتاؤں گا اگلا قدم کیا ہو گا۔“ اس کی بات سن کر نبیو نے اثبات میں سر ہلایا کچھ ہی دیر کے سفر کے بعد ٹیکسی رک گئی کاشف نے طے شدہ کرایہ منگھٹ کی صورت میں ادا کیا یہ ایک ساحلی علاقہ تھا جہاں کافی تعداد میں کشتیاں موجود تھیں یہاں کے ساحلی علاقے پاکستان کے مقابلے میں کافی صاف ستھرے تھے کاشف نے تھوڑے فاصلے پر کھڑے ایک شخص سے کچھ گفتگو کی اور پھر نبیو کی طرف پلٹ آیا۔

”یہ ایک چھوٹا سا دریا ہے جس کے دوسری طرف گولونامی گاؤں آباد ہے جہاں سے تھائی لینڈ شروع ہوتا ہے ہم کشتی کے ذریعے پانچ منٹ میں ہی وہاں پہنچ جائیں گے ویسے تو یہ سفر خشکی سے بھی ہو سکتا ہے مگر اس میں نام بھی زیادہ لگتا اور ہو سکتا ہے وہ تمہارے لیے کچھ مشکل بھی ہو جائے کیونکہ خشکی کے راستے کئی مقامات پر چیک پوسٹ موجود ہیں گولو رہائش کے حساب سے بھی تمہارے لیے کافی محفوظ جگہ ہے۔“

”جی اچھا۔“ نبیو نے آہستہ آواز میں اس کی ساری باتوں کا جواب دے دیا۔

کوئی اور وقت ہوتا تو فوراً کشتی کے سفر سے منع کر دیتی کیونکہ اسے ہمیشہ سے ہی پانی سے ایک انجانا سا خوف محسوس ہوتا تھا یہ ہی وجہ تھی جو وہ کبھی بھی ہاکس یا سی ویو کے پانی میں داخل نہ ہونے لگی تھی اسے اچھی طرح یاد تھا کہ کبھی منوہ بھی نہ گئی تھی کیونکہ وہاں جانے کے لیے اسے بوٹ میں سفر کرنا پڑا جو وہ کسی صورت بھی نہ کر سکتی تھی اور آج وقت کے ہاتھوں تھائی لینڈ جیسے ملک کی انجان سرزمین کے ایک دوریاں میں موجود کشتی میں سفر کر رہی تھی بہر حال اس پانی میں اور اس میں کافی فرق تھا وہ تاحد نگاہ تک پھیلا تھا جس بار تاسنندر جو اپنے اندر جانے کتنے بڑے بڑے دیو پیکل جمانوں کو نکل چکا تھا جبکہ یہ ایک چھوٹا سا پرسکون دوریا جس کے چاروں سمت ہریالی ہی ہریالی تھی تقریباً "پانچ منٹ بعد ہی کشتی رک گئی گولو آگیا کشتی میں موجود لڑکے نے اس کا سامان ساحل تک پہنچا دیا چند سیکنڈ بعد ہی ایک ٹرالی برادر اس کے قریب آ کر کاشف نے اس سے کچھ بات کی اس نے نیبو کا سامان ٹرالی پر رکھا۔

"تم اس کے ساتھ جاؤ میں کچھ کام ختم کر کے تھوڑی دیر تک آتا ہوں۔"

کاشف کی ہدایت کے مطابق وہ چپ چاپ ٹرالی میں سوار ہو گئی آہستہ آہستہ چلتی وہ ٹرالی باہر روڈ پر آگئی نیبو نے چاروں سمت نگاہ دوڑائی یہ گاؤں اس کے تصور سے خاصا مختلف تھا مسرک کے دونوں اطراف موجود بے تحاشا چھوٹی بڑی دکانیں، مسرک پر چلتے پھرتے لوگوں کا رش یہ پاکستان کے کسی چھوٹے سے شہر کا نقشہ پیش کر رہا تھا وہ نہایت دلچسپی سے یہ سب کچھ دیکھتی ایک بل کو بھول ہی گئی کہ وہ کن حالات میں یہ سفر کر رہی ہے اس سفر نے اس کے ذہن میں پاکستانی رکشا کی یاد کو بھی تازہ کر دیا فرق صرف اتنا تھا ٹرالی ہانسی شور کے چل رہی تھی۔ کچھ ہی دیر بعد ٹرالی کا سفر ختم ہو گیا۔ ٹرالی چلائے والے شخص نے اس کا سامان اٹھا کر سامنے موجود گھر کی سب سے نیچے والی میز پر رکھ دیا۔

"یہ میرا گھر ہے اور اب آپ اس میز پر بیٹھ جاؤ کاشف بھائی اپنے گھر گیا ہے کچھ ہی دیر میں آکر آپ کو لے جائے گا۔" تھائی شخص نے کوئی پھولی ملائی میں اپنا دعا سے سمجھا دیا وہ اثبات میں سر ہلاتی میز پر بیٹھ گئی اپنی بوریت کو دور کرنے کے لیے اس نے سیل نکال لیا دو مس کالز تھیں جہاں پاکستان سے آئی تھیں یقیناً "فردوس خان نے احتشام صاحب تک اس کا نمبر پہنچا دیا تھا مگر اس وقت ان حالات میں وہ فی الحال احتشام صاحب سے کوئی بات نہ کرنا چاہتی تھی اس نے رسیجہ کو اپنے تھائی لینڈ خیریت سے پہنچ جانے کی اطلاع دی جس کے فوراً بعد ہی رسیجہ کا فون آگیا وہ اس کے حوالے سے کافی پریشان تھی ابھی وہ بات ہی کر رہی تھی کہ کاشف گاڑی لے کر پہنچ گیا اسے دیکھتے ہی وہ میز چھوٹے سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اچھا اللہ حافظ اب میں کسی محفوظ مقام پر پہنچ کر تم سے رابطہ کروں گی۔" اس نے جلدی جلدی خدا حافظ کر کے فون بند کر دیا کاشف نے نیچے اتر کر اس کا سامان گاڑی میں رکھا اور پھر اس کے اندر بیٹھتے ہی گاڑی اشارت کر دی، تقریباً "دس منٹ کے سفر کے بعد گاڑی ایک ہوٹل کی پارکنگ میں داخل ہو گئی "ہوٹل سبجنگ" کا پورا سا سائن بورڈ دور سے ہی نظر آ رہا تھا یہ سات منزلہ ہوٹل ایک گاؤں کے لحاظ سے کافی بہترین تھا اس کی شاندار عمارت نے ہی نیبو کو متاثر کر دیا کاشف داخلی دروازے کے قریب اسے اتر کر گاڑی پارک کر آیا اور اس کے قریب آکر بولا۔

"ہلو آؤ۔۔۔" وہ اس کی تقلید میں اندر داخل ہو گئی جہاں کاؤنٹر پر کاشف نے اس کے لیے کرایا کر دیا پھر کمرے کی چابی اور ریڈیویشن کارڈ لے کر اس کی جانب بڑھایا۔

"یہ رکھ لو مگر اوپر جانے سے پہلے بہتر ہے کہ تم کچھ کھا لو۔" وہ کاشف کے ساتھ ہی ہوٹل کے کیفے ٹیریا آگئی جہاں تھائی ویٹرس موجود تھیں کاشف کے دیے گئے آؤر کے مطابق کچھ ہی دیر میں یہم ہرگ اور کولڈ ڈرنک آگئی۔

"یہ ہرگ بالکل حلال ہے اس لیے تم اطمینان سے کھا سکتی ہو۔"

وہ جان چکی تھی کہ یہ لوگ کچھ بھی کھانے سے قبل یہ یقین ضرور کر لیتے تھے کہ وہ حلال ہو، اسی بنا پر بغیر کسی قیاحت کے اس نے اپنا ہرگ ختم کیا، ابوزر کو فریج فراز اور سینڈویچ کھلایا قاریغ ہو کر وہ ساتویں منزل پر موجود اپنے کمرے میں آگئی اسے کاشف ہی کی زبانی پتا چلا "ہوٹل سبجنگ" یہاں کا سب سے بڑا اور سیون اشار ہوٹل ہے۔

"یہاں مسلمان رکھ کر میرے ساتھ آؤ۔" کاشف دروازے کے باہر ہی رک گیا نیبو نے جلدی جلدی اپنا سامان کمرے میں رکھ کر صرف ہینڈ بیگ ساتھ لیا اور لاک لگا کر کاشف کے ساتھ ایک دوسرے روم میں آگئی جس کا دروازہ بند تھا کاشف کے بجائے ہی دروازہ کھول کر شمرز باہر نکل آیا شمرز کو اپنے سامنے دیکھ کر اسے ایک خوشگوار سی حیرت ہوئی۔

"اندر آ جاؤ فردوس بھائی تمہارا ہی انتظار کر رہے ہیں۔"

اس نے جھجکتے ہوئے اندر قدم رکھا سامنے بیڈ پر فردوس خان جو لیٹا ہوا تھا اسے دیکھتے ہی فوراً "سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور وہیں سے نکارا۔

"آؤ آؤ بہن یہاں آ کر بیٹھو۔" فردوس خان نے سامنے رکھی کرسی کی سمت اشارہ کیا اسے فردوس خان نے آج پہلی بار بہن نکارا تھا دروازہ ہمیشہ اس کا نام لیتا تھا "نیبو خاموشی سے اس کرسی پر جا بیٹھی کاشف اور شمرز آپس میں کوئی بات کر رہے تھے۔

"تمہیں یہاں تک کے سفر میں کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی۔"

فردوس خان نے نیبو سے دریافت کیا جس کا جواب اس نے صرف نفی میں گردن ہلا کر دیا، وہ ویسے بھی اس وقت ذہنی اور جسمانی دونوں لحاظ سے بری طرح تھک چکی تھی جس کا اندازہ شاید فردوس خان کو بھی ہو گیا۔ "ایسا کرو تم ابھی اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔" اس نے اپنی رست واپس پر ایک نظر ڈالتے ہوئے نیبو کو ہدایت کی۔

"کل تک تمہارا پاسپورٹ تصدیق کے بعد مل جائے گا پھر آگے جو کچھ کرنا ہو گا وہ سب تمہیں کاشف اچھی طرح سمجھا دیے گا فی الحال ابھی تم بے فکر ہو کر سو جاؤ اپنے دروازے کی اندر سے اچھی طرح کنڈی اور لاک لگا لیتا تم نے شاید کبھی سنا ہو تھا لیڈ آگلی عورت کے لحاظ سے ایک بدنام ترین ملک ہے، یہاں قیام کے دوران تمہیں ہر حال میں اپنی حفاظت خود کرنی ہے۔ رات کے کسی پہر اگر ہم میں سے بھی کوئی تمہارا دروازہ بجائے تو براہ مہربانی لاک مت کھولنا اب تم جاؤ ان شاء اللہ تم سے کل ملاقات ہوگی اور ہاں تمہارا رات کا کھانا بھی روم میں ہی آئے گا باہر مت نکلتا۔"

اس کے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہی فردوس خان نے اسے مزید سمجھایا وہ کمرے سے نکل کر باہر کارڈیڈ روم آگئی رات کا مگسا سا اندھیرا چمیل چکا تھا پورے کارڈیڈ روم کی لائٹس جل چکی تھیں کارڈیڈ روم چلتی پھرتی ویٹرس کا حلیہ شام سے قطعی مختلف اور نہایت شرمناک تھا وہ دل ہی دل میں لاحول پڑھتی روم نمبر 710 کے سامنے آگئی لاک میں چابی لگا کر دروازہ کھولا اور اندر داخل ہو کر اپنے پیچھے دروازے کو اچھی طرح بند کر لیا ابھی صرف آٹھ بجے تھے پوری رات باقی تھی جو اسے اس ہوٹل کے کمرے میں تنہا ہی بسر کرنی تھی، وقت گزارنے کے لیے اس نے ٹی وی لگا لیا جہاں صرف ملائی اور تھائی چینل ہی آرہے تھے پھر وہ ایک کوئنگس روگرا م دیکھتی رہی پھر جلد ہی پورہ ہو گئی، باہر کا دروازہ بجایا جا رہا تھا سامنے لگی وال کلاک رات کے دس بج رہی تھی اس نے فوراً کاشف کو فون کیا جس نے تیسری ہی بل پر فون اٹھا لیا۔

”میرے کمرے کے باہر کوئی ہے جو مسلسل دروازہ بجا رہا ہے۔“
اس کی آوازیں موجود تشویش کاشف نے فوراً محسوس کر لی۔

”گھبراؤ مت میں نے کھانا بھجوا دیا ہے لے کر دروازہ پھر سے لاک کر لو کافی بھی ساتھ ہی ہے اور تمہارے بیٹے کا کھانا علیحدہ سے ہے۔“

”شکریہ کاشف بھائی۔“ تفکر سے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں، دروازہ کھول کر اس نے باہر موجود بیڑے ٹرائی لے کر کمرے کے اندر کر لی، ابوزر کو کھانا کھلا کر سلا دیا جب کہ اس کا فی الحال کچھ کھانے کا دل نہیں چاہ رہا تھا صرف کافی پی کر اپنے بستر پر جا بیٹھی وہ اپنے بیڈ پر چت لٹی چھت کی جانب تنک رہی تھی گزرے ہوئے ماضی کا ایک ایک پل اس کی آنکھوں کی اسکرین کے سامنے چل رہا تھا آنسو پانی کی طرح اس کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے، ان حالات میں صرف ایک امید ہی تھی جس کا دامن اس نے شروع سے ہی تھام رکھا تھا ابھی بھی امید ہی کا جنون تھا جو اسے زندہ رکھے ہوئے تھا ورنہ تو شاید ان حالات میں کب کی مرگئی ہوتی ان ہی خیالات میں جا لے اسے کب خیر آگئی۔

ایک دم ہی باہر ہونے والے عجیب و غریب شور سے گھبرا کر اس کی آنکھ کھل گئی باہر سے آنے والی آوازیں پر دھیان دیتے ہی دروازہ پینے کی آواز اس کے کان میں آئی وہ جلدی سے کمرے کے دروازے کے قریب آئی کی ہول سے باہر جھانکا پورے کارڈیڈ میں نہایت شرمناک حلیہ میں وہی تھائی لڑکیاں موجود تھیں جو شام کے وقت ہوٹل میں ویٹرس کے فرائض سرانجام دے رہی تھیں، میک اپ سے ان کے چہرے دمک رہے تھے وہ ہر کمرے کا دروازہ بجا بجا کر چر رہی تھیں۔

”پو پھراؤ۔ پو پھراؤ۔“ (ٹکی چاہیے، ٹکی چاہیے۔)

رات کے سائے میں ان کی یہ آواز کسی چیل کی آواز سے مشابہ محسوس ہو رہی تھی انہوں نے نیو کا دروازہ بجا کر بھی آواز لگائی ان کی ہنسی کی آواز نیو کو اپنے اعصاب پر ہتھوڑے برساتی محسوس ہوئی، عورت کی اس قدر تذلیل نے اس کے رونگٹے کھڑے کر دیے اس کی بڑھتی بڑھتی سرور اتر گئی جب تک باہر یہ شور سنانا دیتا رہا وہ اپنی جگہ کھڑی لرزتی رہی شور ختم ہوتے ہی اس نے وقت دیکھا رات کے دو بج چکے تھے دروازہ اچھی طرح بند کرنے کی فردوس خاں کی ہدایت اسے اب سمجھ میں آئی وہ خاموشی سے کھانے کی ٹرائی کی جانب آگئی سب کچھ ٹھنڈا ہو چکا تھا اس نے چپ چاپ ٹھنڈا کھانا کھا کر اللہ کا شکر ادا کیا جس کی بدولت وہ اب تک صبح سلامت تھی اگر اس کا ساتھ نہ ہوتا تو جانے ان حالات میں وہ کہاں ہوتی؟

اگلے دن صبح ہی اس کا پاسپورٹ مل گیا جس کی اطلاع اسے کاشف نے فون کے ذریعے دی اور ساتھ ہی جلد از جلد تیار ہونے کی تاکید بھی کی۔

”اب کہاں جانا ہے؟“ وہ جانتا جاہتی تھی اگلا مرحلہ کیا ہے۔

”تھائی ایمبیسی۔“ کاشف کے مختصر جواب دے کر فون بند کر دیا، ہمیں مٹا بعد جب وہ اس کے کمرے میں آیا وہ جانے کے لیے بالکل تیار تھی۔

”دیکھو یہاں معاملہ ذرا مختلف ہے کیوں کہ یہاں میری جان پہچان بالکل نہیں ہے اور نہ ہی اس جگہ کوئی تعلقات کام آتے ہیں بلکہ اب جو کچھ کرتا ہے تمہیں خود اپنی ذہانت سے کرنا ہے جس اتنا ہے وہاں بالکل بھی گھبراتا نہیں تاکہ کسی کو تم پر شک نہ ہو، اندر بھی تم اکیلے ہی جاؤ گی میں باہر رہ کر تمہارا انتظار کروں گا یاد رکھنا وہاں تم نے کسی بھی جگہ میرا نام نہیں لینا ورنہ معاملہ بگڑ بھی سکتا ہے۔“

کاشف کی طرف سے ملنے والی ہدایات نے اسے ڈرا دیا وہ تھوڑی سی خوف زدہ ہو گئی پھر بھی یہ سب تو اسے فیس

کرتا ہی تھا پورا ہاتھی نکل چکا تھا اب صرف دم باقی تھی اور وہ بھی نہایت ہی خطرناک قسم کی جس کا اندازہ نیو نے کاشف کی گفتگو سے لگا لیا۔ کاشف نے اسے تھائی ایمبیسی سے کچھ فاصلے پر اتار دیا۔

”جب تم باہر آؤ گے تمہیں ہمیں ملوں گا مگر اندر جو کچھ ہوا ہے تم نے خود ہی حل کرنا ہے میں تمہارے لیے دعا ضرور کروں گا تاکہ تمہیں کوئی پریشانی نہ ہو۔“ نیو دل ہی دل میں آہستہ آہستہ کرسی کا ورد کرتی ہوئی اندر داخل ہو گئی ریپشن سے معلومات حاصل کر کے وہ ایک کاؤنٹر کی جانب آگئی، یہاں تھائی کے ساتھ ملائی زبان بھی بولی جاتی تھی جس کی بدولت نیو کو خاصی آسانی ہو گئی۔

”مجھے اپنے ویزے کی تصدیق کروانی ہے۔“

نیو نے پاسپورٹ کاؤنٹر پر موجود شخص کی جانب بڑھا دیا جس نے چپ چاپ اسے تمام کر کھول کر اندر سے دیکھا، نیو کا دل دھک دھک کرنے لگا اس شخص نے کی بورڈ پر اپنی انگلیاں چلاتے ہوئے نیو کی جانب جتنی دفعہ دیکھا اس کا خون خشک ہو گیا آہستہ آہستہ کرسی کا ورد وہ مسلسل کر رہی تھی اس شخص نے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتی رہ کر دیں۔

”تمہارا نام۔“ اب وہ مکمل طور پر اس کی جانب متوجہ تھا۔

”والد کا نام۔“ پہلے کا جواب ملنے ہی اس نے اگلا سوال کیا اور پھر گاتار کیے جانے والے کئی سوالوں سے اس نے نیو کا مکمل بائوڈیٹا معلوم کر لیا اس سارے عمل کے دوران اس شخص کا لہجہ خاصا کر سخت تھا اس کے علاوہ وہ مسلسل نیو کو دیکھتا توڑنگا ہوں سے گھور رہا تھا جس کے سبب نیو کی پتیلیاں سینے سے بھیگ گئیں تقریباً پندرہ منٹ اس نے نیو سے سوال و جواب کے پھر اپنے سامنے رکھی تیل بجائی، اگلے ہی سینکڑوں ہاں ایک باوردی تھائی لیڈی آگئی نیو کی سانس سینے میں رکنے لگی، وہ مسلسل قرآنی آیات کا ورد کر رہی تھی سامنے موجود شخص نے اس لیڈی سے کوئی بات کی جسے سن کر وہ نیو کی جانب ہٹ گئی۔

”او میرے ساتھ تمہاری فوٹو بننے کی۔“ نیو کا کار کا ہوا سانس بحال ہو گیا، تقریباً آدھ گھنٹہ وہ اس کمپیوٹر سیکشن میں رہی جہاں اس کی مختلف تصاویر بنائی گئیں اس کے بعد بالکل ویسا ہی عمل ابوزر کے ساتھ بھی دہرایا گیا، یہاں کسی نے اس سے کوئی بات نہ کی وہ فارغ ہو کر باہر انتظار گاہ میں آگئی اس کا دل مسلسل دھک دھک کر رہا تھا اب وہ آیت کریمہ کا ورد کر رہی تھی اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہاں موجود ہر شخص اسے گھور رہا ہے۔

کچھ دیر بعد آپٹیکر پر اس کا نام کال ہوا وہ لڑکھڑاتے قدموں سے کاؤنٹر کی جانب بڑھی اس کی وہاں آدراہش کے متعلق چند سوالات کرنے کے بعد سامنے موجود شخص نے پاسپورٹ کسی مشین میں ڈال دیا شاید وہ اسپیڈر تھا۔

اسے محسوس ہوا اب وہ ضرور پھنس جائے گی جعلی سرور سائن کی کمائی کھانے والی ہے، ہر گزرتے لمحہ میں اس کا دل دھڑک دھڑک کر سینے سے باہر آنے کو تیار تھا پاسپورٹ باہر نکل آیا سامنے موجود شخص نے شاید اس پر کوئی مہر لگائی نیو کو بتانا چلا اس لیے کہ وہ اس وقت اپنے حواسوں میں بھی نہ تھی۔

”یہ آپ کا پاسپورٹ۔“ پاسپورٹ اس کے سامنے کاؤنٹر پر رکھا تھا اسے یقین ہی نہ آیا اپنی لرزتی انگلیوں سے اس نے جلدی سے اسے تمام کر اپنے پنڈیگ میں ڈالا اور تیز تیز چلتی باہر نکل آئی، تھوڑے ہی فاصلے پر روڈ کے دوسری طرف کاشف کی گاڑی موجود تھی وہ تیزی سے سڑک کر اس کرئی اس تک پہنچ گئی دروازہ کھول کر اندر بیٹھتے ہی کاشف نے گاڑی اشارت کر دی، نیو کی بیخیریت باہر واپسی اس بات کی غمازی تھی کہ وہ کامیاب لوٹی ہے بصورت دیگر اسے اندر ہی دھر لیا جانا اس لیے اس حوالے سے کوئی بھی سوال کرنا بے کار تھا کاشف نے ایک دو ضروری سوالات کیے اور پھر خاموشی سے ڈرائیو کرتا ہو نکل گیا۔

”تم اوپر جاؤ میں تمہارے ٹکٹ کا پتا کر کے آتا ہوں پھر تم بے شک اپنے گھر والوں کو اپنی واپسی کی اطلاع دے

سکتی ہو۔“

کاشف کے ان الفاظ نے نبیو کو ایک بار پھر سے زندہ کر دیا، شام کے چار بج چکے تھے اس نے دھڑ سے کچھ نہ کھایا تھا، کاشف کے وہاں سے جاتے ہی وہ ہوٹل میں داخل ہونے کے بجائے روڈ کراس کر کے بازار کی طرف آ گئی جہاں تقریباً ”سب دکان دار ہی ملائی تھے اس لیے اسے کوئی دشواری نہ ہوئی سب سے پہلے اس نے ایک چھوٹے سے کیفے ٹیرا میں بیٹھ کر کھانا کھایا پھر بار کاؤنٹر سے کافی لے کر روڈ پر آ گئی، اس نے مختلف دکانوں سے چھوٹی موٹی شاپنگ بھی کی جلد ہی پاکستان واپسی کی خبر نے اس کے اندر بجلی سی بھری تھی ساتھ ہی اسے اپنوں کی یاد بھی آج کی عرصہ بعد آئی ورنہ تو وہ اپنی ہی مصیبتوں میں اس قدر جکڑی ہوئی تھی کہ اسے کسی کا بھی ہوش نہ تھا۔

اس نے آج کافی عرصہ بعد اپنے لیے بھی میک اپ کا کچھ سامان خریدا، کچھ جیولری بھی لی شفا اور امان کے بچوں کے علاوہ رحاب کے بچوں کے لیے بھی گفٹ لیے، شاپنگ کے بعد وہ جب ہوٹل آئی تو رات کے آٹھ بج چکے تھے وہ ابوذر کے لیے بسکٹ اور مختلف طرح کے اسٹیک بھی خرید لائی تھی تمام سامان اچھی طرح چیک کر کے اس نے ریجہ کا نمبر ملایا وہ اسے اپنی آج کے دن کی تمام کاروائی کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتانا چاہتی تھی کہ کاشف اس کے گفٹ کا معلوم کرے گیا ہے اس کی واپسی کا سن کر ریجہ بھی خاصی خوش ہوئی۔

”ارے یاد آیا کل تمہاری ماما کا فون آیا تھا۔“

فون بند کرتے کرتے ریجہ کو یک دم ہی کل ہونے والی اپنی اور ردا کی گفتگو یاد آئی۔

”اچھا کیا کہہ رہی تھیں؟“ جانے کتنا وقت بیت گیا تھا اسے اپنی ماں کی آواز سنے ہوئے۔

”کچھ خاص نہیں بس ناراض ہو رہی تھیں کہ تم کیوں سکندر کا بچہ لیے دنیا بھر میں رتی بھر رہی ہو۔“ وہ پی پرانا روٹا ”سکندر کا بچہ“ تمہارے لیے یہ بھی پیغام دیا کہ اگر تم اس بچے کو اپنے ساتھ لے کر واپس آؤ گے تو کل کو تمہیں دوسری شادی کرنے میں کس قدر پریشانی کا سامنا کرنا پڑے گا اس لیے بہتر ہے اگلی وطن واپس آؤ یہاں اگر شادی کرو گے تو آج بھی تمہارا انتظار کر رہا ہے اور جانے کیا کیا مجھے تو بہت کچھ یاد بھی نہیں۔“

”ان سے کس نے کہا کہ میں اب دوبارہ شادی کروں گی۔“ وہ استہزاء نہی۔

”میرے لیے شادی کا ایک ہی تجربہ ہی بہت ہے مگر سکندر ہو یا سنان مجھے اب کوئی فرق نہیں پڑتا میرے دل سے کسی بھی مرد کے ساتھ زندگی گزارنے کی خواہش اب بالکل ختم ہو چکی ہے۔“ زندگی کی تلخیاں اس کے لہجے کو بھی تلخ کر چکی تھیں۔

”تم جیسی جوان اور خوب صورت لڑکی تہا زندگی نہیں گزار سکتی کیونکہ دنیا کی باتیں اسے جینے نہیں دیتیں میری مانو تو واپس جا کر سب کچھ بھول بھال کر سنان سے شادی کر لو یہ بھی یہی اللہ تعالیٰ کا حکم ہے طلاق یافتہ عورت کی شادی فوراً ”کر دی جائے“ ریجہ نے اسے خلوص نیت سے سمجھایا۔

”اللہ تعالیٰ کے تو اور بھی بہت سے حکم ہیں، بہر حال چھوٹو یہ ایک لمبی بحث ہے اور مجھے اب نیند آرہی ہے اللہ حافظ ان شاء اللہ ہو سکتا ہے اب میں تمہیں پاکستان پہنچ کر ہی فون کروں۔“ فون بند کر کے اس نے کھانا منگوایا، تھوڑا سا پی کھا کر اس کا پیٹ بھر گیا اور وہ سونے کے لیے لیٹ گئی، آج کافی عرصہ بعد اسے ساری رات خواب میں سکندر کا ہیولہ روپ بدل بدل کر ڈرتا رہا اس نے حماد کو بھی خواب میں دیکھا اور پھر کل کی طرح آدھی رات کو ہونے والے شور نے اس کی نیند خراب کر دی، باہر سے آنے والی وحشت ناک ہنسی کی آوازیں نے اسے دوبارہ سونے ہی نہ دیا وہ بستر پر لیٹی کروٹیں بدل رہی تھی جب اسے کاشف کا فون آیا۔

”اپنا ضروری سامان لے کر کمرالاک کر دو اور دو نمبر 786 میں آ جاؤ جہاں کل آئی تھیں۔“ یہ دو نمبر اسی فلور پر واقع تھا اس سات منزلہ ہوٹل کے ہر فلور پر سوئی کمرے تھے ابوذر سو با تھا نبیو نے اسے اٹھا کر اپنے کندھے سے

لگایا اس کی تمام رقم ہینڈ بیک میں ہی تھی اسے اچھی طرح چیک کر کے وہ دو نمبر 786 آ گئی جہاں ان تینوں کے ساتھ ایک شخص اور بھی تھا جسے نبیو نہیں جانتی تھی یہ ہی وجہ تھی جو وہ کمرے کے دروازے پر ہی جھجک کر رک گئی۔

”آؤ، آؤ اندر آ جاؤ گھر آؤ مت یہ میرا دوست ہے تمہارا واپسی کا ٹکٹ اس نے ہی کروا کر دیا ہے اور ویسے بھی جن حالات سے گزر کر تم یہاں تک آئی ہو میں نہیں سمجھتا کہ اب تمہیں ہم جیسے مردوں سے گھبراتا چاہیے، تمہیں تو خود پر فخر ہونا چاہیے کہ اتنے مردوں کی موجودگی میں تم جیسی تنہا عورت کو کوئی غلط نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔“ وہ اندر داخل ہو گئی اور کاشف کے سامنے رکھی کرسی پر اطمینان سے بیٹھ گئی کمرے میں موجود اتنے سارے مرد اور وہ تنہا عورت یہ خوف بھی اس کے دل سے یکسر دور ہو گیا۔

”گڈ گرل تمہارا یہ اعتماد اور بہادری تو کبھی جو تم نے سکندر جیسے کینے کو شکست دی میں آج تک جانے کتنے لوگوں کو یہاں سے نکال کر ان کے ملک واپس بھیج چکا ہوں مگر یقین کرو جب بھی کبھی میں نے تمہارے جیسی کسی لڑکی کی مدد کی ہے مجھے ہمیشہ دل کی گرائیوں سے خوشی حاصل ہوئی ہے عورت کی مدد کرتے ہوئے میں نے کبھی پیسے کو اہمیت نہیں دی بلکہ ہمیشہ اس عورت کو اہمیت دی ہے جس کی میں مدد کرتا ہوں۔“

کاشف کے الفاظ قابل تعریف تھے شاید اس کا یہ ہی جذبہ اسے آج تک اپنے مقصد میں کامیاب رکھے ہوا تھا جس کا اندازہ نبیو کو ہو چکا تھا۔

”بہر حال اپنے گفٹ کی رقم دے دو سنان آج ہی تمہاری سیٹ کنفرم کر دے گا۔“ کاشف کے ان الفاظ کے ساتھ ہی اس نے اپنے پرس سے وہ لفافہ نکالا جس میں پہلے سے ہی 5000 روپے موجود تھے اور اسے فردوس خان کی جانب بڑھا دیا فردوس خان نے رقم گن کر لفافہ کاشف کے حوالے کر دیا۔

”اس میں گفٹ کے علاوہ تمہارے پیسے بھی ہیں کاشف نے لفافہ کھول کر 2000 روپے سنان کے حوالے کیے اور باقی رقم گنے بغیر لفافہ اٹھا کر جیب میں رکھ لیا سنان گفٹ کی رقم لے کر کمرے سے چلا گیا۔

”تمہارا گفٹ بنگاک سے ہو گا جہاں تمہیں بالکل تواناں کے ذریعے جانا ہے ہمارا ساتھ صرف یہاں تک کا تھا اس سے آگے ہم میں سے کوئی بھی تمہارے ساتھ نہ جائے گا بنگاک بھی تھائی لینڈ جیسا خطرناک ملک ہے وہاں تمہیں اپنی حفاظت خود کرنی ہے اس وقت تک جب تک کہ تھائیستان کی فلائٹ پر سوار نہ ہو جاؤ۔“ فردوس خان نے اسے آگے کی تمام صورت حال سمجھائی۔

”مجھے بنگاک کب جانا ہو گا؟“ فردوس خان کے خاموش ہوتے ہی اس نے سوال کیا۔

جیسے ہی تمہارا گفٹ اوکے ہو گا اسی حساب سے کاشف تمہیں یہاں سے بس پر بٹھائے گا کیونکہ ابھی تھوڑی دیر تک میں اور شمرز ملائیشیا واپس جا رہے ہیں وہاں ہمارا کافی کام رہا ہو ہے اب تم مکمل طور پر کاشف کے حوالے ہو بیے جانتا ہے کہ تم میری بہن ہو اس لیے میں سمجھتا ہوں جب تک تم یہاں روکی یہ تمہاری حفاظت اپنی جان سے بھی بڑھ کر کرے گا۔“

”بے فکر ہو کر جاؤ تمہارے بعد اس کی حفاظت کی مکمل ذمہ داری اس وقت تک میری ہے جب تک یہ یہاں ہے البتہ میں کوشش کروں گا اسے بنگاک تک بھی کسی جاننے والے کے ساتھ ہی بھیجوں۔“

فردوس اٹھ کھڑا ہوا اس کے اٹھتے ہی نبیو نے جلدی سے ہینڈ بیک میں ہاتھ ڈال کر وہ لفافہ برآمد کیا جس میں فردوس خان کے کمیشن کی طے شدہ رقم موجود تھی اور جس کا آج تک فردوس خان نے کبھی ذکر بھی نہ کیا تھا۔

”فردوس بھائی یہ آپ کا لفافہ۔“ وہ لفظ رقم استعمال کرتے ہوئے جھجک سی گئی فردوس خان نے جھجکتے ہوئے لفافہ اس کے ہاتھ سے تمام لیا، کھول کر اس میں سے 200 روپے نکالے اور نبیو کے ہاتھ پر رکھ دیے۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے رنگمٹ کو دیکھتے ہوئے فردوس خان سے سوال کیا۔
 ”ایک بھائی کی طرف سے بہن کے لیے تحفہ اور مجھے بہت اچھا لگے گا جب تم وطن واپس جا کر بھی مجھ سے اور میری فیملی سے رابطہ میں رہو۔“
 ”ان شاء اللہ ضرور۔“ نبیو نے صدق دل سے عہد کیا، فردوس خان اور شمرز اس سے الوداعی ملاقات کر کے کمرے سے نکل گئے اب اس کمرے میں صرف وہ اور کاشف موجود تھے، فردوس خان کے کمرے سے باہر نکلتے ہی وہ نبیو کی طرف پلٹا۔

”میں اور فردوس کئی سالوں سے مل کر یہ کام کر رہے ہیں مگر مجھے نہیں یاد پڑتا اس سے قبل وہ کسی کے ساتھ اس طرح آیا ہو آج پہلی بار وہ اپنا تمام کاروبار اور گھریلو چھوڑ کر چار دن تک تمہارے ساتھ رہا ہے، اپنے کام کے لیے تو وہ کئی کئی دنوں تک باہر رہتا ہے مگر کسی دوسرے کے لیے نہیں اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس نے تمہیں بہن صرف کماہی نہیں بلکہ مانا بھی ہے اور اسی لیے تمہاری عزت، ہم پر بھی فرض ہے ہر حال تم اپنا کرا خالی کرو، تاکہ اس کی جو بے منت بنتی ہے وہ ادا کر دی جائے جب تک تمہارا ٹکٹ اؤکے نہ ہو تم اس روم میں رہو گی فردوس خان اس کی آج کی بے منت بھی کر گیا ہے اور ہو سکتا ہے تمہیں آج ہی یہ روم چھوڑنا پڑے بصورت دیگر اگر آج کا ایک دن تمہیں اور رہنا پڑا تو اس کمرے کی مزید بے منت تمہیں کرنا ہوگی۔“
 ”اوکے۔“ نبیو نے مختصر سا جواب دیا، ظاہری بات بھی جب اس نے رہنا تھا تو رقم بھی اسے ہی دینی تھی وہ کسی دوسرے کی ذمہ داری ہرگز نہ تھی۔

”میں چلتا ہوں تم اپنا سامان پیکر رکھو جیسے ہی سجان کا فون آئے تمہیں یہاں سے نکلتا ہو گا اپنے بچے کے لیے کچھ کھانے پینے کا سامان ضرور رکھ لینا تھا لیڈز سے بنگا تقریباً بارہ گھنٹے کا سفر ہے تمام ریفرشمنٹ تمہیں بس میں ملے گی مگر حلال اور حرام کی تمیز کے بعد کچھ کھانا ہو سکے تو اپنے ساتھ ہی کھانے پینے کا کچھ سامان رکھ لو چھوٹے بچے کا ساتھ ہے راستے میں کچھ پریشانی نہ ہو۔“ کاشف اسے سمجھا کر چاکا تھا وہ اپنا تمام سامان اس کمرے میں لے آئی، اپنے پنڈلی کی بیگ میں اس نے ابوذر کے دو جوڑے اور ایک اپنا سوٹ رکھنے کے ساتھ کچھ کھانے پینے کا سامان بھی رکھ لیا تقریباً ”چار بجے اسے کاشف کا فون آیا۔

”تمہارا ٹکٹ ہو گیا ہے تمہیں ابھی پانچ بجے والی بس سے بنگا کے لیے نکلتا ہے جلدی سے تیار ہو کر نیچے لابی میں آ جاؤ میں پندرہ منٹ تک پہنچ رہا ہوں۔“ کاشف کے فون بند کرتے ہی اس نے ہوٹل کی ریسپشن پر فون کر کے ایک ویٹر بلوایا جس کی مدد سے اپنا تمام سامان لے کر وہ نیچے لابی میں آگئی چار بیس پر کاشف وہاں پہنچ گیا جلدی جلدی اس کا سامان گاڑی میں رکھا اور پندرہ منٹ بعد ہی وہ بس اسٹینڈ پر تھے۔

”یہ تمہارا پاکستان کا ٹکٹ ہے کل رات بارہ بجے کی فلائیٹ ہے تم کل صبح تقریباً پانچ بجے تک بنگا پہنچ جاؤ گی اس کے بعد تمہیں اپنا انتظام خود کرنا ہو گا ہو سکے تو ایئر پورٹ پر ہی رک جانا مگر بہت زیادہ احتیاط کے ساتھ کیونکہ بنگا چوروں کا شکار ہے۔“

نبیو نے خاموشی سے اپنا ٹکٹ تمام لیا، اس پر ایک نظر ڈالی اب وہ یقین اور بے یقینی کی کیفیت سے نکل چکی تھی بغیر کسی احساس کے اس نے وہ ٹکٹ اپنے پنڈلی کی اندرونی جیب میں رکھ لیا اس وقت اس کے اعصاب پر وہ بارہ گھنٹے سوار تھے جو اسے بنگا میں تنہا گزارنے تھے جہاں اس کے ساتھ فردوس خان جیسے لوگ نہ تھے اس کی مدد کے لیے شمرز اور کاشف کا ساتھ نہ تھا وہ بالکل تنہا تھی مگر اب گزرتے وقت نے اسے خاصا نڈر اور بے خوف کر دیا تھا یہی سبب تھا جو وہ اتنی پریشان نہ تھی جتنا اسے ہونا چاہیے تھا۔
 ”یہ تمہارا بس کا ٹکٹ۔“

ٹکٹ اندر رکھتے ہی کاشف نے ایک اور ٹکٹ اس کی جانب بڑھایا جس پر سوئیٹ گھنٹہ درج تھا، نبیو نے پرس کھول کر ٹکٹ پر درج شدہ رقم کاشف کے حوالے کر دی جو اس نے خاموشی سے تمام لپٹی نبیو کا سامان پورے گاڑے چکا تھا بس چلنے والی تھی کاشف اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا اس کے قریب پہنچا جب اچانک سامنے کھڑے ایک بارش شخص پر پڑی۔
 ”ایک منٹ روکیں آیا۔“ کچھ ہی دیر بعد کاشف اس شخص کو لیے نبیو کی جانب واپس آیا۔

”ان سے طویہ عبد الباری صاحب ہیں پاکستان کے کسی گاؤں سے ان کا تعلق ہے یہ بھی کل تمہارے ساتھ ہی بنگا سے پاکستان جا رہے ہیں اور آج اتفاق سے اسی بس کے مسافر ہیں جس میں تم سفر کرنے جا رہی ہو میں نے انہیں سمجھا دیا ہے کہ تم فردوس خان کی بہن ہو اور یہ فردوس خان کا بہت اچھے جاننے والے ہیں لہذا کل رات فلائیٹ تک تمہارے ساتھ ہی رہے گا۔“

کاشف کی لمبی چوڑی تمہید ختم ہوتی ہی نبیو نے سامنے کھڑے شخص پر نظر ڈالی جس نے ایک ہاتھ میں کچھ قرانی نسخے تمام رکھے تھے جبکہ دوسرے ہاتھ میں کچھ نسخے تھے ایک اور آسمانی مدد اس ساتھ، پینسٹھ سالہ بزرگ کی شکل میں اسے نظر آئی۔ وہ دل کی گہرائیوں سے اللہ تعالیٰ کی مشکور ہو گئی اتفاق سے عبد الباری صاحب کی سیٹ بھی بس کے اوپر والے فلوئر میں تھی۔ وہ بیڑھیان چڑھ کر اوپر آگئی دروازے پر کھڑی ہوئیں نے خندہ پیشانی سے اسے خوش آمدید کہا اس کے اندر داخل ہونے سے قبل اس نے ایک بار پھر پیچھے مڑ کر دیکھا کاشف ابھی بھی نیچے ہی تھا نبیو نے اسے الوداعی ہاتھ ہلایا اور بس میں داخل ہو گئی۔ اس کے ساتھ والی سیٹ کی اندرین شخص کی بھی جس نے نبیو کی ذاتی درخواست پر وہ سیٹ عبد الباری کے حوالے کر دی، بس کا سفر شروع ہو گیا جس کے ساتھ ہی نبیو نے تھا لیڈز کی سرزمین کو خدا حافظ کہہ دیا، سامنے بیڑی سی اسکرین پر کوئی فلم چل رہی تھی جس کی زبان نبیو کے لیے نا آشنا تھی اس نے ابوذر کو کھانے کے لیے بسکٹ کا ایک پیکٹ تمھارے عبد الباری اس دوران اس کا تمام انٹرویو لے چکے تھے جو کچھ اس کے نزدیک بتانا چاہیے تھا وہ اس نے بتا دیا باقی بہت سی باتیں وہ ایک اجنبی شخص سے ڈسکس نہیں کرنا چاہتی تھی۔

”آپ یہاں کسی سلسلے میں آئے تھے؟“
 عبد الباری کا انٹرویو ختم ہوتی ہی اس نے بر سیبل تذکرہ پوچھ لیا۔
 ”میں یہاں بڑس کے سلسلے میں آتا جا رہا ہوں۔“
 عبد الباری نے اپنی داڑھی میں ہاتھ پھیرتے ہوئے فخریہ کہا۔
 ”وہ اچھا کیا بڑس کرتے ہیں آپ۔“
 ”یہ یہاں روڈ پر کھڑا ہو کر قرآنی نسخہ جات فروخت کرتا ہے۔“

اپنے پیچھے سے آنے والی آواز سن کر نبیو نے پلٹ کر دیکھا، ایک تقریباً ساٹھ سالہ سوئیڈ لوڈ شخص نہایت قیمتی فریم کا سولور چشمہ اور ملائی ٹوپی میں لمبوس عین عبد الباری کی سیٹ کے پیچھے تھا، چھوٹی فریج کٹ داڑھی کے ساتھ وہ نہایت ہی معزز دکھائی دے رہا تھا اس کی شستہ اردو اس بات کی غمازی تھی کہ اس کا تعلق پاکستان یا انڈیا سے ہے۔

”محنت سے کیے گئے کسی کام میں کوئی عار نہیں۔“ عبد الباری نے فوراً ”سے“ پشیمو جواب دیا۔
 ”محنت کا کام۔“ وہ شخص استہزاء سے انداز میں نڈر نڈر سے ہنسا۔
 ”اسے محنت نہیں بلکہ مالکنا کہتے ہیں مولانا صاحب۔“
 ”مولانا کا صیغہ غالباً اس نے عبد الباری کی داڑھی کو دیکھ کر لگایا تھا۔“

”اصل میں جب ان سے کوئی یہ نسخہ یا نسخہ نہیں خریدتا تو ان کی بزرگی پر ترس کھاتے ہوئے ان کے ہاتھ میں کچھ روپے تھما دیتا ہے جسے یہ اپنی محنت کی کمائی کہتے ہیں اس طرح کے اکتانی ہمیں دنیا کے ہر گوشے میں محنت کرتے نظر آئیں گے اور ان کی اس طرح کی محنت نے ہمیں دوسرے ممالک میں بڑی گریڈ کیا ہوا ہے۔“

اس شخص نے نبی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ”نبیو نے پلٹ کر ایک نظر اپنے برابر بیٹھے عبد الباری پر ڈالی جو بڑی لاپرواہی سے آنکھیں موندے بس کی سیٹ سے ٹیک لگا چکے تھے وہ اس طرح کے عملی مظاہرے ملائی میں جگہ جگہ دیکھ چکی تھی جہاں اکثر و بیشتر سڑک کنارے کھڑے پاکستانی لوگوں سے مدد کے طلب گار ہوتے جنہیں دیکھ دیکھ وہ بڑی شرمندگی محسوس کرتی خاص کر جب سکندر ساتھ ہوتا۔“

”تم ہنگامہ کس کے پاس جا رہی ہو؟“ اس شخص نے اپنی جیب سے سگار نکالتے ہوئے نبیو سے سوال کیا۔

”کسی کے پاس بھی نہیں دراصل میری کل رات کی فلائیٹ ہے میں ہنگامہ سے اسلام آباد جا رہی ہوں۔“ نبیو نے آہستہ سے جواب دیا۔

”ہم تو صبح چھ بجے تک ہنگامہ پہنچ جائیں گے پھر تم رات تک وہاں کس کے پاس رہو گی۔“ اس سوال کا نبیو کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

”چتا نہیں شاید کسی ہوٹل وغیرہ میں یا ایئر پورٹ پر ہی ٹائم گزار لوں گی۔“

”دلوں باتیں ہی ناممکن ہیں کیونکہ وہاں شہ عورت کے لیے ان میں سے کوئی بھی جگہ محفوظ نہیں ہے ہنگامہ، تھائی لینڈ، ملائیشیا، سنگاپور یہ سب میرے دوسرے گھر ہیں جہاں ہر جگہ میری ایک عدد دیوی بھی موجود ہے پھر بھی میں یہ سمجھتا ہوں ان میں سے ہنگامہ اور تھائی لینڈ کسی شہ عورت کی چند مٹھ کی رہائش کے لیے بھی قابل بھروسہ نہیں جگہ جگہ جو راجہ اور بد معاش گھات لگائے بیٹھے ہیں۔“

”دراصل عبد الباری صاحب میرے ساتھ ہی ہوں گے۔“

”تم اس کو چھوڑو صرف اپنی بات کرو یہ تو وہاں بھی سڑک کنارے کھڑا کچھ نہ کچھ بیچنے کی کوشش میں روپیہ کمانے میں مصروف ہو جائے گا۔“ اس کی بات کافی حد تک درست تھی۔

”میں نے اتنی باتیں تم سے کر لیں اور اپنا تعارف تو کروایا ہی نہیں۔“

بات کرتے کرتے غالباً اس شخص کو یاد آیا کہ نبیو اس سے قطعی ناواقف ہے۔

”مجھے بہانہ الدین نبی کہتے ہیں میں کراچی کا رہا ہوں میرا چھلیوں کا بہت بڑا بزنس ہے دنیا کے ہر ملک میں ہم چھلی سلائی کرتے ہیں اور۔۔۔“ کچھ کہتے کہتے وہ رک گیا، عبد الباری پر ایک نظر ڈالی جو بظاہر سوراہا تھا اور تھوڑا سا آگے کی جانب کھٹک آیا ساتھ ہی اس نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک چھوٹی سی تھیلی بھی برآمد کر لی ہے جسے کھول کر نبیو کی آنکھوں کے سامنے کر دیا۔ جس کے اندر سے آنے والی ننھی ننھی کڑھکی نے چند لمحوں کو نبیو کی آنکھوں کو چند ہیادیا۔

”جانتی ہو یہ کیا ہے؟“

”ڈائنمٹ۔۔۔“ نبیو نے جواب دے کر بہانہ الدین کی جانب دیکھا۔

”بالکل یہ میرے ہیں اور میں ان کی اس گنگ بھی کرتا ہوں، ہنگامہ کا چھوٹا موٹا ڈان مانا جاتا ہوں یہاں کے لوگ میری جوتی کی نوک تلے رہتے ہیں میں ان سے بھیک نہیں مانگتا بلکہ بڑی شان سے ان پر حکمرانی کر کے کما ہوں۔“

ملائیشیا سے ہنگامہ تک کے سفر میں نبیو جانے کتنے کروادوں سے آشنا ہوئی تھی اور کتنی کمائیاں اسے سننے کو ملی تھیں ان ہی کروادوں میں اب ایک نیا کروادہ بہانہ الدین بھی شامل ہو چکا تھا۔

”ملک ملک گھومنا اور عیاشی کرنے کے علاوہ جانتی ہو میرا ایک اور یونیک شوق کیا ہے؟“ بات کرتے کرتے رک کر اس نے نبیو سے سوال کیا۔

ظاہر ہے نبیو اس کے بارے میں فی الحال کچھ نہ جانتی تھی۔

”نتیجہ شادیاں کرنا۔“ نبیو کو انکار میں سرہلاتے دیکھ کر اس نے خود ہی جواب بھی دے دیا۔

”ابھی تک کوئی پندرہ سولہ شادیاں کر چکا ہوں، تین بیویاں موجود ہیں باقی سب سے فارغ ہوں آخری والی یہ ہی کوئی تمہاری عمر کی ہی ہے۔“

”میری عمر کی۔۔۔“ نبیو نے حیرت سے دوہرایا۔

”ماہیڑ مت بیچو گا مگر میں یہ ضرور پوچھوں گی اس نے اپنے باپ کی عمر کے شخص میں وہ کون سی خوبی دیکھی جو نکاح کر بیٹھی۔“ نبیو نے براہ اعتماد لہجے میں پوچھا۔

”پیسہ جو دنیا کی سب سے بڑی طاقت ہے۔“ خیر بہانہ الدین کے لہجے سے چٹک رہا تھا۔

”اپنی اپنی سوچ کی بات ہے ورنہ میرے نزدیک پیسہ کبھی بھی اتنا پورا فل نہیں ہو سکتا کہ اس کی خاطر اپنے جذبات و احساسات کو قربان کر دیا جائے۔“

”تم پاکستان غیر قانونی طریقہ سے جا رہی ہو؟ آئی مین جعلی ویزا۔“ اس کی بات کو یکسر نظر انداز کر کے بہانہ الدین نے ایک بالکل مختلف سوال کر دیا جس کی اس وقت کم از کم نبیو کو امید نہ تھی جواب میں اس نے صرف اثبات میں سرہلایا ”بس کی لائنیں آن ہو گئیں ہو سٹس نے مائیک پر درخواست کی۔“

”تمام مسلمان مسافر اپنی جگہ پر کھڑے ہو جائیں کیونکہ کھانے کا ٹائم ہو گیا ہے۔“ یہ ہدایت غالباً حلال اور حرام کے سلسلے میں تھی نبیو نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کھڑے ہوتے ہی بس میں چاروں طرف ایک نظر ڈالی اس کے عبد الباری اور بہانہ الدین کے علاوہ بھی وہاں پانچ مسلمان افراد اور تھے کھانا سرو کیا جانے لگا ہو سٹس نے اس کی سیٹ کی سائڈ سے ایک چھوٹا ٹیبل برآمد کر کے اس پر کھانے کی ٹرے سیٹ کر دی ”ممکی گورنگ“ کا پہلا ہی پیچہ منہ میں ڈالتے اسے الٹا کی سی آگئی جانے یہ اس کا وہم تھا یا حقیقت اسے کھانے میں کچھ عجیب سی بو محسوس ہو رہی تھی اس نے ٹرے پرے کھسکا کر ٹیک سے اپنے کھانے کے لیے کچھ اسٹیکس نکال لیے اس کے برابر میں عبد الباری بڑی رغبت سے کھانا کھا رہا تھا نبیو نے اپنی ٹرے بھی اس کے پاس رکھ دی۔

کھانا ختم ہوتے ہی بس کی لائنیں پھر سے مدھم مدھم ہو گئیں، بس میں میوزک کی دھیمی دھیمی آواز سنائی دے رہی تھی نبیو سیٹ سے ٹیک لگا کر سوغتی، تقریاً ”چھ بجے وہ ہنگامہ کے بس اسٹینڈ پر پہنچ گئی جہاں عبد الباری کے ساتھ وہ باہر دوڑ پر آگئی عبد الباری کے انداز نے اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ یہاں کبھی بھی ہوٹل میں نہیں رکا۔

”میرا خیال ہے کہ ہم ٹیکسی کر کے یہاں سے سیدھے ایئر پورٹ چلے جاتے ہیں۔“

”چھ بجے رات بارہ بجے تک، ہم ایئر پورٹ پر کیا کریں گے؟“ عبد الباری کا سوال بھی معقول تھا۔

”ایسا کرو تم میرے ساتھ آ جاؤ میں تمہیں رات کو بحفاظت ایئر پورٹ پہنچا دوں گا۔“ بہانہ الدین ہاتھ پر کوٹ ڈالے اس کے قریب آن پہنچا۔

”ہاں مگر یہ شخص میرے ساتھ نہیں جائے گا اگر منظور ہے تو آ جاؤ۔“ وہ اپنے سامنے کھڑی گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ چکا تھا۔

”ٹھیک ہے تم جاؤ میں تمہیں رات کو ایئر پورٹ پر ہی مل جاؤں گا۔“

ایک لڑکی کو اپنے ساتھ لے کر ہنگامہ کی سڑکوں پر پھرنے سے بہتر تھا کہ اسے بہانہ الدین کی ذمہ داری میں دے دیا جائے اس سوچ نے عبد الباری کو مطمئن کر دیا ”نبیو میں مٹ بعد ہی“ ہوٹل روادا پلانہ“ پہنچ گئی، ہوٹل کی

عظیم الشان عمارت کو دیکھتے ہی نبیو کو بہان الدین کی دولت کا اندازہ ہو گیا، وہ ٹل ابھی بند پڑا تھا گاؤں میں کوئی بھی نہ تھا وہ بہان الدین کے ساتھ وہیں لابی میں بیٹھ گئی، تقریباً ”نوبت“ وہاں کا اسٹاف آنا شروع ہوا، بہان الدین نے کاؤنٹر پر جا کر دم بک کر دیا، ”نبیو وہیں لابی کے صوفے پر بیٹھی رہی، ابوذر بھی جاگ چکا تھا اسے اس وقت شدت سے بھوک محسوس ہو رہی تھی، ابوذر بھی بھوکا تھا۔“

چند منٹوں بعد بہان الدین واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک نوجوان بھی تھا جس کے گلے میں لٹکا کارڈ ظاہر کر رہا تھا وہ اسی ہوٹل کا ملازم ہے۔

اس کے ساتھ اپنا سامان لے کر اوپر دوم میں چلی جاؤ، شام چار بجے تک وہاں آرام کو مجھے کسی کام سے جانا ہے، واپس آکر تمہیں ٹیکسی کروا کر ایئر پورٹ بھیج دوں گا، ابھی اگر ناشتا کرنا ہے تو میرے ساتھ ڈائننگ ہال آجاؤ ورنہ دوم سروس سے آؤرے کر منگوا لو جو تمہیں کھانا ہے۔“

”تھینک یو سر۔“ نبیو بہان الدین کا شکریہ ادا کرتی اس کے دیے ہوئے دوم میں آگئی سب سے پہلے خود نہائی، ابوذر کو مناد دھلا کر کپڑے تبدیل کروائے پھر کمرے میں رکھے دوم فرنیچر کی جانب آگئی جو طرح طرح کے لوازمات سے بھرا ہوا تھا، وہیں سے جوس اور بلیک فارسٹ کیک نکال کر اس نے ناشتا کیا۔ اور سوئی وہ سوئی رہی تھی جب وہ بجے کے قریب بہان الدین نے اس کے کمرے کا دروازہ بجایا نبیو نے دروازہ کھول دیا۔

”مجھے نماز ہے تم اگر چاہو تو کمرے میں ہی روکو کیونکہ میں کبھی کسی ایسی عورت کی جانب غلط نگاہ نہیں ڈالتا جو خود مجھے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش نہ کرے اور میں بند آنکھوں سے عورت کا کارواں جانچ سکتا ہوں۔ پھر بھی اگر اعتبار نہ ہو تو نیچے لابی میں جا کر بیٹھ سکتی ہو۔“

”نہیں نہیں سر مجھے آپ پرور ابھروسہ ہے آپ اندر آجائیں۔“

نبیو نے دروازے کے سامنے سے ہٹ کر اسے اندر آنے کا راستہ دیا اس کا ایک مچ مچ دوم میں آگیا تھا بہان الدین اس میں سے اپنے کپڑے نکال کر ہاتھ دوم چلا گیا نبیو ہر دم کے صوفے پر بیٹھ گئی۔

”میں تمہارے لیے اوپر ہی کچھ کھانے کو بھیج دتا ہوں اس کے بعد تم تیار ہو جاؤ تمہیں یہاں سے پانچ بجے نکلتا ہو گا تاکہ چوبیس بجے تک ایئر پورٹ پہنچ جاؤ۔“

بہان الدین نما کر اپنے کیلے بالوں میں لٹکا کر تا ہوا باہر نکل گیا۔ کھانا کھا کر نبیو تیار ہو گئی اور تقریباً ”پانچ بجو“ نیچے ہوٹل کی لابی میں تھی بہان الدین نے ہوٹل سے ہی گاڑی ہائیر کی اور اسے چھوڑنے باہر تک آیا، باوردی ڈرائیور نے انہیں دیکھتے ہی پیچھے کا دروازہ کھول دیا۔

”یہ میری بیٹی ہے یعنی بھائی کی بیٹی اسے بحفاظت ایئر پورٹ پہنچا کر مجھے واپس آگرتاؤ اگر یہ لڑی کہیں یہاں وہاں ہوئی تو ذمہ دار تم ہو گے۔“

بہان الدین نے ڈرائیور کو انگلیش میں سمجھایا اور پھر نبیو کی جانب پلٹا۔

”یہاں قدم قدم پر دھوکا ہے، مگر یہ سب مجھے بہت اچھی طرح جانتے ہیں اب کوئی تمہارے ساتھ غلط ہاتھ نہیں کرے گا تم اطمینان سے اس کے ساتھ ایئر پورٹ جا سکتی ہو ورنہ تو یہ ٹیکسی والے بھی لڑکیاں بیچ کر نکل جاتے ہیں اور ان پتھاریوں کو ہتھ بھی نہیں چلتا۔“

”شکریہ سر میں آپ کا یہ احسان ہمیشہ یاد رکھوں گی۔“ وہ ٹیکسی میں بیٹھ گئی، ٹیکسی اشارت ہو کر اس کی آخری منزل کی جانب چل دی جہاں سے کچھ گھنٹوں بعد اس کا یہ طویل اور دشوار ترین سفر ختم ہونے والا تھا اور وہ ان گھنٹوں سے گزر کر اپنے ملک پہنچنے والی تھی یا اپنا دہس جہاں سارے اس کے اپنے تھے۔



وہ اور امان پچھلے دو گھنٹوں سے کراچی ایئر پورٹ پر موجود تھے، نبیو کی دی ہوئی اطلاع کے مطابق اسے آج صبح اسلام آباد پہنچ جانا چاہیے تھے جہاں سے ڈائریکٹ فلائٹ لے کر اسے کراچی آنا تھا، انکو اڑی سے حاصل شدہ معلومات کے بعد وہ دو گھنٹہ قبل ایئر پورٹ پہنچ گئے اب تک وہ مختلف ایئر لائن کے جہاز اسلام آباد سے کراچی آ چکے تھے اور اب تیسری اور آخری ایئر لائن کے جہاز کی کراچی آمد کو بھی تقریباً ”سیکس منٹ“ ہو چکے تھے امان لاؤنج کے بالکل سامنے موجود اندر سے آنے والے ایک ایک مسافر کو دیکھ رہا تھا، احتشام صاحب کچھ دور فاصلے پر مسلسل ٹل رہے تھے، رفتہ رفتہ آگے بڑھتی گھڑی کی سوئیوں کے ساتھ وہ مایوسی کا شکار ہوتے جا رہے تھے۔ ٹھنلے سے جہاں ان کی ٹانگیں ٹل ہو چکی تھیں، وہیں مایوسی نے ان کے اعصاب کو بھی ٹل کر دیا تھا ان کے حساب سے نبیو چھ گھنٹے قبل اسلام آباد پہنچ چکی تھی پھر وہ کہاں تھی؟ اب تک کراچی کیوں نہیں آئی؟ اسلام آباد پہنچ کر اس نے احتشام صاحب کو فون کیوں نہیں کیا؟ ان تمام باتوں کو سوچتے ان کی بے چینی میں اضافہ ہو جاتا، ابھی بھی تھک کر انہوں نے قریبی دیوار کا سارا لایا ہی تھا کہ امان تیزی سے لپک کر ان کی جانب آیا۔

”پاپا اب باہر رکے بیچ پر چل کر بیٹھیں۔“ اس نے انہیں کندھے سے تھام لیا۔

”نہیں آئی؟“ امان کی بات کو قطعی نظر انداز کر کے انہوں نے امید و ناامیدی کی کیفیت میں گھرتے ہوئے سوال کیا۔

”ابھی تک تو نہیں مگر ان شاء اللہ آجائے گی آپ پریشان مت ہوں اگر وہ وہاں سے بخیریت اسلام آباد پہنچ سکتی ہے تو یقیناً ”کراچی“ بھی آجائے گی۔“

”کیسے پتا چلے کہ وہ اسلام آباد پہنچی بھی ہے یا نہیں اس نے تو پاکستان آکر مجھ سے ابھی تک رابطہ بھی نہیں کیا اور یہ ہی بات میری گمراہی کا سبب بن رہی ہے تمہارے سامنے ان تینوں فلائٹس میں وہ نہیں ہے، انکلی فلائٹس شام میں آنا شروع ہوں گی اب بتاؤ اس صورت حال میں کیا کیا جائے؟“ انہوں نے پرسوج نگاہوں سے امان کے چہرے کی جانب ہلتے ہوئے سوال کیا۔

”ایسا کریں آپ ٹیکسی کر کے گھر چلے جائیں میں انکو اڑی سے معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہوں یا پھر میرا ایک دوست ہے اسلام آباد میں اسے فون کرنا ہوں وہ وہاں سے معلوم کرے سر حال میں رات آنے والی آخری فلائٹ چیک کر کے ہی گھر واپس آؤں گا۔“

”ایک منٹ اپنے پیچھے دیکھو۔“ امان کو خاموش کرواتے ہی انہوں نے پیچھے لاؤنج کے داخلی دروازے کی سمت اشارہ کیا، ان کے متوجہ کرواتے ہی پیچھے دیکھتے ہوئے امان بالکل ساکت ہو گیا، اسے اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہ آیا کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے حقیقت ہے یا اس کا وہم، یقینی طور پر ایک ہی جیسا وہم، وہ لوگوں کو بیک وقت نہیں ہو سکتا، وہ احتشام صاحب کو وہیں چھوڑ کر پیچھے کی جانب تیزی سے بھاگا، پاس سے گزرتے لوگ حیرانی سے اسے دیکھ رہے تھے۔



چھ بج کر تیس منٹ پر وہ ایئر پورٹ پہنچ گئی، ٹیکسی والے کو اس کا طے شدہ کرایہ ادا کر کے اس نے اپنا سامان باہر نکالا اور سامنے رکھی ٹرائی میں تمام سامان رکھ لیا، ابوذر کے ساتھ وہ ٹرائی ٹھہرتی عمارت کے اندر داخل ہو گئی، چیکنگ کے مختلف مراحل سے گزر کر وہ ایئر پورٹ کے لاؤنج میں آگئی اس تمام عمل میں اس کا ایک گھنٹہ صرف ہو چکا تھا۔

اپنے سامان کی ٹرائی ٹھہرتی وہ انتظار گاہ میں رکھی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گئی، یہاں وہاں نظروں والی انتظار گاہ بھانت بھانت کے مسافروں سے بھری ہوئی تھی، کچھ ہی فاصلے پر عبدالہار بھی موجود تھا جس نے نبیو کو دیکھتے ہی زور شور سے ہاتھ ہلایا اور اٹھ کر اس کے پاس رکھی کرسی پر ہی آ بیٹھا، نبیو کا پاسپورٹ اور ٹکٹ اس کے ہاتھ

میں ہی تھا جو وہ ہاں کاؤنٹر پر چیک کروا چکی تھی یا ہر تقریباً "تین مختلف مقامات پر پاسپورٹ چیک کرنے کے عمل نے نیو کو ذہنی طور پر تھکا سادیا تھا" اس نے خاموشی سے ہاتھ میں پکڑی دونوں پیتزیز پینڈ بیگ کی زپ کھول کر اندر رکھ لیں اور عبد الباری کو مخاطب کیا۔

"پلیز انکل آپ ذرا میری ٹرائل کا خیال رکھیں میں سامنے کاؤنٹر سے کچھ کھانے کے لیے لے کر آتی ہوں۔"

"ہاں ہاں ضرور ہو سکے تو میرے لیے بھی ایک کافی کا کپ لے آنا۔"

عبد الباری نے دانت نکالتے ہوئے فرمائش کی "وہ اگر نہ بھی کستا تو بھی وہ ضرور اس کے لیے کچھ لے کر ہی آتی،" نیو اٹھ کر سامنے والے کاؤنٹر پر آگئی ابوذر کو کھانے کا مختلف سامان لے کر دیا، ساتھ ہی وہاں سے کچھ چھوٹے چھوٹے مختلف اقسام کے کھلونے بھی اسے خرید کر دیے، اپنے لیے حلال کے ٹیک کے ساتھ سینڈویچ اور کافی کا کپ تمام کروا پس اپنی جگہ آگئی جہاں عبد الباری کافی کا منتظر تھا کپ اس کے حوالے کیا۔ خود کرسی پر بیٹھ کر کولڈ ڈرنک کاٹن کھول لیا ٹھنڈی ٹھار کولڈ ڈرنک نے اس کے اعصاب کو کافی حد تک پرسکون کر دیا وہ بڑے اطمینان سے بیٹھی وقت گزرنے کا انتظار کر رہی تھی کیونکہ ان کی فلائیٹ تھوڑی لیٹ ہو چکی تھی اور اب جازانے بارہ بجے کے بجائے ایک بجے یہاں سے روانہ ہونا تھا جانے اسے کتنا ناگوار تھا وہاں بیٹھ ہوئے ہو چکا تھا جب اچانک ہی ایک باوردی شخص تیزی سے اس کی جانب بڑھتا نظر آیا، اسے اپنی طرف اس طرح آتے دیکھ کر وہ یک دم گھبرا اٹھی، اسے محسوس ہوا شاید وہ پکڑی جا چکی ہے، انہونی کے احساس نے اس کے اوسان خطا کر دیے۔ اس کی ٹانگیں لرزنے لگیں۔ وہ شخص عین اس کے سامنے آکر رک گیا نیو نے ابوذر کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھام لیا۔

"پاکستان جانے والے تمام مسافروں سے گزارش ہے کہ وہ بورڈنگ کے لیے آجائیں ان کی فلائیٹ کا نام ہونے والا ہے۔"

وہ شخص یہاں وہاں نظر دوڑاتے ہوئے با آواز بلند یہ سب کچھ کہہ کر وہاں سے جا چکا تھا اس کے جاتے ہی نیو نے اپنا دیر سے رکھا ہوا ساں بحال کیا اور پھر سامان کی بورڈنگ کے بعد سے جہاز میں سوار ہونے کا ایک ایک پل اسے ایک صدی کے برابر لگ رہا تھا، جیسے تیسے یہ تمام عمل مکمل ہوا وہ بحفاظت جہاز کے اندر داخل ہو گئی اور جب تک جہاز نے رن وے نہ چھوڑا وہ مسلسل آیت الکرسی کا ورد کرتی رہی اتفاق کی بات تھی اسلام آباد پہنچنے ہی اسے پہلی ہی فلائیٹ کا ٹکٹ مل گیا جس کے ذریعے اسے کراچی جانا تھا وہ صرف چار گھنٹے بعد ہی اسلام آباد سے کراچی پہنچ گئی، اسلام آباد سے کراچی تک کا سفر اس نے مکمل ٹرائس کی سی کیفیت میں گزارا اسے یقین ہی نہ آ رہا تھا کہ وہ پاکستان پہنچ چکی ہے اس کا دل چاہ رہا تھا وہ اپنے آس پاس موجود لوگوں کو پکڑ پکڑ کرتا کس طرح وہ سکندر کے منہ پر طمانچہ مار کر آئی ہے، وہ چیخ کر کہنا چاہتی تھی کہ عورت کو کبھی کمزور مت سمجھو نہ ہی اسے اتنا تنگ کرو کہ وہ تم سے انتقام لینے پر مجبور ہو جائے، کراچی ایئر پورٹ پر پہنچنے ہی اپنی سرزمین کے احساس نے اس کی گردن کو خسرے مان دیا، تمام مسافر اپنا اپنا سامان حاصل کر کے باہر نکل رہے تھے اس کا بیگ جانے کہاں غائب ہو گیا تھا، کاؤنٹر پر موجود شخص کا کہنا تھا شاید اسلام آباد سے لوڈی نہیں ہوا، بالآخر آگے گئے بعد اس کا بیگ مل گیا۔

وہ جانتی تھی کہ یہ تمام وقت باہر بیٹھے اس کے گھروالوں نے کتنی اذیت میں گزارا ہو گا مگر وہ اس کا سہل آف ہو چکا تھا اس لیے وہ ابھی تک کسی کو اپنے پیچھے کی اطلاع نہ دے سکی تھی، بیگ ملتے ہی سامان ٹرائل میں رکھ کر وہ جلدی جلدی باہر کی جانب چل دی، ہر طرف پھیلید نظمی بھانت بھانت کی زبان بولتے مختلف طرح کے لوگ ان کا سارا سامان بکھیر کر چیکنگ کرتے مملہ کے افزادیہ سب کچھ دوسرے ممالک سے قطعی مختلف تھا مگر یہ بھی اسے اچھا لگ رہا تھا، انانیت کے احساس نے اس کے اندر سرخوشی بھردی تھی یا ہر نکتے ہی وہ سکندر کو فون کرنا چاہتی تھی تاکہ اسے بتا سکے۔

"کہ وہ ابوذر کے ساتھ اپنی پیاری سرزمین پر پہنچ چکی ہے، وہ اس کا بیٹا اس دس لے آئی ہے جس کا نام وہ ہر بار خقارت سے لیتا تھا مگر وہ اپنے بیٹے کو بھی بھی دو سرا سکندر نہ بنے دے گی۔" یہ سب سوچتے اس کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں، لاؤنچ سے باہر نکلتے ہی وہ اپنے جذبات پر قابو کھو بیٹھی اور بے اختیار جھک کر اپنی سرزمین کو بوسہ دیا، آس پاس کھڑے تمام مسافر چیخنے ٹی شرٹ میں لمبوس اس دلی تپ سی لڑکی کو حیرت سے دیکھ رہے تھے جو زمین کو بوسہ دینے کے بعد وہیں پیچھے بیٹھی زاوہ قطار رو رہی تھی۔

امان نے اسے نیچے بیٹھتے دور سے ہی دیکھ لیا تھا یہ ہی وجہ تھی جو وہ تیزی سے بھاگتا اس کی سمت آیا۔ اس کے قریب پہنچتے ہی اسے کندھے سے تھام کر اٹھانے کی کوشش کی، نیو نے روتے ہوئے اپنا سر اٹھایا اس کے سامنے اس کا اپنا بھائی کھڑا تھا، اپنا سا بھائی جسے جانے وہ کتنے عرصے بعد دیکھ رہی تھی امان کے اٹھاتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بلک بلک کر روتے ہوئے اس کے گلے لگ گئی، آج کتنے زمانے کے بعد وہ اس طرح روئی تھی کیونکہ اسے رونے کے لیے کسی اپنے کا کندھا فانیص ہو گیا تھا اور آنسو ہمیشہ اپنوں کے سامنے ہی کرتے اچھے لگتے ہیں کیونکہ وہ انہیں دل کی گہرائیوں سے پونچھتے ہیں۔



جانے آج کتنے دنوں بعد وہ ایسی پرسکون اور گرمی نیند سوئی کہ اسے کچھ ہوش بھی نہ رہا ابھی بھی شاید وہ اور سوئی جو اچانک باہر سنائی دینے والی تیز شور سے اس کی آنکھ نہ کھل جاتی، پہلے تو دیر تک اسے سمجھ ہی نہ آیا کہ وہ کہاں ہے؟ پھر جیسے ہی اس کے حواس بحال ہوئے وہ یک دم اٹھ بیٹھی ابوذر اس کے دائیں پسلوں گرمی نیند سو رہا تھا وہ بھی اس کی طرح کئی ماہ کی ذہنی اور جسمانی تھکن کا شکار تھا بے شک وہ بچہ تھا مگر اس کے ساتھ در بدر پھرتے ہوئے تھک گیا تھا۔

وہ بڑے پیار سے اس کے چہرے کو اپنی نگاہوں میں لیے تک رہی تھی جب ایک بار پھر امان کی تیز آواز بند دروازے سے اندر سنائی دی نیو فوراً "گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی جلدی جلدی بیڈ سے دوٹپا اٹھا کر اوڑھا اور ننگے پاؤں ہی کمرے کا دروازہ کھول کر باہر لاؤنچ میں آگئی جہاں صوفے پر ردا کے بالکل برابر میں جنید بیٹھا تھا جبکہ کچھ فاصلے پر نہایت ہی غصے کے عالم میں امان کھڑا تھا جس نے نیو پر ایک نظر ڈالتے ہی اپنے ہاتھ میں تھما موبائل صوفے پر بیٹھے جنید کی گود میں پھینک دیا۔

اسے چوبیس گھنٹے ہو گئے تھے گھر آئے ہوئے اور ان چوبیس گھنٹوں میں پہلی بار جنید دکھائی دیا تھا جس کے چہرے پر آج بھی اس کے لیے ویسی ہی بے حسی نظر آرہی تھی جیسے کئی سال قبل اس نے سان کے لیے دیکھی تھی۔

"کیا ہوا امان تم کیوں اس قدر غصے میں دکھائی دے رہے ہو؟ خیریت تو ہے نا۔" جنید کو مکمل طور پر نظر انداز کرتے ہوئے اس نے امان سے دریافت کیا۔

"اے؟ چھوڑو یہ تو بغیر کسی وجہ کے جذباتی ہو رہا ہے جنہیں میں بتاتا ہوں اصل بات کیا ہے؟" امان کے جواب دینے سے قبل ہی جنید صوفے سے اٹھ کر کھڑا ہوا اور آہستہ آہستہ چلتا اس کے سر مقابل آگیا۔

"ابھی ابھی میرے پاس سکندر کا فون آیا تھا، دراصل آٹنی فاطمہ نے ابوذر کی کم شدگی کے دکھ کو دل میں ایسا لیا کہ اسپتال جا پہنچیں انہیں شدید قسم کا انیک ہوا ہے اور اس حالت میں بھی وہ صرف ابوذر کو ہی یاد کر رہی ہیں، سکندر کا کہنا ہے کہ تم ہم سب کی ملی بھگت سے پاکستان پہنچی ہو، اپنی ماں کی اس حالت کا وہ دار بھی وہ تم کو ہی گھبرا رہا ہے اور اس کا کہنا ہے کہ اگر ابوذر واپس ملائیشیا نہ گیا اور فاطمہ کو کچھ ہو گیا تو وہ ہمیں نہیں چھوڑے گا۔"

اس نے حیرت کے عالم میں سامنے کھڑے جنید پر ایک نگاہ ڈالی اور دو سری نظراس کے پیچھے کھڑے امان پر،

جس کے چہرے پر چھائی سرخی اس کے اندرونی غصے کو واضح کر رہی تھی وہ حیران تو اس بات پر تھی کہ اتنا سب ہو جانے کے بعد بھی سکندر میں اتنی جرات تھی کہ وہ اس کے سکے بھائی کو فون کر رہا تھا؟ اور اس کا سگا بھائی جانے کس منہ سے سکندر کے فون سن رہا تھا؟ اسے شدید قسم کا دکھ اور صدمہ ہوا۔

”آپ شاید جانتے نہیں ابوزر میرا بیٹا ہے آئی فاطمہ کا نہیں۔“ دل تو چاہ رہا تھا خوب کھری کھری سنائے مگر جب بولی تو صرف یہی اک جملہ باقی تمام الفاظ اس کے حلق میں ہی گھٹس گئے۔

”میں جانتا ہوں وہ تمہارا بیٹا ہے مگر آخر وہ بھی تو دادی ہیں نا اس کی اور پھر سکندر باپ، میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم اس معصوم کو کیوں یہاں لے آئی ہو رلنے کے لیے، جہاں اس زمانے میں کسی کا مستقبل محفوظ نہیں میری ماں تو اسے واپس کر دو اس کی ذمہ داری بھانا تمہارے بس کی بات نہیں ہے اس کو اس کے باپ کے حوالے کر دو یہ میرا تمہیں بہترین مشورہ ہے۔“

”جنید بھائی آپ ہلیز اپنے مشورے اپنے پاس رکھیں، اسے اب آپ کے کسی بھی مشورے کی ضرورت نہیں ہے۔“ مان کے جواب نے اس کی مشکل حل کر دی۔

”دیکھو اماں وہ کہہ رہا ہے کہ میں پاکستانی سفارت خانہ پر کیس کر دوں گا جن کی مدد سے نیرو اس ملک سے فرار ہوئی، وہ کہتا ہے کہ وہ عالمی سطح پر اپنے بیٹے کا کیس لڑے گا اب بتاؤ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو پھر بھی تو یہ بچہ واپس جائے گا۔“ جنید کے الفاظ سن کر نیرو کو حیرت ہوئی جانے یہ کیا شخص تھا جس کی ہمدردی اپنی بہن کے بجائے ایک ایسے مرنے والے کے لیے تھی جس کی ہت دھری، خود سری اور ضد نے ایک جوان عورت کو بھری دنیا میں تھما دیل دیا وہ تو شاید اس کا نصیب اچھا تھا جو وہ بغیر کسی نقصان کے واپس اپنوں تک پہنچ گئی ورنہ تو اسے آگے سوچ کر ہی اسے جھرجھری سی آگئی۔

”آپ بے فکر رہیں وہ اب میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا یہ سب گیدڑ بھکیاں ہیں اگر وہ کوئی اتنا ہی شیر دل مرنے والا مجھے اپنے ملک میں روک کر رکھتا تا جب میں وہاں سے اپنا بیٹا لے کر واپس آسکتی ہوں نا تو اس بچے کی حفاظت بھی بہت اچھی طرح کر لوں گی اسے کہیں کہ اب صرف حماد کی سوچے ابوزر کو بھول جائے وہ بچے بھی میں نے نوکیل سے مشورہ کر لیا ہے اب ہمارا کچھ نہیں کر سکتا یہ بچہ اس کی ماں کا نہیں ہے بلکہ میرا ہے اور کوئی عالمی قانون جھین نہیں سکتا مجھ سے۔“

”بہر حال میرا مقصد تو صرف تم لوگوں کو سمجھانا باقی جو تم لوگوں کی مرضی۔“

یہ کہہ کر جنید وہاں رکھا نہیں بلکہ تیزی سے پیٹا ہر نکل گیا اس کے ہاتھوں پر کتنی ہی وہ اپنا ضبط کھو بیٹھی اور اماں کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی اسے امید نہ تھی کہ سکندر ابھی بھی اس کا پیچھا کرے گا اپنی طرف سے تو وہ سکندر نا کی کتاب بند کر چکی تھی مگر آج جنید کی گفتگو سے اندازہ ہوا یہ کتاب بند کرنا شاید اتنا آسان نہیں جتنا اس نے سمجھ لیا تھا۔

”نیرو بچے آج آؤ تم سے ملنے خبثم آئی ہیں۔“

شفاف اسے دروازے سے ہی اطلاع دے کر واپس پلٹ گئی پہلے تو اس کا دل چاہا جائے ہی نہیں مگر جانے کیا سوچ کر اٹھ کھڑی ہوئی، ایک نگاہ آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر خود پر ڈالی، مگر جاہلیہ اچھے ہوئے بال، وہ اس حال میں بچے نہیں جانا چاہتی تھی لہذا پہلے کپڑے تبدیل کیے، اپنے بال بنائے اور چہل پہن کر نیچے آگئی سامنے ہی صوفے پر خبثم بیٹھی تھیں جو اسے دیکھتے ہی فوراً اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”اسلام علیکم آئی۔“ اس کے سلام کے جواب میں خبثم نے اسے گلے لگا لیا۔ ”کیسی ہو بیٹا طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“ انہوں نے اس کا جازنہ لیتے ہوئے سوال کیا۔

”ہاں جی شکر الحمد للہ میں بالکل ٹھیک ہوں آپ سنائیں کیسی ہیں کچھ کمزور دکھائی دے رہی ہیں“ وہ ان کے قریب ہی بیٹھ گئی جبکہ رحاب سامنے رکھی کرسی پر نہایت ہی خاموشی سے بیٹھی تھی اس کی گود میں موجود ابوزر کو دیکھ کر وہ تھوڑا سا حیران ضرور ہوئی مگر کچھ بولی نہیں اسے محسوس ہوا جیسے خبثم اس سے کچھ کہنا چاہتی ہیں مگر کہہ نہیں پاتیں اور اسی وقت جب وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ آیا خبثم آئی کو اس سے کوئی کام ہے؟ ایک دم ہی لاؤنج کے دروازے سے ساناندر داخل ہوا جسے دیکھتے ہی اسے کرٹ سا لگا اور وہ فوراً سے پنڈھرائی جبکہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ایکسکیوز می آئی مجھے ابوزر کو کھانا کھلانا ہے اس لیے ہلیز آپ براست مانھیے گا میں جا رہی ہوں۔“

خبثم کا کوئی بھی جواب نہ بغیر وہ رحاب سے ابوزر کو لیتی ہوئی تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی، اس طرح وہاں سے جاتے دیکھ کر لاؤنج کے دروازے پر کھڑے ساناندر ایک دم ہی دکھ سے بھر گیا وہ تو صرف اور صرف اسے دیکھنے کے لیے ہی وہاں آیا تھا مگر اس نے تو اسے اس قابل بھی نہ سمجھا کہ رک کر خیریت ہی دریافت کر لیتی اس کے اس طرح شدید رد عمل نے ساناندر کو تھوڑا سا باؤس کر دیا اسے اندازہ ہوا اب یہ معاملہ پہلے سے بھی زیادہ بگڑ چکا ہے اس کے باوجود اس کے دل میں کہیں امید کا جتنو ضرور چمک رہا تھا کہ شاید وہ زندگی میں کبھی نہ کبھی نیرو کے دل میں موجود تمام غبار کو دھو کر وہاں پھر سے اپنی محبت کو بھروسے کا اور اسی ایک دن کے انتظار میں اسے جینا تھا۔

”مجھے انصاف چاہیے، میری بیوی اپنے سفارت خانے کی مدد سے بغیر پاسپورٹ کے اس ملک سے فرار ہوئی اور ساتھ ہی میرا بیٹا بھی اغوا کر کے لے گئی جب کہ میرے بیٹے کا پاسپورٹ ہلاک تھا، پھر وہ کس طرح پاکستان پہنچا؟ اس کا ذمہ دار کون ہے؟“

”میں اسے بھائی کے بغیر بالکل تنہا ہوں، میری ماں اپنے بوائے فریڈ کے ساتھ دیس بھاگ گئی اور ساتھ ہی میرا بھائی بھی لے گئی جو میرے بغیر سوتا نہ تھا مجھے میرا بھائی واپس چاہیے۔“

نیرو کے سامنے مختلف ملائی اخبار بکھرے بڑے تھے جن کے تراشے آج صبح ہی کو ریز کے ذریعے ریجہ نے بھیجے تھے، اسے یہ اطلاع تو کئی دن قبل ہی مل گئی تھی کہ سکندر حماد اور فیدا کے ساتھ مل کر پاکستانی سفارت خانے اور ایئر پورٹ کے باہر مظاہرے کر رہا ہے اس کے ساتھ کچھ سماجی تنظیمیں بھی شامل تھیں جن کے نزدیک سکندر ایک مظلوم مرنے والا تھا اس کے علاوہ اس نے وہاں پریس کانفرنس بھی کی تھیں جس میں وہ نیرو پر کسی نامعلوم مرنے والے سے ایک ترین الزامات لگا رہا تھا۔

سکندر اس پر کیا الزامات لگا رہا تھا؟ اس سے اب نیرو کو کوئی فرق نہ پڑتا تھا مگر اس کے لیے دکھ کی بات تو صرف یہ تھی کہ ان مظاہروں میں حماد بھی اس کے ساتھ شریک تھا جس کی برین واشنگ اس طرح کی گئی کہ اب وہ بھی ان لوگوں کے ساتھ شامل ہو کر اپنے ہاتھوں میں سنگ اٹھائے نیرو کے تعاقب میں تھا۔

اخبار میں نیرو کی تصاویر کے ساتھ ساتھ اس کے پاسپورٹ کی تصویریں تھیں جو سکندر اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر پریس والوں کو دکھا رہا تھا، وہ پاسپورٹ جس کی حیثیت اب ایک معمولی سے کاغذ کے ٹکڑے سے بڑھ کر نہ تھی، سکندر نے اپنے تمام بیانات میں خود کو نہایت ہی مظلوم ثابت کرنے کی کوشش کی تھی اور اپنی مظلومیت کو ثابت کرنے کے لیے اس نے حماد کا اندھا استعمال کیا مگر پھر بھی اسے یقین تھا کہ ایک دن ضرور آئے گا جب حماد اپنی ماں کی بے گناہی اور اپنے باپ کے ظلم کا ضرور علم ہو گا اور پھر وہ اپنی ماں اور بھائی سے ملنے ضرور آئے گا اسے اپنے خدا پر یقین کامل تھا جس نے اتنی مشکلات کے باوجود اسے یہاں تک بحفاظت پہنچا دیا تو یقیناً ”وہ بھی ایک دن حماد کو بھی اس تک ضرور لائے گا۔“

”نہیں امی اب یہ سب کچھ بالکل ہی ناممکن ہے میری زندگی میں نہ شان اور نہ ہی کسی اور مرد کی گنجائش بالکل ختم ہو چکی ہے۔ لہذا برائے مہربانی آپ آئندہ اس حوالے سے مجھ سے کوئی بھی بات مت کیجئے گا۔“

یہ سب کچھ کہہ کر وہ ہاں دیکھ کر نہیں بلکہ تیزی سے دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل آئی سامنے ہی عین میڑھیوں کے قریب رحاب کھڑی تھی جو یقیناً ”ردا اور نبیوہ کے درمیان ہونے والی تمام گفتگو سن چکی تھی جس کا اندازہ اس کے چہرے پر چھائی شرمندگی سے لگایا جا سکتا تھا۔ نبیوہ بنا اس پر توجہ دے تیزی سے میڑھیاں چڑھتی اور اپنے کمرے میں آئی اسے وہ کہ اس بات پر غصہ آ رہا تھا کہ اب کس طرح اتنی جگہ میں اس کے رشتے کی بات کی، اس وقت جب یہ سب کچھ اس کی چاہ میں شامل تھا تو ان تمام لوگوں نے مل کر شان کو اس کی زندگی سے نکال باہر پھینکا اور اب جب وہ عشق و عاشقی کے تمام اسباق زمانے کی تلخیوں میں کھول کر بیٹھی تھی تو جانے کیوں ان ہی تمام لوگوں کو اس کی زندگی کا وہ تجربہ نظر آنے لگا تھا جسے وہ اللہ کی رضا جان کر راضی تھی۔

اسے محسوس ہوا شاید اس کے آس پاس رہنے والے تمام لوگ اس پر ترس کھانے لگے ہیں اور اس ترس کے سبب رحاب اور اس کی ماں نے شان نائی کڑے مردے کو اکھاڑ کر پھر سے کھڑا کر دیا تھا یہ جانے بغیر کہ اب ایسا ہونا نہ صرف مشکل بالکل ناممکن بھی ہے۔

”رفید اور اس کی ماں کو تو یاد ہانے جانے کب کا گھر سے نکال دیا ہے اب دونوں ماں بیٹیاں الگ فلیٹ لے کر رہ رہی ہیں۔“ اس نے آج ہی رجبہ کو فون کیا تھا جس کا مقصد صرف اور صرف حماد کی خیریت جانتا تھا اسے رفید یا اس کی ماں سے کوئی دلچسپی نہ تھی مگر حماد کا پوچھتے ہی رجبہ نے اسے یہ تمام تفصیل بھی سنائی شروع کر دی جو اس کے لیے بالکل ہی بے کار تھی۔

”اوپہ اچھا اب حماد کس کے ساتھ رہتا ہے؟“

”فی الحال تو یاد ہا کے ساتھ ہی ہے۔ رفید ا کا فلیٹ اس کے اسکول سے کافی دور ہے ہاں البتہ ہر ویک اینڈ پر وہ فاطمہ کی طرف رہنے ضرور جاتا ہے۔“

”مجھے سمجھ نہیں آتا آخر سکندر راید ہا یا نور بلینڈوں میں سے کسی ایک لڑکی سے شادی کیوں نہیں کر لیتا ان عورتوں کے لیے ہی تو اس نے اپنا گھر اور بچے برباد کیے پھر کیوں اتنے ماہ گزرنے کے باوجود ابھی تک بغیر شادی کے وقت گزار رہا ہے۔“

یہ بات اس کے ذہن کو اکثر ہی الجھا دیتی تھی اس لیے بھی آج اپنی اس الجھن کا اظہار وہ رجبہ کے سامنے بھی کر بیٹھی۔

”دراصل اگر وہ حماد کے بالغ ہونے سے قبل دوسری شادی کرے گا تو حماد کو لازمی طور پر اس کی ماں کے حوالے کرنا پڑے گا اسی سبب وہ شاید اس کے بالغ ہونے کا انتظار کر رہا ہے۔“ رجبہ نے جتنی معلومات خود حاصل کی تھیں وہ آگے پہنچا دیں۔

”اور ہاں اتنی نوا کا فون آیا تھا تمہاری خیریت دریافت کر رہی تھیں۔ تمہارا نمبر بھی مانگا مگر میں نے نہیں دیا اب اگر تم کو تو دسے دوں وہ سب تم سے بات کرنا چاہ رہی ہیں اور ہاں اتنی نوا کے علاوہ شوہا اور سہتی بھی تمہارے لیے بے قرار ہیں۔“

”ہاں ضرور دے دو بلکہ ایسا کرو مجھے بھی ان کا نمبر دو میں خود بھی فون کر کے انہیں اپنے خیریت سے پاکستان پہنچنے کی اطلاع دے دیتی ہوں یہی تو وہ لوگ تھے جنہوں نے میری مشکل کو آسان بنانے میں میرا ساتھ دیا اور پھر اگلے پل رجبہ سے اتنی نوا اور شوہا نمبر لے کر اس نے فون بند کر دیا۔

کیسے کاریگر ہیں یہ، آس کے درختوں سے لفظ کاٹتے ہیں اور میڑھیاں بناتے ہیں

کیسے باہر ہیں یہ، غم کے بیج بوٹے ہیں اور دلوں میں خوشیوں کی کھیتیاں لگاتے ہیں

کیسے چاہہ کر ہیں یہ، وقت کے سمندر میں کشتیاں بناتے ہیں، آپ ڈوب جاتے ہیں

”دیکھو نبیوہ ہماری بات مان لو امی میں ہی تمہاری اور ابو ذری بھلائی ہے۔“

آج ردا کے ساتھ ساتھ شفا اور رحاب بھی اس کے سامنے کھڑی تھیں۔

”تم نہیں جانتیں بیٹیا یہ پڑا جیسی زندگی ایک مرد کے سہارے کے بغیر گزارنا کس قدر مشکل اور دشوار ترین ہے اور وہ بھی تم جیسی خوب صورت اور کم عمر لڑکی کے لیے۔“

”پہلی بات تو یہ کہ میں اب تمہا نہیں ہوں میرے ساتھ میرا بیٹا موجود ہے اور اس کے علاوہ مجھ جیسی تمہا اور خوب صورت لڑکی اگر اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر تھا تو لینڈ جیسے ملک میں اپنا وقت گزار کر خیریت کے ساتھ وطن لوٹ سکتی ہے تو یقیناً اپنے وطن میں اپنیوں کے درمیان رہ کر اسے آگے بھی کوئی دشواری نہ ہوگی اور اس سلسلے میں میرا خدا پرستین کامل ہے وہ اب بھی ہر مقام پر میری مدد کرے گا ویسے بھی میں اب جاب کرنے کا فیصلہ کر چکی ہوں تاکہ اپنی رقم سے اپنے بیٹے کی کفالت کروں اور اسے اس معاملے میں کسی بھی قسم کے احساس محرومی سے بچا کر رکھوں کہ کوئی دوسرا اس کی ذات پر اپنی پیسہ خرچ کر رہا ہے۔“

وہ جیسے ہر بات کا فیصلہ کیے ہوئے تھی حالات کی غنیمتوں نے اسے بھی پھر کی طرح سخت کر دیا تھا ردا کے ساتھ ساتھ شفا کو بھی ایسا ہی محسوس ہوا جیسے اب نبیوہ کو سمجھانا بے حد مشکل ترین امر ہو چکا تھا۔

”نبیوہ میں اور جیند بھی تم سے بہت شرمندہ ہیں یہاں تک کہ امی بھی تم سے معافی مانگنا چاہتی ہیں وہ تمہارے ساتھ ساتھ ابو ذری کی ذمہ داری نبھانے کو بھی تیار ہیں پلیز تم ہم سب کو معاف کر دو اور ہماری غلطیوں کی سزا شان کو مت دہوہ مرجائے گا۔“

بھابھی مجھے نہ صرف آپ بلکہ جیند بھائی اور آئی کسی بھی فرد سے کوئی گلہ نہیں ہے لہذا آپ لوگ معافی مانگ کر مجھے مزید شرمندہ نہ کریں دراصل میرا واسطہ زندگی میں صرف دو ہی مردوں سے پڑا ایک شان اور دوسرا سکندر اور مجھے دونوں نے ہی مایوس کیا مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ان دونوں مردوں میں ذرا برابر بھی فرق نہیں ہے دونوں ہی اپنے اپنے مفاد کے لیے عورت کو قربان کرنا جانتے ہیں پہلے ماں اور بہن کے لیے شان نے میرا استحصال کیا اور اس کے بعد وہ ہی کام سکندر نے بھی بخوبی انجام دیا اور سچ تو یہ ہے کہ جس طرح میری زندگی میں سکندر کی گنجائش بالکل ختم ہو چکی ہے ویسے ہی میرے نزدیک شان بھی ایک ایسا اجنبی مرد ہے جس سے میرا دوبارہ کوئی رشتہ استوار ہونا بالکل ہی ناممکن ہے۔“

”دیکھو نبیوہ اس نے صرف تمہاری خاطر اپنی بیوی کو چھوڑا وہ مرینہ کو طلاق دے چکا ہے۔“

رحاب شاید بار بار جانتی تھی یا پھر آج وہ شان کا مکمل دفاع کرنے کا ٹھانے ہوئے تھی۔

”یہ کون سا ایسا نیکی یا فخر کا کام ہے جسے آپ بڑھا چڑھا کر سنار ہی ہیں یہی تو وہ وجہ ہے جس نے سکندر اور شان کو ایک ہی لائن میں کھڑا کر دیا ہے وہ ایک ہی جیسے مرد جنہوں نے عورت کو اپنے مفاد کے لیے اپنا یا اور اپنے ہی مفاد کی خاطر چھوڑ دیا سکندر نے اگر مجھے طلاق دی تو نور بلینڈ کے لیے تو کیا شان نے مرینہ کو طلاق نہیں دی میرے لیے

تو پھر چائیں کیا فرق ہے۔ ان دونوں مردوں میں جس کے باعث میں شان کو سکندر پر فوقیت دوں، ویسے بھی فی الحال مجھے ابھی شادی کرنی ہی نہیں ہے اس لیے برائے مہربانی آپ لوگ بار بار اس مسئلے پر بات کر کے مجھے مجبور نہ کریں کہ میں یہ گھر بھی چھوڑ دوں اور کسی ہوشیار یا دارالامان کی راہ لوں جہاں میری زندگی میں کسی کا عمل دخل نہ ہو۔“ اور اگر وہاں سکندر تم تک پہنچ گیا اپنے بیٹے کے حصول کے لیے پھر کیا کرو گی۔“ رجا ب نے سکندر کا نام محض اسے خوف زدہ کرنے کے لیے استعمال کیا ”میں جب سکندر کے ملک میں تھا اور یہ یاد دہکار وہ کر اس سے مقابلہ کر سکتی ہوں تو اب یہاں مجھے سکندر کا کوئی خوف نہیں ہے میں خود میں اس کا مقابلہ کرنے کا پورا حوصلہ رکھتی ہوں آپ اس سلسلے میں میری بالکل بھی فکر مت کریں۔“

ایک بدلی ہوئی نیبو جس کا اندازہ اطوار پہلے والی نیبو سے قطعی مختلف تھا جسے دیکھ کر بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ اب وہ نانے میں تنہا جیسے کافن جان چکی ہے اور شاید اب دنیا میں سفر کرنے کے لیے اسے کسی مرد کی ضرورت نہیں تھی۔

”میں تو سمجھ رہا تھا تمہاری ضد اور غصہ والی عادت اب ختم ہو چکی ہو گی مگر تم سے بات کر کے اندازہ ہوا کہ بجائے ختم ہونے کے یہ عادتیں تم میں مزید پختہ ہو چکی ہیں۔“

وہ ہی نرم لہجہ جس میں وہ ہمیشہ سے نیبو سے گفتگو کرنے کا عادی تھا، نیبو کی سماعتوں سے گزرنا اس کے دل میں اترا چلا گیا مگر اب شاید وہ دل کے بجائے سوچنے کے لیے داغ استعمال کرنے لگی تھی یہ ہی سبب تھا جو صرف ایک سیکنڈ لگا سے شان کے لہجے کے ٹرانس سے باہر آنے میں اور اگلے ہی پل وہ فوراً ”نارمل ہو گئی۔“

”چلو شکر ہے تمہارا میرے بارے میں لگائے جانے والے اندازے اب بھی درست ثابت ہوتے ہیں ورنہ میں تو سمجھی تھی وقت کے ساتھ جہاں سب کچھ ختم ہوا وہاں یہ عادت بھی ختم ہو گئی ہو گی بہر حال جو بھی ہے اس سلسلے میں، میں اپنے فیصلے سے تقریباً ”تمام ہی لوگوں کو آگاہ کر چکی ہوں پھر تم نے کیوں زحمت کی جبکہ تم جانتے ہو کہ میرا جواب اب ہاں میں کبھی بھی تبدیل نہیں ہو سکتا۔“

جب وہ بولی تو سابقہ ہٹ دھرمی ابھی بھی اس کے لہجے میں موجود تھی اور شان جو یہ سمجھ رہا تھا کہ وہ اسے اپنے سامنے پا کر پکسل جانے لگی اس کا یہ اندازہ سو فیصد غلط ثابت ہوا اسے نیبو سے اس لب و لہجہ کی بھی امید نہ تھی جس میں وہ بات کر رہی تھی اس نے تو ہمیشہ سے ہی اپنی ہر بات کے جواب میں اس کا سر تسلیم خم ہی دیکھا تھا جب کہ آج کی صورت حال پہلے سے کافی مختلف تھی۔

”دیکھو نیبو میں مانتا ہوں تمہارے ساتھ ہونے والی ہر زیادتی میں ہم سب شامل تھے ہم لوگوں کے سبب ہی تم دیار غیر میں ان لوگوں کے ہاتھوں اذیت اٹھا کر واپس آئی ہو مگر اب اس غلطی کا اندازہ تقریباً ”تمام ہی لوگوں کو ہو چکا ہے اور سب فرداً فرداً“ تم سے معافی مانگنے کو بھی تیار ہیں ہم سب دل و جان سے یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں تمہاری کھوئی ہوئی خوشیاں واپس مل جائیں اور یہ صرف اس وقت ہی ممکن ہے جب تم ہماری بات مان لو۔“

شان اس سے ہر حال میں اپنی بات منوانے کا فیصلہ کر کے ہی یہاں آیا تھا جس کا اندازہ اس کی گفتگو اور لہجے میں چھپی امید سے لگایا جاسکتا تھا۔

”یہاں ہم کا میضہ غالباً“ تمام اپنی ماں اور بہن کے لیے استعمال کر رہے ہو۔“

اپنی بات کو درمیان سے ہی روک کر اس نے شان کے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور پھر بتا اس کا جواب سننے بات کو آگے جاری رکھتے ہوئے بولی۔

”جانتے ہو شان سکندر بھی جب کوئی بات کرتا تھا تو ہمیشہ ہم ہی کا میضہ استعمال کرتا تھا جس سے اس کی مراد آئی فاطمہ اور رفیدہ ہوتیں اور میں وہ دفعہ وہ مردوں کے ہاتھوں اس ”ہم“ سے ہی تو زیادہ ہوتی ہوں یاد ہے تم کو اپنی

آخری گفتگو جب تم نے مجھ سے محض اس لیے قطع تعلق کیا کہ تمہاری وجہ سے تمہاری بہن کا گھر برباد ہو رہا تھا اب سوچو راز اگر آگے آنے والے چند سالوں میں صورت حال آج سے مختلف ہو جائے اور تمہارے سامنے پھر میں اور رجا ب آن کھڑے ہوں اور تمہیں ہم میں سے کسی ایک کا گھر بچا پڑے تو کیا کرو گے، میری خاطر اپنی بہن کو برباد کرنے کا حوصلہ ہے تم میں۔“

”ایسا اب نہیں ہو گا یہ میرا تم سے وعدہ ہے اب میرے اور تمہارے درمیان کوئی نہیں آئے گا۔“

اس نے باقی لہجہ میں نیبو کو یقین دہانی کرانے کی کوشش کی۔

”نہیں شان اب یہ سب کچھ ناممکن ہے میں کسی بھی ایسے مرد پر اب اعتبار نہیں کر سکتی جو سوچنے کے لیے اپنی ماں اور بہن کا داغ استعمال کرتا ہو ویسے بھی یقین جانو یہاں محبت، عشق و عاشقی جیسے الفاظ میری زندگی سے نکل چکے ہیں۔ میں اب وہ جذباتی سی نیبو نہیں رہی جو محبت کے نام پر سب کچھ وارنے پر تیار رہتی تھی میں تو اب ایک پختہ دل و دماغ کی مالک نیبو ہوں جس کی زندگی کا محور صرف اور صرف اس کا بیٹا ابو زر ہے اب میرا جینا مرنا سب میرے بیٹے کے لیے ہے اس کے علاوہ دنیا کا کوئی بھی مرد میرے نزدیک ثانوی حیثیت کا مالک ہے خواہ وہ کوئی بھی کیوں نہ ہو۔“

”تم مجھے ہر بار دنیا کے ان مردوں میں کیوں شامل کرتی ہو جو تم سے محبت کرنے والے نہ تھے جب کہ تم اچھی طرح جانتی ہو اس محبت ہی کے نام پر تو میں نے اپنی ساری زندگی وادری ہے وہ زندگی جو میں تمہارے بنا جیا ہوں موت سے بھی بدتر تھی۔ نیبو نے کہ میرے ساتھ ایسا ظلم۔“ وہ رو دینے لگا تھا۔

”شان تم شاید نہیں جانتے میرا آٹھ سالہ بیٹا حماد اپنے ہر ملنے والے سے بڑا یہ کہتا ہے کہ اس کی ماں اس کے بھائی کو اغوا کر کے اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ بھاگ گئی اب خود سوچو بھلا میں اگر تم سے شادی کر بھی لیتی ہوں تو میرے بیٹے پر میرا کیا بیج بنے گا کیا وہ سب کچھ جو سکندر نے اس کے دل میں بٹھایا ہے درست ثابت نہ ہو جائے گا اس کے دل میں پختی میری نفرت دگنا ہو جائے گی اور پھر یہاں اگر میری ساری محنت، قربانی رائیگاں جائے گی جو میں نے اس کے لیے اور ابو زر کے لیے دی اس مقام پر تو یقیناً ”ابو زر بھی مجھ سے بد ظن ہو کر اپنے باپ اور بھائی کا ساتھ دے گا تم سے شادی سکندر کے بیاں پر تصدیق کی مہر ثابت ہو گی جو میں ہرگز نہ چاہوں گی۔“

”دیکھو نیبو وہ سروں کی خاطر اپنی زندگی برباد نہ کرو کہنے دو جو کچھ سکندر تمہارے بارے میں کہہ رہا ہے، کل کو جب تمہارے بچے بڑے ہوں گے انہیں خود ہی سب حقیقت کا علم ہو جائے گا اور اس سلسلے میں ہمیشہ تمہارا ساتھ دوں گا۔“

شان کا بس نہیں چل رہا تھا وہ کس طرح نیبو کے انکار کو اقرار میں تبدیل کر دے وہ جب آج نیبو سے بات کرنے آیا تھا تو اپنی محبت کے زعم میں جیلا تھا مگر اب آہستہ آہستہ اس کا یہ زعم ختم ہوتا جا رہا تھا مگر بھی وہ اس کا دامن تھامے ہوئے تھا۔

”نہیں شان جو تم چاہتے ہو وہ اب کبھی نہیں ہو سکتا تم اور تمہارے ساتھ بے شک سب دنیا والے مجھے ڈھٹ اور بے حس لڑکی کا خطاب دے دیں مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا مگر میرے لیے اب وہ سری شادی کسی بھی صورت میں ممکن نہیں ہے اگر مجھے شکست دینے کے لیے سکندر بنا شادی کے وقت گزار رہا ہے تو میں بھی ابو زر کی پرورش تھا کر کے یہ ثابت کر دوں گی کہ دنیا میں عورت کمزور نہیں ہے وہ بھی اگر چاہے تو مرد ہی کی طرح تنہا اپنا بچے کی پرورش کر سکتی ہے جانتے ہو شان تم سے شادی کرنا میری شکست اور سکندر کی جیت ہو گی اس نے جگہ جگہ تمہارے نام کے ساتھ مجھے بدنام کیا ہے مگر اب جب میں تم سے شادی نہیں کروں گی تو یقیناً جانوہ ایک بار پھر مجھ سے ہار جائے گا اور اس کی یہ ہی شکست دیکھنے کے لیے میں اپنی تمام جوانی تباہ کر اپنے بیٹے کی پرورش کروں گی بالکل اسی طرح جس طرح وہ حماد کی کر رہا ہے بلکہ ہو سکتا ہے اس سے بھی اچھی ہی کروں کیونکہ مجھے یقین ہے

ایہ حاکم تربیت کے مقابلے میں، میری تربیت بہترین ہوگی، میں حمار پر بھی ثابت کر دلی کہ اس کے باپ نے جو کچھ میرے بارے میں اس سے کہا وہ صحیحاً "جھوٹ کا پلندہ تھا اور یہ صرف اور صرف اس وقت ہی ممکن ہے جب میں بنا کسی سارے کے اپنے بیٹے کو بال بوس کر کسی اعلیٰ مقام تک پہنچا دوں ویسے بھی شاید اب میں خود کو ذہنی طور پر کبھی کبھی شادی کے لیے آمادہ نہیں کر سکوں گی لہذا میرا تمہیں بہترین دوستانہ مشورہ یہ ہے کہ تم کوئی اچھی سی لڑکی دیکھ کر شادی کر لو میرے انتظار میں اپنی جوانی برباد نہ کرو۔"

اس کے لیےجی کی ثابت قدمی اس کے ارادے کے اٹل ہونے کو ظاہر کر رہی تھی اور شاید اب وہ مزید کچھ سنتا بھی نہ چاہتی تھی اسی سوچ کے تحت سنان شکست خوردہ انداز میں کمرے سے باہر نکل آیا سامنے ہی رحاب اور شفا کسی ہاتھی خبر کے انتظار میں کھڑی تھیں مگر سنان کی حالت نے ہنا پوچھی انہیں سب کچھ سمجھا دیا اور آج رحاب کو خود پر غصہ اور سنان پر دل کھول کر کہہ دیا کہ ہوا کاش وہ اور جیندا اپنی جھوٹی انا کے لیے یہ سب کھیل نہ کھیلتے تو یقیناً "سب کچھ اتنا غلط نہ ہوتا مگر شاید کاتب تقدیر نے جو کچھ ان سب کے نصیب میں لکھا تھا وہ ایسا ہی ہونا تھا اس میں کسی کا کوئی قصور نہ تھا مگر پھر بھی سنان کو یقین تھا کہ گزرتے وقت کے ساتھ وہ نیو کو رام کر لے گا شاید وہ اپنی محبت کا اعتماد کھوتا نہیں چاہتا تھا۔

جب کہ اس کے پیچھے کھڑی نیو بالکل مطمئن اور پرسکون تھی ویسے بھی وہ زندگی میں صرف ایک بار ہی فیصلہ کرنے کی عادی تھی فیصلے کر کے بدلتا اس کے فطرت میں شامل نہ تھا وہ چال جو آج سے کچھ سال قبل رحاب نے چل کر اسے بے دست دیا تھا آج اسی پرواپس پلٹ گئی اور اس میں یقیناً "نیو کا کوئی عمل دخل نہ تھا بلکہ شاید یہ تو مکافات عمل تھا اور وقت کی انٹی چال نے آج اس مقام پر رحاب کے ساتھ ساتھ ایک بار پھر سنان کو کھڑا کر دیا تھا جہاں کبھی نیو تنہا کھڑی تھی اسے یقین تھا اگر سنان اپنی بس کے بجائے خود اپنی کسی مجبوری کے تحت اس سے کنارہ کشی اختیار کرنا یا پھر نیو میں موجود کوئی عیب اسے راستہ تبدیل کرنے پر مجبور کرنا تو آج یقیناً "اس کی واپسی نیو کے لیے ایک اعزاز ہوئی پھر شاید وہ حمار کا خود کے لیے استعمال لفظ "بوائے فرینڈ کے ساتھ فرار" بھی بھول جاتی مگر جن حالات میں سنان نے اسے بیچ راہ میں چھوڑ کر اپنا راستہ تبدیل کیا تھا اب اس کے لیے سنان جیسے مدد کو اپنا نا بھی ممکن نہ رہا تھا اور یہ بات اس کے علاوہ شفا بھی اچھی طرح جانتی تھی کہ اب اگر وقت نے کبھی نیو کو اپنا فیصلہ تبدیل کرنے پر مجبور بھی کیا تو یقیناً "وہ دوسرا مدد پھر بھی سنان نہ ہو گا کیونکہ جس طرح اپنی زندگی سے سکندر کو نکالنے میں کامیاب ہوئی تھی بالکل اسی طرح اس کا دل بھی سنان کی محبت سے خالی ہو چکا تھا وہ سکندر اور سنان نامی دونوں مردوں کو بالترتیب اپنی زندگی اور دل سے نکال چکی تھی اور اب شفا کو انتظار تھا اس وقت کا جب کوئی تیسرا شخص نیو کی زندگی میں داخل ہو کر پورے خلوص نیت، دیانت داری اور محبت کے ساتھ اس کی دنیا ہی بدل دے اور اسے یقین تھا ایسا ضرور ہو گا ورنہ یہی صحیح مگر ایک رائٹ مین اس کی زندگی میں آئے گا ضرور۔

جیتی جاگتی دنیا کے ہنگاموں میں
یوں لگتا ہے جیسے میں ایک سایہ ہوں

کھویا ہے وہ جیسے ہاتھ کی لکیوں میں
ایسے اپنے ہاتھ کو تھکا رہتا ہوں



دل ربا

اس کے چاروں طرف پھیلے آگ کے شعلے اسے ایسے دکھائی دے رہے تھے جیسے سانپ اپنی لمبی لمبی زبانیں لیے اس کی جانب لپک رہے ہوں، اس کا خوب صورت جسم ان شعلوں کی زد میں آکر دھڑا دھڑا جل رہا تھا اور چربی کی بو اس کے تنہوں میں آرہی تھی، پیچ پیچ کر اس کی آواز بیٹھ گئی تھی، تکلیف کی شدت سے بند ہوئی اپنی آنکھوں کو بخشک کھول کر اس نے آخری بار اپنے سے کچھ فاصلے پر کھڑے ان افراد کو دیکھا جو اس کی بے بسی اور اذیت ناک موت کا نظارہ ایسی خاموشی سے کر رہے تھے جیسے یہ حقیقت نہ ہو، بلکہ کسی فلم کی شوٹنگ کے لیے فلما یا جانے والا کوئی سینہ دور وہ سب سیٹ پر کھڑے ہوئے تماشا۔

ان کی آنکھوں میں نظر آنے والی بے بسی اور سادہ سی اس کی آخری امید کو بھی ختم کر دیا اور زمین پر گرتے گرتے اسی آخری بل میں اس نے دونوں کی آگ کا تصور بھی کیا، جس کی شدت اس آگ سے کئی گنا زیادہ ہوگی، لیکن دنیاوی عیاشی میں مشغول بے خبر انسان اپنی چار روزہ زندگی میں کم ہو کر سب کچھ بھلا دیتا ہے۔ "واہ رے انسان تیری بے خبری۔"



وہ بے تماشا تھک چکی تھی، تھکن سے اس کی پنڈلیاں دکھ رہی تھیں، اس نے صوفے پر بیٹھ کر اپنی ٹانگیں سامنے بڑی ٹیبل پر رکھ لیں اور جھک کر اپنے ہی ہاتھوں سے اپنی پنڈلیاں دبانے لگی، ڈرننگ روم میں اسے سی کی کوننگ بھی معمول سے کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہی تھی یا شاید اسے ہی ٹھنڈ زیادہ لگ رہی تھی، اس نے میاں وہاں نظر دوڑائی اور کچھ فاصلے پر رکھا ہوا سا دپنہ جو جانے کس کا تھا، اٹھا کر اپنے گرو لیٹ لیا، اسی دم زوردار آواز سے دروازہ کھول کر امیر بھٹی اندر داخل ہوا، ساتھ ہی نصیبو لعل کے تیز گانے کی آواز بھی اندر تک سنائی دی، وہ یکدم ہی کوفت میں مبتلا ہو گئی۔

"وہ مول رہا جی جلدی آجائیں آپ کا ڈانس ہے۔"

”میرا ڈانس؟“ دل رہا ہے اس کی جانب سوالیہ انداز سے نکلا۔
 ”ابھی تو میں ڈانس کر کے آئی ہوں، مشکل پانچ منٹ پہلے، اب میرا نہیں انمول کا نمبر ہے۔“ اس کا انداز ناگواری لیے ہوئے تھا۔

”وہ تو ٹھیک ہے جی پر تماشائی صرف اور صرف آپ ہی کو دیکھنا چاہتے ہیں، مسلسل آپ کے نام کی آواز گونج رہی ہے ہال میں۔“ امیر بیٹی نے اپنے بچے کو قدرے خوشامد نہ بناتے ہوئے لجاجت سے کہا۔

”تو میں کیا تمہیں پاگل نظر آ رہی ہوں؟ ابھی مسلسل ایک گھنٹہ کی پرفارمنس کے بعد اگر بیٹی ہی ہوں کہ پیچھے ہی تم آگئے ہو۔“ وہ تنک کر بولی۔

”مجھے تو کسی۔“ امیر بیٹی کی بات درمیان میں ہی رہ گئی، ڈر سنک روم کا دروازہ کھول کر میڈم ربی اندر داخل ہوئی اور ایک تیز اور کھلی نظرا میر بیٹی پر ڈالی۔

”نہ تو میں نے کیا تمہیں یہاں آرام کرنے کے لیے بھیجا تھا؟ دل رہا جانی لوگ تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں، بس جلدی سے آ جاؤ، پھر ہم شو ختم کریں۔“ امیر بیٹی کو لٹاؤنے کے ساتھ ساتھ میڈم نے بڑے پیار بھرے انداز سے دل رہا کو مخاطب کیا، جبکہ ان کے لہجے کا مصنوعی پن دل رہا سے چھپا نہ رہ سکا، اب دل رہا کے لیے انکار کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ گئی تھی، وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی، خود پر لیا ہوا دھنڈا اتار کر پھینکا اور کمرے میں موجود ڈیڑھ تنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا بھرپور تنقیدی جائزہ لیا، اسکن کلر کا اسکن ٹائٹ لباس اس کے خوب صورت سراپے پر کسا ہوا اس کے وجود کے ہر عضو کو نمایاں کر رہا تھا، وہ جانتی تھی کہ اس حالت میں اس کا بیجان نیز رقص تماشائیوں کا کیا حشر کرتا تھا، یہ ہی وجہ تھی کہ وہ اس کے بعد کسی اور کو دیکھنے سے انکار کر دیتے تھے اور اس کی اس اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے پچھلے کچھ عرصے سے میڈم کا رویہ بھی اس کے ساتھ کافی تبدیل ہو چکا تھا، اب جب وہ دل رہا سے بات کرتی تو لہجے میں خواہ مخواہ ہی چالوسی کی حد تک شیرینی سمیٹتی تھی، جس سے کبھی بھی تو دل رہا کو کافی لہجھن ہوتی تھی، لیکن زیادہ تر میڈم کا یہ انداز اس کی دلی مسرت کا باعث بنتا۔

”ڈارلنگ ذرا جلدی چلی جاؤ، تاکہ شو ختم کیا جاسکے، سچی اب تو بہت نیند آ رہی ہے۔“ میڈم نے منہ پر ہاتھ رکھ کر بمشکل اپنی جمانی کو روکنے کوئے کہا اور وہیں صوفے پر بیٹھ گئی، جبکہ دل رہا کھٹکے کھٹکے قدموں کے ساتھ دروازہ کھول کر ڈیڑھ تنک روم سے باہر نکل گئی۔

”بس اب نہیں، اب میں بہت تھک گئی ہوں۔“ دریا ب نے اپنی کمر کے گرد لیٹا دھنڈا کھولا اور چہرے پر آئے ہوئے سینے کو صاف کرتی ہوئی دھپ سے کرسی پر بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

”پلیز یار ایک ڈانس اور۔“ سی ڈی پلیئر کے پاس بیٹھی ہوئی رائنہ نے کسی قدر لجاجت سے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا، لیکن دریا ب نے اس کی بات کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور اپنے پاس کھڑی دسویں جماعت کی شاگل سے باتیں کرنے لگی، ان کے اسکول میں آج عید ملن یارٹی تھی، جس کے لیے لڑکیاں اپنے اپنے گھروں سے ٹیپ ریکارڈ اور سی ڈی پلیئر لے کر آئی تھیں اور اپنی اپنی کلاسز میں خوب انجوائے کر رہی تھیں، لیکن سب سے زیادہ رش دریا ب کی کلاس میں تھا، وجہ تھی دریا ب کا رقص، جسے دیکھنے کے لیے دوسرے سیکشن اور کلاسز کی لڑکیاں بھی یہاں جمع تھیں۔

”سنا ہے آج دریا ب گل نے بڑا خوب صورت ڈانس کیا ہے۔“ سندھی کی مس مول راشدی نے کلاس روم میں داخل ہوتے ہوئے با آواز بلند پوچھا، مس مول راشدی ابھی اسکول میں نئی پائینٹ ہوئی تھی، نوجوان سی یہ بچہ اسکول کی بچیوں میں خاصی مقبول تھی۔

”نہ تو میں نے کیا تمہیں یہاں آرام کرنے کے لیے بھیجا تھا؟ دل رہا جانی لوگ تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں، بس جلدی سے آ جاؤ، پھر ہم شو ختم کریں۔“ امیر بیٹی کو لٹاؤنے کے ساتھ ساتھ میڈم نے بڑے پیار بھرے انداز سے دل رہا کو مخاطب کیا، جبکہ ان کے لہجے کا مصنوعی پن دل رہا سے چھپا نہ رہ سکا، اب دل رہا کے لیے انکار کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ گئی تھی، وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی، خود پر لیا ہوا دھنڈا اتار کر پھینکا اور کمرے میں موجود ڈیڑھ تنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا بھرپور تنقیدی جائزہ لیا، اسکن کلر کا اسکن ٹائٹ لباس اس کے خوب صورت سراپے پر کسا ہوا اس کے وجود کے ہر عضو کو نمایاں کر رہا تھا، وہ جانتی تھی کہ اس حالت میں اس کا بیجان نیز رقص تماشائیوں کا کیا حشر کرتا تھا، یہ ہی وجہ تھی کہ وہ اس کے بعد کسی اور کو دیکھنے سے انکار کر دیتے تھے اور اس کی اس اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے پچھلے کچھ عرصے سے میڈم کا رویہ بھی اس کے ساتھ کافی تبدیل ہو چکا تھا، اب جب وہ دل رہا سے بات کرتی تو لہجے میں خواہ مخواہ ہی چالوسی کی حد تک شیرینی سمیٹتی تھی، جس سے کبھی بھی تو دل رہا کو کافی لہجھن ہوتی تھی، لیکن زیادہ تر میڈم کا یہ انداز اس کی دلی مسرت کا باعث بنتا۔

”ڈارلنگ ذرا جلدی چلی جاؤ، تاکہ شو ختم کیا جاسکے، سچی اب تو بہت نیند آ رہی ہے۔“ میڈم نے منہ پر ہاتھ رکھ کر بمشکل اپنی جمانی کو روکنے کوئے کہا اور وہیں صوفے پر بیٹھ گئی، جبکہ دل رہا کھٹکے کھٹکے قدموں کے ساتھ دروازہ کھول کر ڈیڑھ تنک روم سے باہر نکل گئی۔

”بس اب نہیں، اب میں بہت تھک گئی ہوں۔“ دریا ب نے اپنی کمر کے گرد لیٹا دھنڈا کھولا اور چہرے پر آئے ہوئے سینے کو صاف کرتی ہوئی دھپ سے کرسی پر بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

”پلیز یار ایک ڈانس اور۔“ سی ڈی پلیئر کے پاس بیٹھی ہوئی رائنہ نے کسی قدر لجاجت سے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا، لیکن دریا ب نے اس کی بات کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور اپنے پاس کھڑی دسویں جماعت کی شاگل سے باتیں کرنے لگی، ان کے اسکول میں آج عید ملن یارٹی تھی، جس کے لیے لڑکیاں اپنے اپنے گھروں سے ٹیپ ریکارڈ اور سی ڈی پلیئر لے کر آئی تھیں اور اپنی اپنی کلاسز میں خوب انجوائے کر رہی تھیں، لیکن سب سے زیادہ رش دریا ب کی کلاس میں تھا، وجہ تھی دریا ب کا رقص، جسے دیکھنے کے لیے دوسرے سیکشن اور کلاسز کی لڑکیاں بھی یہاں جمع تھیں۔

”سنا ہے آج دریا ب گل نے بڑا خوب صورت ڈانس کیا ہے۔“ سندھی کی مس مول راشدی نے کلاس روم میں داخل ہوتے ہوئے با آواز بلند پوچھا، مس مول راشدی ابھی اسکول میں نئی پائینٹ ہوئی تھی، نوجوان سی یہ بچہ اسکول کی بچیوں میں خاصی مقبول تھی۔

”نہ تو میں نے کیا تمہیں یہاں آرام کرنے کے لیے بھیجا تھا؟ دل رہا جانی لوگ تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں، بس جلدی سے آ جاؤ، پھر ہم شو ختم کریں۔“ امیر بیٹی کو لٹاؤنے کے ساتھ ساتھ میڈم نے بڑے پیار بھرے انداز سے دل رہا کو مخاطب کیا، جبکہ ان کے لہجے کا مصنوعی پن دل رہا سے چھپا نہ رہ سکا، اب دل رہا کے لیے انکار کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ گئی تھی، وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی، خود پر لیا ہوا دھنڈا اتار کر پھینکا اور کمرے میں موجود ڈیڑھ تنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا بھرپور تنقیدی جائزہ لیا، اسکن کلر کا اسکن ٹائٹ لباس اس کے خوب صورت سراپے پر کسا ہوا اس کے وجود کے ہر عضو کو نمایاں کر رہا تھا، وہ جانتی تھی کہ اس حالت میں اس کا بیجان نیز رقص تماشائیوں کا کیا حشر کرتا تھا، یہ ہی وجہ تھی کہ وہ اس کے بعد کسی اور کو دیکھنے سے انکار کر دیتے تھے اور اس کی اس اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے پچھلے کچھ عرصے سے میڈم کا رویہ بھی اس کے ساتھ کافی تبدیل ہو چکا تھا، اب جب وہ دل رہا سے بات کرتی تو لہجے میں خواہ مخواہ ہی چالوسی کی حد تک شیرینی سمیٹتی تھی، جس سے کبھی بھی تو دل رہا کو کافی لہجھن ہوتی تھی، لیکن زیادہ تر میڈم کا یہ انداز اس کی دلی مسرت کا باعث بنتا۔

”ڈارلنگ ذرا جلدی چلی جاؤ، تاکہ شو ختم کیا جاسکے، سچی اب تو بہت نیند آ رہی ہے۔“ میڈم نے منہ پر ہاتھ رکھ کر بمشکل اپنی جمانی کو روکنے کوئے کہا اور وہیں صوفے پر بیٹھ گئی، جبکہ دل رہا کھٹکے کھٹکے قدموں کے ساتھ دروازہ کھول کر ڈیڑھ تنک روم سے باہر نکل گئی۔

”بس اب نہیں، اب میں بہت تھک گئی ہوں۔“ دریا ب نے اپنی کمر کے گرد لیٹا دھنڈا کھولا اور چہرے پر آئے ہوئے سینے کو صاف کرتی ہوئی دھپ سے کرسی پر بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

☆ ☆ ☆

”بس اب نہیں، اب میں بہت تھک گئی ہوں۔“ دریا ب نے اپنی کمر کے گرد لیٹا دھنڈا کھولا اور چہرے پر آئے ہوئے سینے کو صاف کرتی ہوئی دھپ سے کرسی پر بیٹھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔

”پلیز یار ایک ڈانس اور۔“ سی ڈی پلیئر کے پاس بیٹھی ہوئی رائنہ نے کسی قدر لجاجت سے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا، لیکن دریا ب نے اس کی بات کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور اپنے پاس کھڑی دسویں جماعت کی شاگل سے باتیں کرنے لگی، ان کے اسکول میں آج عید ملن یارٹی تھی، جس کے لیے لڑکیاں اپنے اپنے گھروں سے ٹیپ ریکارڈ اور سی ڈی پلیئر لے کر آئی تھیں اور اپنی اپنی کلاسز میں خوب انجوائے کر رہی تھیں، لیکن سب سے زیادہ رش دریا ب کی کلاس میں تھا، وجہ تھی دریا ب کا رقص، جسے دیکھنے کے لیے دوسرے سیکشن اور کلاسز کی لڑکیاں بھی یہاں جمع تھیں۔

”سنا ہے آج دریا ب گل نے بڑا خوب صورت ڈانس کیا ہے۔“ سندھی کی مس مول راشدی نے کلاس روم میں داخل ہوتے ہوئے با آواز بلند پوچھا، مس مول راشدی ابھی اسکول میں نئی پائینٹ ہوئی تھی، نوجوان سی یہ بچہ اسکول کی بچیوں میں خاصی مقبول تھی۔

”نہ تو میں نے کیا تمہیں یہاں آرام کرنے کے لیے بھیجا تھا؟ دل رہا جانی لوگ تمہیں دیکھنا چاہتے ہیں، بس جلدی سے آ جاؤ، پھر ہم شو ختم کریں۔“ امیر بیٹی کو لٹاؤنے کے ساتھ ساتھ میڈم نے بڑے پیار بھرے انداز سے دل رہا کو مخاطب کیا، جبکہ ان کے لہجے کا مصنوعی پن دل رہا سے چھپا نہ رہ سکا، اب دل رہا کے لیے انکار کی کوئی گنجائش باقی نہ رہ گئی تھی، وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی، خود پر لیا ہوا دھنڈا اتار کر پھینکا اور کمرے میں موجود ڈیڑھ تنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا بھرپور تنقیدی جائزہ لیا، اسکن کلر کا اسکن ٹائٹ لباس اس کے خوب صورت سراپے پر کسا ہوا اس کے وجود کے ہر عضو کو نمایاں کر رہا تھا، وہ جانتی تھی کہ اس حالت میں اس کا بیجان نیز رقص تماشائیوں کا کیا حشر کرتا تھا، یہ ہی وجہ تھی کہ وہ اس کے بعد کسی اور کو دیکھنے سے انکار کر دیتے تھے اور اس کی اس اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے پچھلے کچھ عرصے سے میڈم کا رویہ بھی اس کے ساتھ کافی تبدیل ہو چکا تھا، اب جب وہ دل رہا سے بات کرتی تو لہجے میں خواہ مخواہ ہی چالوسی کی حد تک شیرینی سمیٹتی تھی، جس سے کبھی بھی تو دل رہا کو کافی لہجھن ہوتی تھی، لیکن زیادہ تر میڈم کا یہ انداز اس کی دلی مسرت کا باعث بنتا۔

”ڈارلنگ ذرا جلدی چلی جاؤ، تاکہ شو ختم کیا جاسکے، سچی اب تو بہت نیند آ رہی ہے۔“ میڈم نے منہ پر ہاتھ رکھ کر بمشکل اپنی جمانی کو روکنے کوئے کہا اور وہیں صوفے پر بیٹھ گئی، جبکہ دل رہا کھٹکے کھٹکے قدموں کے ساتھ دروازہ کھول کر ڈیڑھ تنک روم سے باہر نکل گئی۔

کا اس پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ نہایت انہماک سے کیبل پر آنے والی کوئی اندین فلم دیکھنے میں مشغول رہی۔
 ”اسی“ ”سمرن سے برداشت نہ ہو سکا اور اس نے شہ پارا کو کندھے سے تھام کر ہلایا۔

”کیا مصیبت ہے، لے لو پکن سے جا کر خود آب پچی تو نہیں۔“ شہ پارا نے اپنے تسلسل میں رخنہ اندازی پر بری طرح جھنجھلاتے ہوئے اسے اچھی طرح لتاڑ دیا اور جواباً ”سمرن خاموشی سے کھڑی ہو گئی اس کی آنکھوں میں ایک دم ہی آنسو آگئے اور گلے میں گولہ سا چھسن گیا اس نے خاموشی سے ایک نظر کارپٹ پر سر کے نیچے فلور کشن رکھ کر لیٹی ہوئی اپنی پاؤں اور اس کے کندھے سے لمبی دریا برف ڈالی اور کمرے سے نکل کر پکن کی جانب آگئی۔

بوا نل گوشت دیتیچی میں ڈھکا رکھا تھا، جبکہ پھلے ہوئے آلو قرہی باؤل میں بڑے سیاہ ہو رہے تھے اس نے باؤل اٹھا کر سنک کے نیچے رکھا اور اس میں انتہائی بھر دیا جس میں آلودوب جا میں آب باؤل اپنی جگہ پر واپس رکھ کر وہ فرنگ کی جانب آگئی، فرنگ میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جسے کھا کر وہ اپنا پیٹ بھر سکتی، یہاں تک کہ گندہ ہوا آنا بھی موجود نہ تھا اس نے خاموشی سے فرنگ کا دروازہ بند کر دیا وہ جانتی تھی کہ اب اس کی ماں شام تک بیوی کے آگے سے نہیں اٹھے گی کیونکہ اس کے پیارات کو دیر سے دکان بند کر کے آتے ہیں۔ لہذا اب یہ کھانا رات کو ہی مکمل ہونا تھا وہ چپ چاپ بیٹھیاں چڑھتی اوپر تائی کے پورشن میں آگئی جہاں تائی جی اور فاریہ بھی پکن میں رکھی ٹیبل پر بیٹھی کھانا کھا رہی تھیں۔

”جاؤ سمرن کھانا کھاؤ۔“ فاریہ بھی نے اسے دیکھتے ہی آواز دی کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ اس وقت نیچے کچھ بھی نہ بنا ہو گا شہ پارا رات کا بچا ہوا سالن اطعمینان سے بنا سمرن کا سوچے رہ گئے کے ساتھ کھا چکی ہوگی جبکہ دریا برف دوسرے کھانا نیچے اپنی امی کے ساتھ کھاتی تھی نہ گئی سمرن تو اس کی پروا نہ تھی سمرن خاموشی سے کرسی پر آگریٹھ گئی اور پلیٹ میں سالن نکال کر کھانا شروع کر دیا۔

”دریا برف کہاں ہے؟“ تائی نے سرسری سا پوچھا۔
 ”اسی کپاسی غالباً“ کوئی فلم دیکھ رہی ہے۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے بتانا پڑا۔

”کئی بار دم کو سمجھا ہے پچی کو پارو کے پاس اتنا نہ جانے دیا کرے، مگر مجال ہے جو اس کی سمجھ میں کوئی بات آئے لڑکی ذات ہے کل کلاں کو کچھ ہو گیا تو دیکھنا، سر پکڑ کر روئے گی۔“ تائی جی نے بنا سمرن کا لحاظ کیے غصے سے کہا اور ان کے کہنے گئے الفاظ نے سمرن کے حساس دل کو اپنی ماں کے حوالے سے خاصا دکھایا، لیکن وہ جانتی تھی کہ تائی کے الفاظ بے شک سخت سہی، لیکن کافی حد تک درست بھی ہیں۔

آغا رحمان گل کے تین بیٹے تھے سب سے بڑے جہانگیر، پھر سرفراز اور شہباز۔ جبکہ ایک بیٹی فریحہ تھی جو شادی کے بعد اسلام آباد میں رہائش پذیر تھی سب کی شادیاں انہوں نے اپنی مرضی سے کیں ماسوائے سرفراز کے دیئے تو ان کی ساری اولاد ہی بہت فربان بردار تھی لیکن عادات و اطوار کے حوالے سے تینوں بھائی ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھا۔

جہانگیر سب سے بڑا بیٹا ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت ہی ذمہ دار تھا کم عمری سے ہی وہ کاروبار میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا تھا جبکہ سرفراز نہ صرف لاپالی بلکہ قدرے عیاشی فطرت کا حامل نوجوان تھا اور ان دونوں کے برعکس شہباز اپنے کام سے کام رکھنے والا کم عمر سا شخص تھا جس کی زندگی کا مقصد صرف اور صرف اعلیٰ تعلیم کا حصول تھا اسے اپنے باپ کے کاروبار سے کوئی دلچسپی نہ تھی وہ مقامی یونیورسٹی سے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ سرفراز نہ صرف شکل و صورت کے اعتبار سے واجبی سی شخصیت کا حامل تھا بلکہ تعلیمی میدان میں بھی کوئی خاص حیثیت نہ رکھتا تھا بری مشکل سے گھیٹ گھیٹ کراس نے میٹرک تک تعلیم حاصل کی تھی اس کے باوجود آغا

جی کے ساتھ سپر اسٹور پر جا کر بیٹھنا وہ اپنی شان کے خلاف سمجھتا تھا بالبتہ جب پیسوں کی ضرورت ہوتی تو وہ اسٹور ضرور جانا اور پھر ضرورت کے مطابق پیسے حاصل کرنے کے بعد پندرہ بیس دن تک وہ سوائے رات کے گھر میں بھی دکھائی نہ دیتا۔

یہ ہی وجہ تھی کہ آغا صاحب اور سیکنہ چاہتے تھے کہ جلد از جلد اس کی شادی کر دی جائے عام روایتی ماں باپ کی طرح ان کی بھی سوچ تھی کہ شاید اسی طرح ان کا بیٹا سدھر جائے دوسرے بیٹوں کی طرح انہوں نے اس کا رشتہ بھی خاندان میں ہی طے کر رکھا تھا شازیہ ان کی بڑی ہوسادیہ کی چھوٹی بہن ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت ہی سادہ مزاج اور قوت برداشت رکھنے والی لڑکی تھی۔ آغا جی کا خیال تھا کہ سرفراز جیسے اٹھرے آدمی کے لیے اس سے بہتر لڑکی کوئی اور ہو سکتی سرفراز کی دن بے دن بگڑتی ہوئی حرکات و سکنات نے انہیں مجبور کیا کہ وہ جلد از جلد شازیہ کو بیاہ کر کھر لے آئیں اور ابھی انہوں نے اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کا سوچا ہی تھا کہ سرفراز نے از خود ہی دھماکہ کر ڈالا۔

چھپلے کچھ دنوں سے وہ اپنے دوستوں کے ساتھ سیرو تفریح کے لیے ٹاورن امیریا گیا ہوا تھا اس دوران آغا جی کے حکم کے مطابق سادیہ اور سیکنہ نے مل کر بلائی بالا اس کی شادی کی ہلکی پھلکی تیاریاں شروع کر دی تھیں کہ اچانک ہی ایک دن وہ ایک نہایت حسین و جمیل اور طرح دار لڑکی کا ہاتھ تھامے آن موجود ہوا۔
 ”یہ میری بیوی پارو ہے۔“

الفاظ تھا یا کوئی ہم پورا گھر لرز کر رہ گیا پارو کے انداز و اطوار یہ سمجھانے کے لیے کافی تھے کہ اس کا تعلق کس علاقہ سے ہے۔ آغا جی فوری طور پر انہیں گھر سے نکال دینا چاہتے تھے غصے کی شدت سے ان کی آنکھوں میں ہوا تر آیا تھا۔

”اس گندگی کے ڈھیر کو لے کر نکل جاؤ میرے گھر سے۔“
 بے تحاشا غصے سے وہ ہولے ہولے کانپ رہے تھے اور ان کا بلڈ پریشر مانی ہو گیا تھا لیکن سرفراز جو شہ پارا کے عشق میں گوڑے گوڑے ڈوب چکا تھا اس پر باپ کی اس حالت کا کوئی اثر نہ ہوا۔

”کیوں نکل جاؤں میں اس گھر سے“ آپ کی وراثت کا پورا پورا حق دار ہوں میں اور مجھے امید ہے کہ آپ جیسا دین دار آدمی اتنی بڑی بے دینی کی بات نہیں کر سکتا اگر آپ نے مجھے نکالا تو جہانگیر اور عمر کو بھی نکالیں۔“

یہ کہہ کر وہ نہایت اطمینان سے پارو کا ہاتھ تھامے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گیا اس کی اس جرات اور بد تمیزی نے آغا جی کو بالکل خاموش کر دیا اس طرح سرفراز کو اس گھر میں رہنے کی اجازت تو مل گئی لیکن اس کا کھانا پینا ہی الفور علیحدہ کر کے اسے اوپر والے پورشن میں شفٹ کر دیا گیا کیونکہ اس مسئلے کا فوری اور بہتر حل اس کے سوا کوئی اور نہ تھا۔

پارو کون تھی؟ کہاں سے آئی تھی؟ کوئی نہ جانتا تھا لیکن یہ دیکھ کر سب حیران ہوتے تھے کہ پارو جیسی حسین و جمیل لڑکی کو سرفراز جیسے کم رو شخص میں کیا نظر آیا جو نہ صرف شکل و صورت بلکہ مالی اعتبار سے بھی کوئی ایسا مستحکم نہ تھا کہ اس کی خاطر پارو جیسی لڑکی سب کچھ تیا کر دے لیکن شاید ان دونوں کاملن نصیب میں لکھا تھا سو ہو گیا کیسے ہوا؟ یہ شاید کوئی بھی نہ جان پایا اور نہ ہی کبھی کسی نے جاننے کی کوشش کی لیکن یہ سچ تھا کہ پارو میں سوائے شکل و صورت کے کوئی دوسری ایسی خوبی نہ تھی جو گھریلو عورتوں میں پائی جاتی ہو اور اس کا اندازہ جلد ہی سرفراز کو بھی ہو گیا۔

وہ صبح سویرے اٹھنے کی عادی نہ تھی یہ ہی وجہ تھی کہ جب دن چڑھے جاتی تو بجائے کوئی کام کرنے کے نہاد ہو کر

خوب تک سبک سے تیار ہو جاتی شروع شروع میں تو سرفراز سے دیکھ کر حیرت اور کسی حسین صورت کی مانند نظر آنے والی پارو کی پوجا کرتا اور چاہتا کہ سامنے بٹھا کر اسے تھکا کرے لیکن کب تک؟ حسن و آئشی کا یہ خمار جلد ہی اتر گیا جب روز بازار کا کاجیب اور پیٹ پر بھاری پڑنے لگا تو سرفراز کے ماتھے پر نمایاں طور سے مل نمودار ہونے لگے اور اس حوالے سے گھر میں ایک نئی تو تکر شروع ہو گئی لیکن وہ پارو بھی کیا جس پر رتی برابر اثر ہوا اور ایسے میں سیکہ نہ کومد کے لیے آگے اتار دیا اور پھر ان کے ساتھ ساتھ سادیہ کی پر خلوص کوششوں کے زیر اثر شہسپارے تھوڑا بہت پکنا تو سیکھ لیا لیکن ابھی اس نے یہ کام روایتی عورتوں کی طرح دلچسپی سے نہ کیا اس کی دلچسپی گھر کیلوا امور سے زیادہ شاپنگ، سینما اور ہولنگ کے علاوہ سارا دن وی سی آر پر نئی انڈین فلموں تک محدود تھی اور اس کی ان حرکتوں کے باعث جلد ہی سرفراز کو اپنی غلطی کا احساس ہونے لگا لیکن اب اس احساس کا کوئی فائدہ نہ تھا کیونکہ پارو اس کی بیٹی سمن کی ماں بن چکی تھی اور اولاد واحد چیز ہے جو مرد و عورت دونوں کو جھکے پر مجبور کر دیتی ہے سو سرفراز بھی صبر کے گھوٹ پی کر رہ گیا اور اپنی اولاد کو دیکھتے ہوئے اسے جلد ہی اس زیادتی کا احساس بھی ہو گیا۔

جو وہ اپنے ماں باپ سے ردا رکھتا تھا اور اس زیادتی کے ازالے کے لیے وہ اتفاق کے ساتھ سپراسٹور جانے لگا لاہالی سے سرفراز کی جگہ ایک سمجھدار شخص ابھر کر سامنے آیا جسے کاروباری شعور اپنے دونوں بھائی کے مقابلے میں زیادہ تھا اس کی انتھک محنت اور حکمت عملی سے سپراسٹور نے ایک بڑے ڈارمنٹل اسٹور کی شکل اختیار کر لی سرفراز کی اس محنت اور کوشش کو اس کے گھر کے ہر فرد نے عملی طور پر سراہا اور اس شعوری طور پر کوشش کی جانے لگی کہ سرفراز کی بیوی کو بھی گھر میں وہی مقام دیا جائے جو سادیہ کی بیوی ارم کو حاصل ہے لیکن جانے کیوں شہسپارا کو بھی کسی کے ساتھ مل کر بیٹھنا پسند نہ تھا وہ شروع سے ہی علیحدہ پورشن میں رہنے کی عادی ہو چکی تھی اس کے میکے سے تو کبھی کوئی آیا نہ تھا اور سسرال والوں سے اس کا اتنا ملنا جلنا نہ تھا لہذا وہ بیوشہ اکیلے رہنے کو ترجیح دیتی یہاں تک کہ بازار بھی اکیلی ہی چلی جایا کرتی ہاں البتہ سال میں ایک ہفتہ کے لیے وہ لاہور ضرور جاتی اور یہ سرفراز کے سنگ ہی ہوتا عام خیال تھا کہ شاید لاہور میں اس کا میکا آباد ہے لیکن تجسس کے باوجود اس بارے میں کبھی کسی نے کیردے کی کوشش نہ کی وجہ غالباً ”شہسپارا کا لاہور یہ تھا۔“

سمن کے دو سال بعد ہی سمرن پیدا ہو گئی یہ بھی اتفاق ہی تھا کہ دونوں لڑکیاں شکل و صورت اور رنگ و روپ کے اعتبار سے ماں سے قطعی مختلف تھیں سمن تو بالکل اپنے باپ جیسی تھی البتہ سمرن کے نقش و نگار ماں جیسے جبکہ رنگت تھوڑی سی دیتی ہوئی سرفراز جیسی تھی لیکن حقیقت تھی کہ وہ دونوں شہسپارا کی بیٹیاں تو معلوم ہی نہ ہوتی تھیں اور حسن کی دلدادہ شہسپارا کو کبھی اپنی بیٹیوں سے کوئی دلی لگاؤ محسوس نہ ہوا یہ ہی وجہ تھی کہ دونوں بچیوں کی تعلیم و تربیت اور پرورش میں زیادہ تر ہاتھ وادی یا پھر تانی سادیہ کا رہا سادیہ کے چونکہ اپنے بیٹیوں بیٹھی تھے لہذا انہوں نے بیٹی کی نشہ خواہش ان دونوں بہنوں سے پوری کر لی سمن اور سمرن کی طبیعت کا رکھ رکھاؤ اور ٹھہراؤ اس بات کی نشاندہی کرتا تھا کہ ان کی تربیت سادیہ جیسی سلیقہ شعار عورت کے ہاتھوں ہوئی ہے۔

عمر کی شادی اپنی کنز ارم سے سرفراز کی شادی کے کچھ ہی عرصہ بعد ہو گئی تھی ارم کے پہلے دونوں بیٹے پیرائش کے فوراً ”بعد ہی فوت ہو چکے تھے سمرن تقریباً دو سال کی تھی جب ارم نے دو جڑواں بیٹیوں کو جنم دیا۔ دریا ب اور نایاب اور تخلیق کے اس عمل کے دوران ارم کو مشکل پچایا گیا اور اب اس کی اتنی تشویش ناک حالت کے سبب دو بچوں کو سنبھالنا ایک نہایت ہی مشکل امر تھا جبکہ سیکینہ اپنی ضعیف العمری اور بیماری کے سبب بچیوں کی ذمہ داری اٹھانے سے قاصر تھیں اور سادیہ پہلے ہی اپنی بیٹیوں بیٹیوں کے ساتھ سمن اور سمرن کو بھی سنبھالے ہوئے تھیں ایسے میں شہسپارا کو جانے کیا ہوا دریا ب کی ذمہ داری سنبھالنے کے لیے اپنی خدمات پیش کر دیں جسے سن کر ہر کوئی حیران رہ گیا کہاں اپنی بچیاں تو سنبھال نہ سکی کجا دوسرے کی بچی لیکن سمر حال شہسپارا کی

یہ پیش کش تا صر ف پر خلوص بلکہ بر محل تھی اس لیے کسی کے پاس اعتراض کی گنجائش نہ تھی۔ دریا ب بے انتہا سرخ و سفید اور نہایت ہی خوبصورت بچی تھی یہ ہی وجہ تھی کہ اسے دیکھتے ہی شہسپارا کو اس پر ٹوٹ کر پیرا آیا اور جھٹ پٹ اپنی خدیمات پیش کر دیں جبکہ اپنی دونوں بیٹیوں کو تو پیرائش کے وقت دیکھتے ہی وہ ہکا بکا رہ گئی تھی اور یہ ماننے کو تیار ہی نہ تھی کہ اتنی سادہ سلونی بچیاں اس کی ہو سکتی ہیں ایسے میں دریا ب کا سرخ و سفید رنگ و روپ شہسپارا کی توجہ کا مرکز بن گیا کوئی اور وقت نہ ہوا تو شاید اہل خانہ کو اعتراض ہو یا تو نہ کہ اس کی کی جانے والی تربیت سے تو سرفراز ہی مطمئن نہ تھا تو دو سروں کی بات تو پھر بعد کی تھی لیکن وہ جو سائنے کہہ گئے کہ مجبوری کا نام شکریہ تو اس کی عملی تفسیر اس موقع پر دیکھنے میں آئی جب اپنی سگی اولاد کی تربیت کی ذمہ داری ماں اور بھابھی کو سونپنے والے سرفراز نے بھائی کی بیٹی کی تربیت بیوی کے ہاتھوں ہوتے دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں اور وہ جو کہتے ہیں کہ خون سے زیادہ گودا پنا اٹھ دکھائی ہے تو اس کا عملی نمونہ بھی جلد ہی سامنے آیا۔



شہسپارا کی شروع سے عادت تھی صبح سویرے تیار ہو کر گھر سے نکل جانا یا پھر سارا دن کیبل پر آنے والی نئی فلموں سے لطف اندوز ہونا گھر کیلوزمہ واریاں صرف اس حد تک تھیں کہ رات کو گھر آنے پر میاں کو کھانا مل جائے خواہ وہ کیسا ہی کیوں نہ ہو جبکہ دونوں بیٹیاں اکثر و بیشتر اوپر تیا کے گھر سے ہی کھالیا کرتی تھیں البتہ دریا ب کی ذمہ داری شہسپارا میں تبدیل لانے کا سبب بنی سدا کی لاہور اور خود میں مگن رہنے والی شہسپارا ایک دم سے ہی ذمہ دار ماں بن گئی وہ راتوں کو جاگ کر سگی اولاد کی طرح اس کی دیکھ بھال کرتی جو نہ وہ فیڈر بچتی تھی لہذا ابھی اس کے فیڈر کی صفائی کا خصوصی اہتمام کیا جاتا اس کے لیے خریدے گئے قیمتی اور رنگ پرنگ کھلونوں سے سپارو کا مکمل بھرچکا تھا پھر بھی وہ دریا ب کے لیے شاپنگ کرتے نہ تھکتی تھی یہاں تک کہ اگر دن میں کچھ وقت وہ نیچے ارم کے پاس ہوتی تو یہ وقت شہسپارا کے لیے کاٹنا دشوار ترین ہو جاتا جانے یہ خدا کی کون سی مصلحت تھی کہ اپنی بیٹیوں کو منہ نہ لگانے والی پارو میں دریا ب کی تو مانوں جان تھی یہ ہی وجہ تھی کہ جیسے جیسے وہ بڑھتی ہوئی گئی مکمل طور پر پارو ہی کے رنگ میں رنگی گئی۔

بچپن میں اس کی ہر وقت نی دی اور فلم میں بے تحاشا دلچسپی کسی نے محسوس ہی نہ کی اور ویسے بھی جب تک دادا، دادی زندہ رہے دریا ب کی یہ دلچسپی مکمل کر بھی سامنے ہی نہ آئی لیکن ان کے آنکھیں بند ہوتے ہی دریا ب کی شکل میں ایک دوسری شہسپارا ابھر کر سامنے آئی فیشن کی دلدادہ، رقص کی شوقین نماز روزے سے غافل ہر وقت فلم کی طرف ہی توجہ مرکوز رکھنے والی دریا ب گل جس نے جانے رقص میں کب اور کیسے مہارت حاصل کی پتا ہی نہ چلا شروع شروع میں تو سب سے چھپ کر پارو کے سامنے کسی انڈین گانے پر کرتی پارو کے کمرے میں اب اکثر ہی نور جہاں اور ناہید اختر کے تیز چننے ہوئے گانے سنائی دیتے شروع شروع میں سب سے چھپ کر کیا جانے والا یہ عمل رفتہ رفتہ سب کے سامنے آنے لگا اور دریا ب کی اس خوبی کا اور اک سب سے پہلے سمرن پر ہی ہوا تھا کیونکہ سمن کے مقابلے میں اس کی کوشش ہوتی کہ وہ تانی سے زیادہ اپنی ماں کے قریب رہے اور اسی کوشش کے نتیجے میں اکثر و بیشتر وہ دریا ب کا در رقص دیکھنے سے مستفد ہو جاتی جو وہ شہسپارا کے کہنے پر اس کے کمرے میں کر رہی ہوتی دریا ب کے اس شوق کو ہمیشہ بچی سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا لیکن اس شوق کے اتنے بھیاںک اور دوسرے نتائج نکلیں گے یہ کوئی نہ جانتا تھا ورنہ شاید اس وقت اس کے شوق کی روک تھام کے لیے کوئی ایسا عملی قدم ضرور اٹھایا جاتا جو آگے چل کر دریا ب کو اس ذلت بھرے گڑھے میں گرنے سے بچانے کا سبب بن سکتا جو مستقبل میں دریا ب کا مقدر بننے والا تھا۔

جمائیر اور سادیہ کے تین ہی بیٹے پڑا دو بہن پھر شاہ زیب اور سب سے چھوٹا شاہد پڑا دو بہن کی شادی اپنی

خالہ زاد فارید سے ہو چکی تھی اور ان کے ماشاء اللہ سے دو بچے بھی تھے جبکہ شاہ زیب کا رشتہ بچپن میں ہی سیکندری لہ اور آغا جان کی خواہش کے عین مطابق سمن سے طے تھا اور اس نسبت پر کبھی کسی کو کوئی اعتراض بھی نہ ہوا یہ ہی وجہ تھی کہ جب شاہ زیب نے مزید تعلیم کے حصول کے لیے کینڈا جانے کی اپنی خواہش کا اظہار کیا تو بہا نکیر صاحب نے اپنی اجازت کو سمن کے ساتھ نکاح سے مشروط قرار دے دیا اور ان کی اس شرط پر شاہ زیب سمیت کسی کوئی اعتراض نہ تھا لہذا بھٹ منگنی پٹ بیاہ کے تحت فوری طور پر اس شادی کا اہتمام کیا گیا اور شاہ زیب کے ساتھ ہی سمن کے کاغذات بھی جمع کروادیئے گئے ورنہ لگتے ہی سمن کو اپنی تعلیم اور وری چھوڑ کر شاہ زیب کی ہمراہی میں کینڈا روانہ ہونا پڑا سمن کے جانے کے بعد سمن بالکل تنہا رہ گئی غیر ارادی طور پر وہ دونوں ہمیشہ ماں کی نسبت ایک دوسرے سے زیادہ قریب تھیں۔ وادی کے بعد سمن نے ہمیشہ سمن کو جذباتی طور پر سارا دیا وہ اس کی چھوٹی چھوٹی خواہش بن کے جان جایا کرتی تھی وہ دونوں ہمیشہ اپنا زیادہ تروت تیا ہی کے گھر گزارا کرتی تھیں جبکہ ان کے گھر اور ماں پر دریا ب کی حکمرانی تھی۔

دریا ب ہمیشہ سمن سے ضد باندھے رکھتی اس کی کاپی ہمتا میں خراب کردیتا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا ہمیشہ سمن کی کوئی نہ کوئی چیز اسے پسند آجاتی جو وہ ضد کر کے سمن سے ہتھ لایا کرتی حالانکہ شہر پارا نے اپنی بیٹیوں کے مقابلے میں ہمیشہ اسی کو فقیہ دی تھی اس کی پسند اس کی خواہشات پاؤں کے لیے زندگی کی علامت تھیں اس نے کبھی بھی کسی چیز کی خواہش یا طلب کے لیے دریا ب کو نہ ترسایا تھا اس کے باوجود دریا ب ہمیشہ اسی چیز میں زیادہ دلچسپی لیتی جو سمن کے لیے اس کے بابا، سمن یا کوئی دوسرا شخص لے کر آتا اور سمن اپنی صلہ جو طبیعت کے باعث خاموشی سے ہر چیز دریا ب کے حوالے کر دیتی جب تک سمن رہی اس نے ہمیشہ سمن کا دفاع کیا وہ کبھی بھی کوئی چیز دریا ب کو دینے نہ دیتی کیونکہ بقل اس کے سمن کا یہ عمل دریا ب میں خود پسندی کی سطح کو خطرناک حد تک پھیلانے کا سبب بن رہا ہے لیکن سمن کے خیالات بالکل مختلف تھے وہ دریا ب کو ہمیشہ اپنی چھوٹی سمن ہی سمجھتی تھی حالانکہ دریا ب کے طرز عمل نے ہمیشہ اس کی حوصلہ شکنی کی۔ لیکن جانے کیوں اپنی خوبصورت ماں سے بے تحاشا محبت کرنے کے باعث اس سے وابستہ ہر چیز سے محبت اور عقیدت خود بخود سمن کے دل میں پیدا ہو جاتی تھی جبکہ دریا ب تو پھر ایک جیتا جاگتا وجود تھا جو اس کی ماں سے وابستہ تھا تا صرف وابستہ بلکہ اس کی ماں کے چہرے پر مسرت بکھیرنے کا سبب بھی تھا۔

اس کی ماں نے ہمیشہ دریا ب کے لیے اعلا سے اعلا چیز خریدی۔ اس عمل نے دریا ب کے دماغ کو ساتویں آسمان پر پہنچا دیا کوئی کم قیمت چیز اس کی نظر میں جھجکتی ہی نہ تھی اور یہ سب شہر پارا ہی کی بدولت ممکن ہوا تھا ورنہ اس کی سخی ماں کو اتنی فرمت ہی نہ تھی کہ وہ دریا ب کی چھوٹی چھوٹی خواہشات کا اس قدر احساس رکھ سکے یہ بھی شاید قدرت ہی کی کوئی مصلحت تھی کہ دریا ب کی جڑواں بہن نایاب کی عمر میں اتنا شدید بخار ہوا کہ اس کے اترنے تک نایاب کو ذہنی طور پر بالکل مغلوب کر دیا اس کے منگنے ترین علاج نے ارم کی کمری توڑ ڈالی تھی لیکن اس کے باوجود دینی عمل طور پر ٹھیک نہ ہو سکی نایاب کے بعد آرزو اور پھر ولید بھی ارم کی وہ توجہ حاصل نہ کر سکے جو ان کا حق تھی کیونکہ ارم کا زیادہ تروت نایاب پر ہی صرف ہو جاتا یہی سمن میں دریا ب کو عمل طور پر شہر پارا کے سپرد کر کے وہ مطمئن ہو چکی تھی۔

گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ دریا ب کے ٹھٹھاٹھ نے اس کے فیصلے پر درستی کی مرثیت کر دی تھی۔ دریا ب کی رقص میں دلچسپی کا کچھ اندازہ تو سمن کو ہو ہی چکا تھا لیکن وہ اس قدر رقص کی والدہ ہے یہ سمن کو پارل والے دن بتا چلا جب اسکول میں ہر طرف دریا ب کے ڈانس کی دھوم مچی ہوئی تھی اور یقیناً "اس سب کے پس پردہ کروار اس کی اپنی ماں کا تھا سمن جب بھی اپنی ماں کو بے خیالی میں چلا پھر تادیکھتی جانے کیوں اسے کسی

اشیخ ڈانسر کا گمان ہوتا اور اس کی تائی تو کئی دفعہ دھکے چھپے الفاظ میں کہہ بھی چکی تھیں کہ۔ "شہر پارا کا تعلق ضرور کسی ناپسندیدہ گمانے والے خاندان سے ہے" حیرت کی بات یہ تھی کہ ان دونوں بہنوں نے نخیال کے نام پر بھی اپنا کوئی رشتہ دار نہ دیکھا تھا صرف ایک بار بچپن میں جب وہ اپنی ماں کے ساتھ لاہور گئی تھی تو ہو مل ہی کے کمرے میں ایک اوجڑ عمر عورت اور برقع پوش جوان لڑکی اس کی ماں سے ملنے آئی تھیں وہ دونوں عورتیں اسے دیکھنے میں بھی اچھی نہ لگی تھیں لیکن سمن سے ان کی والدہ محبت یہ ضرورتاً تھی کہ ان کا سمن سے ضرور کوئی نہ کوئی رشتہ ہے۔ وہ رشتہ کیا تھا آج تک سمن کو معلوم ہی نہ ہو سکا اور نہ ہی اس نے بھی جاننے کی کوشش کی۔ ایک دفعہ شہر پارا نے خود ہی ترنگ میں اگر سمن کو بتایا تھا کہ اس کی پرورش اس کی خالہ نے کی تھی جب اس کی ماں چھ ماہ کی پیارو کو چھوڑ کر اپنے کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی تھی اپنی ماں کے بارے میں بتاتے ہوئے پیارو کو کسی بھی قسم کی شرمندگی کا احساس تک نہ تھا جبکہ اپنی تائی کے بارے میں یہ سب جان کر سمن کا دل اس قدر خراب ہوا کہ پھر اسے مزید کچھ جاننے کی ضرورت ہی باقی نہ رہی۔

اس دن کے بعد اس نے اپنی ماں سے کبھی بھی کوئی سوال نہ کیا وہ جان چکی تھی کہ اس کی ماں کے ماضی پر پڑا ہوا پردہ ہی ان دونوں بہنوں کے حق میں بہتر ہے۔



وہ جیسے ہی کالج سے گھر آئی کچن سے آنے والی اشتہا انگیز خوشبوؤں نے اسے بل بھر کو حیران کر ڈالا۔

"یا الہی میں کسی غلط گھریں تو نہیں آئی۔" پہلا خیال اس کے ذہن میں یہ ہی آیا اور پھر اپنے خیال پر خود ہی ہنسی ہوئی تیزی سے کچن کی جانب بڑھی جہاں حیرت کا دوسرا اور شدید ترین جھوکا اس کا منظر تھا شہر پارا بیٹیم دوپہر کے اس سے نہایت گرمی میں بے حال بڑی تندہی کے کھانا بنانے میں مصروف تھیں۔

"خیریت ہے امی کوئی آ رہا ہے۔"

سمن نے حیرت سے دریافت کیا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اپنے سسرالی عزیزوں کے لیے اس کی ماں نے کبھی بھی ایسا اہتمام کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی تھی ویسے بھی آنے والا ہر مہمان ہمیشہ تائی جی کے گھر ہی ٹھہرتا تھا اور جو کبھی کوئی ملنے کے لیے نیچے آتا تو ہمیشہ بازاری لوازمات سے ہی اس کی خاطر کی جاتی ایسے میں اتنی بھری دوپہر میں شہر پارا کی کچن میں موجودی واقعی اچھے کا سبب تھی۔

"ہاں۔" مختصر سا جواب دے کر شہر پارا ہانڈھی میں چپے چلانے میں مصروف ہو چکی تھی سمن نے کچھ دیر تو انتظار کیا کہ شاید آگے بھی کچھ بتایا جائے لیکن پیارو کی بے نیازی یہ بتا رہی تھی کہ ابھی وہ مزید بات کرنے کے موڈ میں نہیں ہے سمن نے آگے بڑھ کر دیکھ بھول کے ڈھکن اٹھا کر جھانکا اور چکن بریانی دیکھتے ہی اس کی بھوک چمک اٹھی۔

"واؤ زبردست آج تو آپ نے میری فیورٹ ڈش بنائی ہے۔" ایک ماں بھرے لاڈ سے اس نے ماں کی جانب دیکھا۔

"ہاں دریا ب کو بھی چکن بریانی بہت پسند ہے ورنہ میرا ارادہ تو پلاؤ بیٹا کا تھا۔"

سمن پر ہاتھ دھوتے ہوئے پارو نے جواب دیا اور تکیہ سے ہاتھ صاف کر کے چولہے کی آگ کو دم کر دیا اور باہر کی جانب چل دی جبکہ اس کے اس جواب نے جانے کیوں سمن کے جوش و خروش کو بالکل ماند کر دیا اس کی بھوک کا احساس ایک دم ہی ٹھنڈا ہو گیا ایسے جیسے کسی نے جلے ہوئے کوئلوں پر پانی ڈال دیا ہو اس نے خاموشی سے دیکھی کا ڈھکن واپس رکھ دیا یہ جانے بغیر کہ بریانی کے علاوہ اور کیا کچا کچا جودہ خاموشی سے چکن سے باہر نکل آئی۔

"کیا تھا جو ماں ایک بار میرا دل رکھنے کے لیے ہی کہہ دیتی کہ آج بریانی میرے لیے ہی بنی ہے۔" اس کا حلق

نمکین پانی سے بھر گیا پارو کی دی گئی وضاحت سے اس کا دل اس قدر برا ہوا کہ یہ بھی نہ معلوم کر سکی کہ ان کے گھر آج کون مہمان آ رہا تھا؟ خاموشی سے ہاتھ منہ دھو کر یونفارم تبدیل کر کے سونے کے لیے لیٹ گئی۔

شام میں جب اس کی آنکھ کھلی تو حسب معمول لی وی لائونج سے تیز میوزک کی آواز آرہی تھی شروع شروع میں سمن کے جانے کے بعد جب وہ اپنے فلور پر زیادہ رہنے لگی تھی تو اسے ہر دم میوزک کا یہ کھٹ راک بہت پریشان کرتا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ رفتہ رفتہ وہ اسی ماحول کی عادی ہوتی جا رہی تھی ابھی بھی خاموشی سے اٹھ کر ہاتھ منہ دھویا اور پکن میں آگئی ٹھنڈی بریانی پلیٹ میں نکالی اور وہیں ٹیبل پر بیٹھ کر کھانے لگی۔

”تھینک گاڈ یار تم یہاں بیٹھی ہو پلیز ذرا ایک کپ اچھی سی چائے تو بنا دو۔“ ایک دم ہی دروازے سے دریاب کی آواز سنائی دی وہ چونک اٹھی۔

”چائے؟ کس کے لیے۔“

کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس کی ماں اور دریاب شام میں کبھی بھی چائے نہیں پیتیں۔

”اے کمال ہے تمہیں نہیں پتا زوار آیا ہوا ہے۔“

”زوار۔“ سمن نے حیرت سے زیر لب دہرایا۔

”وہ کب آیا۔؟“

”رات میں آیا تھا آج دوپہر میں مہمانی نے نیچے نیچے پر بلایا تھا ابھی بھی نیچے ہی ہے حیرت ہے تمہیں تائی کے گھر میں کسی نے نہیں بتایا کہ زوار آ رہا ہے؟ ہر حال ایک کپ چائے بنا کر لے آؤ تمہاری بھی ملاقات ہو جائے گی۔“

وہ شان بے نیازی سے کہتی ہوئی واپسی کے لیے مڑ چکی تھی۔

”پلیز چائے ضرور بنا دینا ورنہ مجھے آنا پڑے گا۔“ وہ کوئی جواب نہ دے سکی نوالہ نگتے ہوئے چادل اس کے حلق میں ہی کہیں پھنس گئے جسے اس نے پانی کے گھونٹ سے مشکل سے نیچے اتارا ”زوار“ ما صرف اس کی پھپھو فریحہ کا بیٹا تھا بلکہ بچپن سے سمن سے منسوب تھا حالانکہ بہت کم کراچی آتا لیکن جب بھی آتا سمن اپنے اور اس کے درمیان موجود رشتے کو دل کی گہرائیوں سے محسوس کرتی اور اس دفعہ تو اپنی تعلیمی مصروفیات کی بنا پر وہ تقریباً دو سال پہلے کراچی آیا تھا جب وہ نوئیں کلاس میں تھی تب صرف ایک ہفتہ کے لیے زوار اور پھپھو کراچی آئے تھے اس وقت پھپھو اس کے لیے ڈھیروں ڈھیر تحائف لے کر آئی تھیں۔ اسے آج بھی یاد تھا وہ وقت جب زوار دریاب کو دیکھ کر حیرت سے گنگ رہ گیا تھا۔

”اے ماماں آپ کی بیٹی تو دریاب نظر آتی ہے سمن اور سمن تو بالکل آپ کی بیٹیاں ہی نہیں لگتیں۔“

سترہ اٹھارہ سالہ زوار کے اس جملے میں جانے ایسا کیا تھا کہ اچانک ہی سمن کو اپنا آپ ایک دم ہی حقیر سا لگنے لگا اور وہ خود بخود ہی اپنا موازنہ دریاب سے کرنے لگی اور جیسے جیسے وہ موازنہ کرتی اس کا احساس کمتری عروج پر آ گیا اور یہ ہی وجہ تھی کہ اپنی پڑھائی کا بہانہ بنا کر وہ پورا ہفتہ اپنے کمرے میں ہی محدود رہی جبکہ دریاب اور زوار حسن کے قہقہوں سے گھر گونجتا رہتا حیرت کی بات یہ تھی کہ اس کے اس گریز کو سوائے تائی سادیہ اور شاہد بزرگ کسی نے محسوس نہ کیا یہاں تک کہ پھپھو نے بھی نہیں اور یہی بات پھاس کی مانند سمن کے دل میں گڑ گئی تھی۔

”زبہ نصیب آج سورج کہاں سے نکلا تھا بی سمن کے بھی دیدار نصیب ہو گئے۔“ وہ پکن میں فاریہ بھا بھی کہ اس کھڑی کوئی بات کر رہی تھی جب اسے شاہد بزرگ کی آواز سنائی دی۔

”کہاں ہوئی ہو کرنز آج کل اوپر بھی نہیں آتیں۔“

”ہمیں ہوتی ہوں بس ذرا کالج میں سمسٹر ہو رہے تھے اسی کی تیاری کر رہی تھی۔“

”چلو اب آئی گئی ہو تو ذرا جلدی سے میرے اور زوار کے لیے اچھی سی چائے تو بنا دو۔“ آرڈر دے کر وہ واپس پڑے کمرے کی جانب مڑ چکا تھا۔

اور مجبوراً ”مرآتیا نہ کرنا کہ مصداق سمن نے خاموشی سے چائے پٹائی اور ٹرے میں بسکٹ کا جار رکھ کر شاہد بزرگ کے کمرے کی جانب چل دی دروازہ کھلا ہوا تھا اور پردہ دروازے کے پیچھے ہونے کے باعث سامنے کا منظر صاف دکھائی دے رہا تھا سامنے ہی زوار اور شاہد بزرگ ایک سی بیڈ پر شہموراز غائبانہ لیٹی ہوئے دیکھ رہے تھے۔

”آجاکوں رک کیوں گئیں؟“

شاہد بزرگ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا جب کہ زوار لیٹی کے چیمبل سرچ کرنے میں مصروف رہا۔

”السلام علیکم۔“ سمن نے آہستہ آواز میں سلام کیا اور خاموشی سے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر ٹرے رکھ کر واپسی کے لیے پلیٹ گئی۔

”وعلیکم السلام! تم سارا دن کہاں ہوتی ہو نظر نہیں آتیں۔“

بظاہر ریوٹ سے مصروف زوار نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈال کر سوال کیا۔

”آپ کو سوائے دریاب کے نظری کون آتا ہے۔“ دل چاہا یہی جواب دے لیکن اپنی عادت کے برخلاف کہ نہ سکی اور جب بولی تو صرف یہ۔

”ہمیں ہوتی ہوں گھر پر۔“

پر جانے کیوں اس کی آواز زندہ گئی اور جلدی سے باہر نکل گئی۔

”اے کیا ہوا ہے۔“ پیچھے سے زوار کی تحیر آمیز آواز سنائی دی جانے شاہد بزرگ نے کیا جواب دیا اس نے کچھ سنا ہی نہیں اور تیزی سے سیڑھیاں اتر کر نیچے اپنے پورشن میں چلی گئی۔

شام میں وہ اپنے کمرے میں بیٹھی کل کا میسج یاد کر رہی تھی جب اچانک ہی کمرے کا دروازہ کھول کر زوار اندر داخل ہوا۔

”یہ تم کیوں نہیں چل رہیں ہمارے ساتھ۔“ وہ عین اس کے سر پر اکھڑا ہوا۔

”کہاں؟“ اس نے کتاب سے نظر اٹھا کر سوال کیا۔

”باہر گھومنے پھرنے کے لیے۔“ بات کرتے کرتے اس کی نظر سمن کے چہرے پر پڑی۔

”کیوں تمہیں ماماں جی نے نہیں بتایا تھا اپنے پروگرام کا۔“

”تمہیں“ جواب دے کر وہ دوبارہ کتاب میں گم ہو چکی تھی۔

”او کم آن یا ربور مت کرو چلو شاہد بزرگ جلدی سے تیار ہو کر آجاؤ۔“

”مجھے نہیں جانا کل میرا بیالوئی کا میسج ہے۔“

”واٹ!؟“ وہ واپس جاتے جاتے رک گیا۔

”چلو جلدی تیار ہو جاؤ تم جانتی ہو مجھے انکار سننے کی عادت نہیں ہے۔“

”بھلا میں تمہاری عادتوں کے بارے میں کیسے جان سکتی ہوں۔“ سمن کے دل میں آیا کہ دے مگر کہ نہ سکی

اور خاموشی سے اپنی کتابوں میں مصروف رہی۔

”چلو جلدی اٹھو۔“ ایک دم ہی اس نے سمن کو بانو سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔

”تمہارا پاس صرف پانچ منٹ ہیں تیار ہو کر نیچے نہ آئیں تو میں تمہیں اسی حلیے میں لے جاؤں گا اوکے۔“ اس نے سمن کے منہ سے حلیے پر نظر ڈال کر گویا دھمکی دی اور پھر ہٹار کے تیزی سے دروازہ کھول کر باہر نکل

گیا اور وہ کتنی دیر تک اپنی جگہ کھڑی اس کی انگلیوں کا لمس اپنے بازو پر محسوس کرتی رہی۔
عشق کے علاقے میں حکم یا چلتا ہے، مضابطے نہیں چلتے
حسن کی عدالت میں عاجزی تو چلتی ہے، مرتبے نہیں چلتے
دوستی کے رشتوں کی پرورش ضروری ہے
سلسلے تعلق کے خود سے بن تو جاتے ہیں
لیکن ان شکوفوں کو ٹوٹنے بکھرنے سے
روکنا بھی پڑتا ہے

چاہتوں کی مٹی کو آرزو کے پودے کو سینچنا بھی پڑتا ہے
رجشوں کی باتوں کو بھولنا بھی پڑتا ہے
جب تیار ہو کر باہر نکلتی تو زوار حسن گاڑی نکال چکا تھا اور خوب کچی سنوری دریاب اس کے ساتھ اگلی
نشست پر ارجمان تھی بلکہ شہر پار اچھے بیٹھی ہوئی تھی۔
”اوہو بھی جلدی آجاؤ دیر ہو رہی ہے۔“
اسے دیکھتے ہی زوار نے آواز لگائی وہنا کوئی جواب دیئے خاموشی سے دروازہ کھول کر پیچھے بیٹھ گئی۔
”تمہیں جانا ہی تھا تو پہلے ہی تیار ہو جاتیں۔“ شہر پار کی تاگوار اور کوفت زہ آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔
”آپ نے کب کہا تھا مجھ سے تیار ہونے کے لیے۔“ اس نے سوچا ضرور لیکن پلٹ کر اپنی ماں سے کہہ نہ
سکی۔

”تمہیں جب ہمارے ساتھ جانا ہی تھا تو زوار اچھا سا تیار ہی ہو جاتیں۔“
پچھنے کی طرف مڑ کر دریاب نے اس کا بھرپور تنقیدی جائزہ لے کر مشورہ دینا ضروری سمجھا۔
”ٹھیک ہی تو لگ رہی ہے۔“ زوار نے بیکہ یو مرر سے اس پر ایک نظر ڈالی۔
”ہاں ہائی تا میں پہلے کہاں جاتا ہے؟“
”پہلے کسی اچھے سے ریٹورنٹ سے کھانا پیک کروالو کیونکہ سینما میں تو تمہیں بتا ہی ہے کبھی کوئی ڈھنگ کی
چیز نہیں ملتی اور ہاں تم نے ٹکٹ تو لے لیے تھے نا۔“
پارونے سینما میں گئی ایک انڈین فلم کا نام لیتے ہوئے دریافت کیا۔
”جی۔“ زوار نے جواب دے کر ایک نظر لا تعلق سے باہر دیکھتی سمرن پر ڈالی جس کی طبیعت سینما جانے کا سنتے
ہی خاصی مکدر ہو چکی تھی۔

”فوقہ! زوار زرد جلدی گاڑی چلاؤ سچی مجھے تو ابھی سے بڑی بھوک لگ رہی ہے۔“ اس سے قبل کہ وہ سمرن سے
کوئی بات کرتا اس کی توجہ دریاب نے اپنی جانب مبذول کروالی اور پھر اس سارے پروگرام کے دوران وہ خود کو ان
سب کے ساتھ خاصا مس فٹ محسوس کرتی رہی۔
اس کی ماں جو اس سے زیادہ دریاب گل کی ممانی تھی اس پر درپہ اور زوار کی بے جا بے تکلفی کا کوئی اثر نہ ہو رہا
تھا بلکہ وہ ان دونوں کو اتنا قریب دیکھ کر بھرپور خوشی کا اظہار کر رہی تھی اور سمرن اس سے اس بل کو پچھتا رہی تھی
جب اس نے ان کے ساتھ آنے کا فیصلہ کیا تھا ان تینوں کی مثلث کے درمیان تو سمرن کی گنجائش ہی نہ تھی کاش
اس بات کا احساس اسے پہلے ہو گیا ہوتا حالانکہ اس کی کھولی کھولی سی کیفیت دیکھ کر شروع شروع میں ایک دوبارہ
زوار نے ٹوکا بھی لیکن پھر دریاب کی کہنی میں وہ اسے بیکر فراموش کر گیا۔



”تمہیں نہیں لگتا کہ دریاب آج کل زوار میں کچھ زیادہ ہی دلچسپی لے رہی ہے۔“ فاریہ بھابھی نے پتکی کی
فراک تبدیل کرتے ہوئے اچانک ہی سمرن سے سوال کیا اور وہ جو جانے کس خیال میں گم تھی ان کے مخاطب
کرنے پر ایک دم ہی بوکھلا اٹھی۔
”کہاں گم ہو تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔“
”کیا۔“ اس نے بیکر غائب دماغی سے سوال کیا۔

”فوقہ! ایک تو بتانا نہیں تم کیوں اپنی ذات سے اس قدر لاپرواہ ہو کہیں سے بھی پارو چاچی کی بیٹی نہیں لگتیں۔“ اور
وہ کوئی بھی جواب دیئے بغیر خاموشی سے پتکی کے ساتھ کھیلنے لگی فاریہ بھابھی کچھ دیر تو کھڑی اسے دیکھتی رہیں پھر پتکی
کا پذیرے کر پتکی کی جانب چل دیں۔
”تم نہیں لگتیں اپنی اماں اور دریاب کے ساتھ گھومنے پھرنے دونوں ابھی ابھی زوار کے ساتھ گئی ہیں۔“ شاہ
ویز نے اندر داخل ہوتے ہی اس پر ایک نظر ڈال کر سوال کیا۔
”نہیں میرا کل ٹیسٹ ہے۔“ اپنی عزت کی سرخروی کے لیے جھوٹ کا سہارا لینا ضروری تھا ورنہ وہ تو یہ بھی نہ
جانتی تھی کہ اس کی ماں دیر اور زوار کے ساتھ کہیں گئی ہے۔
”یاریہ ٹیسٹ وغیرہ صرف تمہارے ہی ہوتے ہیں دریاب کے نہیں ہوتے جب دیکھو خوب تیار ہو کر گھومتی
ہی نظر آتی ہے۔“ شاہویز نے اس کے تے ہوئے چہرے پر ایک نظر ڈال کر اظہار خیال کیا۔
”وہ ویسے بھی کون سا بڑھتی ہے جو اسے کسی ٹیسٹ کی فکر ہوگی اسے تو اگر کوئی فکر ہے تو صرف فیشن اور اپنی
تیاری کی اس کے علاوہ دنیا کی ہر فکر اس کے لیے بے کار ہے۔“
بھابھی فیڈر لے کر واپس آگئی تھیں اس لیے اس کا خیر میں اپنا حصہ ڈالنا ضروری سمجھتے ہوئے اظہار خیال کر
بینیٹیں۔

”ہاں یہ تو ٹھیک ہے۔“ شاہویز نے ٹی وی آن کرتے ہوئے ان کی ماں میں ہاں ملائی۔
”بھابھی میں جا رہی ہوں۔“ وہ اچانک ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور جلدی سے پاؤں میں چپل پہن کر بیڑھوں کی
جانب چل دی۔
”زکو تو سچی نیچے جا کر کیا کوئی نیچے تو کوئی بھی نہیں ہے۔“
لیکن وہ تالی کی بات کو بیکر نظر انداز کرتی خاموشی سے نیچے اتر آئی۔ جہاں پھیلا سناٹا اسے اپنے اندر تک اترتا
محسوس ہوا۔



زوار جاچکا تھا گھر کی زندگی اپنے معمول پر آگئی تھی۔ شہر پار پھر سے اپنی روز موکی مصروفیات میں گم ہو چکی
تھی اور ان مصروفیات میں دیر بہتیشہ ان کی ہم قدم تھی اور سمرن آج تک یہی نہ جان پائی کہ اس کی اصل جگہ
کہاں ہے؟ اپنے گھرا اور پرائی کے گھر جہاں کا ہر فرد ہمیشہ اس کے لیے دیدہ دل فرش راہ کے ہوتا جبکہ اپنی سگی ماں
اس سے اتنا سرسری سادہ جیسے کوئی جاننے والی ہو پھول آئینہ کے سامنے کھڑی سمرن سوچتی رہ جاتی کہ اس کے
اس دے ہوئے رنگ و روپ کا فہم دار کون ہے؟ کیا وہ خود یہ چاہتی تھی کہ اس کی رنگت اتنی سادہ ہو اور اگر یہ
اللہ کی رضا تھی تو پھر کیوں اس کی ماں کے دل میں اس کی محبت کا احساس نہ جاگا۔
ہرگز رستہ دل اس نے خود کو زیادہ سے زیادہ کتابوں کی دنیا میں گم کر لیا وہ پہلے ہی کافی کم گو تھی لیکن اب تو بالکل
بولنا ہی بھول چکی تھی ایسے میں جب اکثر سمرن کا فون آتا تو اس کی ہوں ہاں اسے بھی پریشان کر دیتی لیکن وہ کیا

کر سکتی تھی اتنی دیر پردیس میں رہتے ہوئے بہن کی دل جوئی کرنا اس کے لیے ممکن نہ تھا جبکہ وہ اپنی بہن کے دکھ سے بھی واقف تھی اسی طرح کئی بے کیف دن گزرتے چلے گئے جو صرف سمرن کے لیے بے کیف تھے جبکہ دریا ب کے لیے تو ہر نادان پہلے سے بڑھ کر کیف انگیز ہوتا جا رہا تھا جانے وہ اور شہر پارا خوب تیار ہو کر جانے کہاں کہاں گھومتی پھرتی اب تو دریا ب نے گاڑی بھی چلاتا سیکھ لی تھی کالج بھرائے نام جاتی کیونکہ اسے پڑھائی سے کوئی خاص شغف نہ تھا البتہ نت نئے کورسز کرنے کے لیے وہ خوب شام میں تیار ہو کر گھر سے باہر نکل جاتی اور اس مقصد کے لیے شہر پارا نے ایک مہران خرید رکھی تھی جو شروع سے ہی درپہ کے زیر استعمال تھی۔



زندگی اپنے مخصوصی ڈگر پر رواں دواں تھی۔ وہ بھی صبح سورج طلوع ہوتا اور شام میں غروب ہو جاتا دن کا آغاز اور رات کا آجانا غرض کہ کچھ بھی ایسا نہ تھا جو قابل ذکر ہو وہ بھی روکھے پھیکے دن جو اپنی مخصوص اور روزمرہ کی رفتار سے گزر رہے تھے سمرن نے آنرز کے لیے یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا تھا جبکہ دریا ب ابھی بھی کالج ہی جاتی تھی گزرتے وقت نے جہاں سمرن کو مزید سنجیدہ کر دیا تھا وہاں دریا ب کی طبیعت کی جولانی بھی کھل کر سامنے آگئی کچھ تو اللہ نے حسن ہی بے تحاشا دیا تھا وہ سراوہ اپنے حسن کی حفاظت بھی باخوبی جانتی تھی وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اپنے حسن کو سنوارنے کا سلیقہ بھی اس میں خوب سے خوب تر بنا رہا تھا اور یہ کر قیقا "اس نے شہر پارا سے سیکھا تھا۔

سرفراز صبح سے گئے رات میں گھر آتے تو ایسے میں ہمیشہ انہیں سمرن پر تھی ہی دکھائی دیتی سنجیدہ اور کم گوئی سمرن اپنے باپ کے آرام اور کھانے پینے کا ہر ممکن خیال رکھتی جانے کیوں گزرتے وقت نے شہر پارا اور سرفراز صاحب کے درمیان ایک ان دیکھی دیوار سی حاصل کر دی تھی ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے وہ دونوں ایک دوسرے سے یکسر اجنبی ہو چکے تھے سرفراز صاحب کی گھر میں موجودگی کے دوران یا تو وہ خوب اہنماک سے کوئی قلم و کلمہ رہی ہوتی یا پھر دریا ب کے ساتھ واک کرنے نکل جاتی سرفراز صاحب کو اگر کوئی پریشانی تھی تو وہ دریا ب کے حوالے سے بھی جانے کیوں انہیں اب کچھ عرصہ سے یہ احساس ستانے لگا تھا کہ شہر پارا کے ساتھ نے دریا ب کی اصل شخصیت کو مٹ کر دیا ہے وہ دریا ب کو دیکھتے تو سوائے خود نمائی غرور و تکبر کے انہیں اس میں کوئی خلی دکھائی نہ دیتی اور اسی حوالے سے انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی شہباز کو بھی ڈھکے چھپے الفاظ میں سمجھانے کی کوشش کی تھی جسے اس نے درخور اہتمام ہی نہ جانا شہر پارا کے توسط سے دریا ب جن لکڑی سولیات کو اپنا لائف اسٹائل بنا چکی تھی ان کے تصور نے شہباز اور ارم کی آنکھیں مکمل طور پر بند کر رکھی تھیں۔ وہ جانتے تھے کہ دریا ب کی منہ زور خواہشوں کو پورا کرنا ان کے اختیار میں نہ تھا اس لیے اس مسئلے کا بہترین حل چشم پوشی تھا جسے انہوں نے مکمل طور پر اختیار کر رکھا تھا جبکہ جمالیہ اور تانی ساوہ سمیت ان کی پوری فیملی بھی سرفراز صاحب کی ہم خیال ہونے کے باوجود محض اس لیے خاموش تھی کہ جب سگے ماں باپ کو کوئی احساس نہیں تو "میں اور تو کون ہوتے ہیں بات کرنے والے یہی وجہ تھی کہ خاندان کے ہر فرد نے جان بوجھ کر اس سارے معاملے سے پردہ پوشی اختیار کر رکھی تھی اور شہر پارا، دریا ب کے حوالے سے مکمل طور پر خود مختار زندگی گزار رہی تھی اور وہی دریا ب تو اپنی زندگی کے اٹھارہ سال شہر پارا کی سرپرستی میں گزارنے کے بعد خاصی آزاد خیال اور بے باک ہو چکی تھی۔ بے انتہا نہ پھٹ دریا ب ہٹا کسی لحاظ سے ہر بات منہ پر دے مارنے کی عادی ہو چکی تھی۔

سچ ہے خون سے زیادہ تربیت شخصیت پر مکمل طور سے اثر انداز ہوتی ہے سمرن شہر پارا کی بیٹی ہونے کے باوجود انتہائی سلیقہ شعار یا اخلاق سلجھی ہوئی رکھ رکھاؤ کی حامل شخصیت کی مالک تھی جبکہ اس کے برعکس دریا ب بے انتہا بد تمیز خود غرض اپنی نفس کی ماری ہوئی شخصیت اختیار کر چکی تھی جہاں سمرن قناعت پسندی کی

قابل تھی وہاں دریا ب کے نفس کا پیمانہ لالچ اور طمع جیسی بیماریوں کا شکار ہو چکا تھا مزید کی خواہش نے اس میں سے اچھے برے کی تمیز یکسر ختم کر دی تھی یہی وجہ تھی کہ خاندان کے علاوہ بھی جو لوگ دریا ب کی شخصیت کے اس تاریک پہلو سے تھوڑا بہت واقف ہو چکے تھے اس سے دور رہنا ہی پسند کرتے تھے لیکن اسے اس کی خود پسندانہ فطرت نے کبھی اس بات کا احساس نہ ہونے دیا۔ اپنی خوبصورتی کے حوالے سے کالج میں لڑکیوں کی ہر وقت کی قصہ خوانی نے اس کے فخر و غرور میں بے تحاشا اضافہ کر دیا تھا ایسے میں اس نے اپنی زندگی میں کبھی کسی کی پرواہی نہ کی سوائے شہر پارا کے جانے کیسے وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم قرار پا چکی تھیں۔



گھروالوں کے علم میں لائے بغیر دریا ب نے ڈانس اکیڈمی جوائن کر لی تھی اور اس عمل میں اسے مکمل طور پر پارا کی پشت پناہی حاصل تھی ڈانس کا شوق دریا ب کی زندگی میں جنون کی سی کیفیت اختیار کر چکا تھا درپہ وہ ڈانس کے ذریعے شوہر کی دنیا میں اوپر تک جانے کا فیصلہ کر چکی تھی اور کسی بھی نتیجہ کی پروا کیے بغیر اس کے ہر فیصلہ میں ہمیشہ شہر پارا اس کے ساتھ ہی کھڑی نظر آتی اب بھی ایسا ہی ہوا ڈانس اینڈ آرٹ اکیڈمی میں ہفتہ میں دو دن رقص کی کلاس ہوتی دریا ب ہمیشہ شہر پارا کے ساتھ ہی اکیڈمی جایا کرتی جہاں وہ دو گھنٹے پارا اس کے انتظار میں باہر لابی میں بیٹھا کرتی اور تقریباً "رات آٹھ بجے کے بعد جب یہ دونوں واپس آتیں تو اوّل تو کبھی کسی نے ان سے جواب طلبی ہی نہ کی اور جو کبھی اتفاق سے کبھی کسی نے پوچھ بھی لیا تو ایک سواک بھانے گھرے گھرے ان کی بٹاری میں موجود ہوتے جن کا ہر وقت استعمال انہیں ہر طرح کی پریشانی سے محفوظ رکھنے کا موجب بنتا۔

ویسے بھی اپنی زندگی کے تین سال اس خاندان میں گزارنے کے بعد پارا کے دل میں کسی کا وہ ڈر و خوف یا لحاظ موت باقی نہ رہا جو ابتدا کی چند سالوں میں اس کی شخصیت کا خاصہ رہا تھا حقیقت یہ تھی کہ آتما کی اور سیکنے بی بی کی موت اور سرفراز صاحب کی بے اعتنائی نے اسے مکمل طور پر پانی کر دیا تھا شاید یہی وجہ تھی کہ اپنی محرومی کا بدلہ وہ دریا ب کی ذات سے لے رہی تھی اور یہ بات شاید وہ خود بھی نہیں جانتی تھی بہر حال جو بھی تھا یہ تھا کہ ان کا ہر قدم دریا ب کو بدترین تباہی کی جانب لے جا رہا تھا جس کا احساس کسی کو بھی نہ تھا یہاں تک کہ پارا کو بھی نہیں وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی بے تحاشا محبت بے جا لاڈ پارا نے دریا ب کو بے راہ روی کے راستوں پر ڈال دیا ہے بہت اوپر جانے کی خواہش میں کچھ بھی کھو نہ دریا ب کے لیے کوئی اہمیت نہ رکھتا تھا شوہر کی چکا چوند نے بے خبری میں ہی اسے گھیر لیا تھا کچھ عمر میں اس کی آنکھوں میں بسنے والا خواب وقت گزرنے کے ساتھ حقیقت کا روپ دھارنے کے لیے بے قرار ہو چکا تھا اور اسی خواب کے حصول نے دریا ب کے دل سے اپنی روایات، خاندانی وقار اور جاوہر جلال کو بھی بالکل فراموش کر دیا تھا۔

وہ تو بچی تھی بروقت سمجھایا جاتا تو شاید سمجھ جاتی لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس کی کچی آنکھوں کو یہ خواب بخشے والی پارا بھی شاید ایک بڑی فلمی اداکارہ بننا کبھی پارا کی خواہش رہا ہو جو وقت نے پوری نہ ہونے دی اور اب اپنی وہ خواہش پوری شدت کے ساتھ وہ دریا ب کے خون میں اتار چکی تھی۔ لاشعوری طور پر اپنی پہلے دن کی اس گھر میں آمد پارا بھی نہ بھولی تھی آتما کی کے کئے گئے الفاظ "گند اخون" آج بھی اس کا بلڈ پریشر بڑھانے کا سبب بن جاتے تھے اور پھر اپنے لیے سب کی آنکھوں میں ہلک آمیز تاثرات کی اذیت بھی اسے آج تک یاد تھی اپنی سگی اولاد کے پرورش دوسروں کے ہاتھوں ہونے والی بات بھی وہ کبھی نہ بھولی تھی اور اس سب کے رد عمل میں اس کے دل میں پیدا ہونے والی نفرت شاید دریا ب کی محبت سے بھی کم نہ ہو سکی پارا کے زخم و وقت نے مندر ضرور کیے لیکن شاید۔



پچھلے ایک گھنٹہ سے فون کان سے لگائے دریا جانے کس سے باتیں کر رہی تھی آواز اس قدر دھیمی تھی کہ کچھ فاصلے پر بیٹھی سمرن کو بھی کچھ سنا ہی نہ دے رہا تھا شہ پر دریا کے بالکل قریب ہی بیٹھی تھی فون پر مصروف ہونے کے باعث تا صرف وی کی آواز کم تھی بلکہ دونوں میں سے کوئی بھی لڑکی کی جانب متوجہ نہ تھی یہ ہی وجہ تھی کہ سمرن کوئی نیوز چینل لگائے بیٹھی تھی ورنہ عام حالات میں تو ان دونوں میں سے کسی ایک کی بھی موجودگی میں نیوز چینل لگایا جاتا نہ خود ایک جرم تھا۔

”یہ لو مجاہد سے بات کرو۔“ دریا کی بات سن کر سمرن لاشعوری طور پر ان کی جانب متوجہ ہو گئی اور یہ جاننے کا فطری تجسس کہ دوسری سمت کون ہے اس نے غیر ارادی طور پر وی کی آواز کو قدرے کم کر دیا حالانکہ کسی کی ٹوہ لینا اس کی فطرت نہ تھی لیکن اس وقت وہ اپنے شک کو یقین میں بدلنا چاہ رہی تھی۔

”ہاں بیٹا وعلیکم السلام تم تو ایسا کراچی سے گئے کہ دوبارہ پلٹ کر پوچھنا تک نہیں۔“

تو سمرن کا شک درست نکلا دوسری طرف یقیناً ”دوار حسن“ ہی تھا۔ سمرن کا دل ایک دم ہی ساری دنیا سے اچاٹ ہو گیا اس نے نہایت خاموشی سے ریموٹ صوفے پر رکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی ایک نظر صوفے پر بے حد مصروف دریا اور پار پر ڈالی اور اپنے کمرے کی سمت جانا ہی چاہتی تھی کہ اچانک لاؤنج کا دروازہ کھول کر شاہد بڑی تیزی سے اندر داخل ہوا اور کمرے میں موجود دونوں ہستیوں کو مکمل طور پر نظر انداز کرتا ہوا سمرن کے عین مقابل آکھڑا ہوا۔

”جلدی سے باہر آؤ مجھے تمہیں کچھ دکھانا ہے۔“ خلاف توقع وہ بے حد ایکسائیزڈ تھا۔

”کیا دکھانا ہے۔“ کچھ دیر قبل والی بے زاری اور اپنی شخصیت کو نظر انداز کرنے کا دکھ ابھی بھی اس کی آواز میں جھلک رہا تھا۔

”ایک تو تم سوال جواب بہت کرتی ہو جلدی چلو۔“

سمرن خاموشی سے لاؤنج کا دروازہ کھول کر شاہد بڑی کی ہمراہی میں باہر نکل گئی جبکہ خود کو نظر انداز کرنے کا شاہد بڑی کا یہ عمل دریا کو اندر تک جلا کر بھسم کر گیا۔

”تمہیں بتا ہے میرا بی بی اے کلاسٹ سمسٹر بہت اچھے نمبروں سے کلیئر ہوا ہے۔“ وہ بیڑھیوں سے تیز تر اترتا ہوا بول رہا تھا۔

”مجھے کیسے بتا چلا جب تم نے بتایا ہی نہیں۔“ وہ ذرا سا خفگی سے بولی۔

”صل میں کچھ ایسا ہے ڈیر کزن کہ بھائی نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ اچھے رزلٹ کے سبب وہ مجھے گاڑی کے لیے پیسے بھیجیں گے اور میں جانتا تھا کہ ان شاء اللہ اپنی محنت کے ذریعے یہ دونوں کامیابیاں میں ضرور حاصل کر لوں گا لہذا اچھا رزلٹ اور گاڑی یہ دو سر پر اترتے جو میں نے تمہیں دینے تھے بس اسی لیے نہیں بتایا۔“ وہ سامنے کھڑی سلور مہران کا دروازہ کھولتے ہوئے قدرے وضاحت کرتا ہوا سب کچھ بتا گیا۔

”چلو بہت بہت مبارک ہو اب جلدی سے مٹھائی کھلاؤ۔“ وہ ایک دم ہی سب کچھ فراموش کر کے خوش و خرم ہو گئی۔

”تم بیٹھو گاڑی میں میں تمہیں مٹھائی کھلانے ہی لے کر جا رہا ہوں۔“

اس نے فرنٹ ڈور سمرن کے لیے کھول دیا اور دروازہ تمام کر خطر نگاہوں سے اس کی جانب نکلنے لگا جبکہ وہ ایک دم ہی کنفیوز ہو گئی۔

”میں اکیلی۔“ وہ گھبرا کر بولی (جانے تائی اور سب کیا سوچیں۔)

”میں امی کو بتا چکا ہوں بھابھی نے خود جانے سے منع کر دیا ہے کیونکہ فریال (بھابھی کی بیٹی) کو نمپر بچہ ہے اب

کوئی اور اعتراض ہو تو وہ بھی جلدی سے بتاؤ ورنہ بیٹھ جاؤ۔“

”وہ دراصل میں نے اسکارف نہیں لیا اور ہاں۔“ جیسے اسے کچھ یاد آیا۔

”ایسے کرو دریا کو بھی بلال لاؤ جانے وہ کیا سوچے۔“

”اسکارف کے بغیر بھی تم بہت اچھی لگ رہی ہو اور اچھا ہی ہوا جو اسکارف لے کر نیچے نہیں آئی ہو یقین جانو اسکارف میں تم میری کزن کم انی زیادہ لگتی ہو۔“

دریا کے ذکر کو مکمل طور پر نظر انداز کرتا ہوا وہ ہنس کر بولا۔

”بری بات شاہد بڑی دوبارہ میرے اسکارف کا مذاق مت اڑنا۔“ وہ سخت برامان کر بولی۔

”وہ سواری یا تم جانتی ہو میں مذاق کر رہا تھا ویسے بھی تم نے سر پر دوپٹا اتنی اچھی طرح اوڑھا ہے کہ اسکارف کی کمی محسوس ہی نہیں ہو رہی۔“ وہ ستائش بھری نظروں سے اس کا بھرپور جائزہ لیتا ہوا بولا جبکہ شاہد بڑی کے اس طرح دیکھنے سے وہ بری طرح پبل ہو گئی اور شاید پہلی دفعہ ایسا ہوا کہ شاہد بڑی کے ساتھ آگے بیٹھے ہوئے اس کی خود اعتمادی کو بحال ہونے میں کچھ وقت لگا اسے ایسا محسوس ہوا کہ اس کا دل شاہد بڑی کی محبت کی روشنی سے جگمگانے لگا ہے اور اس حقیقت کا ادراک ہوتے ہی وہ شاہد بڑی کے ساتھ خود سے بھی نظرس چرانے لگی۔

وہ دونوں سی دیو آگئے جہاں بنا کوئی بات کیے دونوں نے ایک لمبی چل قدمی کی نہ جانے الفاظ دونوں کے پاس ختم ہو گئے تھے یا دلوں میں تازہ سر اٹھانے والے چور جذبوں نے ان کی زبان بندی کر دی تھی۔ پھر وہاں سے واپسی میں وہ پراہٹ آگئے جہاں کے تروتازہ ماحول میں دونوں آہستہ آہستہ اپنی پرانی جون میں واپس آگئے پراکھانے کے بعد سمرن کا دل آئس کریم کھانے کا چاہا جس کا اظہار اس نے بر ملا شاہد بڑی سے کر دیا اور چند ہی لمحوں میں شاہد بڑی اس کے لیے آئس کریم کیمپارسل کی صورت میں لے آیا۔

”ایسا کرو تم آئس کریم گاڑی میں بیٹھ کر کھالو میں ذرا فاریہ بھابھی کے لیے پرائیک کروالوں۔“ گاڑی کی چابی سمرن کو دے کر وہ واپس پلٹا۔

”بات سنو شاہد بڑی ایک پرا دریا ب کے لیے بھی پیک کروالو اسے پرا بہت پسند ہے۔“ اس نے اکثر و بیشتر پرا ڈیوری اپنے گھر ہوتے دیکھی تھی اسی لیے بول پڑی جبکہ شاہد بڑی کوئی جواب دیے اندر چلا گیا اور جب تھوڑی دیر بعد واپس آیا تو خالی ہاتھ تھا۔

”بھابھی کھانا کھا چکی ہیں میں نے فون کر کے پوچھا تھا انہوں نے منع کر دیا۔“ اپنے خالی ہاتھ آنے کی وضاحت اس نے بنا پوچھے ہی کر دی۔

”اور دریا ب۔“ وہ پوچھے بنانہ رہ سکی جانے کیوں دریا ب کے سامنے شاہد بڑی کے ساتھ اس طرح رات کو اکیلے آتا ہے کچھ اچھا محسوس نہ ہو رہا تھا اور اپنے اس گلٹ کو کم کرنے کے لیے وہ چاہتی تھی کہ دریا ب کے لیے بھی کچھ لے کر ہی گھر جائے۔

”تم ہر وقت دریا ب دریا ب کیوں کرتی رہتی ہو گیارا اہلم ہے تمہارے ساتھ۔“ وہ سخت چڑ کر بولا۔

”یاد رکھنا دوبارہ جب بھی میرے ساتھ آؤ تو پلیز اس خود غرض لڑکی کا نام بھی مت لینا جانتی ہو اتنی بے باک لڑکیاں مجھے بالکل بھی پسند نہیں ہیں وہ تو کزن ہونے کے ناتے تھوڑی بہت بات کر لیتا ہوں ورنہ ایسی لڑکیوں کے پاس سے گزرنا بھی میں اپنی تو بہن سمجھتا ہوں۔“

گاڑی کو تیزی سے ریورس کرتے ہوئے وہ سخت غصے میں تھا جبکہ دریا ب کے حوالے سے اس کے خیالات اور چہرے پر پھیلی ہوئی نفرت نے سمرن کو حیرت زدہ کر دیا وہ حیران تھی کہ دریا ب جیسی حسین ترین لڑکی سے بھی بھلا نفرت کی جاسکتی ہے وہ جو یہ سمجھتی تھی کہ دریا ب جیسی لڑکیاں ہر شخص کے دل پر راج کرنے کا کر جانتی ہیں

ڈالی۔

”میں تم سے کچھ پوچھ رہا ہوں۔“ انہوں نے اپنی آواز کو حتی الامکان مدھم رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، جبکہ شہر پارا ان کی بات کو بے پروائی سے خاموشی سے اپنا کام کرتی رہی۔ پھر نیل پالش کا ڈسکن بند کر کے اپنے ناخنوں پر پھونک مارتے ہوئے بالکل اس طرح کھڑی ہوئی جیسے کمرے میں کوئی دوسرا فرد موجود ہی نہ ہو نیل پالش کی بوتل ڈرننگ نیل پر رکھی اور پلٹ کر نہایت اطمینان سے چلتی ہوئی عین ان کے مقابل کھڑی ہوئی۔

”مجھ سے کچھ کہا ہے آپ نے؟“ اس کی بے نیازی عروج پر تھی۔

”ہاں تم سے ہی کہہ رہا ہوں، کون ہے یہ شخص جو آج کل ہمارے گھر آ رہا ہے۔“

”میری کزن کا بیٹا، بھانجا لگتا ہے میرا۔“ اس کا اطمینان دیدنی تھا۔

”یہ تمہاری ایسی کون سی کزن پیدا ہو گئی، جس کا بیٹا لینڈ کروزر کا مالک ہو۔“ سرفراز صاحب کا انداز استہزائیہ تھا۔

”کیوں کیا ہم جیسوں کی کوئی کزن نہیں ہوتی یا ان کا کوئی بیٹا نہیں ہو سکتا، آپ کو اعتراض کس بات پر ہے، کزن پر، بیٹے پر یا لینڈ کروزر پر۔“

وہ ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کھڑی تھیں، جانے ان کے لہجے میں ایسا کیا تھا کہ ایک دم ہی سرفراز صاحب گھبرا اٹھے، وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس بڑھاپے میں آکر تیس سال قبل اٹھایا جانے والا غلط قدم ان کی بدنامی کا باعث بنے، انہیں اپنے سے زیادہ اپنی بیٹی کی فکر تھی اور یقیناً ”شہر پارا کا ماضی ان کی بیٹی کے مستقبل کو داغ دار کر سکتا تھا۔“

”دیکھیں سرفراز صاحب اگر آپ کے بہن، بھائی اس گھر میں آسکتے ہیں آپ سے مل سکتے ہیں تو پھر میرا بھانجا کیوں نہیں آکر آج تیس سال بعد میرا کوئی رشتہ دار آپ کے گھر آ بھی گیا ہے تو آپ کی غیرت ایک دم جاگ اٹھی۔ اگر میرا بھانجا ایک مرد ہے تو کیا آپ کے بھانجے، بیٹے مرد نہیں ہیں یا وہ غیرت کے زمرے میں نہیں آتے، آپ کا قانون سب مردوں کو ایک برابر نہیں سمجھتا؟ کیا اس میں میرے رشتہ داروں اور آپ کے خاندان والوں میں کوئی فرق ہے، آپ کا بھانجا آئے تو ٹھیک میرا آئے تو گناہ۔ واہ جی واہ۔“ وہ کمر پر ہاتھ رکھ کر ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولی۔

”وہ تو ٹھیک ہے، لیکن میں تو صرف درباریہ کی وجہ سے۔“

”آپ درباریہ کی فکر نہ کریں۔“ وہ تیزی سے ان کی بات کاٹ کر بولی۔

”اللہ خیر کرے، اس کے ماں باپ دونوں موجود ہیں، اپنی بیٹی کا بھلا براسب دیکھنے کے لیے، آپ صرف اپنی بیٹی کا خیال کریں جو آپ کی ذمہ داری ہے۔“ اس نے سمرن کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا، اب سرفراز صاحب کے پاس مزید بات کرنے کی گنجائش ہی باقی نہ رہی تھی۔

”شادی کرتے وقت تو دیکھتے نہیں کہ کس خاندان میں کر رہے ہیں اس وقت عشق کا بخار دماغ پر چڑھ جاتا ہے، بعد میں دنیا دکھاوے کے لیے اس بار میں بیٹھتے ہیں ڈرامہ باز لوگ یاد رکھیے گا، سرفراز صاحب میں جو بھی ہوں جیسی بھی ہوں اللہ کا شکر ہے آپ کے لیے اپنے گھر سے بھاگ کر نہیں آئی، خود ہیہ کر لائے تھے مجھے آپ اور پھر ساری عمر ایک کونے میں ڈال کر اپنے فرض سے آزاد ہو گئے اور میری زندگی گزر گئی آپ کی عزت بچاتے ہوئے اونہ۔“ انہوں نے ایک نخوت بھری نظر سرفراز صاحب پر ڈالی جو ایسے کھڑے تھے جیسے وہاں موجود ہی نہ ہوں نہ امت سے گردن چمکائے اپنے ماضی پہ شرمسار اس غلطی پر تادم جس کے نتیجے میں شہر پارا ان کی بد بیٹیوں کی ماں بننے کی حق دار ٹھہری کاش یہ سب آج سے تیس سال قبل سوچا ہوتا تو آج اتنی ندامت کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔“ اسے کاش

میں اپنی محبت کے زور پر اس عورت ہی کو بدلنے کی ایک کوشش کر لیتا، لیکن اب لا حاصل۔ اب وقت میرے ہاتھوں سے ریت کی طرح پھسل گیا، نہ میں نے اپنے ماں باپ کو کوئی خوشی دی اور نہ ہی اس عورت کو وہ بھرپور توجہ دی جو شاید آج اس کے دل میں موجود ہو کہ تریاق میں بدل دینے کے کام آتی۔“ وہ مرے مرے قدموں سے واپس مڑے۔

”اور ہاں ایک بات اور یاد رکھیے گا میں نے دریا ب کو ماں بن کر پالا ہے، سگی ماں سے بڑھ کر اس سے محبت کی ہے۔ راتوں کو اس کے ساتھ جاگی ہوں، اس کی ہر دھڑک اور تکلیف کو اپنے دل پر محسوس کیا ہے، میں کبھی کوئی ایسا قدم نہیں اٹھاؤں گی جس سے اسے تکلیف پہنچے۔“

شہر پارا کی نخوت بھری آواز ان کے کانوں سے ٹکرائی، وہ خاموشی سے باہر نکل آئے۔

جہاں دروازے کے قریب ہی سمرن کھڑی تھی، آنکھوں میں ڈھیروں سوال لیے اس کا دل چاہا آج ضرور اپنے باپ کو روک کر پوچھے کہ اس کی ماں کا تعلق کس خاندان سے ہے؟ کیا جو لوگ کہتے ہیں وہ سچ ہے؟ کیا اس کی ماں کا تعلق ریڈ لائٹ ایریا سے ہے؟ لیکن وہ جانتی تھی کہ اس کا باپ ان میں سے کسی بھی سوال کا جواب نہ دے پائے گا اور وہ جانتا بھی نہیں چاہتی تھی، کیونکہ ”ٹنگ“ اور ”ٹینس“ میں کتنا فرق تھا۔ وہ اسے آج صبح معنوں میں معلوم ہوا اور اس آگہی کی اذیت نے اسے اندر تک چیر دیا، شاہ ویز جو ابھی ابھی باہر سے آیا تھا اندر سے آنے والی تیز تند گفتگو سن کر بل بھر میں ہی ساری بات جان گیا اور دانش سہگل سے متعلق شہر پارا سے کسی بھی جواب طلبی پر لعنت بھیج کر خاموشی سے سیڑھیاں چڑھ کر اپنے فلور کی جانب بڑھ گیا۔



شام میں جب اس کی آنکھ کھلی تو گھر میں حسب معمول خاموشی کا راج تھا۔ یقیناً ”درباریہ اور اماں کہیں باہر گئی ہوں گی، یہ سوچ کر وہ باہر آمدے میں آگئی۔ پہلے چاہا اوپر چل جائے، لیکن شاہ ویز کی موجودگی کے خیال سے ارادہ بدل دیا اور جانے کیا بات تھی آج کل وہ شاہ ویز کے سامنے زیادہ جانے سے گریز کرتی تھی، وجہ شاہ ویز کی حال دل بیان کرتی آنکھیں تھیں، اس کی بولتی نگاہوں سے وہ گھبرا اٹھتی تھی۔ عورت ہونے کے ناتے وہ بنا کے ہی شاہ ویز کی دل کی آواز سن چکی تھی اور یہی وجہ تھی کہ وہ اس سے کترانے لگی تھی، اسی لیے خاموشی سے نیچے ارم چچی کے پاس آگئی جو اس وقت نایاب کو کھانا کھلا رہی تھیں، اپنی بیماری کی بدولت وہ اٹھارہ، انیس سال کی عمر میں بھی بچوں ہی کی طرح حری ایکٹ کرتی تھی، اسی وجہ سے آرزو اور ولید ہمیشہ اپنی ماں کی عدم توجہی کا شکار رہے۔

”چھا ہوا آبی آپ آگئیں اب مجھے مہینہ کا یہ والا سوال سمجھا دیں۔“ ولید اسے دیکھتے ہی اپنی کانپی لے کر آگیا، جبکہ ارم نایاب کا کھانا ختم کرنے کے بعد اس کا منہ ہاتھ کیلے تو لیے اسے اچھی طرح صاف کر رہی تھیں۔

”چلو تم ولید کو ہوم ورک کروادو، میں تمہارے لیے چائے لاتی ہوں۔“ ارم چچی نے فارغ ہو کر تمام برتن سینے اور کچن کی جانب بڑھتے ہوئے سمرن کو مخاطب کیا۔

”رہنے دیں چچی میں بی بی کر آئی ہوں۔“

”کوئی بات نہیں میرے ساتھ ایک دفعہ اور بی بی۔“ وہ ولید کو سوال سمجھا رہی تھی، جب شاہ ویز دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔

”میں تمہیں سارے گھر میں ڈھونڈ رہا ہوں، تم یہاں چھپی بیٹھی ہو۔“ وہ کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”خیر چھپی تو نہیں بیٹھی، ویسے ہی تناول گہرا رہا تھا، اسی لیے سوچا نیچے چلوں ذرا بچوں میں دل ہی بھل جائے گا۔“ وہ اپنے اندر کی کیفیت کو چھپا کر بڑے نارمل انداز میں بولی۔

”چلو خیر تمہاری مرضی، ورنہ دل تو مجھ سے بھی بھل سکتا ہے۔“ اس نے سفید دپٹے کے بالے میں موجود سمرن

کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے شوقی سے کہا، اس سے قبل کہ وہ کچھ کتنی ارم آگئیں، ہاتھ میں پکڑی رہے سمرن کے سامنے رکھی۔

”مجھے تو بتائی نہیں چلا کہ شاہدیز بھی آیا ہوا ہے، چلو اب تم بیٹھو میں ایک کپ چائے اور بنا لاؤں۔“ یہ کہہ کر وہ واپس بچن کی جانب مڑ گئیں، جبکہ شاہدیز کی نظروں کا ارتکاز محسوس کر کے سمرن کچھ کنفیووزی ہو گئی، اسی لیے منہ نیچے کیے جلدی جلدی ولید کو سوال سمجھانے لگی اور شاہدیز بڑی دلچسپی سے اس کی حرکات کو نوٹ کرتا رہا۔ گھبراہٹ میں سمرن نے گرم کپ چائے کا ایک بڑا سا گھونٹ لے لیا اور پھر جلدی سے کپ واپس رُے میں میں رکھ دیا شاہدیز بے اختیار ہی ہنس کر ادا اور جانے کیا سوچ کر سمرن کی چائے کا کپ اٹھالیا۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ سمجھتی شاہدیز نے بڑے مزے سے اس کی بچی ہوئی چائے کے سبب لینے شروع کر دیے، ارم چچی ایک اور کپ لے کر واپس آچکی تھیں اور نایاب کی جانے کو ن سی بات سننے میں مصروف تھیں۔ دُتین سب لے کر اس نے کپ واپس رُے میں رکھ دیا۔

”یہ باتی چائے تم پی لیتا میں اور پی کر آیا تھا۔“ بچی ہوئی چائے کا کپ اس نے سمرن کے سامنے رکھ دیا۔

”اب یہ مت کہہ دیتا میں تمہارا چھوٹا نہیں بیوں گی۔“ تہمت آہستہ سے کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

”اے تم کہاں جا رہے ہو چائے تو پی لو۔“ نایاب میں ابھی ارم چچی نے شاہدیز کے کھڑے ہوتے ہی اس کی توجہ چائے کی جانب مبذول کروائی۔

”بس چچی مجھے کہیں جانا تھا میں تو ویسے بھی ولید سے ملنے نیچے آ گیا تھا۔“ اس نے ولید کے بالوں کو آہستہ سے چھو کر سمرن پر ایک نظر ڈالی اور باہر نکل گیا۔

شہر پارا کے دو ہی شوق تھے ایک شاپنگ، دوسرا فلم بنی، لیکن جانے آج کل ایسا کون سا قارون کا خزانہ اس کے ہاتھ لگ گیا تھا کہ جب بھی دونوں گھر سے جاتیں واپسی میں خوب لدی پھندی ہوتیں قیمتی ملبوسات، پینڈیک، امپورٹڈ جوتے، پرفیوم اور جیولری سے دونوں کی مشترکہ الماری لدی پڑی تھی ڈورنگ ٹیکبل پر موجود میک اپ کے قیمتی سامان میں ہونے والے دن بہ دن اضافہ نے بھی سمرن کو دنگ کر رکھا تھا۔ دونوں کے ہاتھوں میں موجود موبائل ان کے بیش قیمت ہونے کا اعلان کرتے اس سلسلے میں استعمال ہونے والی اضافی رقم کا ذریعہ کیا تھا شاید یہ سوال سمرن کو مزید کچھ عرصہ پریشان رکھتا، اگر ایک دن یونیورسٹی سے واپسی پر وہ اپنی ماں اور دریا کو دانش سہگل کے ساتھ نہ دیکھ لیتی۔

”تو قارون یہ شخص ہے جس کے خزانے سے میری ماں اور دریا فیض یاب ہو رہی ہیں۔“ جیولر شاپ سے باہر آتی دریا پر ایک تاسف بھری نظر ڈال کر اس نے سوچا۔

اچانک ہی اس کی نگاہ سفید یونیفارم میں ملبوس اس لڑکی پر پڑی تو واپس پلٹنا بھول گئی۔ ”اُپر“ اس لڑکی کو دیکھتے ہی پہلی تشبیہ مرعلی کے دل نے دی جسے دل کی گہرائیوں سے تسلیم کرتے ہوئے مرعلی نے ہر تصدیق ثبت کر دی۔ یونیفارم پر بڑی بے نیازی سے دوپٹہ گلے میں ڈالے اپنی دوست سے ہنس ہنس کر باتیں کرتی، وہ مرعلی کی جانب بڑھتی آرہی تھی اور اس کا اٹھتا ہوا ہر قدم مرعلی کو اپنے دل پر پڑتا محسوس ہو رہا تھا جانے وہ لڑکی واقعی اپنے قامت خیز حسن کی تجلیوں سے بے خبر تھی یا اپنی بے نیازی کے زور پر دونوں کو تسخیر کرنے کا فن جانتی تھی۔ مرعلی کو تسخیر نظر انداز کرتی وہ اس کی گاڑی کے پاس سے ایسے گزری جیسے سبک رفتار ہوا کا جھونکا۔ مرعلی کو ایسا محسوس ہوا

جیسے وہ زمین پر نہیں بلکہ پانی پر چل رہی ہو تہمت ہی دکلش اور دل کو موہ لینے والی چال چلتی ہوئی جیسے ہی وہ سڑک کا موڑ مڑ کر مرعلی کی نظروں سے اوجھل ہوئی ایسا محسوس ہوا جیسے ایک دم ہی سارے عالم پر اندھیرا چھا گیا ہوا اور پھر مرعلی کا دل وہاں ایک بل بھی نہ لگا۔

وہ اپنے دوست عمر لغاری کے ساتھ مقامی گرلز کالج آیا تھا جہاں عمر کی والدہ پر نجل تھیں، عمر کو اپنی والدہ سے کوئی کام تھا، اسی لیے وہ زبردستی مرکو بھی اپنے ساتھ لے آیا، اب پچھلے پندرہ منٹ سے وہ اندر اپنی والدہ کے پاس تھا، جبکہ مرکاڑی سے ٹیک لگائے کھڑا اس کے انتظار میں سخت بور ہوا تھا کہ اچانک ہی اس ”اُپر“ کے دیدار نے مرعلی کی پوریت کو اڑن چھو کر دیا اور وہ دل کی گہرائیوں سے عمر لغاری کا مشکور ہوا، جس کی بدولت ایسے حسن جہاں سوڑ کا نظارہ اس کے لیے ممکن ہو سکا۔

آج کل اسلام آباد سے پھوپھو اور زوار آئے ہوئے تھے، زوار تو ویسا ہی تھا خوش و خرم اور ہشاش بشاش، لیکن جانے کیا بات تھی اسے پھوپھو پہلے جیسی دکھائی نہ دے رہی تھیں، سمرن نے جب بھی انہیں دیکھا افسردہ اور بے بسی بھی ہی نظر آئیں، نیچے تو خیر وہ ویسے ہی کم آتی تھیں، لیکن جب وہ تائی سادیہ کے پاس اوپر گئی پھوپھو کو کسی گہری سوچ میں غرق ہی پایا، جب تک وہ اوپر رہتی پھوپھو خالی خالی نظروں سے اس کی جانب ٹکا کر تھیں اور پھوپھو کی اس حالت نے اسے حقیقتاً ”پریشان“ کر دیا۔

”بھابھی یہ پھوپھو واقعی ہی پریشان ہیں یا صرف مجھے محسوس ہو رہا ہے۔“ اس سے رہانہ گیا اور فاریہ بھابھی سے پوچھ ہی بیٹھی۔

”پریشان نہیں بلکہ کافی پریشان ہیں۔“ فاریہ بھابھی دھیسے سے جواب دے کر اپنے کام میں مشغول ہو گئیں اور وہ جوان کی پریشانی جانا چاہتی تھی منتظر ہی رہی کہ فاریہ بھابھی مزید کچھ بتائیں لیکن بھابھی کی طرف سے طاری ہونے والی خاموشی کسی سنجیدہ بات کی سمت اشارہ کر رہی تھی۔

”پریشانی کی وجہ۔“ ”کید نے کی عادت نہ ہوتے ہوئے بھی وہ پھر سے پوچھ بیٹھی۔

”زوار حسن۔“ بھابھی نے پلٹ کر اس پر ایک نظر ڈالی اور پھر اس کے سوالیہ انداز کو سمجھتے ہوئے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

”وہ ایسا ہے سمرن۔“ بھابھی کی سمجھ میں نہ آیا بتائیں کہ نہیں۔

”زوار، دریا ب سے شادی کرنا چاہتا ہے۔“ آخر کار بھابھی نے بتانے کا فیصلہ کر ہی لیا۔

”تو اس میں اس قدر پریشانی والی کیا بات ہے۔ ایسا تو ہونا ہی تھا۔“ وہ حیران ہو کر بولی۔

”دریا صرف ان کے بھائی کی بیٹی ہے بلکہ ان کے بیٹے کی پسند بھی ہے اور اتنی خوبصورت لڑکی کی خواہش تو کوئی بھی شخص کر سکتا ہے اس میں زوار حسن کا کیا قصور ہے بھلا۔“

”ہر شخص تو خیر نہیں ہاں البتہ ہر بے وقوف شخص ضرور کہا جاسکتا ہے۔“

بلاشبہ یہ آواز شاہدیز کی تھی جو غالباً ابھی ابھی اس سے آیا تھا۔

”اور میرا خیال ہے کہ زوار کا شمار بھی ان ہی بے وقوف لوگوں میں ہوتا ہے ورنہ کم از کم میرے جیسے پیکٹیکل آدمی کے لیے صورت سے زیادہ سیرت اور مضبوط کردار اہمیت کا حامل ہے اور مجھے آج تک دریا میں کوئی ایسی خوبی نظر نہیں آئی جس کی بنا پر اس کے دائمی ساتھ کی خواہش کی جائے۔“

”تلفاری بات بھی ٹھیک ہے لیکن پھر بھی سب کا اپنا اپنا نظریہ ہوتا ہے کچھ لوگ صورت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔“ بھابھی نے اپنا مجزیہ بیان کیا۔

”لیکن پھوپھو کے نزدیک صورت سے زیادہ سیرت اہم ہے وہ ایک حسین مجسمہ سے زیادہ سکھ ہو کی خواہش مند ہیں جبکہ زوار اپنی ضد پر عمل طور سے اڑا ہوا ہے اب پھوپھو اونٹ کس کرٹ پیٹھے۔“
بھابی نے ہاتھ دھو کر ڈبلہ سے صاف کیے اور پلٹ کر سمن کی جانب بھاگا۔

”ویسے ایک بات بتاؤ سمن تمہیں کبھی برا نہیں لگا کہ زوار دریا میں اتنا انڈر سٹڈ ہے جبکہ وہ تم سے منسوب تھا اور یہ بات تقریباً سب ہی جانتے تھے۔“

سمن کے لیے بھابی کے دل میں موجود فطری محبت تاسف کی صورت میں ان کے لہجے میں در آئی جبکہ شاہویر کی موجودگی میں سمن کے لیے اس بات کا جواب دینا خاصا دقت طلب تھا اور وہ بھی اس صورت میں جب وہ جان چکی تھی کہ شاہویر بھی اس کا جواب جاننے کے لیے بے قرار ہے۔

”بات دراصل یہ ہے بھابی میرے نزدیک کبھی بھی وہ شخص عزت اور اہمیت کا حامل نہیں ہو سکتا جس کے نزدیک میری کوئی حیثیت نہ ہو اور یہ تو زیادہ اچھا ہوا کہ زوار نے خود ہی اپنی زندگی کے فیصلے سے سب کو آگاہ کر دیا ورنہ دوسری صورت میں مجھے خود اس کے رشتے سے انکار کرنا پڑتا کیونکہ میں خود بھی ذہنی طور پر خود کو شاید اس رشتے کے لیے آمادہ نہ پائی تھی۔“

وہ اطمینان سے جواب دے کر کچن سے باہر نکل گئی اور خاموشی سے بیڑھیاں اتر کر اپنے فلور پر آئی۔
یہ سچ ہی تھا کہ بھابی کی دی گئی خبر سے اس کے دل میں دریا یا زوار کے متعلق کوئی بھی ملال یا منفی خیال نہ آیا تھا زوار حسن اس کے بچپن کی ایک ایسی خواہش تھی جو دوسروں کے احساس دلانے سے اس کے دل میں ابھری ضرور تھی لیکن زوار کے رویہ نے اس خواہش کو سرے سے ختم کر کے اسے حقیقت پسندی کی دنیا میں لاکھڑا کیا تھا اور اب زوار دریا سے شادی کرنا یا کسی اور سے اسے کم از کم اس سے کوئی فرق نہیں پڑنے والا تھا پھوپھو نے اپنے چھوٹے بھائی شہباز کے سامنے دریا ب گل کے لیے دست سوال دراز کیا تو تقریباً ”ہر وہ شخص حیران ہو گیا جو سمن اور زوار حسن کے متوقع رشتے سے باخبر تھا اور ایسے موقع پر پھوپھو کو نہایت شرمندگی سے اعتراف کرنا پڑا کہ زوار خود دریا ب کے ساتھ کا خواہش مند ہے اور پھوپھو کی اس وضاحت نے ہر شخص کو خاموش کر دیا جبکہ شہباز اس رشتے کی قطعی حمایت میں نہ تھے ان کے نزدیک یہ سراسر سمن کے ساتھ نا انصافی تھی لیکن سرفراز صاحب کے سمجھانے بھانے پر وہ بھی نیم رضامند ہوئی گئے سرفراز صاحب کے خیال میں دریا ب کے بہتر مستقبل کے لیے ضروری تھا کہ اس کی شادی جلد از جلد کر دی جائے ان کے نزدیک شادی دریا ب کو تحفظ فراہم کرنے کا ایک بہترین ذریعہ تھی۔

اس طرح لاشعوری طور پر ان کی کوشش تھی کہ دریا ب کو شہر پارا سے دور کر دیا جائے اور اس کے لیے زوار سے بہتر رشتہ کوئی اور نہیں مل سکتا تھا مگر کارروائی کے طور پر ارم نے شہر پارا سے دریا ب کی رضامندی جاننے کے لیے رابطہ کیا کیونکہ وہ سب سے زیادہ شہر پارا کے ہی قریب تھی اور اس کی پسند ناپسند اس سے بہتر کوئی نہیں جان سکتا تھا دریا ب اور زوار کے درمیان موجود رابطہ کو دیکھتے ہوئے سب کو یہ یقین تھا کہ زوار نے یہ قدم دریا ب کی مکمل رضامندی کے بعد ہی اٹھایا ہے لہذا پھوپھو نے ممکن کی شاپنگ کی غرض سے بازار کا ایک چکر بھی لگا لیا تھا خیال تھا کہ بیٹے تک پھوپھو جان اور دوسرے گھر والے بھی پہنچ جائیں گے اور ان کے آتے ہی ممکن کی باقاعدہ رسم کر دی جائے گی اور اس وقت جب سب ہی اس فیصلے کو اللہ کی رضا جان کر خوش اور مطمئن ہو چکے تھے دریا ب نے ایک ایسا دھماکہ کیا جسے سمن کر ہر شخص حیران رہ گیا۔

”یہ آپ نے کس سے پوچھ کر پھوپھو کو ہاں کی ہے؟“

وہ ارم کے سامنے تنی کھڑی اس کی نگاہوں میں نگاہیں ڈالے نہایت بد تمیزی سے جواب طلب کر رہی تھی جبکہ حیران پریشان ارم کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی بات کا کیا جواب دیں وہ تو ابھی تک اس کی اس قدر دیدہ دلیری پر ہی حیران ہو رہی تھیں جس نے ان اور بیٹی کے درمیان ادب و احترام ہی ختم کر دیا تھا۔

”ہو لیں چچی آپ نے کس سے پوچھ کر پھوپھو کو ہاں کی ہے۔“
وہ شروع سے ہی شہر پارا کو۔ ماما اور ارم کو چچی کہنے کی عادی تھی۔
”ہاں میں نے نہیں تمہارے ابو نے کیا ہے جا کر ان سے پوچھو۔“ وہ بالا خراپنا غصہ برداشت کرتے ہوئے بولیں۔

”دوریہ تم مجھ سے بات کس طرح کر رہی ہو تمیز بھول گئی ہو کیا۔“
”میں اسی طرح بات کرتی ہوں آپ نے کبھی کی ہو تو آپ کو بتا چلے آپ کو تو ہمیشہ اپنے بچوں سے ہی فرصت نہیں ملی آپ نے صرف نایاب کو پیدا کیا تھا مجھے نہیں اور ہاں منع کر دیتے گناہے میاں کو میری شادی کی فکر میں انہیں دہلا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“

وہ تیزی سے کہہ کر واپس چلی اور بیڑھیاں چلتی چلی گئی جبکہ ارم اپنی جگہ پر کھڑی ہکا بکا اس کو جاتا ہوا دیکھ رہی تھیں جانتی تھیں کہ وہ بہت زبان دراز اور بد تمیز ہے لیکن اس کا عملی مظاہرہ آج پہلی بار دیکھا تھا۔

اور پھر دریا ب گل نے سب کے سامنے نہایت بے باکی اور جرات کا مظاہرہ کرتے ہوئے زوار سے شادی کرنے سے انکار کر دیا اس انکار کو سمن کر ہر شخص دنگ رہ گیا۔ شاہویر کا کہنا تھا کہ وہ بے باکی کی آخری حد ہے جس پر دریا ب کھڑی ہے اور اس کی یہ بے باکی آنے والے وقتوں میں یقیناً ”اسی کے لیے ایک عذاب ثابت ہوگی۔ جیسے ہی دریا ب نے انکار کیا پھوپھو کے من کی گویا مراد پوری ہوئی انہوں نے جھٹ پٹ سمن کے لیے دامن پھیلا دیا ان کا کہنا تھا کہ زوار خود سمن سے شادی کرنا چاہتا ہے کیونکہ اس کی آنکھوں پر بندھی دوریہ کے عشق و حسن کی پٹی اتر چکی ہے پھوپھو کی اس خواہش کا علم جیسے ہی سمن کو ہوا وہ اپنے باپ سرفراز صاحب کے پاس پہنچ گئی۔
”بابا آپ کا جان اور جس سے دل چاہے میری شادی کر دیتے ہیں لیکن پلینوار حسن سے نہیں اور آپ مجھ سے اس انکار کی وجہ پوچھیے گا بھی مت کیونکہ میری پاس اس کا کوئی جواز نہیں ہے سوائے اس کے کہ میں دریا ب کی ٹھکرائی ہوئی چیزوں کو اپنانے کا حوصلہ شاید اب خود میں نہیں پاتی۔“

نہایت خود اعتمادی سے بات کرتے کرتے اس کا لہجہ بھرا گیا اور آنکھوں میں پانی بھر آیا اس لمحہ سرفراز صاحب کو اپنی اس بیٹی پر ٹوٹ کر پار آیا انہوں نے نہایت خاموشی سے اپنا دست شفقت اس کے سر پر رکھ کر اسے اپنے ساتھ کی یقین دہانی کروائی اور پھر اس کے عملی ثبوت کے طور پر اپنی بہن کو انکار کر دیا اور اس انکار میں انہوں نے سمن کا کوئی ذکر نہ کیا زوار نے بہت کوشش کی کہ وہ ایک دفعہ اس کی بات سن لے لیکن سمن نے صاف انکار کر دیا کیونکہ اس کا کہنا تھا کہ بات تب سنی جاتی ہے جب دلوں میں کوئی گنجائش موجود ہو یا فیصلوں میں لپک ہو لیکن جب ایسا نہ ہو تو بات سننے کا کوئی فائدہ نہیں۔

اور یہی بات فارسی بھابی سے کہہ کر جب وہ نیچے اتری تو آخری بیڑھی پر اسے شاہویر کھڑا دکھائی دیا۔ چاہتی تھی کہ نظر انداز کر کے نکل جائے لیکن اس نے دیوار پر ہاتھ رکھ کر اس کا راستہ مسدود کر دیا ناچار اسے رکن پڑا۔
”تھینک یو یار۔“

”کس بات کا۔“ اس کی حیرانی بجا تھی۔
”زوار کے رشتے سے انکار کا“ جانتی ہو مجھے تم سے اتنی جرات مندی کی امید نہیں تھی لیکن تمہاری اس جرات

نے تو مانو مجھے نئی زندگی بخش دی ہے۔“

”۲۰ وہ اس کا مطلب ہے بابا نے شاہین کو جو بتا دی ہے۔“ اس نے سوچا۔

”۲۱ چھالیں میرے انکار سے تمہارا کیا تعلق ہے۔“

وہ تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے بولی۔

”تم نہیں جانتیں؟“ وہ سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھتا ہوا بولا۔

”نہیں۔۔۔ اچھا اب ہٹو آگے سے بابا آنے والے ہیں مجھے کھانا بنانا ہے۔“ وہ شاہین کی نظروں سے خائف ہوتے ہوئے بولی۔

”ہٹ جاتا ہوں لیکن پہلے وعدہ کرو میرے پر پوزل پر تو انکار نہیں کرو گی نا۔“ وہ یک دم ہی بنا کسی تمہید کے بولا اور سر نہ کچھ بول ہی نہ پائی۔

”ویسے تو بڑے کہتے ہیں خاموشی نیم رضامندی ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود میں تم سے جواب سننا چاہوں گا جو یقیناً ”ہاں ہی ہوگا۔“

”جب تمہیں پتا ہے تو پھر کیوں پوچھ رہے ہو؟ اور چلو اب ہٹو آگے سے۔“ وہ اپنے اعتماد کو بحال کرتے ہوئے تیزی سے بولی۔

تھینک یو یار۔ تھینک یو سوچ اور ہاں یاد رکھنا تم میری سکیڈ چوائس نہیں ہو بلکہ پہلی اور آخری پسند ہو کیونکہ مجھے کم از کم دریا اب جیسی لڑکیاں کبھی پسند آتی نہیں سکتیں۔“ وہ اسے راستہ دیتا ہوا بولا۔

”جانتی ہوں۔“ یہ کہہ کر سر نہ تیزی سے آگے کی جانب بڑھ گئی۔

موسم بدل رہا تھا ہلکی ہلکی خنکی کے ساتھ فضا میں ہر طرف ایک نامعلوم سی اداسی چھائی ہوئی تھی سر نہ اپنے کمرے میں بیٹھی بظاہر تو پڑھ رہی تھی لیکن اس کی ساری توجہ برائے کمرے میں مرکوز تھی جہاں دانش سہگل اپنی کسی آنٹی کے ساتھ آیا بیٹھا تھا اور اس کی یہ آمد بلا مقصد نہ تھی بلکہ وہ دریا اب کا پر پوزل لے کر آیا تھا اس کی اس جرات بر جہاں شہباز صاحب تخت حیران تھے وہاں سرفراز صاحب نہایت ہی غصے میں تھے دانش سہگل دریا سے دو گنی عمر کا ایک معمولی شکل و صورت کا بندہ تھا جس کی واحد خوبی شاید اس کا بیک بیلنس اور لمبی چوڑی گاڑی تھی جس نے دریا اور شہباز کو اپنے محرمین جکڑ رکھا تھا اور اس میں کوئی ایسی خوبی نہ تھی جس کی بنا پر دریا جیسی کم عمر اور حسین لڑکی اس کا مقدر بناتی جاتی۔

یہ ہی وجہ تھی کہ دونوں بھائیوں نے متفقہ فیصلہ کرتے ہوئے صاف انکار کر دیا جیسے ہی شہباز نے کچھ کہنے کی کوشش کی سرفراز صاحب نے اسے جھڑک کر خاموش کر دیا اور شاید وہ بھی موقع کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے خاموش ہو گئی تباہی کی طبیعت کی خرابی کے باعث تباہی اور نانی سادہ بھی نیچے نہ آئے تھے جبکہ ارم چچی دریا اب کی اس طنز کی بد تمیزی سے خاصی کبیدہ خاطر تھیں یہ ہی وجہ تھی کہ انہوں نے بھی تباہی کی بیماری کا بسانہ بنا کر اوپر آنے سے معذرت کر لی تھی۔ اور دریا اب شاید اپنے اور شہباز کے مشترکہ کمرے میں بھی سر نہ کی کھڑکی کا پردہ ہٹا ہوا تھا جب اس نے دانش سہگل کو ایک نہایت ہی الزماؤرن سی خاتون (جن کا جسم ساڑھی پہننے کے باوجود عریاں تھا) کے ساتھ واپس جاتے دیکھا دانش سہگل کے چلنے کا انداز اس کے اندرونی غصہ کا غمازی کر رہا تھا جبکہ وہ خاتون شہباز پارا سے جانے آہستہ آہستہ کیا باتیں کر رہی تھیں جن کے جواب میں شہباز کی صرف گردن ہی ہل رہی تھی اور پھر وہ دونوں بیڑھیاں اتر گئی اور سر نہ نے یہ خبر سن کر اطمینان کا سانس لیا کہ چچا جان نے اس رشتے سے انکار کر دیا ہے لیکن اس کا یہ اطمینان چند روز ہی ثابت ہوا۔

وہ جو کہتے ہیں تاکہ رشتے تو آسمان پر بنتے ہیں تو شاید درست ہی تھا حالانکہ خاندان کا کوئی بھی فرد اس رشتے پر دل سے راضی نہ تھا کہاں نوار حسن جیسا خیر و نوجوان اور کہاں دانش سہگل جیسا گھاک اور بوجھا ہوا مرد جو سر نہ کو کم از کم ایک ایسا گھاک شکاری نظر آتا جو معصوم پرندوں کو اپنے جال میں پھانسنے کا فن بخوبی جانتا تھا اور اس کی نزدیک دریا بھی ایک ایسا ہی معصوم پرندہ تھا جو اپنی بے وقوفانہ خواہشات کے حصول کے لیے دانش کے پچھائے ہوئے جال میں پھنسنے کے لیے باخوشی تیار تھی یہی وجہ تھی کہ سب کے انکار کے باوجود وہ شہباز صاحب سے جواب طلبی کے لیے نیچے پہنچ گئی۔

”آپ نے دانش کے رشتے سے انکار کیوں کیا ہے؟ کیا خرابی ہے اس میں؟“ وہ ابھی ابھی گھر آئے تھے اور ہاتھ دھو کر کھانا کھانے ٹیبل کی جانب بڑھ رہے تھے جب اچانک دریا اب ان کے راستے میں آ گئی۔

”کیا بد تمیزی ہے دریا اب آرام سے بیٹھو پہلے اپنے باپ کو کھانا کھانے دو پھر بات کرنا۔“ ارم نے اسے کندھے سے تھام کر بھجانا چاہا۔

”پلیز آپ میرے معاملے میں نہ ہی بولیں تو اچھا ہے ورنہ آپ جانتی ہیں کہ میں کسی کا لحاظ کرنے کی عادی نہیں ہوں اور خاص طور پر آپ سے تو میری کوئی ایسی رواداری بھی نہیں ہے جس کی باعث میں آپ کا لحاظ کر جاؤں۔“ وہ اپنے کندھوں سے ارم کے ہاتھ جھٹکتی ہوئی بولی تو تا صرف ارم بلکہ شہباز بھی اس کی اس قدر بد تمیزی پر ششدر رہ گئے۔

”تمہاری ماں ہے یہ معافی مانگو فوراً اس سے۔“

وہ حتی الامکان اپنے غصے کو دباتے ہوئے آہستہ آواز میں بولے۔

”میری ماں یہ نہیں شہباز راہمائی ہیں یہ بات آپ اچھی طرح جانتے ہیں یہ صرف تباہی، آرزو اور ولید کی امی ہیں اور ویسے بھی میں آپ سے یہ نہیں پوچھنے آئی کہ میری ماں کون ہے؟ اور نہ ہی مجھے اب اس کی ضرورت رہی ہے میں تو آپ سے صرف آپ کے انکار کی وجہ پوچھنے آئی ہوں۔“

اس کے گیسے میں ارم کے لیے اس قدر زہر بھرا ہوا تھا کہ ارم بھی ہکا بکا رہ گئیں۔

”اور ہاں اگر دانش میں کوئی برائی ہے تو بھی مجھے یہ قبول ہے اس لیے پلیز آپ کی عزت اسی میں ہے کہ آپ اپنی رضامندی کا بھی اظہار کر دیں۔“

وہ بے باکی سے اپنے باپ کے سامنے تن کر کھڑی تھی اور شہباز تو زمین میں گڑ گڑ رہے گئے ان کا رعب اور طفلانہ جھاگ کی طرح چمٹ گیا اور انہیں ایسا محسوس ہوا کہ اب اگر انہوں نے مزید کوئی بات کی تو شاید دریا اب ان کی اتنی بھی عزت نہ کرے جتنی اب تک کر چکی ہے اور اسی بل انہوں نے فیصلہ کیا کہ اپنی عزت بچانے کا واحد حل یہ ہے کہ بنی کو اپنے ہاتھوں رخصت کر دیا جائے۔ چلنے بولنے کے ساتھ وہ خوش رہ سکے گی یا نہیں اور اسی میں ان کی عافیت تھی ورنہ دریا اب سب کچھ ختم کرنے کا حوصلہ رکھتی تھی۔ اور اس سب میں اس کے باپ اور خاندان کی عزت بھی شامل تھی جس کی اس کے نزدیک ذرا بھی وقعت نہ تھی اور پھر ایک بل لگا شہباز کو فیصلہ کرنے میں۔

”تم اوپر جاؤ میں ابھی بھابھی کیس پاس آتا ہوں باقی بات وہیں ہوگی۔“

وہ ہارے ہوئے خواری کی طرح ٹوٹے دریا اب کو ایک حیران نظروں سے گزر دیا اور اسے باہر نکل گئی جبکہ شہباز بغیر کھانا کھائے اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئے اور آج اٹھارہ سال بعد ارم کو اس خسارے کا احساس ہوا جو انہوں نے اپنی اولاد کی طرف سے غفلت برت کر حاصل کیا تھا اور شاید یہ پہلا دن تھا جب وہ تباہی کو کھانا کھانا بھی بھول گئیں وہ تو جب تباہی نے ٹوٹے ہوئے لفظوں میں دوا دلا کر شروع کیا تو انہیں ہوش آیا۔

”یا خدا ایک لڑکی اس حال میں اپنی بیماری کے ہاتھوں زندہ درگور اور دوسری خود اپنے ہاتھوں زندہ درگور ہونے جاری ہے یا میرے مالک ہم پر رحم کرے۔“ وہ اپنا سر دونوں ہاتھوں پر گرائے ساکت بیٹھی تھیں جبکہ آنسو خود بخود ان کی آنکھوں سے بہہ رہے تھے۔

اور پھر دانش سہگل کا پرنس قبول کر لیا گیا۔ اس پرنس پر سوائے دریاب اور شہرہ پارا کے کوئی خوش نہ تھا۔ دریاب تو بے حد خوش تھی دانش کے روپ میں اسے اپنی منزل قریب نظر آرہی تھی شہرہ پارا کی چکاچوند نے بنا دیکھے ہی اس کے دل و دماغ پر قبضہ بنا رکھا تھا وہ خود کو ہمیشہ کسی ایسی بڑی اداکارہ کے روپ میں دیکھتی جس سے آؤ گراف لینے والوں کی قطاریں لگی ہوں اپنے اس خواب کے حصول کے لیے دانش سہگل سے بہتر شخص اس کی نظر میں کوئی نہ تھا دانش کے تعلقات شہرہ پارا کے حلقوں میں اوپر تک تھے اور تا صرف اپنے ملک بلکہ بڑی ملک کے بھی کئی ڈائریکٹر اور بڈا بڈا بڈا اس کے جاننے والے تھے۔ اور اسی چیز نے دریاب کو اس کا دیوانہ بنا رکھا تھا۔ دریاب نے اپنی شادی کی ساری شاپنگ شہرہ پارا کے ساتھ جاکر مکمل کی یہاں تک کہ اپنی بری کی خریداری بھی اس نے خود شہرہ پارا کے بہترین ڈریس ڈیزائنر اور بوتیک کی تھی اس کی بارات کا سوٹ جانے کتنے لاکھ کا تھا جو خود دانش کی اپنی پسند کا تھا غرض کہ اس کی ہر چیز نامعلوم اور کوالٹی کی تھی یہاں تک کہ اس کی بری دیکھ کر خاندان کی دیگر خواتین کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں اور سب نے ہی ظاہری نمود نمائش دیکھ کر دریاب کے مقدر کو خوب سراہا اور ان کے رشک سے بھرے جملے سن کر دریاب کی گردن فخر و غور سے تن ہی گئی اور اسے ایسا لگا یہ بازی وہ پورے اعزاز کے ساتھ جیت چکی ہے اور اسی فخر و غور کے ساتھ وہ دانش سہگل کی ہمراہی میں رخصت ہو کر اس کی طویل و عریض کوٹھی میں پہنچ گئی جہاں اس کا استقبال کرنے کے لیے سوائے چند ملازمین کے کوئی نہ تھا اسے ایک بچے سجانے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔

”میں آپ آرام سے بیٹھئے۔“

اسکرت بلاؤز میں ملبوس نہایت سمارٹ سی ملازمہ نے اسے ٹیکہ لگا کر آرام سے بٹھایا۔

”میں آپ کیلینا پسند کریں گی جس کا کافی۔“

”کچھ بھی نہیں۔“ وہ جیسے سے بولی جبکہ احساس تقاضا طور پر اس کی آواز سے چمک رہا تھا۔

”میں آرام کروں گی تم جاؤ۔“

”ٹھیک ہے میں صغرا نے آپ کے کپڑے نکال کر ہاتھ دھو میں رکھ دیئے ہیں آپ کو جب پہنچ کرنا ہو یہ تیل بجا دیجئے گا صغرا آپ کی مدد کو آجائے گی۔“

”ٹھیک ہے اب تم جاؤ۔“

”بے وقوف عورت بھلا دانش کے دیکھے بغیر میں کیسے اس ڈریس کو پہنچ کر سکتی ہوں اتنا پیسہ خرچ کر کے میں جس کے لیے تیار ہوئی ہوں وہی نہ دیکھے تو کیا فائدہ ہوا۔“ وہ تنفر سے سوچتی کراؤن سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی اور جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی دروازے پر ہونے والے کھٹکے سے وہ یک دم ہڑبڑا کر اٹھی تو پہلے تو یہی یاد نہ رہا کہ وہ کہاں ہے؟ اور جیسے ہی اندر آئے دانش پر نظر پڑی ایک دم بوکھلا کر اٹھ بیٹھی فوراً ”اپنا دوشا درست کیا جو بھی تھا تھی تو وہ ایک کم عمر اور شریف خاندانی لڑکی تھی۔ اس کا دل دھک دھک کرنے لگا وہ لاکھ بے باک سہی لیکن پھر بھی اس کے جذبات میں کبھی پہلے کسی غیر مرد نے کوئی ایسی ہلچل نہ مچائی تھی دانش تھکا تھکا سا کمرے میں داخل ہوا۔

”تم نے ابھی تک اپنا ڈریس پہنچ نہیں کیا۔“ وہ حیرانی سے بولا اور اس دم دریاب کی نگاہ سامنے دیوار پر لگے پیش قیمت وال کلاک پر پڑی جو پانچ کا نام لکھا ہوا تھا۔

”اُمائی گاؤں کہیں تم عام مل کلاس لڑکیوں کی طرح میرا انتظار تو نہیں کر رہی تھیں۔“ وہ اس کے قریب ہی نیم دراز ہوتا ہوا بولا۔

”بٹ سوری میری جان میں ان تمام فارمیٹوں کا عادی نہیں ہوں، سر حال تمہاری منہ دکھائی تمہیں دینا ضروری تھی اسی لیے آیا ہوں ورنہ کس کافر کا دل چاہتا تھا کہ اتنی حسین رقاصہ کو چھوڑ کر۔“

”جملہ ادھر واپس چھوڑ کر اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور گاڑی کی چابی نکال کر اس کی گود میں رکھ دی وہ کچھ سمجھ ہی نہ پائی۔

”یہ تمہاری گاڑی کی چابی ہے لیکن یہ یاد رکھنا تم میری مرضی کے بغیر گاڑی لے کر باہر نہیں جاؤ گی کیونکہ اب تم کوئی عام عورت نہیں بلکہ دانش سہگل کے نام سے منسوب ہو۔“ وہ سرخ سرخ آنکھوں سے دریاب کو گھورتا ہوا بولا۔

اور دریاب جو اپنے لیے ستائشی جملے اور تعریفی کلمات سننے کی منتظر تھی ایک بالکل نئی صورت حال کا سامنا کرنے پر حیران مگر فکر اس کی شکل دیکھ کر جاری تھی اپنی تعریف کی شوقین دریاب حیران تھی کہ یہ کس قسم کا مرد ہے جسے اپنی بیوی کی خوبصورتی میں کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔

”اور ہاں۔“ وہ یک دم دریاب کے قریب ہوا تو اس کے منہ سے آنے والے بدلو کے بھبھکے نے دریاب کو احساس دلایا کہ وہ نشے میں ہے۔

”تم بھی ڈریس پہنچ کر کے باہر ہی آ جاؤ میں ہال میں۔“ اگر دیکھتیں تارابیائی کو کیا زبردست تاجی ہے اس کا رقص مانور وہ جسم میں جان ڈال دیتا ہے قیامت ہے قیامت۔“

وہ آنکھیں بند کر کے تصویر کی تصویر میں تارابیائی کے لچکے بدن کا تصور کرتا ہوا بولا۔

”لیکن پھر بھی تمہاری والی بات نہیں ہے تم تو جب میدان میں آؤ گی تا میری جان تو یقین کرنا تمہارے سامنے تو کوئی بھی نہ ملے گا بلوی۔“

وہ اچانک ہی دریاب کو دیکھ کر ہنسنے لگا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر خود سے قریب کر لیا اور دریاب اس کی کچھ دیر قبل کی گئی گفتگو سے خاصی بد مزہ ہوئی تھی ایک دم ہی اس کی قوت کے احساس سے دھک اٹھی اسے اپنے دل کی دھڑکن اپنے کانوں میں سنائی دے رہی تھی۔

”تم بہت خوبصورت ہو میری جان بہت خوبصورت بالکل کسی گڑیا کی مانند باری ڈل۔“ وہ دریاب کو کندھوں سے تھام کر بولا۔

”لیکن جانتی ہو گڑیا صرف اس وقت تک اچھی لگتی ہے جب تک شوکیس میں بچی ہو اگر اسے باہر نکال کر کھیل لیا جائے تو وہ جلد ہی میلی ہو جاتی ہے اور میلی گڑیا جلد ہی کوڑے دان کا حصہ بن جاتی ہے اور پھر اس کی جگہ کوئی اور خوبصورت اور نئی گڑیا لے لیتی ہے لیکن میں اتنا کم ظرف نہیں ہوں جو تم سے کھیل کر تمہیں کوڑے دان میں پھینک دوں۔“ پھر وہ رک کر تھوڑا سا مسکرایا۔

”یاد رکھنا ہمیشہ ایک قیمتی اور خوبصورت تمہاری مانند میری الماری میں ہی بچی رہو گی۔“ وہ دریاب کے بالکل قریب ہو کر بولا لیکن دریاب تو اس وقت ہوش میں ہی نہ تھی یہاں تک کہ وہ اپنی زندگی کی سب سے بڑی خواہش بھی نظر انداز کر چکی تھی اس کا سر اشار بننے کا خواب نہیں دور رہ گیا تھا اس کی آنکھیں بند تھیں اور وہ ہولے ہولے کانپ رہی تھی کہ اچانک ہی دانش کے ہاتھوں کی حرکت تھم گئی اور وہ بالکل ساکت سے ہو گئے صرف اس کی سانسوں کی آواز تھی جو دریاب کے کانوں میں سنائی دے رہی تھی اس نے کسی انہونی کے احساس کے تحت یک دم آنکھیں کھول کر دیکھا دانش سوچا تھا اس کے بازو پر اپنا سر دھرے بے خبر اور بدست دریاب کو ایسا لگا جیسے وہ پتے

صحرا میں ننگے پاؤں کھڑی ہے اس کے اندر آگ کے جلنے بھانپتے تھے جن پر پانی ڈالنے والا بھی کوئی نہ تھا وہ یکدم ہی بے بسی کے احساس تلے دب کر رونے لگی۔

صبح تقریباً ”دس بجے“ اس کے گھر سے ناشتا آگیا شہر پارا، سمرن اس کی خالہ زاد نورین خلاف توقع شاہ ویز کے ساتھ ناشتے کر آئیں تو سہل ابھی سو رہا تھا جبکہ دروہ کو ایک ماہر پویش تیار کر کے جا چکی تھی اس کا گھر اور ٹھاٹس باٹ دیکھ کر اس کی کرن نورین خاصی حیران ہوئی جبکہ سمرن اور شاہ ویز بالکل ہی خاموش تھے دانش کی غیر موجودگی کا غور پیش کرتے ہوئے دروہ نے چپکے سے شہر پارا کو بتایا کہ وہ صبح ہی سوئے ہیں شہر پارا اس کی وضاحت کو اپنی مرضی کے معنی پہنا کر خوش ہو گئی دروہ نے سب کو اپنی گاڑی دکھائی جو اسے منہ دکھائی میں ملی تھی اور شاہ ویز کی خاموشی محسوس کر کے دل ہی دل میں خوب اترا تھی۔

”ہونہ دیکھا کیسا جلا جیرے ٹھاٹس باٹ دیکھ کر۔“

وہ ایسی ہی تھی ہمیشہ لوگوں کے بارے میں غلط اور جلدی اندازے لگانے والی اور جانتی تھی کہ ہمیشہ شاہ ویز کے سلسلے میں لگایا جائے والا اس کا اندازہ غلط ہوتا ہے لیکن پھر بھی باز نہ آئی تھی۔

رات شہر کے ایک فائیو اشار ہوٹل میں اس کا دلیمہ تھا اور دروہ کو نہ چاہتے ہوئے بھی دانش کی ہدایت کے مطابق بے حد ڈپ گلی کی سیلیولیس میون کلر کی میکسی پننا بڑی جس پر اونچا کر کے بنایا گیا ہیرا شائل اس پر خوب کھل رہا تھا گلے اور کانوں میں پسنی ہوئی ڈائمنڈ جیولری اپنی عجیب ہی ہماورد کھادی تھی جب ماہر حسن نے تیار کر کے اسے آئینہ کے سامنے کھڑا کیا تو اپنا روپ دیکھ کر وہ خود بھی مبہوت سی ہو گئی ایسے میں اپنے لباس کی عربائی کا احساس اس کی پیشانی کو عرق آلود کر گیا اسے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ اس کے گھروالے کیسا وچیں گے لیکن جب دانش کی ہمراہی میں اس نے بنگلوٹ ہال میں قدم رکھا تو خود پر پڑنے والی سٹائشنی نظروں اور تعریفی جملوں نے ایک دم ہی اس کے احساس عربائی کو زائل کر دیا ہر طرف سے اس کے کانوں میں بڑنے والی جملوں نے اسے احساس دلایا کہ شاید وہ کوئی ایسا ہے جو آسمان سے اتری ہو پارو تو اسے دیکھتے ہی کھل اٹھی، تائی سادیہ کے گھر سے صرف فارہ بھابھی اور بھائی ہی آئے تھے فارہ بھابھی اور سمرن نے اسے دیکھتے ہی بے اختیار شرم سے اپنی نظریں جھکا لیں ارم بے تاثر چہرے لیے بیٹھی شکر ادا کرتی رہیں کہ شاہ ویز اور شہباز نہیں آئے جبکہ پھوپھو اور ان کی فیملی کا کوئی بھی فرد شادی میں شریک نہ ہوا تھا ایسے میں سرفراز صاحب نہایت ہی شرمندہ دکھائی دیئے انہیں شدت سے یہ احساس ہوا کہ بے راہروی اور بے حیائی کا جو پودا وہ شہر پارا کی شکل میں لائے تھے اس نے دروہ نامی تیل کو اپنے گرد لپیٹ کر خوراک ضرور فراہم کی تاکہ وہ زندہ رہ سکے لیکن اس تیل کا اپنا وجود بالکل ختم کر دیا جبکہ دروہ کسی بھی احساس سے عاری دانش کی سنگت اور ہمارائی میں خود کو آسمانوں پر اڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

تقریب میں بے حیائی، رقص و سرور اور ام المیٹ کا دورانیے عروج پر تھا یہ ماحول سرفراز صاحب اور ان کی فیملی کے بانی لوگوں کے لیے تقریباً ناقابل برداشت تھا یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ بغیر کھانا کھائے تاجاجی کی طبیعت کی خرابی کا غور پیش کر کے جا چکے تھے لیکن دروہ کو کسی کی بھی کوئی پروا نہ تھی وہ تو دانش کی ہنسی کی نظریں محسوس کر کے اسی احساس سے سرشار تھی کہ یقیناً ”آج دانش سہل اس کے قدموں میں ہو گا اور اسے تسخیر کر لے گا لیکن رات کے بڑھتے سایوں نے اس کی اس غلط فہمی کو جلد ہی دور کر دیا ہوٹل سے واپس آتے ہی دانش اپنے بار روم میں چلا گیا تھا جو کہ اس نے اپنے گھر کی ہسٹنٹ میں بنایا ہوا تھا۔

”پلیز ابھی ڈریس چنج نہ کرنا۔“ دروہ کے ہاتھ تھام کر حسن کے حضور درخواست پیش کرتا ہوا بولا۔
”میں ابھی آتا ہوں۔“ دروہ آنے والے خوش کن کلمات کے تصور میں گھر کے اس کا انتظار کرنے لگی اس کا انتظار ابھی طویل نہ ہوا تھا کہ اچانک ہی کمرے کا دروازہ آہستہ سے کھول کر کوئی اندر داخل ہوا وہ اس کی میڈ میری تھی۔

”میم آپ کو صاحب نیچے بلا رہے ہیں اپنے بار روم میں۔“ اطلاع دے کر وہ جواب کے انتظار میں مودب کھڑی تھی۔
”کیوں؟“ وہ حیرت زدہ تھی۔

”چپ نہیں میم آپ آئیں میں آپ کو وہاں تک چھوڑ دوں۔“ وہ خاموشی سے اٹھ کر میری کے پیچھے بیڑھیاں اتر کر نیچے آگئی ہسٹنٹ کاشیش کا دروازہ میری نے کھولا تو وہ خاموشی سے اندر داخل ہو گئی میری دروازہ بند کر کے واپس جا چکی تھی ہسٹنٹ میں بکھری ہوئی رنگین روشنی میں اس نے دیکھا کہ سارے ہال میں صرف قائین ہی بچھا ہے جبکہ دیوار کے ساتھ کچھ گاؤتیکے رکھے ہوئے ہیں ایک دیوار کے ساتھ چند کرسیاں بھی دھری تھیں جونی الوقت ساری ہی خالی تھیں اے سی کی خنکی محسوس کرتے ہی اسے اپنی کم لباس کا احساس ہوا قیمتی ایئر فریشنز کی خوشبو بڑی بھلی معلوم ہو رہی تھی وہ خاموشی سے آگے بڑھی دیوار کی الماریوں میں مٹکے برانڈڈ مشروبات رکھے تھے۔

”آج آؤ میمیں آج آؤ میرے پاس۔“ دانش سامنے ہی گاؤتیکے سے ٹیک لگائے بیٹھا ”ام المیٹ“ کی رہا تھا نہایت ہی نفیس اور بلوریں گلاس اس کے پاس دھرے تھے وہ خاموشی سے اس کے قریب آکر بیٹھ گئی۔
”میڈ کی۔“ اس نے خالی جام اٹھاتے ہوئے دریافت کیا۔
”پلیز دانش میں نہیں بیٹی۔“ وہ یک دم گھبرا گئی اس کی گھبراہٹ دیکھ کر دانش بہت محظوظ ہوا اور دھیرے سے ہنسا۔

”کوئی بات نہیں خود ہی بیٹے لگو گی ہمارے ساتھ رہو گی تو ضرور پیو گی جانتی ہو میں نے تمہیں یہاں کیوں بلایا تھا۔“ اس نے آہستہ سے اپنی گردن فنی میں ہلا دی۔
”آج میں نے تارا بابلی کو منع کر دیا کیونکہ آج میں تمہارا رقص دیکھنا چاہتا ہوں صرف تمہارا میری جان۔“
”یا خدا یہ کیسی فرمائش تھی جو اس کا شوہر شادی کی دوسری رات اس سے کر رہا تھا بغیر یہ جانے کہ اس کے جذبات کیا ہیں اس کے دیکھتے اور کنوارے جڑیوں کی اسے کوئی پروا نہ تھی وہ صرف اپنے نفس کا بندہ تھا اپنی خواہشات کا غلام۔ اور تم؟“ کوئی اس کے اندر دھیرے سے ہنسا۔
”تم کون ہو؟ تم نفس کی غلام نہیں ہو؟ ناچنا گانا تو خود تمہارا بھی شوق رہا چہرہ کیا ہوا جو تمہارے شوہر نے تم سے فرمائش کر دی عیوں کے سامنے بھی تو ناچنا ہی ہے نا۔“ اس کا ضمیر دل کھول کر نرس رہا تھا اس کا مذاق اڑا رہا تھا وہ ایک دم گھبرا اٹھی۔

”انتظار نہ کرو۔“ تم نہیں جانتیں جب شراب کا نشہ مجھ پر چڑھتا ہے تو رقص اس کو چند کر دیتا ہے اسی لیے آج کی میری اس محفل کو صرف تم سچاؤ کی صرف تم۔“ اب کوئی چارہ نہ تھا وہ خاموشی سے کھڑی ہو گئی دانش سی ڈی پلیز پر گانا لگا کر تیکے کے سارے لیٹ گیا اور اس ساری رات ناچ ناچ کر دروہ کا انگ انگ ٹوٹ گیا تھکن سے اس کا جسم چور ہو گیا لیکن جانے دانش کا شوق کیسا تھا جب تک صبح ناچ بجے تک وہ نہ سویا اس نے دروہ کے پیروں کو تھمنے نہ دیا اور آج پہلی بار اسے پتا چلا اپنے شوق سے کوئی کام کرنا اور کسی جبر کے تحت وہ ہی کام کرنا تو انوں کس قدر مختلف امر ہیں لیکن ہر حال یہ ایک ایسا راستہ تھا جس کا انتخاب اس نے خود کیا تھا کیا کسی نتیجہ کی پروا دیکھے

اور ظاہر ہے اب اس راستے پر اسے آگے تک کا سفر اکیلے ہی طے کرنا تھا تا کسی سارے کے بغیر تھکے۔



”تم ایک گھنٹے تک تیار ہو کر میرے آفس آجانا تمہارا پاسپورٹ، خوانا ہے اور ہاں اپنے تمام ضروری چیز بھی ساتھ لے آنا۔“

وائلٹ نے تیار ہو کر خود پر فوم کا سپرے کیا اور ایک اچھتی سی نظر خاموش بیٹھی دریہ پر ڈالی اور شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی ٹانگی کی ناٹ درست کرنے لگا۔

”ٹھیک ہے۔“ وہ اپنے بال درست کرتی بستر سے اتر آئی اور خاموشی سے ہاتھ روم کی جانب بڑھ گئی بنا کوئی سوال وجواب کیے۔ ایک پل کے لیے تو وائلٹ بھی حیران ہوا اور پلٹ کر دریہ پر ایک نظر ڈالی لیکن اسے اپنی جانب متوجہ نہ پا کر پھر سے اپنی تیاری میں مشغول ہو گیا اور پھر اگلے چوبیس گھنٹوں کے اندر دریاب کا پاسپورٹ بن کر آگیا۔

”میری بیکنگ کرلو ہم کل شام کی فلائٹ سے ملائیشیا جا رہے ہیں۔“

وائلٹ نے رات اس کا پاسپورٹ چیک کر کے اپنے کافزات میں رکھتے ہوئے اسے اطلاع دی اور وہ جوڑی بے دلی سے گلاس پر گلاس چڑھاتے وائلٹ کو تک رہی تھی اس اطلاع پر حیران رہ گئی جو یقیناً ”اس کے لیے غیر متوقع تھی۔“

”میں حیران کیوں ہو رہی ہو؟ دراصل میں ملائیشیا میں کپڑے کی مارکیٹ چیک کرنا چاہتا ہوں عام خیال ہے کہ وہاں پڑوسی ملک کے ڈسٹریبیوٹر خالص مقبول ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ وہاں اپنے کچھ نئے ڈسٹریبیوٹر متعارف کرواؤں بس اسی لیے ایک ہفتے کا وزٹ سے سوچا تمہیں بھی لے چلوں اسی ہمارے ہمراہی مون بھی ہو جائے گا۔“

دریاب تو ملائیشیا جانے کا سن کر ہی اس قدر خوش ہو گئی تھی کہ اسے مزید کسی وضاحت کی ضرورت ہی نہ رہی تھی اس کا دل چاہا فوراً گھر پر فون کر کے شہر پارا کو اطلاع دے تاکہ سارے گھر میں یہ خبر نشر ہو جائے کہ دریاب سہل ملائیشیا جا رہی ہے وہ اونچائی جس کے خواب بچپن سے وہ دیکھتی آئی تھی اس کی پہلی سیڑھی پر اس نے قدم رکھا تھا اور اب جلد ہی اس کے خواب کی تعبیر اسے ملنے والی تھی دولت کے بعد شہرت اور پہچان بھی جلد ہی اس کا مقدر بننے والی تھی اسے یقین تھا جلد ہی شوبز کی دنیا کا وہ ایک چمکتا دمکتا ستارہ بننے والی تھی جس کے آؤگراف کے لیے لوگ اس کے پیچھے بے قرار پھریں گے اس کے اسکول اور کالج کی فرینڈز اسے دیکھ کر حسرت سے کہیں گی۔

”کاش ہم نے دریاب سے ایک آؤگراف لے لیا ہوتا۔“

یہ خیال آتی ہی اسے خود ہی ہنسی آگئی یقیناً ”یہ ہی تو وہ خواب تھا جس کی تعبیر حاصل کرنے کے لیے اس نے وائلٹ سہل کا انتخاب کیا تھا وہ جانتی تھی کہ اس جیسی معمولی سا بیک گراؤنڈ رکھنے والی لڑکی کو یہ مقام صرف اور صرف وائلٹ کی جان پہچان سے ہی حاصل ہو سکتا ہے وائلٹ کے سنگ ہی وہ بلندی کا یہ سفر خرابی طے کر سکتی تھی ورنہ اپنے گھر کے وقیانوسی ماحول میں تو سوائے شادی اور بچوں کے اس کے لیے کسی تیسری چیز کی کوئی گنجائش نہ تھی۔“



وہ فیض محمد سے ملنے آرٹ اکیڈمی آیا تھا لیکن فیض محمد کو اپنے کمرے میں موجود نہ پا کر اسے ڈھونڈتا ہوا اوپر ہال میں آگیا جہاں غالباً کوئی رقص کا پروگرام تھا جس کی اطلاع اسے فیض محمد پہلے ہی دے چکا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ

مرعلی اچھے رقص کا شہساز تھا۔ ایک ڈیرا ہونے کے باوجود مرعلی آرٹسٹک ذہن رکھنے والا بندہ تھا خوبصورت، کلاسیکل رقص اس کی کمزوری تھی حالانکہ جس فیلڈ سے اس کا تعلق تھا وہاں تو اتنی نازک مزاجی کا کوئی عمل دخل ہی نہ تھا لیکن مرعلی کو اپنے پیشے سے زیادہ آرٹ سے دلچسپی تھی یہی وجہ تھی کہ آرٹ سے منسلک لوگوں سے اس کی ہمیشہ اچھی دوستی رہی اسی بنا پر فیض محمد اس کے بہترین دوستوں میں شمار ہوتا تھا ابھی جیسے ہی وہ ہال میں داخل ہوا اس کی نگاہیں ہال کے منگے اندر میرے سے گزر کر فوراً ”سامنے اسٹیج پر مرکوز ہو گئیں۔ جہاں سفید فرائز اور جوڑی دار پاجامہ میں ملبوس ”اسپرا“ کو محور رقص دیکھ کر اس کی نظریں ساکت ہو گئیں اور آج اس کی سمجھ میں آیا کہ اس کی چال اس قدر دلکش کیوں تھی؟ یقیناً ”وہ ایک فنکارہ تھی اور پھر اس کا ہر اگھتا قدم مرعلی کو اپنے دل پر پڑنا محسوس ہوا، جانے کب پروگرام ختم ہوا اس لڑکی کو غالباً پہلا انعام بھی دیا گیا لیکن مرعلی کو کچھ پتا نہ چلا جب ہوش آیا تو بال تقریباً خالی ہو چکا تھا اور وہ اسی اسپرا کے خیال کو دل میں بسائے خاموشی سے فیض محمد کے ہمراہ ہال سے باہر آگیا۔“



جیسے ہی اس نے کے ایل ایئر پورٹ پر قدم رکھا اس کی گردن فحور غور سے تن گئی کون کہہ سکتا تھا کہ دریاب گل جس نے کبھی اسلام آباد بھی اپنی زندگی میں نہ دیکھا ہو آج ایک شان سے کو الپور ایئر پورٹ پر کھڑی ہوئی جہاں باہر نکلتے ہی باوردی ڈرائیور اور شہر کے بہترین فانیو اشار ہوٹل کا ایک بہترین سویٹ اس کا منتظر ہو گا کہ کاش شاہ ویز دیکھ سکتا میں کس قدر شان سے یہاں کھڑی ہوں شاہ ویز جسے مجھے جیسے لڑکیاں تاپسند تھیں اونہ سے ”نخوت سے سوچتے ہوئے اس نے اپنی گردن کو جھکادیا اور فحور غور کے احساس میں گھری ہوٹل کی جانب رواں ہو گئی اور پھر پورا ایک ہفتہ اس نے ملائیشیا کا چپا چپا گھوما اور خوب شاپنگ کی وائلٹ تو سارا دن اپنے کام میں مصروف رہتا جبکہ دریاب کو اس نے گاڑی اور ڈرائیور کی سہولت فراہم کر رکھی تھی جس کا ورہ نے خوب فائدہ اٹھایا۔

وہ کے ایل سی سی گئی تو وہاں کی خوبصورتی نے اسے اپنے سحر میں جکڑ لیا آئی لینڈ اس کے خوابوں کا جزیرہ جہاں آگے کی پل میہورت رہی اور پھر لنگائی بنے دیکھتے ہی اسے احساس ہوا کہ واقعی دنیا سن و خوبصورتی سے بھری ہوئی ہے یہ سات دن کس طرح گزرے اسے احساس ہی نہ ہوا اور جس دن وہ واپس آئی اس کے قدم ہی زمین پر نہ تھے اس کا دل چاہا آج ہی گھر جائے اور سب کو اپنی تصاویر دکھائے تاکہ گھر کا ہر فرد اس کی قسمت پر رشک کرے وہ یقیناً ”ان لوگوں میں سے تھی جن میں خود نمائی کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے اور جو دوسروں سے تعریف و توصیف سینٹا اپنا حق سمجھتے ہیں ان ہی سوچوں میں گھری وہ اپنے بیڈ روم تک آگئی وائلٹ فریش ہوتے ہی بیسمنٹ میں چلا گیا تھا جہاں اس کا بار روم تھا جبکہ اس کے ساتھ صفر اسی کے روم میں آگئی تھی۔

وہ فریش ہو کر ڈھیلے سا گلاباؤن پہن کر باہر آئی تو صفر کو اپنا منتظر پایا وہ جانتی تھی کہ صفر کیوں بیٹھی ہے؟ اس کے بستر پر بیٹھی ہی صفر نے اس کے کپڑوں اپنی گود میں رکھ لیے اور نہایت ہی پیار سے اس کے نرم نازک پاؤں کا ماساج شروع کر دیا اسے ایک عجیب سی راحت ملنے لگی اس سے قبل کہ وہ سو جاتی مس میری اس کے لیے تازہ اورنگ جو س لے آئی جو اسے بے حد پسند تھا اس نے بڑی نزاکت سے جوس کا گلاس اٹھا اور اپنے لبوں سے لگا لیا کھونٹ گھونٹ جوس اس کے حلق کو تر کرنے لگا اس تمام عرصہ میں میری نہایت مودب سی اس کے پاس کھڑی رہی جوس ختم کر کے اس نے خالی گلاس میری کے ہاتھ میں موجود کرشل کی نازک سی ٹرے میں دھر دیا اور خود نشو سے اپنا منہ صاف کیا صفر اب اس کے کندھے دبا رہی تھی جبکہ میری ابھی بھی اپنی جگہ پر کھڑی تھی یقیناً ”کوئی خاص بات تھی جو وہ اس سے کرنا چاہتی تھی۔“

”کوئی کام ہے تمہیں مجھ سے۔“

”جی میم دراصل آپ کے کزن آئے تھے آپ سے ملنے کے لیے شاہ ویز آئی تھنک یہ ہی نام انہوں نے بتایا تھا۔“

”کتنا جلا ہو گا جب اسے پتا چلا ہو گا میں ملاشیا گئی ہوں اپنے ہنی مون ٹرپ کے لیے۔“ اپنے ایک وزٹ کو ہنی مون ٹرپ کا نام دے کر اس نے خود ہی لطف لیا اور اب اپنی عادت کے مطابق شاہ ویز کے سلسلے میں غلط اندازے لگا کر خود ہی خوش ہو رہی تھی۔

”میم وہ آپ کے لیے مٹھائی دے کر گئے ہیں۔“

میری نے اسے خیالوں کی دنیا سے باہر نکالا اور خوب پیٹ بھرا ہونے کے باوجود مٹھائی کا سن کر اس کا دل لچا گیا کیونکہ وہ بچپن سے ہی مٹھائی بہت پسند کرتی تھی جبکہ شادی کے تقریباً ایک ماہ بعد سب کچھ میسر ہونے کے باوجود اس نے مٹھائی نہ چکھی تھی کیونکہ دانش کا خیال تھا کہ مٹھائی اور سو فٹ ڈرنک عورت کے فیکو کو خراب کر دیتے ہیں اور یہ ہی سوچ کر اس نے بھی دل پر جبر کر لیا کہ اپنا حسن اور جسمانی خوبصورتی اس کا بھی جنون تھا۔

”بتایا نہیں مٹھائی کس خوشی میں لایا تھا۔“

وہ تنکے سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند چکی تھی۔

”جی میم غالباً ان کی انجمن جمعٹ ہوئی ہے آپ کی کزن سمرن کے ساتھ۔“ میری نے سب کے نام اچھی طرح رٹ رکھے تھے۔

بظاہر یہ کوئی ایسی بات نہ تھی پھر بھی جانے کیوں دریا ب کا حلق اندر تک کڑا ہو گیا اور اس کے دل میں اک چھانسی سی چبھ گئی۔

”ونہ بڑا آیا نیک باکاز، نیک پروین سے شادی کرنے کا خواہشمند کنوس کا مینڈک۔“

”بس صغرا اب مجھے سونا ہے تم جاؤ اور ہاں جاتے ہوئے کچن سے مٹھائی لے جانا تمہارے بچے کھالیں گے میں اور تمہارے صاحب مٹھائی بالکل پسند نہیں کرتے اور میری اب تم بھی جاسکتی ہو جاتے ہو۔ بڑا لائٹ آف کر دیتا۔“

صغرا سے بات ختم کر کے اس نے میری کو ہدایت دی اور تنکے سے ٹیک لگا کر خاموشی سے آنکھیں موند لیں۔

وہ چاہتی تھی کہ ملاشیا سے لائے گفٹ گھر جا کر خود دے آئے ویسے بھی شہ پارا کے دو تین فون آچکے تھے وہ دربیہ سے ملنے کے لیے بے قرار تھی وہ گھر جانے کے لیے خوب تک سبک سے تیار ہو کر لاؤنج میں داخل ہوئی تو سامنے بیٹھے دانش پر نظر پڑی جو نہایت اطمینان سے صوفے پر نیم دراز سرگرتہ لی رہا تھا۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ دانش نے اس کے دلکش سراپے پر ایک نظر ڈالی اور بلیک اور وائٹ سوٹ میں اس کے کھلتے ہوئے حسن کو دل ہی دل میں سراہا۔

”گھر۔“ مختصر سا جواب دے کر اس نے ڈرائیور کو فون کر کے گاڑی نکالنے کا حکم دیا اس — دوران دانش بڑی خاموشی سے اس کا جائزہ لیتا رہا۔

”میرا خیال ہے تم یہ تمام تحائف نور محمد کو دے دو وہ تمہارے گھر پہنچا دے گا۔“ دربیہ کے موبائل آف کرتے ہی دانش نے سامنے ٹیبل پر رکھے ہوئے تحائف پر ایک طائرانہ نظر ڈال کر حکم نامہ جاری کیا۔

”کیوں؟“ اس نے ابرو اچکاتے ہوئے دانش کی طرف دیکھا۔

”مجھے صرف تحائف ہی نہیں دینے بلکہ اپنے گھر والوں سے ملنا بھی ہے ممائی بار فون کر چکی ہیں۔“

”مل لیتا میری جان گھر والوں سے بھی مل لیتا ایسی بھی کیا جلدی ہے مگر آج نہیں آج میں نے تمہاری بیوٹیشن کو ٹائم دے رکھا ہے وہ بس آئے ہی والی ہوگی دیکھو تمہاری اسکن گتھی رف ہو رہی ہے۔“

دانش اسے رام کرنے کے تمام گر جان چکا تھا۔

”آج کا پورا دن تمہارا ہے اسے خوب ریلیکس ہو کر گزارو آرام کرو کیونکہ کل میں نے فارم ہاؤس پر چوہدری عبدالباری کے اعزاز میں ایک شاندار فنکشن ارنج کر رکھا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس فنکشن میں تم سب سے نمایاں نظر آؤ کیونکہ چوہدری صاحب کے تعلقات بہت اوپر تک ہیں اور پھر وہ ایک فلم بھی پروڈیوس کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں ان کو خوش کر کے تا صرف مجھے انگلینڈ میں بلبوسات کا ایک بڑا آرڈر مل سکتا ہے بلکہ ہو سکتا ہے کہ وہ تمہیں اپنی نئی فلم میں بطور ہیروئن بھی سائن کر لیں ویسے تو خیر ہمارے ملک میں فلم کا کوئی اچھا مستقبل نہیں ہے لیکن پھر بھی آگے جانے کی ابتدا تو تمہیں سے ہی کرنا ہوگی۔“

دانش نے دربیہ کی کر کے گرد پاؤں حائل کر کے اسے خود سے قریب کرتے ہوئے بڑی خوبصورتی سے قائل کرنے کی کوشش کی اور اس طرح دانش سہگل نے خوبصورت الفاظ میں لیٹ کر کوئین کی کٹوئی گولی کو بھی بیٹھایا دیا جو با آسانی دریا ب کے حلق سے اتر گئی اور تا صرف دریا ب نے اسے نگلا بلکہ اس نے دریا ب کے جسم میں کیف و سرور سا بھرا دیا اس نے تمام سامان ڈرائیور نور محمد کے ہاتھ گھر بھیج دیا اور پھر اس کا سارا دن بے حد مصروف گزارا کیونکہ آنے والا کل اس کے لیے بہت اہمیت کا حامل تھا اسے خراج وصول کرنا تھا اپنے حسن و خوبصورتی کا۔

یقیناً ”آج وہ نظر لگ جانے کی حد تک خوبصورت لگ رہی تھی بہت مختصر سائیٹ کا ریڈ ٹاپ جس کا قدرے ڈیپ گلا ایک لمبے کے لیے اسے بھی شرمسار کر گیا تھا لیکن جلد ہی وہ اپنی شرمساری کے حصار سے نکل کر براہ اعتماد ہو گئی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اس فنکشن میں اس سے بھی زیادہ مختصر لباس دکھائی دیں گے ٹاپ کے نیچے نہایت مختصر سائیک اسکرٹ اس کے ٹانگوں کے حسن کو مزید نمایاں کر رہا تھا اور وہ جانتی تھی کہ آج کی رات صرف اس کی ہے اور وہ سب کچھ جو وہ اور دانش سہگل حاصل کرنا چاہتے تھے با آسانی حاصل کر لیں گے اور ایسا ہی ہوا چوہدری عبدالباری اسے دیکھتے ہی پاگل سا ہو گیا جس کا اندازہ اسے فارم ہاؤس میں داخل ہوتے ہی ہو گیا تھا دانش اس کی کر کے گرد پاؤں حائل کرتا ہوا اسے چوہدری صاحب کے قریب لے گیا جو اپنے قریب کھڑے کسی شخص سے باتیں کرنا بھول کر یک نکل دربیہ کی جانب تنگ رہا تھا۔

”چوہدری صاحب ان سے ملیں یہ دریا ب سہگل ہیں مائی وائف۔“ چوہدری کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی اس نے ستائی انداز میں اپنی پانچوں کو مزید پھیلا لیا اور دربیہ کو اس کے منہ سے باقاعدہ طور پر رال چبھتی محسوس ہوئی۔

”بے شرم پچاس سال کی عمر میں بھی یہ حال ہے۔“

دربیہ نے سوچا ضرور مگر کہا نہیں۔

”آئیے۔ آئیے دریا ب میرے پاس بیٹھیں۔“ وہ دریا ب کو بانو سے تمام کر قدرے اندھیرے گوشے میں رکھے صوفے کی جانب بڑھ گیا اور دربیہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی صرف اپنے مفاد کے پیش نظر کوئی مزاحمت نہ کر سکی اور نہایت خاموشی سے صوفے پر اس کے پہلو سے لگ کر بیٹھ گئی۔ اور پھر ایک پچاس سالہ شخص کو بیس سالہ عاشق کا رول پلے کرتے دیکھ کر دربیہ کی گردن فخر و غور سے اٹھ گئی اور آج پہلی بار اس نے دانش کے کہنے پر سب کے سامنے ایک مختصر سار قص بھی پیش کیا جو صرف اس کے فن کے اظہار کے طور پر تھا۔ اور اس مختصر قص کے دوران اس نے تا صرف چوہدری عبدالباری بلکہ اس پاس موجود تمام افراد کو حیرت سے لٹک کھڑے دیکھا اور لوگوں کے چہرے پر نظر آنے والی ستائش نے اس کے اندر بجلی سی بھردی اور پھر قص کے اختتام پر اسے اتنی

دادو تحسین ملی کہ بل بھر کو وہ آسمان کی بلند یوں پر پہنچ گئی اور محفل میں جو رنگ دربیہ کے رقص نے بھرا پھر وہ بعد میں آنے والی کرشل رقصائیں بھی نہ بھر سکیں۔

چوہدری نے اس رات دربیہ کے حصول کی بہت کوشش کی لیکن دانش سہگل نے اس کی اس کوشش کو کسی طور بھی یار اور ثابت نہ ہونے دیا دانش جیسا کھاگ شخص دربیہ کی قیمت بڑھانا جانتا تھا اور ویسے بھی وہ اس کے نزدیک ایک نرم و نازک گریبا کی حیثیت رکھتی تھی جو زیادہ ہاتھوں میں جا کر مٹی جاسکتی تھی اس کی اپنی ذاتی رائے تھی کہ ایسی قیمتی اور نایاب چیزوں کو بہت سوچ سمجھ کر استعمال کیا جانا چاہیے اور وہ بھی اس وقت جب آنے والے وقتوں میں اس سے دگنا منافع حاصل کیا جاسکے اسی خیال کے پیش نظر بالکل مدہوش چوہدری کو اپنی بلائی ہوئی ایک رقصہ کے حوالے کر کے وہ نہایت خاموشی سے دربیہ کو وہاں سے نکال لایا اس کے اس عمل نے دربیہ کو اندر تک مطمئن کر دیا اور وہ اس غلط فہمی کا شکار ہو گئی کہ شاید دانش سہگل نے یہ قدم دربیہ کو اپنی عزت سمجھ کر اٹھایا ہے آخر تھی تو ٹل کلاس کی پست ذہن عورت نبویہ سمجھتی تھی کہ مرد اپنی عورت کا محافظ و نگہبان ہوتا ہے اسے کیا پتا تھا ایسے مرد تو صرف اس معاشرے میں پائے جاتے ہیں جسے اپنے مفادات کے حصول کے لیے بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی اب تو جس معاشرے کو وہ اپنا بچہ تھی یہاں تو عورت صرف ایک کھلونا تھی ایک قیمتی اور نایاب کھلونا جسے صرف اپنے مفاد اور ضرورت کے لیے استعمال کیا جاتا تھا اس سے زیادہ اس سوسائٹی میں عورت کی کوئی عزت نہ تھی۔

”میڈم چوہدری صاحبہ کا فون ہے۔“ وہ جانے کب تک بے خبری سے سوئی رہتی اگر چوہدری کی مسلسل آنے والے کال کی بنا پر میری کو اسے بے دار نہ کرنا پڑتا۔
”کیا ٹائم ہوا ہے۔“ کارڈ لیس میری کے ہاتھ سے لیتے ہوئے اس نے بمشکل اپنی آنکھیں کھولتے ہوئے دریافت کیا۔

”میم سکس اور کلاک۔“

”اوماں گاؤ مجھے تو دانش کے ساتھ فنکشن میں جانا تھا۔“ یہ خیال دماغ میں آتے ہی وہ بجلی کی سی پھرتی سے انہی اور فون کو کان سے لگا لیا۔

”جی چوہدری صاحبہ کیسے یاد کر لیا۔“ اپنے بچے میں حتی الامکان شیرینی گھولتے ہوئے اس نے دریافت کیا۔

”وہ جی آپ آج رات میرے ساتھ ڈنر کر رہی ہیں نا۔“

چوہدری کا خوشامد بھر الجھ اس کے کان سے نکل آیا۔

”ڈنر۔ لیکن مجھے تو آج دانش کے ساتھ۔۔۔“

”گولی مارو دانش کے ساتھ تو آپ نے میرے ساتھ جانا ہے میں ابھی دانش کو فون کر کے بات کر لیتا ہوں۔“
چوہدری نے اس کی بات درمیان سے کاٹنے ہوئے بڑی بے قراری سے کہا اور پھر چوہدری کے فون رکھنے کے صرف چند سیکنڈ زبانی دانش کا فون آگیا جس کی بدایت پر عمل کرتے ہوئے دربیہ نے خود کو ڈنر کے لیے اچھی طرح تیار کیا تقریباً ”نو بجے“ چوہدری صاحبہ کا ڈرائیور اسے لینے آگیا اور پھر یاد دہی ڈرائیور کی ہمراہی میں وہ شہر کے مشہور فائیو اسٹار ہوٹل پہنچی جہاں اس کا استقبال باری نے بڑی ہی بے صبری اور بے قرارگی سے کیا۔

”آتی ہو، ہم تو آپ کے انتظار میں جان سے ہی گزر رہے تھے۔“

باری نے اسے خود سے قریب کرتے ہوئے کہا۔

”بس باری صاحبہ میری طبیعت ٹھیک نہ تھی آپ نے بلایا تو انکار نہ کر سکی۔“ دربیہ نے کرسی سنبھالتے ہوئے نزاکت سے کہا۔

”چلیں پھر پہلے آپ کو ڈاکٹر کے پاس لے چلیں۔“

”نہیں نہیں پلیز آپ بیٹھیں میں میڈمسن لے کر آئی ہوں۔“

دربیہ نے جلدی سے ٹھہراتے ہوئے کہا اور پھر اس ڈنر کے بعد دربیہ نے بمشکل باری سے اپنی جان چھڑوائی اور تقریباً ”ایک بجے“ کے قریب گھر واپس آئی۔

”جانتی ہو عبد الباری نے میرے ساتھ مل کر انگلینڈ میں ملبوسات کی نمائش پر سرمایہ لگانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

دانش غالباً ”اس کے انتظار میں ہی بیڈ روم میں موجود تھا یہ خبر دربیہ کو سناتے ہوئے خوشی اس کے بلجھے چھلک رہی تھی دربیہ نے ایک نظر اس کے خوشی سے بھرپور چہرے پر ڈالی اور اپنا پرس سائیڈ نیبل پر رکھ کر وہیں صوفے پر نیم دراز ہو گئی صوفے پر جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے کپاؤں کو جوتے کی قید سے آزاد کیا۔

”لیکن اس کی ایک شرط ہے۔“

دریاب نے آنکھیں کھول کر دانش کی جانب دیکھا جو بیڈ سے اٹھ کر اس کے قریب صوفے پر بیٹھ چکا تھا۔
”وہ نہیں بھی ساتھ لے کر جانا چاہتا ہے اس کا خیال ہے کہ تمہیں بھی ان ملبوسات کی نمائش میں بطور ماڈل حصہ لینا چاہیے تاکہ تمہاری خود اعتمادی کو مزید جلا ملے۔“

”لیکن میں تو ماڈلنگ کر ہی نہیں سکتی یہ کیٹ واک میرے بس کا کام نہیں ہے۔“ دربیہ نے قطعی انداز اختیار کیا۔

”پھر بھی کوشش کرنے میں کیا حرج ہے۔“

دانش نے سگریٹ سلگاتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔

”اور دیکھو نا اس میں فائدہ بھی سراسر تمہارا ہی ہے اسی بہانے پر نا صرف میڈیا بلکہ شو بیز سے وابستہ لوگوں کی نگاہوں کا مرکز بھی بن جاؤ گی کیونکہ اس فیشن شو میں تقریباً ”تمام ہی ممالک حصہ لے رہے ہیں اور وہ سکتا ہے اس طرح میڈیا میں کلک ہونے کے بعد تمہیں وہ پذیرائی حاصل ہو جس کا تم نے تصور بھی نہ کیا ہو۔“

دانش کے لب و لہجے میں ایسا ضرور کچھ ہوتا تھا جو دربیہ کو بل بھر میں اپنی مرضی کے راستہ کی جانب گامزن کر لیتا تھا لہذا ابھی بھی ایسا ہی ہوا اور اس فیشن شو میں دریاب کے تین رقص شامل کر لیے گئے اس کے کلاسیکل رقص کے لیے سلاوے گئے مشرق و مغرب کے امتزاج کے ساتھ تیار کردہ بہترین ملبوسات کا شمار قیمتی برائینڈل ڈریسز میں ہوتا تھا اور پھر دریاب کے حسین جسم پر ج کر ان ملبوسات کی قیمت کئی سو گنا بڑھ گئی یہ ایک اہم شو تھا جس پر دانش سہگل اور چوہدری عبد الباری نے دل کھول کر پیسہ خرچ کیا اور اس پیسے کو سو فیصد منافع کے ساتھ واپس آنش کرنے میں بھی وہ دونوں اتنے ہی پر امید تھے یہ ہی وجہ تھی کہ اس شو کی تیاری بڑے اہتمام سے کی جارہی تھی دانش کا زیادہ تر وقت اپنے اسٹوڈیو میں گزرتا جہاں وہ مختلف ماڈلز کو اس شو کے متعلق بریفنگ دیتا ایسے میں دریاب بھی ہمیشہ اس کے ساتھ ہوتی ویسے تو اس نے باقاعدہ دانش اکیڈمی سے رقص سیکھا تھا لیکن پھر بھی یہاں ایک ڈانس ڈائریکٹر کا خاص طور پر اہتمام کیا گیا تھا جو ماڈلنگ کے لحاظ سے دریاب کو رقص کی پریکٹس کروا رہا تھا۔ دربیہ کو ہر لباس کے حساب سے رقص کا ناز چڑھاؤ سکھایا جا رہا تھا اس تمام عرصہ میں چوہدری بھی ہمہ وقت وہیں پایا جاتا جہاں دربیہ ہوتی اور اس کی پیاسی نگاہیں ہر دم دربیہ کا طواف کرتی رہتیں۔ جس دن صبح چھ بجے کی اس کی لندن کی فلائٹ تھی اسی رات اس کے پاس شہباز کا فون آگیا۔

”گماں غائب ہوئی ہو تم نہ کوئی اتنا نہ پتا۔ تم یہ بھی جانتی ہو کہ تمہارے بغیر میں کتنی تنہا ہو چکی ہوں۔“ دریاب

سے شکوہ کرتے ہوئے خود بخود اس کی آواز بھر گئی۔

”جذبائی بلکہ میلنگ۔“ اس نے سخت سے سوچا۔

”کہیں نہیں ہوتی مہاس آج کل کچھ برنس کی مصوفیات بڑھ گئی ہیں۔“ اور برنس کی مصوفیات کیا ہیں؟ یہ جاننے سے زیادہ شہسپار کے لیے اس بات کی اہمیت تھی کہ درجہ دانش سہل کے ساتھ خوش ہے۔

”مصوفیات سے تھوڑا وقت نکال کر گھر کا ایک چکر لگا لو کیونکہ نایاب کی طبیعت کافی خراب ہے ورنہ ہسپتال میں ایڈمٹ رہ کر کل ہی گھر آئی ہے“ نایاب بیمار تھی یہ کوئی ایسی خبر نہ تھی جو دریا ب کے دل کے ناروں کو چھوٹی کیونکہ اسے نایاب سے تو کیا اپنے گھر کے کسی بھی فرد سے کوئی جذباتی لگاؤ نہ تھا اس نے تو آنکھیں کھولتے ہی اپنے پاس رشتہ کے نام پر صرف شہسپارہ کو ہی دیکھا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ صرف شہسپارہ ہی کے لیے اپنے دل میں کوئی نرم گوشہ رکھ سکتی تھی ورنہ تو باقی سب اس کے لیے ایک ہی جیسے لوگ تھے لیکن پھر بھی دنیا داری نبھانا بھی ایک فن ہے جیسے وقت کے ساتھ ساتھ درجہ بھی سیکھ چکی تھی۔

”کیا ہوا نایاب کو۔“ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ شروع سے ہی دماغی عارضہ کا شکار ہے الفاظ خود بخود اس کے منہ سے پھسل گئے۔

”سے پھر بہت زیادہ ٹرمیجر ہے شاید دماغ پر بخار چڑھ گیا ہے اکثر ہی دورے پڑ رہے ہیں اب تو بیٹھے بیٹھے بے ہوش بھی ہو جاتی ہے۔“

”اگر ماما مجھے بتائیں تو شاید گھر کا کوئی دوسرا فرد مجھے کبھی بھی اطلاع دینا ضروری نہیں سمجھے ایک دم ہی یہ شکوہ اس کے دل میں ابھرا۔

جب میرے اپنے خال پاپ نے مجھے اطلاع دینا ضروری نہ سمجھا تو پھر میں وہاں کیوں جاؤں۔“

اس کی اناٹے نایاب کو دیکھنے کی خواہش کو پیدا ہونے سے قبل ہی ختم کر دیا۔

”وہ ایسا ہے ماما کہ میں کل انگلینڈ جا رہی ہوں۔ ان شاء اللہ دوپہر تک واپس آ جاؤں گی پھر گھر آؤں گی اس سے قبل تو میرا آنا تقریباً ناممکن ہے اور ہاں اگر آپ کو کچھ چاہیے تو بتادیں میں یہی آؤں گی۔“ اور محبت کے اس اظہار نے شہسپارہ کا فون سیروں سے بڑھا دیا وہ کل اٹھی۔

”نہیں بیٹا مجھے کچھ نہیں چاہیے تم خیریت سے واپس آ جاؤ میرے لیے یہ ہی کافی ہے۔“

لاکھ کوشش کے باوجود مرعلی کو آخری کیس بگھٹاتے دوپہر کے دو بج ہی گئے اس نے اپنی گھڑی پر ایک نظر ڈالی اور کورٹ سے نکل کر تیزی سے اپنے پیچیر کی جانب بڑھ گیا جہاں اس کی سرکیری مس نین تارا غالباً ۱۳ کی منتظر تھی۔

”ایک یوزی سر آپ کے ٹکٹ آگئے ہیں۔“

کپوڈر مصوف نین تارا مرعلی کو دیکھتے ہی اس کی جانب متوجہ ہو گئی۔

”گڈ۔ کب کی فلائٹ ہے۔“ مرعلی نے وہیں کاؤنٹر کے پاس کھڑے ہو کر دریافت کیا۔

”مجھے کوئی چھوٹا ہے۔“ نین تارا نے ٹیبل کی دروازے سے ٹکٹ نکال کر دیکھتے ہوئے کہا۔

”آج منگل ہے۔ یعنی ٹھیک تیسرے دن اس کا مطلب ہے کہ میرے پاس گاؤں جانے کے لیے صرف یہی دو دن ہیں۔“ مرعلی نے دل ہی دل میں حساب لگایا۔ جانے بابا جان کو مجھ سے کیا کام پڑ گیا ہے جو اس قدر اہم جیسی میں بلاتا بھیجا ہے۔

”تارا میرے اگلے دو دن کی اپائنمنٹ کینسل کر کے نئی تاریخ دیں کیونکہ میں گاؤں جا رہا ہوں۔“ نین تارا

کو یہ اطلاع فراہم کر کے وہ ہر نکلا جہاں اللہ بخش گاڑی لے کر اس کا منتظر تھا۔

گاؤں سے اس کی کوئی بھی ایسی جذباتی وابستگی نہ تھی کہ اسے وہاں جا کر خوشی حاصل ہوتی گاؤں کے ساتھ ہی صدوری کا تصور اس کے ذہن میں آکر اس کی طبیعت کو خاصا مکرر کر گیا۔ صدوری تا صرف اس کی بیوی اور دو بیٹیوں کی ماں تھی بلکہ اس کے چچا کی اکلوتی بیٹی اور سات بھائیوں کی اکلوتی بہن ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی دو بہنوں کی نند بھی تھی یہی نہیں بلکہ وہ مرعلی کے بابا نواز علی کی خاص منظور نظر بھی تھی مرعلی جیسے آرتھسٹک بنڈے کے ساتھ صدوری جیسی بے تحاشا موٹی اور کھانے کی شوقین عورت ذرا نہ چبختی تھی لیکن کیا کیا جائے خاندانی رسم و رواج میں بکڑے ہوئے لوگ لاکھ چاہنے کے باوجود اپنے پیروں کو ان زنجیروں سے آزاد نہیں کر سکتے جو جائیداد کی حریفانہ خواہش نے ان کے پیروں میں ڈال رکھی تھیں۔

مرعلی کو اپنے گاؤں کے رسم و رواج اور جاگیردارانہ نظام سے سخت نفرت تھی یہی وجہ تھی کہ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا ہونے کے باوجود اس نے کبھی بھی جائیداد کے معاملے میں دلچسپی نہ لی تھی بلکہ یہ کام اس کے چچا کا بیٹا اور اس کا بڑا سالا منصور علی لغاری ہی کرتا تھا اس کی بہ نسبت منصور اس کے باپ کا نہ صرف دست راست بلکہ نہایت منہ چڑھا بھی تھا یہی وجہ تھی کہ مرعلی اس سے بہت کم بات چیت کرتا تھا۔ اور اب بھی گاؤں جا کر گزارنے والے چوبیس گھنٹے اس کے لیے سہان روح تھے۔ اسے ہر حال میں جمعرات کو واپس آنا تھا تاکہ جمعہ کی صبح لندن کے لیے روانہ ہو سکے جہاں اہم کلائنٹ سے اس کی ملاقات طے تھی۔

عبدالرب گوندل ایک اعلا حکومتی عہدیدار ہونے کے علاوہ قومی اسمبلی کے ممبر بھی تھے پاکستان میں ان کی کچھ جائیداد تھی جس کے سلسلے میں انہیں مرعلی کی خدمات درکار تھیں اسی سلسلے میں مرعلی کو ایک ہفتے کے وزٹ پر لندن جانا تھا اس کے علاوہ بھی وہاں اس کو اپنا بھی کوئی ذاتی کام تھا اور چونکہ اگلا پورا ہفتہ کورٹ متوقع ہڑتال کے سبب بند تھا۔ اس لیے مرعلی کے پاس اس سے بڑھ کر کوئی اچھا موقع نہ تھا۔ گاؤں کی حدود شروع ہوتے ہی مرعلی کو ایک عجیب سی محسوس نے گھیر لیا اور اس نے اپنی آنکھیں موند کر خاموشی سے اپنا سر گاڑی کی سیٹ سے لٹکایا۔

آنے والے چوبیس گھنٹوں نے دریا ب کی زندگی کو یکسر تبدیل کر دیا وہ انگلینڈ کی سرزمین پر پہنچ چکی تھی ہوٹل مون لائٹ کے سوٹ میں پہنچ کر بھی اسے یقین نہ آیا کہ وہ لندن جیسے عظیم الشان شہر میں موجود ہے۔ اس کے ساتھ پاکستان سے آئی ہوئی دوسری ماڈلز بھی تھیں لیکن وہی آئی پی کمراس کے پاس تھا اور یہ بات اس کے لیے بہر حال اعزاز کی تھی کہ وہ مسز دانش سہگل بھی لیکن اپنے اس اعزاز پر فخر و غور کرنے کا موقع اسے بہت کم ہی نصیب ہوا اور جلد ہی اس کی ملاقات مشہور ماڈل نشاء سے ہو گئی نشاء نے ان کے گروپ کو لندن میں ہی جوائن کیا تھا اور دوسری ماڈلز کی نسبت وہ خاصی منہ پھٹ اور صاف گو شخصیت کی مالک تھی دریا ب سے اس کی ملاقات لیکن ہال میں ہوئی جہاں یہ نمائش منعقد ہوئی تھی اس نمائش میں حصہ لینے کے لیے مختلف ممالک کے علاوہ پاکستان سے بھی دوسرے اور لوگ آئے ہوئے تھے۔ بلاشبہ یہ ایک بڑی ملبوسات اور جیولری کی نمائش تھی اور اس وقت جب وہ دانش کی ہمراہی میں ہال کے ڈرائنگ روم میں موجود ماڈلز کی آخری تیاریاں دیکھ رہی تھی اچانک ہی نشاء آگئی دانش اس سے اسی طرح ملا جیسے دوسری ماڈلز سے ملتا تھا یہ سب اس فخر کا حصہ تھا جس میں دریا ب قدم رکھ چکی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اسے یہ سب بالکل بھی برانہ لگتا تھا۔

”میت ہرشی انا زانی و انف دریا ب سہگل۔“

اس نے بڑی ترنگ سے دریا ب کا تعارف نشاء سے کروایا اور نشاء اس تعارف پر حیران سی رہ گئی اور جیسے ہی دانش وہاں سے ہٹا وہ دریا ب کے قریب آگئی۔

”تمہارے ماں باپ نہیں ہیں۔“ اس نے حیرت سے آنکھیں پھیلا کر دیکھ کر یہ سوال کیا۔
”کیوں؟“ اس کا سوال ہی ایسا تھا کہ دریا ب کا حیران ہونا بجا تھا۔

”حیرت ہے میری جان تم جیسی معصوم اور خوبصورت ہرئی کو کون سے ماں باپ ہوتے ہیں جو دانش جیسے مرد کے ہاتھوں میں سوئے ہوئے ہیں۔“ وہ سگریٹ کا دھواں اس کے منہ پر چھوڑتے ہوئے تنہی سے کہی۔
”میں شاید غلط کہہ گئی دانش تو مرد کھلانے کے قابل بھی نہیں ہے کیونکہ مرد تو وہ ہوتا ہے جو کسی عورت کو عزت، سائیاں، تحفظ اور محبت دے سکے جبکہ دانش کے پاس تو دینے کے لیے ان میں سے کچھ بھی نہیں ہے یہاں تک کہ وہ تو کسی عورت کے قابل بھی نہیں ہے پھر تم اتنے ماہ سے کہیے اس کے ساتھ رہ رہی ہو حیرت ہے مجھے۔“
”تاسف اس کے لیے ہے جھک رہا تھا اور اس کے الفاظ دریا ب کو کسی نیزے کی انی کی مانند لگ رہے تھے۔
”جانتی ہو عورتوں کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر انہیں اسٹیج پر چلنا سکھاتے سکھاتے اس میں خود وہ تمام خوبیاں پیدا ہو گئی ہیں جو دیگر مردوں کو اس کی جانب متوجہ کرتی ہیں یقیناً نہ آئے تو کبھی آنا کر دیکھ لیتا۔“

الفاظ تھے یا پکھلا ہوا سیسہ جو اس نے دریا ب کے کانوں میں اندر لے دیا اور پھر بتا اس کے درد کا دریاں کہیے اس پر ایک تاسف بھری نظر ڈال کر کچھ دور کھڑے پرئیں فوٹو گرافر ٹھیک کی جانب بڑھ گئی جبکہ دریا ب اس نے آنکھ شاف کے بعد زمین میں ہی گر گئی دانش کا گریز آج اس کی سمجھ میں آیا وہ بھرم جو اس نے اپنے اور دانش کے درمیان پچھلے کئی ماہ سے قائم کر رکھا تھا ریت کی دیوار ثابت ہوا اور اس کو اپنا آپ جلتی دھوپ میں گھلتا محسوس ہوا۔
”تو کیا دانش کے تمام ملنے والے اس حقیقت سے واقف ہیں؟ جب جانتے ہیں کہ دانش میرے حقوق پورے نہیں کر سکتا۔“ یہ ایسے سوال تھے جنہوں نے اس سے اس کا بخرو غرور سب چھین لیا۔

”میں جو دنیا کے سامنے فخر و غرور سے گردن اٹھائے گھومتی ہوں کہ میں مسز دانش سہل ہوں تو یہ سب لوگ مجھ پر کتنا ہنستے ہوں گے؟ سوچتے ہوں گے آسانشات کی ماری عورت ایک اور عورت کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔“ تاکہ خود کو سمجھانے کے باوجود وہ اندر سے بالکل ٹوٹ گئی اس رات فلیکس ہال میں پیش کیا جانے والا فیشن شو ہر لحاظ سے بہت کامیاب رہا دریا ب کے تینوں رقص بے حد پسند کیے گئے اسے لوگوں نے بے حد سراہا اس کا انداز فیشن ماڈلنگ میں بالکل ایک نیا لگ تھا۔ ان ڈھنڈ کی مانگ سب سے زیادہ رہی جنہیں دریا ب نے دوران رقص استعمال کیا تھا لیکن پھر بھی جانے کیوں اس سب سے بھی دریا ب کو بلی خوشی حاصل نہ ہوئی وہ اندر سے بالکل کھرجکی تھی اسے رونے کے لیے ایک کندھا درد کا تھا جیسے ہی ان کا شو ختم ہوا وہ خاموشی سے باہر نکل کر لابی میں آگئی اور یقیناً ”آج اسے کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا وہ لابی میں بالکل تنہا کھڑی تھی جب کسی کام سے باہر آتے چوہدری عبدالہاری کی نگاہ اس پر پڑی۔

”زہے نصیب سرکار آپ کدھر جا رہے ہیں۔“
وہ اپنی حریفانہ نظریں اس کے جسم کے پار اتارتے ہوئے بولا۔
”اپنے روم میں۔“ وہ تھکی تھکی آواز میں بولی۔

”گولی مارو جی اپنے روم کو آؤ میرے ساتھ۔“ چوہدری نے اس کی کمر کے گرد اپنا بازو حائل کر کے اسے سہارا دیا اور وہ کوئی احتجاج بھی نہ کر سکی کیونکہ اس وقت وہ اپنے حواسوں میں ہی نہ تھی بنا کسی مزاحمت کے نہایت خاموشی سے وہ چوہدری کے روم میں آگئی اور یہ پہلی رات تھی جب اس نے ام النجاشہ کو منہ لگایا اور پھر پتی چلی گئی اسے اپنے دکھ درد دور کرنے کے لیے چوہدری کا کندھا نصیب ہو گیا تھا اور چوہدری نے اس کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اپنی محبت کی پھوار سے وہ گھر مقصود حاصل کر لیا جس کے لیے شطرنج کی یہ بساط چھائی گئی تھی یہاں بھی وہ اپنی بے خبری کے ہاتھوں ماری گئی صبح کے طلوع ہوتے سورج نے رات کے گناہ کو اپنی پلیٹ میں لے

لہا اور صبح جب وہ بے دار ہوئی تو اسے پہلا خیال دانش کا ہی آیا دانش کا خیال آتے ہی وہ متعادل کیفیات میں گھر گئی کہیں دانش ناراض ہی نہ ہو جائے۔ پہلا خیال اسے یہ ہی آیا میں دانش کو اس رات کا کیا جواز دوں گی؟ وہ گھبرا اٹھی شاور لیتے ہوئے بھی اس کی ذہنی رو بہک کر دانش کی سمت ہی جاری تھی اسے حیرت تھی کہ اس کی غیر حاضری کو محسوس کرتے ہوئے دانش نے اب تک اسے تلاش کیوں نہ کیا؟

اس کے موبائل پر دانش کی کوئی ایک مس کال نہ تھی وہ نہیں جانتی تھی کہ چوہدری کے ساتھ گزارا جانے والا وقت دانش کی مرضی کے مطابق ہی تھا جس کے لیے وہ ایک بڑی اور معقول رقم معاوضے کی شکل میں چوہدری سے حاصل کر چکا تھا جبکہ دریا ب اپنی بے خبری کے سبب دانش کا سامنا کرتے ہوئے سخت شرمندگی محسوس کر رہی تھی۔ اپنے اسی گھٹ اور احساس شرمندگی کے بوجھ تلے دبی جب وہ دانش سے ملی تو اس کے نارمل رویے نے جلد ہی اس کے احساس شرمندگی کو زائل کر دیا۔

”افہ میں تو ایسے ہی گھبراتی تھی اسے تو کچھ بتا ہی نہیں چلا۔“

وہ سمجھ رہی تھی کہ رات غالباً ”دانش اس کے کمرے میں آیا ہی نہ تھا۔ ابھی وہ اس سوسائٹی کی روایات اور تقاضوں سے بے بہرہ تھی ورنہ جان جاتی کہ یہاں اس طرح کے واقعات پر کوئی شرمندگی محسوس نہیں کی جاتی بلکہ اپنے عاشقی کے ایسے واقعات کو بھی محفلوں میں فخریہ بیان کیا جاتا تھا وہ نہیں جانتی تھی کہ جو کچھ ان کے ماحول کے صائب سے بے راہ روی اور بے حیائی میں شمار ہوتا تھا وہ اس جدید معاشرے کا فیشن تھا۔



وہ جیسے ہی رائل ابارٹمنٹ کی لفٹ سے باہر نکلا سرد ہوا کا جھونکا اس کے چہرے سے ٹکرایا اس نے فوراً اپنے کوٹ کے کار کھڑے کر لیے اور تیزی سے پارکنگ کی جانب بڑھ گیا جہاں گونڈل صاحب کا شو فر اسی کا منتظر تھا گونڈل صاحب سے اس کی آج کی یہ ملاقات کا رویہ باری اعتبار سے کافی کامیاب رہی تھی تمام ضروری معاملات لمکس کر کے وہ ان کا کیس لینے کا فیصلہ کر چکا تھا اس سلسلے میں تقریباً ”تمام کاغذی کارروائی اس نے مکمل کر لی تھی ان کی جائیداد کے ضروری کاغذات اس کے ہاتھ میں موجود فائل میں لگے ہوئے تھے جس کا گھر جا کر اس نے اچھی طرح مطالعہ کرنا تھا تاکہ کیس کی شروعات کے سلسلے میں مدد مل سکے ابھی وہ گاڑی تک پہنچا ہی تھا کہ اس کے موبائل کی مخصوص دھن بجنے لگی موبائل کوٹ کی اندرونی جیب میں تھا جسے نکالتے نکالتے بھی کال منقطع ہو گئی فون پر نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے لیے گاڑی کا دروازہ کھول دیا اس سے قبل کہ وہ اندر بیٹھتا فون بجنے لگا اس نے اسکرین پر ایک نظر ڈالی۔

”شعائل کاننگ۔“ اسکرین پر جگہ گاہا تھا اس نے فوراً اس کا بٹن دبا کر فون کان سے لگالیا۔
”ہیلو۔“

”کہاں ہو میری تم ابھی تک میری exhibition میں نہیں پہنچے۔“

میر علی نے بے اختیار اپنی گھڑی پر نظر ڈالی جہاں سات بج رہے تھے پھر اس نے گاڑی کے شیشے سے باہر جھانکا ہال چھائی ہوئی دھند کے سبب سارا شہر لندن تیز روشنیوں میں نہما سا گیا تھا۔
”شوکتے بچے شروع ہو گا؟“
”تقریباً“ آٹھ بجے تک۔“

”وکے میں آ رہا ہوں۔“ اس نے ایک بل کو سوچا اور جواب دے کر فون بند کر دیا۔

”ایسا کرو مجھے وکٹوریہ روڈ پر فلیکس ہال کے پاس ڈراپ کرو۔“

آج اگر شعائل نے فون کر کے یاد دہانی نہ کروائی ہوتی تو یقیناً ”میں اس کا یہ شو بھول چکا تھا اس نے دل ہی دل

میں شعا نزل کا شکریہ ادا کرتے ہوئے گاڑی کی سیٹ سے سر نکال لیا۔

شعا نزل تا صرف اس کی بہترین دوست تھی بلکہ ایک مشہور ڈیزائنر بھی تھی لیکن اس کے شو میں شرکت کی اصل وجہ فیض محمد سے کیا ہوا وعدہ تھا شعا نزل مسز فیض محمد تھی۔ اور فیض محمد اپنے کسی آئیشل کام کی بدولت لندن نہ آ سکا تھا یہی وجہ تھی کہ اس نے مرعلی کو اس شو میں شرکت کرنے کی خاص ہدایت کی تھی اور اگر آج وہ اپنا وعدہ بھول جاتا تو فیض محمد یقیناً "سارا ض" ہوتا اور اسے یقین تھا کہ تقریباً "ایک گھنٹے تک وہ فلیکس ہال پہنچ جائے گا۔"

وہ جیسے ہی یونیورسٹی سے واپس آئی گھر میں پھیلے ہوئے سناٹے نے اس کا استقبال کیا یقیناً "تمام لوگ ہسپتال گئے ہوئے تھے کیونکہ رات سے نایاب کی حالت کافی خراب تھی جس کی بنا پر اسے آئی سی یو میں منتقل کر دیا گیا تھا نیچے کے فلور پر صرف آڈیو اور ویدئو سے خاموشی سے اوپر آگئی کچن میں جا کر کھانا گرم کیا ابھی کھانے ہی بیٹھی تھی کہ موبائل پر ایس ایم ایس کی مخصوص دھن سنائی دی یقیناً "سمن کا مسیج ہو گا کیونکہ آج کل سب نایاب کی وجہ سے خاصے پریشان تھے اس نے فوراً "موبائل اٹھا کر چیک کیا مسیج تو سمن کا ہی تھا لیکن کیوں کیا تھا یہ فوری طور پر سمن کی سمجھ میں نہ آیا مسیج میں کسی ویب سائٹ کا ایڈریس دیا گیا تھا۔ ساتھ ہی اس ویب سائٹ کو جلد از جلد سرچ کرنے کی ہدایت بھی درج تھی۔

"آئی سی ایم آر جی ہو گئی اس ویب سائٹ کو سرچ کرنے کی۔"

سمن نے چرائی سے سوچا ویب سائٹ کسی فیشن شو کے متعلق تھی جبکہ سمن کو کبھی بھی کسی ایسی ویب سائٹ سے دلچسپی نہ تھی اور یہ بات سمن اچھی طرح جانتی تھی پھر بھی اگر اس نے سمن کو چیک کرنے کی ہدایت کی تھی تو ضرور کوئی خاص بات ہی تھی سمن کو کسی انجائی بے چینی نے گھیر لیا اس نے جلدی جلدی کھانا ختم کیا اور فوراً "کمپیوٹر آن کر دیا۔ کمپیوٹر کے آن ہوتے ہی وہ فوراً "سمن کی بتائی ہوئی ویب سائٹ سرچ کرنے لگی جو تھوڑی ہی دیر میں اسے مل گئی لندن میں کیے ہوئے والے مختلف فیشن شوز "اسٹیج پر کیٹ واک کرتی باڈلز کچھ بھی ایسا نہ تھا جو سمن کی دلچسپی کا سبب بنتا اس سے قبل کہ وہ کمپیوٹر بند کر دیتی۔ اسکرین پر نظر آنے والی شخصیت کو دیکھ کر اس کی انگلیاں کی بورڈ پر چلنا بھول گئیں۔

"او میرے خدا۔" اسے یقین ہی نہ آیا کہ جو وہ دیکھ رہی ہے سچ ہے۔

"دریاب۔۔۔ یہ دریاب ہے نا۔"

عقب سے آئی شاہدیز کی آواز سن کر وہ کھڑکھا کر پلٹی اس کی طرح شاہدیز بھی غیر یقینی کیفیت میں گھرا اسکرین کی جانب یک ٹک دیکھ رہا تھا پھر وہ آہستہ آہستہ چلا اس کے قریب آیا۔

"تمہیں اس ویب سائٹ کا کس نے بتایا۔"

"سمن نے۔" سمن نے تھکی تھکی آواز میں جواب دیا۔

"کمپیوٹر بند کر دو اور کسی سے اس بات کا ذکر مت کرنا کیونکہ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ ارم چچی پہلے ہی نایاب کی وجہ سے سخت ٹینشن کا شکار ہیں اب انہیں کچھ اور مت بتانا۔"

اسے سختی سے ہدایات دیتا ہوا شاہدیز تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔ جبکہ وہ کئی دیر حیران کن کیفیت میں گھری ہوئی اپنی جگہ سن بیٹھی رہ گئی۔

اتفاق کی بات تھی کہ آج تیسری دفعہ بھی مرعلی نے اسے اسٹیج پر ہی دیکھا تھا بے حد خوبصورت برقرار منظر دیتے ہوئے لیکن جانے کیوں وہ مرعلی کو پچھلی دوبار کی دیکھی ہوئی "پرا" سے قطعی مختلف لگی نہایت گرم سم اور کھوٹی کھوٹی۔

"آج میں ضرور اس سے بات کروں گا۔" اپنی سیٹ پر بیٹھتے بیٹھتے مرعلی دل ہی دل میں پکارا وہ کچھ تھا لیکن شاید اس کے نصیب میں ابھی یہ ملاقات نہ تھی یہی وجہ تھی کہ شو ختم ہونے کے بعد وہ اسے کہیں دکھائی نہ دی مرعلی نے اپنے طور پر اسے کافی تلاش کیا لیکن کامیاب نہ ہو سکا اس لیے بنا کسی سے کچھ پوچھے خاموشی سے اپنے اپارٹمنٹ میں واپس آ گیا۔

"اب مجھے یہ ضرور معلوم کرنا ہے کہ یہ لڑکی کون ہے۔" مرعلی اسے کھوجنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

گھر واپس آتے ہی اسے پہلی خبر یہ ملی کہ نایاب فوت ہو گئی۔

"آج صبح ہی اس کی موت ہو گئی ہے۔" اس نے اپنے دل میں اطمینان محسوس کیا بے شک وہ اپنے گھر کے ہر فرد سے لا تعلق رہ کر زندگی گزارتی آئی تھی لیکن یہ بھی سچ تھا کہ نایاب کی حالت دیکھ کر وہ دل ہی دل میں کڑھتی رہتی تھی اور اکثر ہی سوچتی تھی کہ اس کا مستقبل کیا ہو گا اگر اس سے پہلے ارم چچی کو کچھ ہو گیا تو؟ یہ وہ سوال تھے جو دریاب جیسے بے حس اور رشتوں سے بے سرو لڑکی کے ذہن میں بھی کبھی کبھی آہی جاتے تھے لیکن پھر بھی نایاب کی وفات کان کر اسے وقتی طور پر دکھ ضرور ہوا جو بھی تھا جیسی بھی تھی "تھی تو ایک انسان اور پھر اس کی بہن جس نے ہوش سنبھالتے ہی دنیا میں دیکھا ہی کچھ نہ تھا۔

"میرا کوئی سا بھی وائٹ کائن کا سوٹ نکال کر رکھو مجھے ابھی اپنے گھر جانا ہے۔" صغیر اکو ہدایات دے کر وہ واش روم کی جانب بڑھ گئی شاور لیتے ہوئے بھی نایاب ہی اس کے ذہن پر سوار رہی جانے کیوں آج اسے گھر جانے کی بھی جلدی تھی وہ جیسے تیسے شاور لے کر باہر نکلی تو سامنے بیڈ پر نیم دراز دانش کو دیکھ کر سانس ہی رہ گئی دانش کا دیدیہ اس سے بیش بہا فائل سا رہا تھا وہ جب بھی کبھی کمرے میں آتا صوفے پر بیٹھ کر خوب پیتا اور اکثر وہیں ڈھیر ہو جاتا وہی کوئی روایتی بیوی تو تھی نا جو اس کی خدمت کرتی اور جوتے اتار کر ٹانگیں سیدھی کر دیتی لہذا اس کام کے لیے وہ فوراً "سے بیڈ پر صغیر اکو بلاتی اور خود نہایت اطمینان اور بے نیازی سے اپنے بیڈ پر سو جاتی آج شاید یہ پہلا موقع تھا کہ دانش اس کے روم میں اس کے بیڈ پر نیم دراز تھا وہ مکمل طور پر اسے نظر انداز کرتی ڈرائنگ کے سامنے آکر اپنے بال سمجھانے لگی اسے احساس ہو گیا تھا کہ دانش نہایت باریک بینی سے اس کا جائزہ لے رہا ہے اور ابھی کچھ پوچھنا والا ہے۔

"کیس جا رہی ہو؟" بالا خراس کا اندازہ درست ثابت ہوا۔

"ہاں! اپنے گھر میری بہن کی دفعتہ ہو گئی ہے آج سے تقریباً "دس دن قبل جب میں لندن میں تھی۔" اس نے تفصیلی جواب دینا مناسب سمجھا اسے خدشہ تھا کہ کہیں دانش اسے جانے سے منع ہی نہ کر دے اور جلد ہی اس کا یہ خدشہ درست ثابت ہوا۔

"ویری سیڈیا رہت افسوس ہوا۔" وہ آہستہ آہستہ چلا دروہ کے قریب آ گیا نہایت قریب یہاں تک کہ اس کی سانس کی آواز دروہ کو اپنے کانوں میں سنائی دے رہی تھی لیکن جانے کیوں آج دروہ کو اس کا اس قدر قریب آنا ذرا اچھا نہ لگ رہا تھا۔ اس کے گلون اور سکرٹ کی ملی جلی خوشبو جس نے شادی سے قبل دروہ کو اپنا پیو اناہ بنا رکھا تھا اب اپنی اہمیت کھو چکی تھی کیونکہ اب دریاب کسی حد تک اس کی شخصیت کے گھناؤنے کردار سے واقف ہو چکی

تھی بے شک وہ جس قدر گھٹیا شخص تھا اتنا تو دریا ب شاید کبھی بھی نہ جان پاتی لیکن جو اس نے جانا وہ بھی اس کے لیے قابل نفرت ہی تھا بظاہر اوپر سے نظر آنے والا ایک صحت مند مرد آندر سے کیا تھا یہ تو صرف وہ ہی جانتی تھی کہ وہ لوگ جو دانش سہگل کے قرب کا شرف رکھتے تھے دریا ب اپنی چھین گلے میں ڈال کر لاک لگانے کی کوشش کر رہی تھی دانش نے خاموشی سے اس کی گردن پر ہاتھ رکھ کر لاک بند کر دیا۔

”شکریہ۔“ وہ اپنی جوتی کی جانب بڑھی اس کی کوشش تھی کہ جلد از جلد اس کمرے سے باہر نکل جائے۔
”وہ ایسا بد دریا ب جان تم اپنے گھر کل چلی جانا۔“

اسے اپنے عقب سے دانش کی پرسکون آواز سنائی دی وہ کرنٹ کھا کر پلٹی۔

”ڈاٹ ڈیو یو مین؟“ دانش صاحب میں نے ابھی آپ کو بتایا ہے کہ میری بہن کو فوت ہوئے دس دن ہو چکے ہیں پورے دس دن میرے گھر والے میرے بارے میں کیا سوچ رہے ہو آپ کے اس بات کا احساس ہے آپ کو؟ کیا میں اتنی بے حس ہوجاتی ہوں کہ اپنی سگی بہن کی عیادت تو نہ کر سکی اب تعزیت بھی نہ کروں۔“
”وہ تو ٹھیک ہے جان لیکن آج رات چوہدری صاحب نے مقامی فائیو اسٹار ہوٹل میں ایک تقریب کا اہتمام کیا ہے جس کی مہمان خصوصی تم ہو۔“ وہ نہایت ڈھٹائی سے اسے خود سے قریب کرتا ہوا بولا۔

”اور جانتی ہو اس تقریب میں لاہور سے ایک دو فلمی پروڈیوسر بھی خاص طور پر شرکت کرنے آرہے ہیں جنہیں اپنی فلم کے لیے سنے اور فریش چروں کی تلاش ہے اور میں چاہتا ہوں کہ وہ تمہیں اپنی فلم میں بطور ہیروئن منتخب کر لیں اس لیے رات تمہارا فریش ہونا نہایت ضروری ہے۔“ وہ نہایت کھاگ شکاری تھا اس نے دریا ب کو اس کی پسند کا دانہ ڈال دیا تھا۔

”میرا خیال ہے کہ تم ابھی اچھا سانا شٹلو میں ایرج کو فون کر دیتا ہوں وہ اگر تمہاری سروس کر دے گی دوپہر میں اچھی نیند لیتا تاکہ رات کو تمہارے چہرے پر ٹھکن کے آثار نہ ہوں تمہارے ڈریس اور میک اپ کے لیے بھی میں نے ایرج کو ہدایات دے دی ہیں اس کی ایکسپٹ رات آٹھ بجے تک آئے گی تمہیں تیار کرنے میں چاہتا ہوں آج کا اور دن تم مکمل ریلیکس ہو کر گزارو تاکہ تمہارے چہرے پر ایک فریش لک آئے جہاں تم نے دس دن تعزیت نہیں کی وہاں ایک دن اور رک جاؤ۔“ اس نے رک کر دریا ب پر ایک نظر ڈالی۔
”دیسے کوئی زبردستی نہیں ہے اگر تم چاہا ہو تو تمہاری مرضی۔“

وہ جانتا تھا دریا ب کو اپنا مفاد دینا کے ہر شے سے زیادہ عزیز ہے۔
”ٹھیک ہے میں کل چلی جاؤں گی۔“ شو بزی کی متوجہ چکا چونڈنے اس کی آنکھوں کو خیرہ کر رکھا تھا۔
”گڈ نائٹ۔“ وہ آہستہ آہستہ اسے اپنے ساتھ لگائے بیڈ تک لے آیا اور دریا ب بالکل بھول گئی کہ اس کی سگی بہن کو فوت ہوئے شخص دس دن ہوئے ہیں۔

اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ وہ اپنی ماں جانی کی تعزیت کے لیے جانا چاہتی تھی اس یاد رہا تو صرف اتنا کہ آج کی رات اس کی زندگی میں وہ سنیاں بھرے والی تھی آج کی رات اس کی زندگی کو کامیابیوں کی راہ پر گامزن کر دینے والی ایک رات تھی جس کا ہر لمحہ اس نے کشید کرنا تھا۔ اپنی پہچان اپنا نام پانے کے لیے اسے صرف ایک فلم چاہیے تھی ایک فلم کے بعد کامیابی اس کا مقدر بن جانے والی تھی وہ جانتی تھی کہ اوپر جانے کے لیے پہلا اسٹیپ مل جائے تو پھر اونچائی پر پہنچنا کچھ مشکل نہ تھا۔



رات چوہدری صاحب کی منعقد کردہ پارٹی میں اس کی ملاقات مشہور فلمی پروڈیوسر فاضل کریم سے ہوئی جو دریا ب کو دیکھ کر حقیقی معنوں میں دنگ رہ گیا دریا ب کر نکل شیفون کی ریڈ عرین میکسی میں غضب ڈھاری تھی

میکسی کے دونوں جانب سے اوپر تک کھلے چاک اس کے جسم کی خوبصورتی کو واضح طور پر نمایاں کر رہے تھے تقریب میں موجود ہر شخص اس کی اک نظر کریم کا متنی تھا لیکن وہ صرف فاضل کریم کی توجہ چاہتی تھی جس میں مکمل طور پر کامیاب رہی اور تقریب کے اختتام تک وہ اسے کل رات شہر کے سٹے ترین ہوٹل میں ڈنر انوائٹ کر چکا تھا اور دریا ب کے نزدیک یہ شہرت کی میڑھی پر رکھا جانے والا پہلا قدم تھا جو جلد ہی اسے آسمان کی بلندیوں تک لے جانے والا تھا۔



گھر میں داخل ہوتے ہی برآمدے میں بچھی دوری پر اسے ارم نظر آئیں غم کی شدت سے نڈھال ڈیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی ارم کو دیکھتے ہی جانے دریا ب کو کیا ہوا ارم کی اس قدر ناگفتہ بہ حالت کو دیکھتے ہی اس کا دل دکھ اور غصے کی شدت سے بھر گیا۔

”دہنہ۔۔۔ ایک پاگل بیٹی کا اتنا دکھ اور کہاں میری زندگی بھر کبھی کوئی خبری نہ لی۔“ وہ خاموشی سے ارم کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔

”کیسی ہیں ارم چچی آپ۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے ارم کے ہاتھ تھام لیے اور اس کا دل یک دم ماں کی محبت سے بھر گیا۔

”میری نایاب جلی گئی مجھے چھوڑ کر۔“ ارم ذرا سادہ جوتی کا احساس پاتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں دریا ب جس کا دل کچھ دیر قبل ماں کی محبت سے لبریز ہونے چلا تھا نایاب کی خاطر ماں کو رونا دیکھ کر یک دم کدر سا ہو گیا۔

”آج نایاب گئی تو اتنا دکھ، کل مجھے ایک دن کی بچی کو دوسروں کی گود میں ڈالا تھا تب دل نہ لگتا تھا۔“ چاہا کہہ دے لیکن حالات کی نزاکت دیکھتے ہوئے خاموش رہی اور جلد ہی ارم کے ہاتھوں سے اپنا ہاتھ کھینچ کر کچھ دور ہو کر بیٹھ گئی۔

”رے دریا ب آئی ہوئی ہے۔“ چاک ہی سرن کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی اس نے بل بھر کو نظر اٹھا کر سرن کی جانب دیکھا سادہ سلونی سرن پہچانی ہی نہ جاری تھی بلکہ اور ریڈ سوٹ میں وہ دریا ب کو پہلے سے کہیں زیادہ مختلف اور خوبصورت نظر آئی شاید اس کے حسن کو یہ جلاشاہو بڑی محبت نے بخشی تھی۔

”کیسی ہو تم اور ماما کہاں ہیں نظر نہیں آرہے۔“ بیک وقت کئی سوالات اس نے سرن سے کر ڈالے۔
”میں ٹھیک ہوں البتہ ماما کی طبیعت پچھلے کچھ دنوں سے خراب ہے بخار نہیں اتر رہا۔“

”وہ چلو پھر میں اور ہی چلی جاتی ہوں۔“ وہ فوراً سے بیشتر اٹھ کھڑی ہوئی اور میڑھیاں چڑھ کر شہر پارا کے فلور پر آگئی شہر پارا اسے دیکھتے ہی کھل اٹھی۔

”رے تم تم کب آئیں۔“ اس کے تن مرہ میں جان ہی بڑ گئی۔
”میں بھی آئی تھی کیا ہوا آپ کو۔“ وہ کرسی کھینچ کر شہر پارا کے بیڈ کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

”کچھ نہیں بس معمولی سا بخار ہے تم بیٹھو میں تمہارے لیے کچھ لے کر آئی ہوں۔“
”نہیں نہیں ماما پلیر آپ بیٹھیں میں بس آپ سے مل کر جاؤں گی مجھ پر ہوری ہے دانش میرا انتظار کر رہے ہوں گے کئی مہینے کا آپ ہیں۔“

”رے بیٹھو ابھی تم کہاں جا رہی ہو کھانا کھا کر جانا۔“ سرن اس کے لیے اور نیم جو س لے کر آئی تھی۔
”تم نے خواہ مخواہ زحمت کی۔“ سرن سے گلاس اٹھاتے اس نے سرن کو مخاطب کیا۔

”زحمت کیسی تم اتنے دنوں بعد آئی ہو کم از کم اتنی خدمت تو تمہارا حق بنتا ہے۔“ سرن نے مسکرا کر جواب دیا اور وہیں بیڈ پر شہر پارا کے قریب ہی بیٹھ گئی۔

”تمہاری شادی کب ہو رہی ہے۔“ گھونٹ گھونٹ جوس حلق میں اتارتے ہوئے وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سوال کر بیٹھی۔

”اصل میں تایاجی اور تائی سادیہ فریضہ صبح کی ادا نیگی کے لیے گئے ہوئے ہیں جیسے ہی واپس آئیں گے تازہ کر دی جائے گی بس ان کے ساتھ ساتھ سمن اور شاہ زیب بھائی کا انتظار ہے۔“

”شاہد ویز آج کل کہاں جا رہا ہے؟“

”بینک میں۔۔۔ دیے تو اسے شارجہ میں ایک بہت اچھی جاب آفر ہوئی تھی لیکن چونکہ اس وقت گھر کی تمام ذمہ داری اسی پر ہے اس لیے اس نے اس آفر کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔“

”حیرت ہے تم نے سمجھا تھا وہ سروس کے لیے کیوں اپنے مستقبل کو داؤ پر لگا رہا ہے۔“

”میں نے ہی سمجھا کیا کیونکہ میں بغیر رشتوں کے زندگی نہیں گزار سکتی اور ویسے بھی دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے نمود نہ مٹاؤ ہی کام نہیں آتی انہوں کا ساتھ بھی بہت تقویت دیتا ہے۔“

اچانک ہی جوس کا گھونٹ اس کے حلق میں پھنس گیا اس نے آٹھ کلاس واپس رکھ دیا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”میں چلوں در ہو رہی ہے۔“

شہسپارا سے گلے مل کر وہ واپس پٹی تو جانے یکدم سمن کو کیا ہوا۔

”اے یاد آئی میں نے تمہارے فیشن شو کی تصویریں دیکھی تھیں۔“ اپنی عادت کے برخلاف جانے کیوں وہ در پہ کو حتمی بنانہ رہ سکی۔

در پہ نے یکدم ہلٹ کر سمن پر ایک نظر ڈالی۔

”میری تصویریں تم نے کہاں دیکھ لیں۔“ ایسے جیسے اسے سمن کی بات پر یقین ہی نہ آیا ہو۔

”نیت پر۔“ سمن کا اطمینان قابل دید تھا۔ جیسے اسے در پہ کے اس اقدام سے کوئی فرق نہ پڑا ہو۔

”تمہاری چلوں والش کئی فون کر چکے ہیں۔“ سمن کی بات کو یکسر نظر انداز کرتی وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر گئی۔

”کوئی دیکھتا ہے تو بے شک دیکھے آخر کل جب میں نے فلم سائن کرنی ہے تب بھی تو ان لوگوں کو بتا چلتا ہی ہے

نا۔ گاڑی میں بیٹھتی ہی اس نے اپنے دل کو تسلی دی ویسے بھی اس نے کبھی کسی کی پروا کرنے کی عادت ڈالی بھی نہ

تھی تو خواہ مخواہ میں دوسروں کا سوچ کر اپنے شاندار مستقبل کو وہ داؤ پر نہیں لگا سکتی تھی اور یہ یقیناً اس کا آخری

فیصلہ تھا۔

اکیس دسمبر کو سمن کی شادی تھی سمن کو آئے ہوئے ہفتہ ہو چکا تھا اور سمن کی شادی کی تیاریاں اس نے اور فارہ بھابی نے مل کر کی تھیں رات ہی کاڑھ چھپ کر آئے تھے جن پر نام لکھا جا رہا تھا۔

”در پہ کو کارڈ دینے جاؤ تو مجھے بھی ساتھ لے جانا۔“ یہ بات وہ جانے کتنی بار شاہد ویز کو بتا چکی تھی کہ اسے در پہ

سے ملنے اس کے گھر جانا ہے اس لیے کارڈ دینے جاتے ہوئے اسے بھی ساتھ لے جایا جائے کیونکہ وہ پچھلے پانچ

سالوں سے دریاب سے نہیں ملی تھی۔

”چلو آجاؤ میں جا رہا ہوں۔“ شاہد ویز کا رڈ پر نام لکھ کر اٹھ کھڑا ہوا اور وہ اس کے ساتھ در پہ کے گھر آگئی گاڑی

جیسے ہی اس کے عظیم الشان بنگلے کے سامنے کھڑی ہوئی سمن ہکا بکا رہ گئی۔

”واؤ بھئی زبردست بڑا خوبصورت گھر ہے۔“ سنگ مرمر سے بنے سفید بنگلے پر نظر ڈالتے ہی ستائشی جملہ خود بخود

اس کے منہ سے نکل گیا۔

”یہ تم ظاہری نمود نہ مٹاؤ پر کب سے جان دینے لگیں۔“

شاہد ویز نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے گٹ کا انٹر کام بجا دیا۔

دریاب دودن قبل ہی اپنی فلم کی شوٹنگ سے واپس لوٹی تھی اور اس کی اس نئی سرگرمی کے متعلق فی الحال کسی کو علم نہ تھا فلم پچھترہ فیصد مکمل ہو چکی تھی ڈنگ اور آؤٹنگ کا کام جاری تھا وہ بڑی بے چینی سے اپنی اس فلم کے

مکمل ہو کر سینما میں لگنے کی منتظر تھی تاکہ اسے اپنی مارکیٹ ویلو کا اندازہ ہو سکے اسی لیے اس نے ہلکے کسی کو نہ بتایا

تھا وہ اچانک میڈیا میں آکر سب کو حیران کر دینا چاہتی تھی خاص طور پر اپنے اسکول اور کالج کی فرینڈز کو جن کے لیے

دریاب کو بحیثیت ایک اداکارہ دیکھنا یقیناً حیرت انگیز ہوتا ابھی بھی وہ ان ہی خوش کن خیالات میں گھری ہوئی تھی

جبکہ صفرا اس کا مساج کر رہی تھی اتنے میں انٹر کام پر اسے اپنے گھر سے آئے ہوئے مہمانوں کے متعلق اطلاع

ملی۔

”بدر بھیجو۔“ ملازم کو ہدایت دے کر وہ جلدی جلدی تیار ہونے لگی اپنے گھر سے کسی کی آمد کا سن کر اسے

یقیناً دلی خوشی ہوئی تھی لیکن ساتھ ہی شاہد ویز کا تصور اس کی طبیعت کو خاصا مدگر کر گیا کیونکہ وہ ابھی بھی فانیو اشار

ہوٹل کی لابی میں شاہد ویز سے اچانک ہونے والے اس سامنے کو بھولی نہ تھی یہی سب سوچتی ہوئی وہ ڈرائنگ

روم میں داخل ہوئی۔

”اوہو سمن بابی آپ کب آئیں۔“ تنے سالوں بعد سمن کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ باقی سب کچھ یکسر فراموش کر

بیٹھی اور بڑی محبت سے سمن کے گلے ملی۔

”مجھے تو ایک ہفتہ ہو گیا۔“ سمن نے بڑی محبت سے اس کا ہاتھ چومنا۔

”شاہد ویز کے پاس ہی وقت نہ تھا ورنہ میں تو تم سے ملنے میں کبھی اتنے دن نہ لگاتی۔“ سمن کی اس وضاحت پر

اس نے ایک سرسری سی نظر شاہد ویز پر ڈالی جو چہرے پر یکسر اجنبیت طاری کیے بیٹھا تھا۔

”اور تم تو ماشاء اللہ بہت ہی خوبصورت ہو گئی ہو۔“ سمن کے تا صرف الفاظ بلکہ نظروں میں بھی اس کے لیے

ستائش تھی سمن کی اس تعریف پر وہ صرف ہلکا سا مسکرا اس کے قریب صوفے پر بیٹھ گئی صفرا ٹرائی لے کر آگئی تھی۔

”اے تم نے یہ سب اتنا تکلف کیوں کیا میں تو بس اب جا رہی ہوں۔“ سمن شاہد ویز کو مسلسل پہلو بدلتے

ہوئے کچھ چکی تھی۔

”جی نہیں آپ آج کھانا کھا کر جائیں گی۔“ جانے کیوں اس کا دل چاہ رہا تھا کہ سمن آج کچھ دیر اور اس کے

پاس بیٹھے اسے یکدم ہی سمن کی وہ محبت یاد آتی جو ایک گھر میں رہتے ہوئے سمن اس سے اور سمن سے کرتی

تھی اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی آگئی جانے کیوں وہ اس قدر جذباتی سی ہو رہی تھی۔

”میں پھر آؤں گی یہ سمن کی شادی کا کارڈ ہے تم نے ہر رسم میں شرکت کرنی ہے میں خاص طور پر تمہارا انتظار

کروں گی دانش بھائی کو بھی لے کر آنا۔“ شاہد ویز کے اشارہ کرتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”اچھا اللہ حافظ۔“ اب کے دریاب کے انداز میں وہ والمانہ پن نہ تھا اور یہ بات سمن بھی محسوس کر چکی تھی

اس لیے جیسے ہی اس سے الوداعی ہاتھ ملایا اس کے دونوں ہاتھوں کو بڑی محبت سے تھام کر لولی۔

”تمہارا گھر بڑا خوبصورت ہے بالکل تمہاری طرح اور ہاں شادی پر ضرور آنا، ہم سب تمہارا انتظار کریں گے۔“

سمن کی والمانہ محبت اور ستائشی جملوں نے اس کے دل کے بوجھل پن کو کافی حد تک دور کر دیا۔ شاہد ویز شیشے کا

دروازہ دھکیل کر باہر نکل چکا تھا۔ اس نے سمن سے وعدہ ضرور کیا کہ وہ شادی کی تمام رسومات میں شریک ہوگی

لیکن بظاہر اس کا ایسا کوئی ارادہ نہ تھا اس نے کارڈ اپنے کمرے میں لے جا کر خاموشی سے بیڈ کی سائیڈ ٹیبل کی دراز

میں ڈال دیا۔

اس کی فلم اگلے ہفتے تک سینما میں لگنے والی تھی فلم کے پوسٹرز مختلف سینما گھروں کے باہر لگ چکے تھے ہاتھ سے بنے ہوئے ان پوسٹرز میں وہ قدرے مختلف دکھائی دے رہی تھی اس کا فلمی نام ”دل ربا“ رکھا گیا تھا یہی وجہ تھی کہ ابھی تک اس کے قریبی جاننے والوں کو بھی اس کی اس نئی سرگرمی کا علم نہ ہوسکا تھا یا شاید کسی کو اس حد تک امید نہ تھی وہ ریڈ کارٹ کے سلسلے میں ایک ’ڈوٹی وی چینل‘ پر بھی آچکی تھی اور اب جانچنا چاہتی تھی کہ آیا لوگ اسے فلم اشار دل ربا کی حیثیت سے جان پائے ہیں یا نہیں یہی سوچ کر وہ سمرن کے ویلے میں شریک ہونے پیراؤ اتر پڑا۔

ریڈ فستی ساڑھی میں خوبصورت اور جدید چو لری کے ساتھ وہ ایک منفرد سی شخصیت دکھائی دے رہی تھی باہر استقبال پر ہی اسے شاہد وز کے ہمراہ زوار بھی کھڑا نظر آیا ان دونوں کو یکسر نظر انداز کرتی وہ تاپا سرفرازی کی جانب بڑھی جنہوں نے اس کے سلام کا جواب دے کر منہ دوسری جانب پھیر لیا۔

”مجھے انہیں بھی سلام نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ وہ سخت ہچکتائی اور اندر کی جانب بڑھ گئی شہد پارا بڑی محبت اور والمان پن سے ملی۔

”ایکسکسوزی میڈم آپ دل ربا ہیں نا۔“ وہ کوئی پندرہ ’سولہ سالہ لڑکی تھی جو بڑے اشتیاق سے اس سے دریافت کر رہی تھی۔

”جی۔۔۔“ لڑکی کو مختصر سا جواب دے کر وہ پارا کی رہنمائی میں آگے بڑھ گئی۔

”اس کا مطلب ہے میں لوگوں میں اپنی پہچان بنانے میں کامیاب ہو چکی ہوں۔“ نیل کے گرد دھری کر سی پر بیٹھتے ہوئے اس سوچ نے اطمینان کی ایک لہر اس کے اندر تک اتار دی اسے محسوس ہوا تقریب میں موجود اکثر افراد اسے پہچان چکے ہیں یا پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں اس کی گردن فخر سے اگڑی وہ ٹانگ پر ٹانگ دھرے بڑے فخر سے بیٹھی تھی کہ اچانک ہی اس کی نظریے دھیانی میں اسٹیج پر جا پڑی جہاں رسٹ اور اورج شرارہ سوٹ میں سمرن بے حد خوبصورت دکھائی دے رہی تھی اور اس کے پہلو میں بیٹھا شاہد وز خوشی سے کھلا جا رہا تھا اس کی خوشی کا اندازہ وہ اتنے فاصلے سے بھی لگا سکتی تھی وہ جانے سمرن کے کان میں ہر سیکنڈ بعد کیا کہتا تھا کہ سمرن کے چہرے پر شرمیلی سی مسکراہٹ پھیل جاتی تھی۔ ایک مکمل منظر جو کبھی اس کا نصیب نہ بن سکتا تھا نہیں اس منظر میں کب تک وہ کھوئی رہتی اگر اسے سمرن کی آواز نہ سنائی دیتی۔

”اے تم یہاں کیوں بیٹھی ہو وہاں آؤ اسٹیج پر سمرن سے ملو۔“ اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اسے سمرن کے ساتھ اسٹیج پر جانا پڑا جہاں تائی سادی، پھوپھو اور فاریہ بھابھی بھی پہلے سے ہی موجود تھیں۔ ان تینوں خواتین کا رویہ اس سے بالکل روکھا سا تھا۔ اس نے بھی کوئی پروا نہ کی اور بڑی نزاکت سے سمرن کے پاس جا بیٹھی اس کے فوٹو سیشن کے فوراً بعد آرزو اور زوار بھی ایک ساتھ ہی اوپر آگئے جی سنوری آرزو پہچانی ہی نہیں جا رہی تھی پھوپھو بڑی محبت سے اس سے ملیں اور اسے لاکر سمرن کے پہلو میں بٹھا دیا۔

”اصل میں کل ہی زوار اور آرزو کا نکاح ہوا ہے کیونکہ زوار کو لندن میں جاب مل گئی ہے پھوپھو اسے اکیلا بھینچنا نہیں چاہتی تھیں اسی لیے ان دونوں کا چانک ہی نکاح ہو گیا۔“ سمرن آرزو کی جانب محبت سے دیکھتے ہوئے جانے لگا کچھ کہہ رہی تھی لیکن اسے کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا وہ جو یہ سمجھ رہی تھی کہ زوار حسن آج بھی اس کی محبت کا جوگ لیے بیٹھا ہے سمرن کی فراہم کردہ اس اطلاع نے اس کی اس غلط فہمی کو یکسر ختم کر دیا زوار حسن کے چہرے پر اپنی محبت کھو جتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ وہاں اب آرزو کا نام درج تھا وہ بے حد بددل ہو گئی اور پھر کھانا کھا لے بغیر گھر واپس آگئی۔ حالانکہ اسے شہد پارا سمرن، سمرن جی کہ ارم نے بھی روکا لیکن وہ نہ مانی یہ عادت اس کی بڑی پرانی تھی جب کوئی کام کرنے کا فیصلہ کرتی تو کبھی بھی اس سے ایک انچ پیچھے نہ ہمتی آج بھی اس نے

ایمانی کیا وہ جو یہ سمجھتی تھی کہ اس کا رعب حسن لوگوں کے دلوں کو اسیر کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ شاہد وز کے بعد اب زوار کا نظر انداز کیا جانا بالکل بھی برداشت نہ کر سکی اور اس رات شاید پہلی بار وہ اپنے اکیلے لمرے میں پھوٹ پھوٹ کر روئی۔



آج اس کی فلم کا پرمیٹ شو تھا جس میں شرکت کے لیے وہ فاضل کریم کے ساتھ آگئی تھی۔ دانش اپنے بزنس کے سلسلے میں دوبئی گیا ہوا تھا اور اگر ہوتا بھی تو کن سا اس کے ساتھ آجانا اور اسی پرمیٹ شو کے دوران اس کی ملاقات شعا نزل کے ہمراہ موجود مہر علی سے ہو گئی۔

”آپ نہیں جانتیں آپ سے ملاقات میرا ایک دیرینہ خواب تھا جو آج شعا نزل کے طفیل پورا ہوا۔“ مہر علی کا بطور مذاق کیا جانے والا یہ جملہ جانے کیوں اس کے دل میں ترازو ہو گیا اسے بھی یہ سانسو لا سلوٹا بھرے بھرے ہنس والا ہنڈسم سانو جوان اچھا لگا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں ہلکورے لیتی محبت و ریر کے لیے ایک بالکل نیا تجربہ تھی۔

”شاید مجھے غلط فہمی ہو گئی ہو۔“ یہ کہہ کر ویر نے اپنے دل کے کسنے کو جھٹلانا چاہا لیکن پھر بھی وہ کئی دنوں تک مہر علی سے ہونے والی اپنی اس سرسری سی ملاقات کو بھلا نہ پائی۔ حالانکہ وہ لوگوں کو اتنا عرصہ یاد رکھنے کی عادی نہ تھی۔

اس کی فلم ریلیز ضرور ہوئی لیکن باکس آفس پر کوئی خاص بزنس نہ کر سکی اور اس کی دوبئی وجوہات ہو سکتی تھیں ایک تو یہ کہ پاکستان میں فلموں کی وہ مارکیٹ ویلیو نہ رہی تھی جو کچھ عرصہ قبل تک تھی دوسرا شاید ہماری عوام اتنی مشہور ہو گئی تھی کہ فلم میں اچھی اور معیاری کہانی چاہتی تھی اور آٹھ ’دس گانوں اور ڈانس کے ذریعے کسی بھی فلم کو کامیاب نہیں بنایا جاسکتا جو بھی تھا اس فلم کی ریلیز سے ویرہ کو فائدہ ضرور ہوا شوز کے حلقہ میں وہ پہچانی جانے لگی تھی۔ وہی وی کے ایک دو مارٹنگ شوز میں بھی بطور مہمان بلوائی گئی اور پھر اسے کچھ اشتہارات بھی مل گئے پہلے تو دل ربا نے اشتہار کرنے سے انکار کر دیا اس کے خیال میں اس طرح اس کی مارکیٹ ویلیو ڈاؤن ہونے کا خطرہ تھا لیکن پھر دانش کے سمجھانے پر آمادہ ہو گئی اب اس نے بڑی ملک میں فلم حاصل کرنے کی اپنی کوشش کو مزید تیز کر دیا۔



جے آنند کا تعلق بڑی ملک کی انڈسٹری سے تھا دانش کی ہر ممکن کوشش تھی کہ وہ اپنی فلم میں دل ربا کو بھی کاسٹ کرے اسی سلسلے میں اس نے آج جے آنند کے اعزاز میں ایک فنکشن کا اہتمام کر رکھا تھا جس کی روح رواں ”دل ربا“ بھی رات اس تقریب میں جب وہ شفون کی سفید ساڑھی میں نہایت مختصر بلاؤز کے ساتھ ہال میں داخل ہوئی تو ہر نگاہ میں اس کے لیے ستائش ہی ستائش تھی اور پھر بیگنی رات میں چند مخصوص مہمانوں کے لیے سجائی گئی اس محفل میں اس کے قیامت خیز رقص نے ایسا سماں باندھا کہ مہمان پروڈیو سربے آنند اپنا دل اس کے قدموں پر رکھنے کے لیے آمادہ ہو گیا۔

پھر اگلے جو عین گھنٹے دل ربا کی زندگی میں ایسے آئے کہ اس کی پوری زندگی ہی بدل گئی دل ربا نے بطور ہیروئن جے آنند کی فلم سائن کر لی اب تو جیسے وہ ہواؤں میں اڑ رہی تھی۔ اگلے ہی ہفتے وہ جے آنند کے ساتھ دوبئی روانہ ہو چکی تھی جہاں اس فلم کی اوپننگ تھی یقیناً ”اس کی زندگی کا وہ سنہرا دور شروع ہو چکا تھا جس کے لیے اس نے اپنا سب کچھ دوا کر رکھا تھا۔“



دانش اسے جے آئند کے ساتھ وہی چھوڑ کر آج صبح کی فلائٹ سے لندن چلا گیا تھا جہاں سے اس کی واپسی تقریباً "پندرہ دن بعد" تھی وہ فلم کے دیگر افراد کے ساتھ ہوٹل مولن لائٹ میں مقیم تھی جے آئند کی منظور نظر ہونے کے سبب اسے یہاں بھی خاصا دی آئی پی پروڈکشن دیا جا رہا تھا وہ صبح سوکرا تھی تو جے آئند جاچکا تھا پہلے اس نے سوچا کہ ناشتا کمرے میں ہی منگوائے لیکن جانے کیا سوچ کر اپنے اس خیال کو اس نے خود ہی مسترد کر دیا اور شاہور لے کر جینز پر لیمن فلر کی ٹی شرٹ کے ساتھ وہ نیچے ہال میں آگئی۔

"ہیلو۔" ناشتے کی ٹرے اپنے آگے سرکا کر اٹھی اس نے پلیٹ ہی اٹھائی تھی کہ ایک جانی پہچان آواز اس کی سامنے سے ٹکرائی بغیر دیکھے ہی وہ جان چکی تھی کہ یہ آواز یقیناً "نشاء" کی تھی جو کرسی کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ چکی تھی۔

"کیسی ہو تم؟"

"ٹھیک ہوں۔" مختصر سا جواب دے کر وہ ناشتا کرنے میں مشغول ہو گئی کہ نشاء نہایت فرصت سے اس کا جائزہ لینے کا شغل سرانجام دیتے لگی۔

"آج کل تو بھی تمہارے بڑے ٹھٹھٹ ہیں سنا ہے جے آئند کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہی ہو۔"

سگریٹ سلگاتی ہوئی نشاء کی اس بات نے دل ریا کو اندر تک سلگا ڈالا۔

"تمہیں کس نے یہ غلط اطلاع فراہم کی ہے؟ تم شاید جانتی نہیں میں نے اس کی فلم سائن کی ہے جس کا معاوضہ اس نے مجھے ادا کیا ہے جو کہ میرا حق تھا۔" باوجود کوشش کے بھی وہ اپنا لہجہ دھیمانہ رکھ سکی۔

"اس معاوضے کے علاوہ میں نے ابھی تک جے آئند سے ایک روپے کا کوئی ٹکٹ بھی حاصل نہیں کیا۔" اپنی صفائی پیش کر کے اس نے نیپھکی اٹھالیا تاکہ ہاتھ صاف کر سکے کیونکہ نشاء کی آمد نے اس کی طبیعت خاصی کدر کر دی تھی۔ اس کی ہلکے بالکل ختم ہو چکی تھی۔

"بے بی یا تو تم بہت معصوم ہو یا بننے کی کوشش کر رہی ہو۔" وہ نیپھکی پر آگے کی جانب جھکی اور قدرے راز دارانہ انداز میں گویا ہوئی۔

"حیرت ہے تم نہیں جانتیں دانش سہل تمہارے قیمتی وقت کی قیمت دونوں ہاتھوں سے وصول کر رہا ہے وہ قیمتی وقت جو تم جے آئند کو فلم کے علاوہ دے رہی ہو۔" اس کا انداز قدرے استہزائیہ تھا جبکہ یہ دل ریا کے لیے ایک بالکل نیا انکشاف تھا۔

"غلط کہہ رہی ہو تم ایسا نہیں ہو سکتا امپا بل۔" بے یقینی اس کے پیچھے سے عیاں تھی۔

"ہو سکتا ہے میں جھوٹ ہی کہہ رہی ہوں لیکن تمہارے پاس یقیناً "چوہدری صاحب قاضل" کہہ کر اور اپنے دیگر چاہنے والوں کے نمبر تو ضرور ہوں گے تو ہو سکتے تو ان سے رابطہ کر کے دریافت کرنا کہ دانش تمہاری اب تک کتنی قیمت وصول کر چکا ہے۔" بڑی بے دردی سے تمام حقیقت اس کے گوش گزار کر کے وہ اٹھ کھڑی ہوئی جبکہ دل ریا کے جسم میں ٹوٹ گیا جان ہی نہ رہی اس کی ٹانگوں نے اس کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا اور وہ بڑی مشکل سے خود کو ٹھیک کر کمرے تک لے کر آئی۔

اسے اس احساس نے شدت سے گھیر لیا کہ آج تک وہ دانش کے ہاتھوں میں ایک کھلونے کی مانند زندگی گزارتی رہی ایک ایسا کھلونا جس کی قیمت وہ دونوں ہاتھوں سے وصول کرتا رہا جبکہ وہ بے خبری رہی اس احساس نے دل ریا کا دل دانش سے مکمل طور پر اچاٹ کر دیا۔

"اگر مجھے کامیابی حاصل کرنی ہے تو سب سے پہلے دانش سہل سے چھٹکارا پانا ہو گا۔" یہ فیصلہ کرتے ہی اس کا دل مطمئن ہو گیا حالانکہ وہ جانتی تھی کہ یہ اتنا آسان کام نہیں ہے پھر بھی اسے یقین تھا کہ وہ کامیاب ضرور ہوگی

کیونکہ اب وہ دریا بھل نہیں بلکہ ایک فلم اشار "دل ریا" تھی اسے تلاش تھی کسی ایسے ہاتھ کی جو اسے دانش کے چنگل سے باخفاقت نکال سکے اور قدرت نے یہ موقع بھی اسے خود ہی فراہم کر دیا جلد ہی اس کی ملاقات ایک مشہور صنعت کار راجہ بشارت سے ہو گئی راجہ صاحب کی شخصیت اور طاقت دیکھتے ہوئے دل ریا کو یقین آ گیا کہ یہ ہی وہ ہاتھ ہے جو اسے دانش سہل کے چنگل سے نکال سکتا ہے۔

فلم میں اس کا کام تقریباً "مکمل ہو چکا تھا اور وہ آج رات کی فلائٹ سے واپس جا رہی تھی اس دو ماہ کے عرصہ میں صرف ایک بار دانش اس سے ملنے آیا اسی وقت جب وہ بنگال میں شوٹنگ کے سلسلے میں مصروف تھی وہ دانش سے اسی طرح ملی جیسے آج تک ملتی آ رہی تھی جے آئند دو ماہ ملنے کا وعدہ لے کر اسے ایئر پورٹ چھوڑ گیا تھا وہ نہایت ہی ست قدموں سے لاؤنج میں داخل ہوئی دو ماہ کی ٹھکن اس کے جسم پر قابض تھی فلائٹ دو گھنٹے لیٹ تھی وہ وہیں لاؤنج میں رکھے صوفے پر بیٹھ گئی اس کا سامان لوڈ ہو چکا تھا جبکہ ہینڈ لیری کے طور پر ایک بیگ اس کے قریب دھرا تھا اسی طرح بیٹھے اسے جانے لگتی دیر ہو چکی تھی وہ اپنے آس پاس موجود چہروں کو خالی الذہنی سے دیکھتی ہوئی ایک سی پوزیشن میں بیٹھی تھی جب اس کے قریب کوئی آکر بیٹھا۔

"ایکیکو زی مس۔" اس نے پلٹ کر دیکھا چالیس سال سے اوپر کا ایک مرد جس کی صحت قابل رشک تھی نہایت قیمتی ٹی شرٹ میں ملبوس اس سے کچھ دور بیٹھا تھا۔

"کافی۔" اس نے اپنے ہاتھ میں موجود کپ دل ریا کی جانب بڑھایا۔

"نو تھینکس آپ نہیں۔"

"میں بی چکا ہوں بہ کپ آپ کے لیے ہے۔" دل ریا نے حیرت سے پلٹ کر اس کی جانب نکلا۔

"در اصل میں کافی دیر سے آپ کو نوٹ کر رہا ہوں۔ آپ تمہاں اور شاید کچھ ڈپر سڈ بھی اسی لیے سوچا آپ کو کچھ کمپنی دی جائے۔" دل ریا کی آنکھوں میں جھانکتا سوال شاید وہ پڑھ چکا تھا اسی لیے وضاحت کرتا ہوا بولا۔ اب انکار کی گنجائش نہ تھی دل ریا نے خاموشی سے کپ تھام لیا اور آہستہ آہستہ پینے لگی حالانکہ چائے اور کافی وہ بالکل نہ پیتی تھی۔

مجھے راجہ بشارت کیسے ہیں اور آپ؟" اس کے قریب سے آتی مٹکے ترین کلون اور پرفیوم کی خوشبو اس کے اعلا ذوق کی نشاندہی کر رہی تھی۔

"دل ریا۔" اتنا ہی تعارف کافی تھا راجہ بشارت درحقیقت ایک بہت بڑا صنعت کار ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت ہی عیاش شخص تھا اسے پہلی ہی نظر میں دل ریا کے معصوم حسن نے ہی جانب متوجہ کر لیا تھا کوئی اور وقت ہوتا تو دل ریا بھی اس کی حوصلہ افزائی نہ کرتی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ دانش کی رضامندی کے بغیر وہ کسی شخص سے دوستی جیسا بے ضرر رشتہ بھی استوار نہیں کر سکتی تھی لیکن اب پہلے والی بات نہ تھی "نشاء" کی لگائی ہوئی آگ نے اس کے تمام جسم کو جلا کر خاکستر کر ڈالا تھا اور وہ بغاوت کی آگ میں لگزی کی مانند سلگ رہی تھی اسی جذبے نے اسے راجہ بشارت کے قریب کر دیا اور راجہ بشارت کو زیادہ مشتق نہ کرنی پڑی چونکہ عورت تو ہوتی ہی شخصیت پرست ہے خصوصاً وہ شخصیت جو تقدس کا لبادہ اوڑھ کر آئے وہ اسے کیس کا نہیں چھوڑتی اور ایسا ہی دل ریا کے ساتھ ہوا وہ بھی راجہ بشارت کی ظاہری شخصیت سے دھوکا کھا گئی یا شاید دھوکا تو اس فیلڈ میں آتے ہی اس کا مقدر ہو چکا تھا اس کا سفر راجہ بشارت کی بھڑائی میں نہایت ہی سہل اور آرام دہ ہو گیا راجہ نے اسے اپنا رابطہ نمبر دے دیا اور اس کا نمبر خود حاصل کر لیا تاکہ آگے ملاقاتوں کے لیے راہ ہموار ہو سکے۔

”تم راجہ بشارت سے کب سے مل رہی ہو۔“ وہ ابھی سوکر اٹھی تھی جب دانش زوردار آواز سے دروازہ کھوتا ہوا اندر داخل ہوا۔

”پلیز آہستہ بولو میرے سر میں درد ہے۔“ دانش کی بات کو مکمل طور پر نظر انداز کرتی وہ بیڈ سے نیچے اتر آئی پاؤں میں سلپرز ڈالے اور اپنے بالوں کو دونوں ہاتھوں سے سمیٹ کر ہاتھ روم کی جانب بڑھ گئی۔

”میری بات کا جواب دو پھر تم کہیں جاسکتی ہو۔“ اس سے قبل کہ وہ ہاتھ روم کے دروازے کی تاب گھماتی طیش میں بل کھاتا ہوا دانش اس کے اور دروازے کے درمیان میں حائل ہو گیا دانش کا یہ روپ اس کے لیے بالکل انوکھا تھا۔

”تمہیں میری ذاتیات جاننے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔“ دل ربا کا جواب دانش کے غریب و غضب میں اضافہ کا سبب بن گیا لیکن وہ نہایت گھاگ شخص تھا وقت کے بدلتے چہرے کو اپنے ہاتھ میں رکھنے کا فن جانتا تھا۔ دریا ب کا موڈ اسے بہت کچھ سمجھا گیا۔

”اختیار ہے کیونکہ میں تمہارا قانونی اور شرعی شوہر ہوں۔“ اس کا لہجہ پہلے سے کافی تبدیل ہو گیا اور وہ اپنی آواز کو قدرے دھیمہ کرتا ہوا بولا۔

”شوہر۔“ دل ربا پر ہنسی کا شدید وعدہ پڑا ہنستے ہنستے اسے کھانسی ہونے لگی اور آنکھوں سے پانی بہہ نکلا وہ وہیں کاپٹ پر بیٹھ گئی دانش کھینا ناسا ہو گیا۔

”شوہر دانش صاحب آپ نے آج کیسے خود کو میرا شوہر تسلیم کر لیا۔ حیرت ہے؟“ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور آہستہ روی سے چلتی دانش کے عین مقابل آکھڑی ہوئی۔

”آپ شوہر کا مطلب جانتے ہیں؟“ وہ عین اس کی آنکھوں میں دیکھتی ہوئی بولی دانش کے پاس اس کے اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

”شوہر وہ ہوتا ہے جو اپنی بیوی کو عزت، محبت اور تحفظ فراہم کرے، خود اپنے ہاتھوں اپنی بیوی کا سودا کرنے والا آج شوہر کہلانے کا حق دار کیسے ہو گیا بولو جواب دو۔؟ تم شوہر نہیں ایک عزت دار دلال ہو نہایت ماڈرن سوسائٹی میں عزت کے ساتھ لڑکیاں سلطانی کرنے والے۔“ اس نے لفظ عزت پر زور دیا۔

”بہر حال تم جو بھی ہو مجھے اس بات سے کوئی غرض نہیں ہے لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ میں اب تم جیسے نامکمل مرد کے ساتھ زندگی نہیں گزار سکتی مجھے تم سے طلاق چاہیے۔“ طلاق کا لفظ نہایت روانی سے اس کی زبان سے ادا ہو گیا اور وہ خود بھی حیران رہ گئی جبکہ دانش ابھی تک ناقابل فہم حالت میں کھڑا تھا اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ دل ربا میں اتنی بڑی تبدیلی آئی کیسے؟ وہ سخت پچھتا رہا تھا کوس رہا تھا اس وقت کو جب اس نے راجہ بشارت کے سلسلے میں دل ربا سے باز پرس کی۔

”اور ہاں۔“ ہاتھ روم کا دروازہ کھولتے ہوئے وہ پھر رکی۔

”میرے ساتھ کوئی ہوشیاری کرنے کی کوشش مت کرنا ورنہ راجہ بشارت تمہیں زمین میں زندہ ہی گاڑ دے گا۔“

وہ تیزی سے دروازہ بند کر کے ہاتھ روم میں گھس گئی۔
”لو کی۔۔۔ میں نہ ہوتا تو دیکھتا آج کون تمہیں اپنی فلم میں سائن کرتا۔“ بند دروازے کو دیکھتے ہوئے دانش نے زیر لب نہایت بے ہودہ گالیاں دیں اور ہاتھ روم کے دروازے کو ٹھوکر مارتا تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

دل ربا آج کل راجہ بشارت کے دیئے ہوئے فلیٹ میں رہائش پذیر تھی جبکہ کورٹ میں اس نے خلع کا مقدمہ

بھی دائر کر دیا تھا۔ دل ربا کی انڈین فلم ریلیز ہو چکی تھی جس میں اس کے کردار کو تا صرف مختصر بلکہ نہایت مسخ کر کے پیش کیا گیا تھا جس نے دیکھنے والوں پر کوئی خاص تاثر نہ چھوڑا اب اس کے پاس کرنے کو کچھ بھی نہ تھا سوائے راجہ بشارت کے شوہر کے حلقوں میں اس کی پی آر اتنی نہ تھی جتنا وہ سمجھ بیٹھی تھی اب اسے احساس ہوا کہ جو بھی تھا دانش غیر محسوس انداز سے اس کے سیکرٹری کے فرائض انجام دے رہا تھا یہی وجہ تھی کہ آج تک اس نے اپنی ظاہری خوبصورتی کو ہی استعمال کیا تھا داغی استعمال کا تو بھی اسے موقع ہی نہ ملا یقیناً ”کوئی ایسا پر خلوص دوست چاہیے تھا جو اس میں اس کی رہنمائی کر سکتا۔ آخر کار بہت کوشش کے بعد اسے ایک ٹیلی فلم میں کام تو ملا لیکن اسے جلد ہی یہ اندازہ ہو گیا کہ بیوی اس کی منزل نہیں ہے کیونکہ وہ تو دانش کی شیدائی تھی جبکہ بیوی میں اداکاری دیکھی جاتی ہے جو شاید اس کے بس کی بات نہ تھی لاکھ کوشش کے باوجود وہ اپنے چہرے کے تاثرات کو سین کے مطابق ڈھالنے میں کامیاب نہ ہو سکتی تھی یہی وجہ تھی کہ ایک ڈرامے کے بعد اس کا دل بیوی سے مکمل طور پر اچھا ہو گیا اور ایسے ہی بے زار ترین دنوں میں اسے راجہ نے ایک انوکھا مشورہ دیا۔

”تم اپنے ڈانسنسز کی ایک برائیوٹ سی ڈی کیوں تیار کر کے ریلیز کرواؤ؟“
شام سے ہی راجہ اس کے فلیٹ پر تھا ابھی ابھی کے ایف سی کا نمائندہ ان کی مطلوبہ ڈبل پہنچا کر گیا تھا وہ راجہ کے پہلو میں بیٹھی اپنا پسندیدہ مشروب پینے میں مشغول تھی راجہ کا دیا ہوا مشورہ اسے ایک پل کو حیران کر گیا۔
”جانتے ہو سی ڈی کی تیاری اور ریلیز کے لیے کتنا پیسہ چاہیے۔ اور جی یہ ہے کہ میرے پاس اگر پیسہ ہوتا تو میں اپنی ایک ذاتی فلم نہ بنا لیتی۔“

”خیر فلم میں تو زیادہ سرمایہ درکار ہے اس کام میں اتنی رقم کی ضرورت نہیں پڑتی اگر تم تیار ہو تو اس سلسلے میں میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔“ راجہ نے اسے نیم رضامند دیکھ کر اپنی خدمات پیش کیں اس کا کوئی ایسا جاننے والا تو تھا نہیں جس سے مشورہ کرنے کی ضرورت پیش آئی لہذا تھوڑے سے پس و پیش کے بعد خود ہی آمادہ ہو گئی۔

اور پھر جلد ہی اس کے رقص کی برائیوٹ سی ڈی تیار ہو کر مارکیٹ میں آگئی اور اس سی ڈی کی تیاری اور پھر مارکیٹ میں اس کا تعارف اس قدر مشکل اور تھکا دینے والا مرحلہ تھا کہ دل ربا نے دوبارہ ایسی غلطی نہ کرنے کا پکا فیصلہ کر لیا وہ سری طرف دانش نے اپنے پیس کی بالکل بھی پیروی نہ کی اور جلد ہی اسے کورٹ سے خلع حاصل ہو گئی راجہ بشارت اپنے قیمتی وقت کی قیمت اس کی قربت سے حاصل کر کے کنارہ کش ہو چکا تھا لیکن اب دل ربا اس ماحول کی عادی ہو چکی تھی وہ جان چکی تھی کہ کچھ حاصل کرنے کے لیے سب کچھ کھونا پڑتا ہے پھر کامیابی حاصل ہوتی ہے لیکن اصل مشکل تو یہ تھی کہ جو کامیابی وہ چاہتی تھی اس تک پہنچنے کے لیے اسے کوئی راستہ نہ مل رہا تھا اور اس وقت جب وہ شہرت کی بلندیوں کی جستجو میں غلاطی کی دلدل میں دھنستی جا رہی تھی ایک بار پھر قسمت نے اس پر یوری کی اور اس کی ملاقات مہر علی سے ہو گئی۔

”میدم ایک کلاسیکل فلم ہے اگر آپ کام کرنا چاہیں تو میں کوشش کروں۔“ سہیل باجوہ کو اس نے حال ہی میں اپنے سیکرٹری کے طور پر اپائنٹ کیا تھا اس سے قبل وہ ایک مشہور فلمی اداکار کے ساتھ ہوتا تھا جس کی شادی نے باجوہ کو مکمل طور پر فارغ کر دیا تھا۔

”کس کی فلم ہے؟“ اس نے اپنے ناخن فائل کرتے ہوئے بڑی بے نیازی سے دریافت کیا۔

”مہر علی شاید کوئی نیا پروڈیو سر ہے آپ نہیں جانتیں۔“

مہر علی کا نام سنتے ہی دل ربا کے ذہن کے پردہ اسکرین پر مسکراتی آنکھوں والا ایک نوجوان آگیا جس سے ہونے والی کئی ماہ قبل کی ملاقات وہ آج تک نہ بھولی تھی۔

”تم ایڈوکیٹ مرعلیٰ کی بات تو نہیں کر رہے۔“ بے یقینی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

”وہ مرعلیٰ جو شاید مشہور ڈیر انفر شعلزل کا بھی دوست ہے۔“

”ہو سکتا ہے کہ وہی ہو آپ جانتی ہیں اسے؟“ باجوہ نے سوالیہ انداز سے اس کی جانب دیکھا۔

”ہوں۔ ہو سکے تو میری اس سے ایک ملاقات کرواد مجھے یقین ہے وہ بھی مجھے اچھی طرح جانتا ہوگا۔“ اسے یقین تھا کہ مرعلیٰ اسے نہ بھولا ہوگا اور اپنے اس ہی یقین کو جانچنے کے لیے وہ مرعلیٰ سے ملنا چاہتی تھی اور پھر سہیل کی کوششوں کی بدولت اس کی یہ خواہش جلد ہی پوری ہوگئی مرعلیٰ سے ہونے والی ملاقات نے اسے یقین دلا دیا کہ اس سے ملنا مرعلیٰ کی بھی ایک ایسی خواہش تھی جو یقیناً ”باجوہ کے ذریعے پوری ہوگئی تھی۔“

کلاسیکل فلم بنانے کا آئیڈیا فیض محمد کا تھا جس کا سرمایہ مرعلیٰ نے فراہم کیا لیکن ان ہی دنوں اچانک فیض محمد کو اپنے کسی کام سے ابرو ڈھاننا پڑ گیا جس کی بنا پر فلم میکنگ کا یہ منصوبہ التوا کا شکار ہو گیا لیکن اس فلم کے ذریعے مرعلیٰ اور دل ربا ایک دوسرے کے قریب آگئے۔ دل ربا کو آج تک سالوں بعد ایک حقیقی دوست کا ساتھ میسر آیا مرعلیٰ اس کا ایک ایسا دوست تھا جسے اس کے جسم سے کوئی غرض نہ تھی اس کے نزدیک دل ربا آج بھی ایک دیوی کی حیثیت رکھتی تھی جس کی صرف ہوجا کی جاسکتی ہو سچ تو یہ ہے کہ مرعلیٰ عام مردوں سے ہٹ کر ایک قدرے پر خلوص مرد تھا دل ربا کے تمام حالات جان کر اسے اس لڑکی پر بہت افسوس ہوتا جس نے شوہر کی جھلملائی روشنیوں کے تعاقب میں خود کو اندھیروں کی نذر کر دیا یہ جانے بغیر کہ یہ چکاچوند پر ایک کافعی نہیں ہوتی اور اب وہ اتنا سفر طے کر چکی تھی کہ واپسی کے راستے مسدود ہو گئے تھے جلد ہی باجوہ کے مشورے پر لاہور منتقل ہو گئی۔ وائس سے طلاق کے بعد وہ اپنے موبائل کے سم تبدیل کر چکی تھی اور اس تمام عرصے میں اس نے اپنے گھر والوں سے بالکل بھی رابطہ نہ کیا جانے کیوں اسے کبھی یہ احساس شدت سے ہوتا کہ اسے اس مقام تک پہنچانے میں زیادہ کردار اس کے پاس باپ کا ہے جن کی لا پرواہی کے سبب وہ گھر سے ہٹ کر اور کھوٹے کی پہچان بھول کر ان راہوں کی مسافر ہو گئی جہاں کوئی کسی کا نہیں ہوتا سب اپنی غرض کے بندے ہوتے ہیں نہایت مایوسی کے عالم میں اسے شدت کے ساتھ یہ احساس گھیر لیتا کہ اگر آج اس سے بے جالا ڈھار نہ کیا گیا ہو تاو شاید وہ بھی سمن سمین اور آرنو کی طرح گھریلو زندگی گزار رہی ہوتی لیکن اس پر مایوسی اور خود شکستگی کی یہ بیلخار کچھ ہی دیر کے لیے ہوتی پھر وہ جلد ہی ان تمام خیالوں کو اپنے ذہن سے جھٹک کر خود کو اپنی موجودہ زندگی کی ریگینوں میں گم کر گئی کیونکہ اب یہ ہی اس کا اصل تھا باقی سب تو بہت پیچھے رہ گیا تھا اور پیچھے پلٹ کر دیکھنا اسے پسند نہ تھا۔

اس دن وہ اپنا پرانا پنڈ بیگ چیک کر رہی تھی کہ اچانک اسے اپنی پرانی اسم مل گئی جانے کیا سوچ کر اس نے وہ سم موبائل میں لگای وہاں سمن کا ایک سے مسج موجود تھا جو جانے کب کا تھا۔

”سما بہت بیمار ہیں اگر ہو سکے تو ایک بار آکر مل جاؤ۔“ مسج بے شک پرانا تھا لیکن پھر بھی بڑھ کر وہ نہ سکی اور پہلی ہی فلائیٹ سے کراچی آگئی ایئر پورٹ سے اسے مرعلیٰ نے ریسیو کیا اور اپنے فلیٹ پر لے آیا۔ تقریباً ایک گھنٹے بعد فریش ہو کر وہ مرعلیٰ کی گاڑی اور ڈرائیور کے ہمراہ آسمانہ گل پہنچی جہاں گیٹ پر ہی اس کے مڈ بھڑارم سے ہو گئی جن کے ساتھ غالباً ”ولید تھا آٹھ نو سالہ ولید ایک خوبصورت نوجوان میں تبدیل ہو چکا تھا جانے کیوں اس کا دل چاہا وہ ولید کو گلے لگا کر ہار کرے لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ تقریباً ”نا ممکن ہے کیونکہ ارم کے ساتھ ساتھ ولید کی آنکھوں میں بھی وہ اپنے لیے اجنبیت اور سرد مہری دیکھ چکی تھی ارم اس کے پاس سے ایسے گزریں جیسے دیکھا ہی نہ ہو وہ بھی نہایت خاموشی سے سیرتھیں چڑھ کر اوپر شہر پار کے فلور میں آگئی۔

سامنے ہی سمن بیٹھی جانے شہر پار سے کیا باتیں کر رہی تھی کہ یکدم ہی اس کی نگاہ روانہ اسے پرکھڑی دل ربا

پر پڑی جو آج بھی اتنی ہی خوبصورت تھی جتنی اس گھر سے جاتے ہوئے ہوتے ہیں کچھ ایسے لوگ جن پر زمانے کے سرد گرم اسے اثرات مرتب نہیں کرتے۔ سمن نے دل ہی دل میں اس کی خوبصورتی کو سراہتے ہوئے اپنی کرسی خالی کر دی لیکن وہ بیڈ پر شہر پار کے قریب ہی بیٹھ گئی شہر پار کو جانے کیا ہوا اسے دیکھ کر خود پر ضبط نہ کر سکی اور دریا کو گلے لگاتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی دریا نے بڑی مشکل سے اسے خود سے دور کیا اور قریب رکھا پانی کا گلاس اٹھا کر اس کے منہ سے لگایا پانی پلا کر نٹھو سے اس کا منہ صاف کیا اور نیکی سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا اتنی دیر میں سمن اس کے لیے جس کا گلاس لے آئی اور بنا کچھ کے خاموشی سے اس کے سامنے رکھی ٹیبل پر دھر دیا۔

”پی اب جاتی ہوں شانزل جاگ گیا تو بہت روئے گا۔“ اس نے دریا کی طرف ایک نظر ڈالنا بھی گوارہ نہ کیا بات کرنا تو دریا کی بات تھی۔ دریا بھی مکمل طور پر اسے نظر انداز کر کے شہر پار کی طرف ہی متوجہ تھی کہ یکدم ہی دروازہ کھول کر کوئی اندر داخل ہوا۔

”کتنی دفعہ کہا ہے نیچے آؤ تو اسے۔“

باقی الفاظ اس کے منہ میں ہی رہ گئے ایک دم ہی اس کی نگاہ دریا پر پڑی دریا نے پلٹ کر دیکھا شاہد ویز کی نگاہوں میں اپنے لیے موجود واضح نفرت اسے قدرے فاصلے سے بھی دکھائی دے رہی تھی۔

”چلو اوپر تم۔“ دریا پر ایک نظر ڈالتے ہوئے اس نے اپنی گود میں موجود بے حد خوبصورت بچہ جو تقریباً ”ایک سال کا تھا سمن کی گود میں ڈالا اور واپس پلٹ گیا سمن بھی اس کے پیچھے ہی نکل گئی اب کمرے میں ہر طرف خاموشی کا راج تھا سوائے سانسوں کی آواز کے جو شہر پار اور دریا کی تھیں اور جانے کیوں پندرہ منٹ شہر پار کے ساتھ گزار کر جب وہ واپس آئی تو سارے راستہ اس کی نگاہوں میں وہ رہ کر گلے گوتھنے سے شانزل کا چہرہ ہی آتا رہا اور شاید وہ پہلی رات تھی جس دن وہ کئی سالوں بعد اپنے گھر والوں کی یاد میں ٹوٹ کر روئی آج اسے سب کچھ بہت یاد آیا یہاں تک کہ آج پہلی بار اس نے اپنی کھوئی ہوئی عصمت اور عزت کو بھی یاد کر کے آنسو بہائے تھے۔

اسٹوڈیو میں جو ایک دو فلمیں زیر تکمیل تھیں مکمل ہو گئیں اب اسٹوڈیو پر مکمل طور سے سناٹا طاری ہو گیا۔ باجوہ اپنے بھائی کے پاس دو بی بی چلا گیا تھا دل ربا مختلف پروڈیوسرز کے پاس چکر لگانے لگی ایسا ہی ایک دن تھا جب وہ اسٹوڈیو کی لابی میں بیٹھی ملک حیات سے ملاقات کا انتظار کر رہی تھی کہ اچانک ہی وہاں میڈم روبی آگئی میڈم روبی ان چند لوگوں میں سے تھی جو خود کو دنیا کے ساتھ بھانے کا فن جانتے ہیں وہ اپنے وقت کی ایک کامیاب اداکارہ تھی اور اب نا صرف اسٹیج کی کامیاب اداکارہ بلکہ پروڈیوسر بھی تھی فلموں کی گرتی ہوئی سہاک نے روبی جیسے لوگوں پر کوئی اثر نہ ڈالا تھا اس کے ٹھاٹھ بات ابھی بھی اتنے ہی شاہانہ تھے ایک نئی فلمی اداکارہ کے طور پر وہ دل ربا کو پہچانتی تھی۔

”کیا بات ہے دل ربا یہاں کیوں بیٹھی ہو۔“ چلتے چلتے اچانک ہی اس کی نگاہ دل ربا پر پڑی اور اس نے اپنے بڑے سے کالے چشمہ کی اوٹ سے اسے جھانکا۔

”کچھ نہیں ملک صاحب سے ملنے آئی تھی۔“ اس نے اندر موجود پروڈیوسر کا نام لیا۔

”یہ تم کیا ملک صاحب کے چکرلوں میں پڑ گئی ہو جانتی تو ہو کہ آج محل فلموں کا دور ختم ہو گیا ہے اب کوئی بھی خصل مند سرمایہ دار فلموں پر اپنی رقم نہیں ڈالتا چھوٹو فلم کا چکر میرے ساتھ آجاؤ میں تمہیں اسٹیج کی ملکہ بناؤں گی دیکھنا دولت اور شہرت دونوں تمہارے قدم چومیں گی اب تو اسٹیج کا دور ہے چھوڑو ان فلموں کے چکر کو۔

یہ میرا کارڈ رکھ لو اگر آنا چاہو تو مجھ سے رابطہ کر لیتا اس نے اپنی ساڑی کے پلو کو بڑی نزاکت سے جھٹک دیا اور

تیزی سے آگے بڑھ گئی وہ تو اپنی آفریے کر جا چکی تھی اب فیصلہ دل ربا کو کرنا تھا۔ اور اب اس کے فیصلے عام طور پر مرعلی سے مشورے کے بعد ہوتے تھے آج بھی ایسا ہی ہوا گھر اگر اس نے مرعلی کو فون کیا تو اس کا موبائل آف تھا گھر کے نمبر سے پتا چلا کہ وہ گاؤں گیا ہوا ہے۔ ایک ہفتے تک مرعلی سے رابطہ نہ ہو سکا اب وہ مایوس ہو گئی مایوس کن حالت میں گھر کر اس نے میڈم ربی سے رابطہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

میں سے اس پر کامیابیوں کا ایک نیا دروا ہوا اپنے ہیجان خیز رقص کی بدولت وہ تماشاویوں کے دلوں پر راج کرنے لگی اس کا رقص لوگوں کو اپنے سحر میں جکڑ لیتا اسے بھی اس کام میں لطف آنے لگا اس کے دن سوتے اور راتیں جاگتی تھیں میڈم اسے ایک معقول معاوضہ دیتی اپنے وقت کو رٹکلیں بنانے کے لیے اس کے آس پاس کئی پروانے منزل لانے لگے تھے ان دنوں وہ مرعلی کو مکمل طور پر فراموش کر چکی تھی وہ حالت مایوسی سے نکل گئی تھی اب ایک اور منزل اسے اپنے سامنے دکھائی دے رہی تھی۔ اور اس منزل تک پہنچنے کا ایک ہی راستہ تھا، باقر درانی جو تا صرف ایک بہت بڑا زمین دار بلکہ اعلیٰ حکومتی عہدیدار بھی تھا۔

باقر درانی سے دل ربانے خوب فائدہ اٹھایا باقر نے بھی دل کھول کر اس پر رقم خرچ کی۔

ان دنوں بھی وہ باقر کے ساتھ مری آئی ہوئی تھی جہاں سخت سردی میں اسے مال روڈ پر واک کرنا اچھا لگتا وہ دن بھور بن ہی سی میں گزارنے کے بعد وہ مری میں باقر کے کالج میں قیام پذیر بھی اس شام پرف بارے کے بعد ایک دم ہی سردی بڑھ گئی تھی وہ فر کا کوٹ پہنے سر پر مفلر لیے باقر کے ساتھ مال روڈ پر گھوم رہی تھی جب اپنے عقب میں سنائی دینے والی آواز نے لمحہ بھر کو اسے ساکت کر دیا۔

”منع کیا تھا تمہیں کہ باہر بہت سردی ہے بیمار بن جاؤ گی لیکن تمہاری سمجھ میں کوئی بات آئے تب تا چلو اب جلدی واپس چلو۔“ یقیناً ”یہ آواز زوار کی تھی وہ مرکز دیکھنے کی ہمت نہ کر سکی اسے لیکن تھا کہ آج اگر اس نے مرکز دیکھ لیا تو ساری زندگی پھر کی بن کر گزار دے گی اس کے دل میں ایک تیز درد کی لہر اٹھی جس نے اس کے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا پیچھے آنے والے اس کے قریب سے گزر کر آگے بڑھ گئے تھے اس نے نہایت حسرت سے دیکھا زوار کے ساتھ آرزو تھی جس کی گود میں ایک بچہ بھی تھا وہ دونوں نہایت خوش و خرم تھے ایک دوسرے کو پانے کا احساس تا صرف ان کی آواز بلکہ چال سے بھی جھلک رہا تھا سب ہی ایک مکمل زندگی گزار رہے تھے ہستی تھیلی زندگی اور وہ خود کماں کھڑی تھی۔ انجانے میں ہی اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔

”یہ شال دیکھو کیسی ہے؟“ باقر درانی نے بے حد خوبصورت پنک شال اس کے کندھوں پر ڈالتے ہوئے نہایت پیار سے پوچھا۔

”اچھی ہے۔“ اس کی دھیمی آواز آنسوؤں سے رندھی ہوئی تھی۔

”کیا ہوا تمہیں۔“ باقر علی سخت حیران تھا۔

”میری ایک بات مانو گے۔“ اسے جانے کیا ہوا ایک دم ہی باقر علی کے دونوں ہاتھ تھام کر بولی۔

”مجھ سے شادی کر لو بے شک مجھے اپنے گھر نہ لے کر جاؤ لیکن جانو میں کبھی تم سے کچھ نہ مانگوں گی بلکہ تم صرف مجھ سے شادی کر لو۔“ وہ رو دینے کو تھی۔

”ٹھیک ہے آپ پہلے کالج چلیں پھر وہاں بات کریں گے۔“ باقر علی اس کی بکھری ہوئی حالت دیکھ کر پریشان ہوا تھا اور بڑی مشکل سے اسے ہلکا ہلکا گھر تک لایا وہ ساری رات اس نے تڑپ تڑپ کر رو کر گزار دی درانی نے اسے ہلانے کی ہر ممکن کوشش کی مگر حاصل وہ نہ ہو سکا جب وہ جاگئی تو رات والے کمزور لمحہ کی گرفت سے نکل چکی تھی شاور لینے کے بعد خاموشی سے اس نے اپنا سامان بیک کرنا شروع کر دیا درانی بیڈ کے کراؤں سے ٹیک لگائے سگریٹ کے کش لگا تا بڑی خاموشی سے اس کی ساری کارروائی دیکھ رہا تھا۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ بالا خراس سے رہا نہ گیا سگریٹ کی راگھ ایش ٹرے میں جھاڑتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

”لاہور۔“

”مجھے تم لاہور کیسے جاسکتی ہو جانتی ہو تمہاری مجھ سے ایک ہفتے کی کٹ منٹ ہے جبکہ ابھی صرف تین دن۔“

”پہلے سارے پیسے مجھ سے واپس لے لیتا لیکن تم اچھی طرح جانتے ہو کہ جب میں کوئی فیصلہ کر لوں تو واپس نہیں ہوتی مجھے آج اگر لاہور جانا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آج ہی، آج سے کل ہونا میرے لیے ناممکن ہے۔“ وہ تیزی سے بیک زب بند کرتے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے چلی جانا میں تمہیں نہیں روک رہا لیکن پہلے کچھ کھا تو لو۔“ درانی نے بڑے پیار سے اسے کندھے سے تھامتے ہوئے کہا اور دل ربا کو ہمیشہ سے درانی کی یہی عادت پسند تھی وہ زبردستی کرنے کا قائل نہ تھا اور پھر رات ہونے سے قبل وہ لاہور واپس آگئی کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھی کہ مری میں اس کا دوبارہ سامنا آرزو یا زوار سے ہو وہ خود میں ان سے سامنا کرنے کی ہمت نہ پاتی تھی۔

الحرم میں لگا اس کا ڈرامہ ”گمراہ شاہ“ بہت ہی کامیاب جا رہا تھا اس کے ہوشیار قص نے تماشاویوں کے دل لوٹ لیے تھے میڈم ربی اس سے بہت خوش تھیں تقریباً ”وس دن کی مصروفیات کے بعد آج اس ڈرامہ کا وقفہ تھا دل ربا بہت تھک چکی تھی سارا دن ہی بے خبر سو کر گزار دیا جانے کب شام ہوئی کچھ پتا ہی نہ چلا آنکھ کھلی تو کمرے میں مکمل طور سے اندھیرا طاری تھا اور اس اندھیرے میں سیل فون کی آواز ایک عجیب سی سال پیش کر رہی تھی جو جانے کب سے بج رہا تھا۔

اس نے جب سے اسٹیج ڈراموں میں کام شروع کیا تھا مرعلی نے اس سے رابطہ ہی نہ رکھا تھا شروع میں تو ایک دوبارہ فون کر کے اس نے دل ربا کو منع بھی کرنے کی کوشش کی لیکن جب وہ باز نہ آئی تو وہ خاموشی سے کنارہ کش ہو گیا بغیر دیکھے ہی اس نے فون اٹھا کر کان سے لگا لیا۔

”ہیلو۔“

”کہاں غائب ہو کب سے فون کر رہا ہوں۔“ دوسری جانب درانی تھا۔

مری سے واپسی کے بعد آج کئی دن کے بعد اس کا فون آیا تھا۔

”جی سوری تھی۔“ اس نے مختصر سا جواب دیا ابھی تک وہ اس رات کے اپنے جذباتی بن پر شرمندگی محسوس کر رہی تھی جانے درانی میرے بارے میں کیا سوچتا ہو گا یہ خیال اکثر ہی اسے جی بھر کر شرمندہ کرنا۔

”مجھ سے شادی کر لو۔“ درانی کا سوال اتنا اچانک تھا کہ وہ ایک سیکنڈ کے لیے شاکندہ رہ گئی۔

”یقیناً مجھ سے مذاق کر رہا ہے۔“ اس سوچ نے اسے مزید شرمندہ کیا۔

”نہیں درانی اس رات میں۔“

”کوئی وضاحت نہیں صرف ہاں یا نہ جلدی بولو میں ایک گھنٹے تک تمہارے پاس پہنچ رہا ہوں لیکن صرف اس صورت میں جب تمہارا جواب ہاں میں ہو۔“ وہ اس کی بات کاٹ کر تیزی سے بولا۔

”ٹھیک ہے آج آؤ۔“ اسے صرف ایک پل لگا اور فیصلہ ہو گیا اور اسی رات اپنے وعدے کے مطابق درانی نے اس سے نکاح کر لیا بے شک یہ ایک مکمل طور پر خفیہ شادی تھی لیکن اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا باقر درانی نے اس رات کی اس کی جذباتی کیفیت کو نظر انداز نہیں کیا بلکہ اس کی بات کو اہمیت دے کر اسے ”مسز باقر درانی“ کا اعزاز بخشا۔

باقراچاہتا تھا کہ وہ اب ڈراموں میں کام نہ کرے لیکن چونکہ اس نے کچھ ڈراموں کا ایڈوانس لے کر ایگریمینٹ سائن کر رکھے تھے اس لیے ان میں کام کرنا ضروری تھا اور ویسے بھی میڈم ربی نے جس طرح اس کا ساتھ دیا تھا اس کے لیے لازم تھا کہ وہ بھی ایک حد تک اس کا ساتھ دے اور آہستہ آہستہ ڈرامے چھوڑے باقرا سے اپنے ساتھ لے کر رہی مومن منانے بنکالے گیا جہاں سے واپس آئے ہی باقر نے اسے ایک پوشا پرے میں فریشنگ فلیٹ خرید کر دیا اس فلیٹ کے تمام ضروری کاغذات اس کے حوالے کرتے ہوئے باقر کی صرف ایک ہی شرط تھی کہ اس فلیٹ میں باقر کے علاوہ کوئی دوسرا شخص دل رہا سے ملنے نہ آئے اور اس وقت جو دل رہا کی کیفیت تھی اس کے سبب اس کے پاس کسی بھی بات سے انکار کی گنجائش ہی نہ تھی یہی وجہ تھی کہ اس نے باقر کی اس شرط کو دل کی گہرائیوں سے تسلیم کیا ویسے بھی باقر کے ساتھ نے اسے بہت خوشی بخشی تھی۔

کچھ عرصہ بعد ہی زندگی پرانے ڈگری پر واپس آگئی پرانے ڈرامے ختم ہونے سے قبل ہی اس نے مزید نئے ڈرامے سائن کر لیے وہ جوتے ہیں کہ چھٹی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی تو دل رہا اس کی عملی تفسیر تھی ہر بار وہ دل میں تہہ کرتی کہ یہ اس کا آخری ڈرامہ ہے بس ایک آخری بار لیکن جلد ہی اپنا عہد توڑ کر نیا ڈرامہ سائن کر لیتی۔

شروع شروع کے جوش کے بعد درانی کا جذبہ محبت بھی کافی حد تک ماند پڑ چکا تھا اس کی بیٹی کی منگنی ہو چکی تھی اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کی بیٹی کے سسرال تنگ کوئی ایسی خبر پہنچے جس کا اثر اس کی بیٹی کی آئندہ زندگی پر پڑے یہ ہی وجہ تھی کہ دل رہا سے ملنے میں وہ مزید محتاط ہو چکا تھا پھر آہستہ آہستہ اس نے دل رہا کو اس کے حال پر چھوڑ دیا اس کے شروع دنوں والا المانہ پن تقریباً ختم ہو چکا تھا شاید اس طرح کی غلطیاں درانی جیسے مردوں کی زندگی کا حصہ تھیں جنہیں کر کے بھول جانا ان کی فطرت میں شامل تھا اب دل رہا صرف اس کی ضرورت بن کر رہ گئی تھی اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے باقر نے ایک فلیٹ کے عوض اس کی زندگی کو گروی رکھ لیا ہر اور اسی سوچ نے ایک دفعہ پھر اس کے دل میں بغاوت کے جذبے کو ابھار دیا یہی وجہ تھی کہ جب کئی دنوں بعد باقر کو اس کی یاد آئی تو وہ سلگ ہی اٹھی وہ چاہتی تھی کہ جس طرح وہ اس کی دوری میں تڑپتی ہے باقر بھی تڑپے اور اس کی اسی سوچ کی بنا پر وہ سب کچھ ہو گیا جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہ کیا تھا۔

رات ہی باقر کا فون آیا تھا وہ تقریباً "دون بعد لاہور اس سے ملنے آئے والا تھا اس کے فون نے دل رہا کو کوئی دلی مسرت نہ دی اور پھر اپنے ڈرامے کی مصروفیات میں وہ باقر کی آمد یکسر فراموش کر بیٹھی۔

"اب آپ ملاقات کا شرف کب بخشیں گی۔" گاڑی سے باہر نکلتے نکلتے حیدر کا سوال سن کر رک گئی اور ایک ادا سے اس کی جانب پلٹ کر دیکھا۔

"جب آپ چاہیں۔"

ہم تو چاہیں گے کہ آج کی ملاقات ہی کبھی ختم نہ ہو۔" وہ ہنس کر بولا۔ وہ جاتے جاتے رک گئی۔

"سوچ لیں حیدر صاحب اگر آپ کی بیوی کو پتا چل گیا تو جانتے ہیں تاکیا ہو گا۔" نکلتے ہی اس میں اس کو وارن کرتی وہ داخلی گیٹ کی جانب بڑھ گئی جبکہ حیدر اس وقت تک کھڑا اسے دیکھتا رہا جب تک داخلی گیٹ سے اندر داخل ہو کر اس نے الوداعی ہاتھ نہ ہلا یا یا رنگ عبور کر کے وہ بیڑھیوں کی جانب بڑھی تو اسے یک دم ہی باقر یاد آ گیا۔

"آج جب نور محمد نے واپس جا کر میرے نہ آنے کی اطلاع دی ہوگی تو کس قدر تڑپا ہو گا۔" یہ تصور ہی دل رہا

کے لیے برا خوش کن تھا باقر کی بے چینی کے تصور ہی نے اسے سرشار کر دیا۔ بڑی ترنگ سے اس نے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھولا اور پرس جھلاتی اندر داخل ہوئی تو سامنے صوفے پر بیٹھے باقر کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ باقر تمام احتیاط ہالائے طاق رکھ کر اس کے فلیٹ تک آجائے گا اس نے ایک نظر باقر کی جانب دیکھا جو بلوریں گلاس ہاتھ میں لیے گھونٹ گھونٹ تلخ مشروب اپنے قلع سے نیچے اتار رہا تھا سامنے رکھی بول تقریباً "خالی ہو چکی تھی۔

"اس کا مطلب ہے یہ کافی دیر سے آیا بیٹھا ہے۔" وہ دل ہی دل میں سوچتی اسے یکسر نظر انداز کرتی اندر کر کے کی جانب بڑھی۔

"کہاں سے آ رہی ہو؟" باقر کی سخت آواز نے اس کے پڑھتے قدم روک دیے۔

"تم سے مطلب۔" وہ سخت چڑی ہوئی تھی یہی وجہ تھی کہ باقر کا استحقاق جتنا اسے ذرا اچھا نہ لگا۔

"بٹھ سے مطلب نہیں، تو پھر کس سے مطلب ہو گا؟" صوفے پر ہی بیٹھے بیٹھے وہ اس کا بھرپور جائزہ لیتا ہوا بولا۔

"اور یہ کون تھا جس کے ساتھ تم اتنی رات کو آئی ہو۔" اس کا اشارہ یقیناً "حیدر کی جانب تھا۔

"میرا دوست۔" جواب دے کر اس نے اندر کی جانب بڑھنا چاہا، لیکن ایک دم ہی باقر اس کے سامنے آ گیا۔

"تمہیں پتا تھا آج میں نے اتنا ہے پھر کیوں گئیں کسی اور کے ساتھ ہاں بولو جواب دیوں گئیں؟" وہ اس کے بازو کو سختی سے تھام کر بولا۔

"میں تمہاری غلام نہیں ہوں باقر کہ جب تمہارا دل چاہے تم میرے پاس آؤ یہ جانے بغیر کہ میرا دل کیا چاہتا ہے میں جوں رات تمہاری آگ میں سلتی رہتی ہوں تمہیں احساس ہے اس بات کا تم سے نکاح کر کے تو میں اور اکیلی ہو گئی ہوں۔" وہ غصے کی شدت سے پھٹ ہی پڑی اور چلا کر بولی۔

"یہ تم اکیلے ہو ابھی تو اسے کسی یار کے ساتھ عیاشی کر کے آئی ہو۔" اپنی عادت کے برخلاف وہ تیز آواز میں چیخا اس کی بڑھتی ہوئی طلب غصے کی شکل میں ظاہر ہو رہی تھی۔

"تو اس مت کرو تم اچھی طرح جانتے ہو میں اس طرح کے انداز گفتگو کی عادی نہیں ہوں۔" جواباً وہ بھی دھاڑی۔

"چھٹیک ہے نہیں کیوں اس کرتا۔ چلو شاپاش اندر آؤ تم جانتی ہو میں تمہارے پاس اپنے سارے غم بھولنے آتا ہوں اسی لیے چاہتا ہوں کہ جب میں آؤں تو تم صرف میرے لیے ہو صرف میرے لیے۔" وہ اس کی کمرے کے گرد بازو حائل کرتا قدرے نرم لہجے میں بولا لیکن جانے کیوں دل رہا کا دل اس کی قربت کے تصور سے ہی متلائے لگایا شاید وہ تھکن سے نڈھال ہونے کے سبب باقر کی ضرورت پوری کرنے کی ہمت خود میں نہ پا رہی تھی۔ اسے باقر کی ایک ماہ کی غیر حاضری پر بھی غصہ تھا اس نے دل ہی دل میں یہ عہد کر رکھا تھا کہ باقر کو ایک دفعہ کم از کم انکار ضرور کرے گی تاکہ اسے احساس ہو کہ ضرورت پوری نہ ہونا کس قدر تکلیف دہ امر ہوتا ہے۔

"تمہیں اپنی ضرورت کا تو بہت احساس ہے کبھی میری ضرورت کا سوچا ہے تم نے؟ پناہ بند کر کے میری تمام ضروریات سے پرہیز پوٹی اختیار کر رکھی ہے۔"

"ہر مرد ایسا ہی ہوتا ہے عورت کو اس کا انتظار کرنا پڑتا ہے کب مرد اسے بلائے اور دیکھ لو آج میں صرف تمہارے لیے سب کچھ چھوڑ کر آیا ہوں اب یہ دونوں میں صرف اور صرف تمہارا ہوں۔" وہ اسے کمرے کی جانب لے جاتا ہوا بولا۔

سنتے ہی شہر پار پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی۔
”میری پتی جانے کس حال میں ہوگی تمہا، بالکل اکیلی۔“ روتے روتے اچانک ہی اس نے سمرن کے ہاتھ تھام لیے۔

”خدا کے لیے سمرن مجھے اس کے پاس لے چلو میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔“
”ہیں۔۔۔“ سمرن گھبرا اٹھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ گھر کا کوئی بھی فرد اسے اکیلے شہر پارا کے ساتھ لاہور نہ جانے دے گا ویسے بھی اس نے خود بھی کبھی اتنا سفر اکیلے طے نہ کیا تھا۔
”آپ جانتی ہیں مجھے شاہدیز بھی نہیں جانے دیں گے۔“
”شاہدیز سے میں خود بات کر لوں گی بس تمہاں کرو۔“ وہ منت بھرے لہجے میں بولی۔
”ٹھیک ہے آپ بات کر کے دیکھ لیں۔“ اور پھر اس کا خدشہ درست ثابت ہوا شاہدیز ساری بات سنتے ہی بھڑک اٹھا۔

”سمرن ٹوکیا گھر کا کوئی فرد بھی اسے دیکھنے لاہور نہیں جائے گا۔“ اس نے حتمی انداز میں اپنا فیصلہ سنایا۔
”بیمار کی عیادت عین ثواب ہے وہ جیسی بھی بری سہی، تھی تو ہمارا خون سمرن تم تیار کر دے شہر پارا کے ساتھ جانے کی میں ابھی تم دونوں کے ٹکٹ منگوا دیتا ہوں بلکہ میرا خیال ہے کہ شاہدیز تم بھی ان کے ساتھ چلے جاؤ۔“
نایا جی کے فیصلے نے پل بھر کو سب ہی کو حیران کر دیا اور شاہدیز جس نے اپنے گھر کے کسی بھی فرد کو کبھی دریہ سے ہمدردی کرتے نہ دیکھا تھا اپنے باپ کی بات سن کر ساکت ہی رہ گیا۔
”دیکھو بیٹا ہم کون ہوتے ہیں کسی کے گناہ پر اسے سزا دینے والے، سزا اور جزا کا اختیار تو صرف اس کو ہے جو سب کا خالق و مالک ہے۔“ وہ اٹھ کر شاہدیز کے قریب آگئے اور بڑی شفقت سے اس کے دائیں کندھے پر اپنا ہاتھ رکھا۔

”تمہاری نفرت، بجا سہی لیکن یہ یاد رکھو جب اللہ اپنے بندوں کے بڑے سے بڑے گناہ معاف کر دیتا ہے تو پھر ہمیں بھی دلوں میں بغض اور کینہ نہ رکھنے سے پرہیز کرنا چاہیے وہ اچھی ہے یا بری اس بات کا فیصلہ کرنا ہمارا تمہارا کام نہیں ہے۔“
اور اب شاہدیز کے پاس انکار کی محجائش بالکل نہ تھی رات ہی ان کے ٹکٹ آگئے اگلے دن صبح آٹھ بجے کی ان کی فلائیٹ تھی اسپتال کا نام اخبار میں درج تھا جسے سمرن نے نوٹ کر لیا اور اگلے ہی دن وہ تینوں اس اسپتال پہنچ گئے جمال دریہ ایڈمٹ تھی۔



باقدر رانی شدید بچھتاوے کا شکار تھا۔ وہ اپنے حلقہ سے صوبائی اسمبلی کا الیکشن لڑ رہا تھا جبکہ اس کی بیٹی کی شادی بھی طے ہو چکی تھی ایسی حالت میں اس طرح کا سنگین اسکیڈل نا صرف اس کے سیاسی بلکہ خاندانی کیریئر کو بھی جیاں بکھیر دیتا۔ اس اسکیڈل کو بننے سے پہلے ختم کر دینا ضروری تھا ورنہ صرف اس وقت ہی ممکن ہو سکتا تھا جب دل ربا اسے معاف کر دیتی۔ وہ جانتا تھا کہ دل ربا کا پولیس بیان اس کی ساری زندگی کی محنت پر پانی پھیر سکتا تھا اس کا نام اخبار کی زینت بن جاتا تو دنیا کی کوئی طاقت اس کی کھوئی ہوئی عزت کو بحال نہیں کر سکتی تھی وہ میڈیا کی طاقت سے خوف زدہ تھا اس نے پہلی ہی فرصت میں میڈم رولی کے ذریعے دل ربا کو بھاری معاوضے کے عوض اپنی زبان بندی کا پیغام بھیجا جبکہ دل ربا کا پہلے ہی کوئی ایسا ارادہ نہ تھا اس کے پیچھے کوئی ایسی طاقت نہ تھی جس کی بنا پر وہ درانی سے اچھے کی کوشش کرنی ایسے میں درانی کی آفر قبول کرنے کے سوا اس کے پاس کوئی چارہ نہ تھا لہذا دل ربا کی زبان بندی کا بھاری معاوضہ اس کے اکاؤنٹ میں منتقل کر دیا گیا۔

”وکی۔ وکی۔“ اس نے پوری شدت سے زور لگا کر خود کو باقر کی گرفت سے چھڑانے کی ایک اور کوشش کی۔
اس نے خود کو چھڑانے کے لیے باقر کو پیچھے کی جانب دھکا دینے میں ہونے کے باعث باقر لڑکھڑا کر صوفے پر جا کر اس کی شدت پسندی، غصے اور ضد نے باقر جیسے ٹھنڈے دل و دماغ کے آدمی کو یک دم ہی غصہ دلایا۔ وہ اپنا صبر و ضبط کھو بیٹھا اور غصے کی شدت سے اس پر پل بڑا دل ربانے بھی اب نہ بچاؤ کے لیے اس کی کمر اور منہ پر ناخن مارے لیکن جو بھی تھا ایک عورت کسی بھی طرح مرد کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھی تو وہ ایک نرم و نازک عورت اور باقر ایک طاقتور مرد جو نشے میں ہونے کے باوجود اس پر حاوی ہو گیا اور اس وقت جب وہ تندرہال دل ربا کو سر کے بالوں سے گھسیٹتا ہوا کمرے کی جانب لے جا رہا تھا جانے کیسے دل ربا کے ہاتھ میں کاربٹ پر لڑھکی ہوئی شیشے کی بوتل آگئی جو اس نے کھینچ کر باقر کو مانی چاہی باقر تو بچ گیا لیکن بوتل ہوئی بوتل کاشیشہ پورے کاربٹ پر پھیل گیا اور ایک نوک لکڑا اچانک ہی دل ربا کے پیٹ میں گھس گیا خون کا فوارہ ابل پڑا خون دیکھتے ہی باقر کے حواس ساتھ چھوڑ گئے وہ بوکھلا ہٹ میں سب کچھ ویسے ہی چھوڑ کر باقر کی جانب بھاگا۔ اور اگر کچھ دیر تک وہ کی واپس نہ آتا تو شاید خون کی زیادہ مقدار بہہ جانے کے سبب وہ مر ہی چلی ہوئی لیکن وکی کی بروقت آمد اس کی زندگی بچانے میں کافی مددگار ثابت ہوئی وکی گیارہ سالہ لڑکا تھا جو اس کے پاس بطور ملازم کام کرتا تھا۔ دل ربا کو خون میں نہایا دیکھ کر فوری طور پر وہ اپنے حواس کھو بیٹھا وہ جان چکا تھا کہ یہ سب کارروائی باقر صاحب کی ہے اس کے لیے اس وقت بڑا مسئلہ دل ربا کو اسپتال پہنچانے کا تھا۔

اس نے صرف ایک سیکنڈ لگا یا اور سب سے پہلے میڈم رولی کو اس حادثہ کی اطلاع دی میڈم رولی کے ساتھ ہی ایمریٹس بھی پہنچ گئی اسے فوری طبی امداد کے لیے ایمر جیسی پہنچایا گیا بے شک یہ پولیس کیس تھا لیکن میڈم کے تعلقات نے دل ربا اور وکی دونوں کی مشکلوں کو قدرے آسان کر دیا۔



سمرن ابھی ابھی حوریہ اور علی کو ہومورک کروا کر فارغ ہوئی تھی کہ اچانک ہی حواس سی شہر پارا گھبرا اٹھی ہوئی اور آگئی اس کے ہاتھ میں ایک فلمی اخبار تھا سمرن جانتی تھی کہ اس کی ماں شام کے علاوہ صبح شام ہونے والے اخبارات کے بھی فلمی صفحات بڑے شوق سے پڑھتی تھی غیر شعوری طور پر وہ دل ربا سے متعلق کسی بھی خبر کی منتظر رہتی اور ایسے تمام اخبارات کو الماری میں چھپا کر رکھتی جن میں دل ربا کا نام بھی شائع ہوا ہو۔
”یہ دیکھو سمرن یہ اخبار میں کیا آیا ہے۔“ گھبراہٹ کے سبب وہ بول ہی نہ پا رہی تھی سمرن کو اس کی آواز ندرہ می ہوئی محسوس ہوئی۔

”کیا ہو گیا ہے امی آرام سے بیٹھیں۔“ سمرن نے اخبار ان کے ہاتھ سے لے لیا۔ ان کی حالت اس بات کی نشاندہی کر رہی تھی کہ معاملہ خاصا سیریس ہے ان کی آواز سن کر فارغیہ بھا بھی اور تائی سادیہ بھی باہر نکل آئیں۔
”مشورہ اسٹیج ڈانسر دل ربا اپنے فلیٹ پر شدید زخمی حالت میں پائی گئیں عام طور پر خیال کیا جا رہا ہے کہ ان کا اپنے کسی چاہنے والے سے جھگڑا ہوا ہے جس کی طرف سے کیے گئے تشدد نے انہیں اس حال تک پہنچایا ہے۔“
بے شک پچھلے کئی سالوں سے ان کا دل ربا سے کوئی تعلق نہ تھا پھر بھی انسانیت کے ناتے اس خبر نے سمرن اور فارغیہ بھا بھی دونوں کو ہی لمحہ بھر کے لیے دکھی کر دیا۔

”ظاہر ہے جیسی کرنی ویسی بھنی، بڑے کا انجام برا۔“ یہ تائی سادیہ تھیں جو ہمیشہ سے ہی دریہ کی آزاد خیالی کی سب سے زیادہ مخالف رہیں سمرن نے پلٹ کر خاموشی سے انہیں اندر جاتے دیکھا اور خود شہر پارا کے قریب بیٹھ گئی جو گھنٹوں میں سردیے دروہی تھی۔
”خاموش ہو جائیں امی اللہ بہتر کرے گا۔“ ظاہر ہے وہ صرف تسلی ہی دے سکتی تھی اس کے تسلی آمیز الفاظ

پولیس کو دیئے جانے والے بیان کے مطابق یہ ڈکیتی کا واقعہ تھا جس کے دوران مزاحمت پر ڈاکوؤں نے اسے تشدد کا نشانہ بنایا، باقر اپنا اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے دل ربا کے ساتھ ساتھ پولیس کی زبان بھی بند کر چکا تھا اب اسے کوئی خطرہ نہ تھا صرف رسمی کارروائی تھی جو پوری کی جارہی تھی دل ربا کا پیٹ کا زخم کافی گہرا تھا جس کی بنا پر وہ ابھی تک ہسپتال میں ایڈمٹ تھی نور محمد نہایت رازداری سے طلاق کے پیر زاور حق مری رقم اسے دے گیا تھا جس کے ساتھ ہی اس کے اور درانی کی درمیان موجود رشتہ دھاگے کی مانند ٹوٹ گیا۔

ابھی ابھی نرس اس کے پیٹ کی ڈریسنگ کر کے گئی تھی جس کی بنا پر وہ شدید تکلیف میں مبتلا تھی وہ کی گھر گیا ہوا تھا میڈم رولی بھی آج صبح ہی اس سے مل کر گئی تھی اور ظاہر ہے اب اسے ملنے کس نے آنا تھا نرس کا لایا ہوا سوپ قریبی میز پر دھرا تھا لیکن اس کا سوپ بننے کو بالکل بھی دل نہ چاہ رہا تھا اسپتال کے سنانے نے اس کے دل کو بوجھل سا کر دیا تھا وہ آنکھوں پر بازو رکھے لیٹی تھی جب اچانک ہی دروازہ کھول کر کوئی اندر داخل ہوا۔

”وکی یہ سوپ پلی لومیر لال نہیں چاہ رہا۔“ یقیناً ”یہ وقت وکی کے ہی آنے کا تھا اس لیے وہ بنا دیکھے چادر منہ تک لیتے ہوئے بولی۔

”ہائے میری بچی یہ کیا حال بنا رکھا ہے۔“ یہ آواز تو شہسپارہ کی تھی اس نے ایک دم ہی چادر کو ہٹایا کچھ بل تھو وہ بالکل ہی ساکت رہ گئی۔ اپنے سامنے موجود شہسپارہ اس سرن اور شاہد کو دیکھ کر کئی بل تواتر سے یقین ہی نہ آیا کہ جو کچھ وہ دیکھ رہی ہے حقیقت ہے اور پھر جو وہ شہسپارہ کے گلے لگ کر بلک کر روئی تو سنبھال ہی نہ گئی ایک رات اسپتال میں گزار کر سرن اور شاہد کو اسلام آباد چھوڑ کر فاریہ کے گھر چلے گئے جبکہ شہسپارہ دل ربا کے پاس ہی رہ گئی اس نے سرن کو اپنا حتمی فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

”جب تک یہ مکمل صحت یاب نہ ہوگی مجھے کراچی نہیں آنا۔“ دل ربا بھی اپنی تمنائی سے خوف زدہ تھی اس لیے اس نے بھی شہسپارہ کو نہ جانے دیا دل ربا کا زخم آہستہ آہستہ بھر رہا تھا لیکن پھر بھی کبھی اس زخم میں اتنی ٹیسس اٹھیں کہ وہ تکلیف کی شدت سے بے حال ہو جاتی فی الحال وہ رقص کے قابل نہ رہی تھی اسپتال سے ڈسچارج ہوتے ہی اس نے پراپرٹی ڈیلر سے رابطہ کر لیا وہ چاہتی تھی کہ باقر کا دیا ہوا فلیٹ جلد از جلد بیچ کر اپنی رہائش کہیں اور اختیار کر لے فی الحال وہ لاہور چھوڑ کر نہ جاسکتی تھی کیونکہ اس کا کس مقامی عدالت میں زیر تفتیش تھا۔



ابھی ابھی وہ ہسپتال سے آئی تھی آج اس کا چیک اپ تھا وہی کچھ سو اسلف لانے قریبی مارکیٹ تک گیا ہوا تھا وہ لاؤنج میں رکھے ہوئے صوفے پر ہی نیم دراز ہو گئی شہسپارہ یکن میں اس کے لیے سوپ تیار کر رہی تھی حالانکہ ہائی بلڈ پریشر اور شوگر کے باعث وہ کافی عرصے سے یکن کا کام مکمل طور پر چھوڑ چکی تھی پھر بھی دل ربا کے لیے خود اپنے ہاتھوں سے کچھ تیار کرنا اسے آج بھی ہمیشہ کی طرح بہت اچھا لگتا تھا سوپ تقریباً تیار ہو چکا تھا اس سے قبل کہ وہ اسے باؤل میں نکالنی یک دم داغلی دروازے کی گھنٹی کی تیز آواز سنائی دی یہ یقیناً ”وکی نہ تھا کیونکہ اس کے پاس گھر کی چابی موجود تھی شاید دل ربا کو کوئی جاننے والا اس کی عیادت کو آیا ہو کیونکہ اکثر و بیشتر ہی اس کے اسٹیجنگ گاؤں نہ کوئی ساتھی اسے دیکھنے آجاتا تھا اس نے باؤل سلپ پر رکھا اور نشوے ہاتھ صاف کرتی دروازہ کھولنے کے لیے آگے بڑھی پیچھے سے دریہ کی آواز سنائی دی۔

”دروازے کی زنجیر ہٹائے بغیر دیکھئے گا باہر کون ہے؟“ اس نے دریہ کی ہدایت کی عین مطابق دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔

”جی فرمائیے“ باہر تقریباً پینتیس سالہ ایک اجنبی کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں موجود کبے اس بات کی نشاندہی کر رہا تھا کہ وہ دل ربا سے ملنے آیا ہے اس کا قیمتی لباس اور پرفیوم کی مہک شہسپارہ کو متاثر کرنے میں کامیاب

ہو چکے تھے۔

”دل ربا ہیں گھر پر۔“ آنے والے نے نہایت ہی نرم لہجہ میں شہسپارہ سے دریافت کیا یہ آواز اور یہ لہجہ تو دریا اب آج بھی لاکھوں میں پہچان سکتی تھی۔

”مرعلی۔“ اس کے لبوں سے بے آواز ادا ہوا اور وہ تیزی سے اٹھ کر دروازے کی جانب لپکی دروازہ کھولتے ہی وہ مرعلی کے گلے لگ کر رونے لگی مرعلی یقیناً ”اس کا ایک ایسا دوست تھا جس سے وہ کچھ بھی نہیں چھپا سکتی تھی۔ وہ ساری دنیا میڈیا، پولیس سب سے جھوٹ بول سکتی تھی لیکن مرعلی کے سامنے اس نے سب کچھ اکل دیا خود پر ہونے والی زیادتی من و عن سناؤالی اس کی تکلیف کے احساس سے ہی مرعلی کا حساس دل دکھ اور غصے کی زیادتی سے بھر گیا لیکن وہ بھی باقر درانی کے خلاف کچھ نہ کر سکتا تھا۔

وہ دل ربا کی دل سے عزت کرتا تھا یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ایک ایسی عورت ہے جس کو معاشرہ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا اس نے بھی تمنائی میں بھی کوئی ایسی غیر اخلاقی حرکت نہ کی تھی جس سے دل ربا کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا کہ مرعلی کے نزدیک وہ ایک باعزت عورت نہیں ہے دل ربا مرعلی کے گھریلو حالات سے بھی مکمل طور پر واقف تھی وہ جانتی تھی اس کے خاندان میں کبھی بھی کسی نے یہ جاننے کی کوشش نہ کی کہ وہ ایسا کہاں رہتا ہے اور سارا دن کیا کرتا پھرتا ہے؟ غرض ایسا لگتا تھا کہ اس کے گھر میں کسی کو بھی اس سے دلچسپی نہ تھی یہ تو مرعلی ہی کی شرافت تھی کہ وہ آج تک کسی غلط سرگرمی میں ملوث نہ ہوا بلکہ وہ تمام برائیاں جو اس کے خاندان کے مردوں میں بدرجہ اتم موجود تھیں مرعلی ان سے بھی بیحد دور رہا اسے شراب اور شباب سے بھی کبھی دلچسپی نہ رہی لیکن جانے کیوں دل ربا کو دیکھتے ہی اس کا دل ہمیشہ اس کے ساتھ کا خواہاں رہا اس کے باوجود ان دونوں کے تعلقات ایک صاف ستھری دوستی سے آگے نہ بڑھ سکے۔

دل ربا اپنا فلیٹ بیچ چکی تھی مرعلی کی کوششوں سے اسے قریبی علاقے میں ہی ایک اچھا فلیٹ کرائے پر مل گیا جہاں وہ شہسپارہ کے ساتھ شفٹ ہو گئی جب کہ مرعلی پچھلے ایک ہفتے سے کراچی گیا ہوا تھا آج دل ربا کی عدالت میں پیشی تھی رسمی کارروائی بننا کہ وہ اپنے وکیل کے ہمراہ باہر نکل رہی تھی۔ جب اس کی نگاہ مرعلی پر پڑی جو احاطے کے باہر گاڑی کا شیشہ ٹپنے کیے غالباً ”اسی کا منتظر تھا اسے خوشگوار سی حیرت نے گھیر لیا۔

”اچھا وکیل صاحب اب اجازت دے۔“ تیزی سے گئی ہوئی وہ گیٹ کے سامنے کھڑی گاڑی کے پاس آگئی۔

”تم کب آئے؟“ ایسا لگتا تھا کہ وہ ایک ہفتہ نہیں بلکہ ایک سال بعد آیا ہو۔

”آج ہی“ او بیٹھو۔“ وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولا دل ربا خاموشی سے بیٹھ گئی۔

”کیا کھاؤ گی؟“ اس نے ایک نگاہ دل ربا کے چمکے چمکے چہرے پر ڈالی جو مرعلی کو دیکھتے ہی کھل اٹھا تھا اس کی خوشی کا اندازہ مرعلی بھی لگا چکا تھا۔

”دکراہی۔“ مختصر سا جواب دے کر اس نے گاڑی کی سیٹ سے نیک لنگلی مرعلی نے اپنی گاڑی کا رخ ایک قریبی ریسٹورینٹ کی جانب موڑ لیا۔

”تمہارا کیا خیال ہے یہ کیس کتنے عرصے میں ختم ہو جائے گا۔“

”میرا خیال ہے ایک دو پیشیاں اور ہوں گی۔“ وہ سامنے رکھی ہوئی سی ڈیز نکال کر دیکھتے ہوئے بولی مرعلی نے کوئی جواب نہ دیا بلکہ خاموشی سے ڈرائیو کرتا رہا۔ اور پھر دل ربا نے اس کے ساتھ ایک اچھا سا لچ کیا۔

”مہم کے لیے کیا پیک کر داکس۔“ مرعلی کے منہ سے شہسپارہ کے لیے کہا گیا لفظ ممال دل ربا کو اندر تک نمال کر گیا اسے بہت اچھا لگا مرعلی کی اپنائیت نے اس کا دل خوش کر دیا۔

”جو تمہارا دل چاہے لے لو وہ سب کچھ خوش ہو کر کھا لیتی ہیں۔“

”ٹھیک ہے تم گاڑی میں چل کر بیٹھو میں کھانا لے کر آتا ہوں۔“ وہ گاڑی کی چابی دل ربا کو دیتا ہوا بولا اور پھر جلد ہی شہر پارا کے لیے لنچ بیک کروا کر لے آیا جانے کیا بات تھی وہ ایسی کا سارا سفر اس نے خاموشی سے طے کیا دل ربا کو لگا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن کہہ نہیں پاتا وہ کچھ الجھا ہوا سا تھا جلد ہی دل ربا کا اپنا ٹمنٹ آگیا۔

”مما کو میرا سلام دینا۔“ شاپر دل ربا کے ہاتھ میں دیتے ہوئے بولا۔

”کیوں تم اندر نہیں آؤ گے۔“ وہ حیران رہ گئی۔

”میں کسی کام سے جا رہا ہوں شام کو آؤں گا۔“

دل ربا مزید کچھ کہنے بنا خاموشی سے نیچے اتر آئی۔

”اللہ حافظ۔“ کہتی ہوئی وہ آگے بڑھی۔

”دریہ۔“ اچانک ہی اسے اپنے عقب سے مرعلی کی آواز سنائی دی آج پہلی بار اس نے دل ربا کو اس نام سے پکارا تھا وہ شاید گھڑی گئی اس کے قدم زمین میں گڑ گئے وہ ایک اچھے آگے نہ بڑھ سکی مرعلی گاڑی سے اتر آیا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب آگیا۔

”دریہ مجھ سے شادی کرلو۔“ وہ بول ہی رہا مرعلی کے لبوں سے نکلنے والے الفاظ نے دریہ کو گنگ کر دیا اسے ایسا محسوس ہوا جیسے تیز چتی ہوئی دھوپ میں بارش ہو گئی ہو اس کا سارا جسم محبت کی پھوار میں بھگ گیا۔

”خدا پروردار حیم و کریم ہے۔“ آج اسے اللہ کی رحمت پر یقین آئی گیا اس کی آنکھیں تشکر کے آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں وہ کچھ بول ہی نہ سکی۔

”دریہ مجھ سے شادی کر لو یقین جانو میں بہت تنہا ہوں بالکل تمہاری طرح آؤ ہم دونوں مل کر ایک دوسرے کی تنہائیاں بانٹ لیں۔“ وہ اسے کندھوں سے تھام کر بولا اور آج پہلا موقع تھا جب مرعلی نے اسے چھوا تھا وہ اس کے ہاتھوں کی حرارت سے پکھل گئی۔

”اور تمہاری بیوی۔“ وہ اس قدر ہی بولی تھی کہ مرعلی نے اس کی بات کاٹ دی۔

”وہ گاؤں میں رہتی ہے تم میرے شہر والے گھر میں رہو کی میرے ساتھ یقین جانو میں تمہیں پورا پورا وقت دوں گا تمہاری ہر ضرورت پوری کروں گا تمہیں مجھ سے کبھی کوئی شکایت نہ ہوگی لیکن میری صرف ایک شرط ہے تمہیں یہ سب کچھ چھوڑنا ہوگا۔“ انکاری کوئی گنجائش نہ تھی اور نہ ہی اس کے پاس کوئی ایسا جواز تھا کہ جس کی بنا پر وہ مرعلی جیسے بندے کا باز توڑتی۔

”میں تمہاری خاطر سب کچھ چھوڑ سکتی ہوں لیکن مجھے کبھی دھوکہ مت دینا ورنہ یقین جانو میرا اعتبار دنیا کے ہر رشتے سے اٹھ جائے گا میں تم پر بہت مان کرتی ہوں میرا مان نہ توڑنا مرعلی ورنہ میں مرجاؤں گی۔“ وہ آہستہ سے بولی۔

”موت کے علاوہ دنیا کی کوئی طاقت مجھ سے تم سے جدا نہیں کر سکتی یہ ایک مرد کا قول ہے۔“ وہ نہایت پیار سے اس کے ہاتھ تھپتھا کر بولا اور دل ربا کا سروں خون بڑھ گیا۔

”میں شام میں آؤں گا باقاعدہ طور پر ممات سے تمہارا ہاتھ مانگنے۔“ وہ واپس پلٹتا ہوا بولا اور گیٹ سے اپنا ٹمنٹ تک کا فاصلہ دریہ نے ایسے طے کیا جیسے وہ ہوا پر چل رہی ہو اسی روز رات آٹھ بجے مرعلی شعازل اور فیض محمد کے ساتھ آگیا اپنے ساتھ وہ لوگ مضافی اور پھول بھی لے کر آئے تھے۔

”ہم دریہ کا ہاتھ مانگتے آئے ہیں۔“ مرعلی کے لیے۔“ یہ فیض محمد تھا اور شہر پارا کو ایسا محسوس ہوا جیسے دریہ کے لیے کی جانے والی اس کی دعاؤں کو شرف قبولیت نصیب ہوئی ہو جانے کیوں دریہ کے سلسلے میں ہمیشہ شہر پارا کو اپنا وجود گناہ گار لگتا کبھی بھی اسے ایسا محسوس ہوا کہ دریہ سے اس کی اتنی محبت محض دنیا دکھاوے سے زیادہ نہ تھی ورنہ

برہ اس کا اصل مقصد تو شاید انتقام لینا تھا جو وہ آٹھا صاحب کے خاندان سے لینا چاہتی تھی لا شعوری طور پر وہ آج تک وہ الفاظ نہ بھولی تھی جو پہلی بار اس کی گل ہاؤس آندر پر آجاتی تھے کہ تھے دوسروں کی نفرت اور اپنے بارے میں کہے جانے والے الفاظ تو شاید وہ فراموش کر رہی ہوئی لیکن سرفراز صاحب کی بے اعتنائی اس کے دل کا ایسا تانور تھی جس کی تسکین ہمیشہ دریہ کے حوالے سے ان سب کو پریشان دیکھ کر اسے حاصل ہوتی تھی لیکن اب وہ تھک چکی تھی اور چاہتی تھی کہ دریہ کو کوئی مضبوط سائبان مل جائے اور یقیناً اس کی یہ خواہش مرعلی کی صورت میں پوری ہو سکتی تھی۔



نماز جمعہ کے بعد مقامی مسجد میں ان دونوں کے نکاح کی سادہ سی رسم ادا کی گئی جس میں فیض محمد شعازل شہر پارا، وکی کے علاوہ مسجد میں آنے والے چند نمازی شامل تھے جنہیں قاری صاحب نے نماز جمعہ کے بعد روک لیا تھا نکاح کے بعد مرعلی کی جانب سے مٹھائی اور چھو بارے تقسیم کیے گئے اور شاید یہ زندگی کا پہلا موقع تھا جب دریہ کے ساتھ شہر پارا نے بھی اللہ کے حضور دو نفل شکرانے کے ادا کیے بے حد سادگی کے ساتھ کیا جانے والا یہ نکاح اس نکاح سے کہیں افضل تر نہ تھا جو آج سے کچھ سال قبل دریہ اور دانش کا ہوا تھا کیونکہ اس نکاح میں فریقین کا خلوص شامل تھا اور یہ بغیر کسی ذاتی مفاد کے ظہور پذیر ہوا تھا اور شادی کیا ہوتی ہے؟ اس کی دلی خوشی دریہ نے آج حقیقی معنوں میں محسوس کی تھی اور اسے یقین آگیا تھا کہ اللہ کبھی بھی اپنے بندوں کو فراموش نہیں کر سکتا بے شک وہ کتنے ہی نافرمان کیوں نہ ہوں۔

اس نے اپنا فلیٹ خالی کر دیا تھا وکی چاچا کا تھا آج شام کی فلائیٹ سے وہ اور شہر پارا، مرعلی کے ساتھ کراچی آگئی تھیں جہاں انیورٹ پر مرعلی کا ڈرا سپور اور گاڑی موجود تھی پہلی پنک شلوار قمیض پر کالی چادر اوڑھے دریہ اس دل ربا سے قدرے مختلف لگ رہی تھی جسے ایک زمانہ جانتا تھا مرعلی نے کراچی کے ایک پوش علاقے میں اس کے لیے فلیٹ خرید رکھا تھا جس کی تزئین و آرائش ایک نامور ڈیکوریشنر نے کی تھی اس فلیٹ میں پہنچ کر دریہ کو گونا گوں سکون حاصل ہوا مرعلی کے ساتھ نے اس چند ہی دنوں میں وہ اعزاز اور عزت بخش دی جو اتنے سال کی انھیں محنت اور اپنے وجود کی قربانی دے کر بھی وہ حاصل نہ کر سکی تھی سچی خوشی کیا ہوتی ہے؟ اسے اب پتا چلا وہ خوشیوں کے ان لمحات کا پل پل کشید کرنا چاہتی تھی شاید اس لیے کہ اسے ملنے والی خوشیوں کی مدت ہمیشہ سے ہی کم ہوتی تھی۔



”یہ کیا لے آئے آپ۔“ جان محمد ڈانٹنگ ٹینل پر کچھ شاپر رکھ کر چاچا کا تھا جب کہ مرعلی قریبی صفحے پر بیٹھا اپنے جوتے اتار رہا تھا دریہ ان شاپرز کو کھول کر دیکھ رہی تھی کہ وہ اس کی پشت پر آکھڑا ہوا۔

”ابھی برتھ ڈے ٹوئیو۔“ میری جان میری زندگی۔“

مرعلی نے پیچھے سے اسے تھام کر اس کے کانوں میں سرگوشی کی۔

”تھینک یو مرعلی تھینک یو سوچ۔“ اس کے پاس الفاظ نہ تھے جن سے وہ مرعلی کا شکریہ ادا کر سکتی۔

”آپ کو کیسے پتا چلا کہ آج میری سالگرہ ہے۔“

”جن سے محبت کی جائے ان کے ہر لپ کی خبر رکھنی پڑتی ہے چلو اب جلدی سے تیار ہو جاؤ کیک کاٹ کر ہمؤز کرنے باہر جا رہے ہیں۔“ وہ اس کے گال تھپتھا کر اندر کمرے کی جانب جاتا ہوا بولا اور وہ دل سے مرعلی کی عظمت کی قائل ہوئی۔

معنوں میں حیران رہ گیا یہ دل ربا اس دل ربا سے بالکل مختلف نظر آ رہی تھی جس سے کبھی حبیب اللہ ملا تھا اور اگلے ہی پل حبیب اللہ کی حیرت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا جب اس نے دل ربا کے پیچھے آتے مرعلی کو دکھا جانے مہر علی نے دل ربا سے کیا کہا اس کے چہرے پر پھیلی ایک آسودہ سی مسکراہٹ حبیب اللہ کو اتنے فاصلے سے بھی دکھائی دے رہی تھی اس کی حیرانی بے چینی میں تبدیل ہو گئی مرعلی اور دل ربا حبیب کے لیے ایک ایسا سوال تھا جسے حل کرنا اس کے لیے لازمی ہو چکا تھا اگر مرعلی ان کی طرح کوئی عیاش مردہ تو یقیناً ”حبیب اللہ نظر انداز کر دیتا لیکن مرعلی جیسے شریف النفس بندے کے ساتھ دل ربا یہ بات یقیناً ”اسے“ مضمّن نہ ہو رہی تھی اور پھر دل ربا کی بدلی ہوئی شخصیت اسے کوئی اور ہی کہانی سنارہی تھی جس کا سراغ لگانا ضروری ہو چکا تھا۔

”یہ کیا کہہ رہے ہو ادا تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“ وہ گھر جانے کے بجائے سیدھا اپنے چچا کے گھر آیا اور فوراً ”صدوری سے ملنے اس کے کمرے میں پہنچ گیا۔

”یہ مرعلی آخری بار گاؤں کب آیا تھا؟“ وہ کچھ سوچتا ہوا بولا۔

”یہ ہی کوئی ایک ماہ قبل جب حارث علی اور شیر علی اپنی چھٹیوں میں گاؤں آئے تھے۔ کیوں کیا مرعلی نے کچھ کہہ دیا تھا۔“ وہ اپنے بھائی کے چہرے پر نظر ڈال کر قیاس آرائی کرتے ہوئے بولی۔

”کہنا کیا ہے بابا اس نے تو کر لیا ہے۔“

”کیا کر لیا ہے؟“ وہ حبیب اللہ کی بات سمجھ نہ سکی۔

”شادی۔ اور کیا کرتا ہے اور وہ بھی ایک تاپنے لگانے والی عورت ہے۔“

وہ برا سامنا نہ کر فطرت سے بولا۔

کچھ دیر تو صدوری منہ کھولے حیرت سے اپنے بھائی کی بات ایسے سنی رہی ہے جیسے کچھ سمجھ ہی نہ آ رہا ہو اور پھر ایک دم ہی کھلمکھلا کر ہنس پڑی۔

”میں تو سمجھی جانے مرعلی نے کیا کر دیا ہے ادا یہ کون سی نئی بات ہے یہ تو ہماری خاندانی روایات میں ہمارے مردوں کی شان ہے ایک سے زیادہ شادیاں کرنا۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔

”اور پھر کب تک رہے گی وہ تاپنے والی اس کے ساتھ ایسی عورتیں کسی ایک کھونٹے سے بندھی نہیں رہ سکتیں جلد ہی منہ کالا کر کے چلی جائے گی اور پھر مرعلی نے کہاں جانا ہے یہ سب چھوڑ کر۔“ یقیناً ”اس کا اشارہ جائیداد کی طرف تھا۔

”ویسے بھی ادا میں تو صرف اس کی خاندانی بیوی ہوں بلکہ اس کے دو بیٹوں کی ماں بھی ہوں اور مرعلی تو جیتا ہی اپنے بچوں کے لیے ہے۔“

اپنے بیٹوں کا ذکر کرتے ہی اک احساس نفاخر اس کے لیے محسوس ہوا لیکن حبیب اللہ کو چین نہ آیا اور ویسے بھی صدوری نہیں جانتی تھی کہ دل ربا کے سلسلے میں لگایا جانے والا اس کا اندازہ سو فیصد غلط ہے جبکہ حبیب اللہ جان چکا تھا کہ مرعلی نے دل ربا سے یہ رشتہ وقتی جذبہ کے ہاتھوں مجبور ہو کر نہیں جوڑا وہ اس سلسلے میں مرعلی کا والہانہ لگاؤ جانچ چکا تھا اور شاید محبت کرنا مرعلی کا وہ جرم تھا جس کی سزا دل ربا نے بھگتی تھی کیونکہ یہ اس کے نصیب میں لکھا جا چکا تھا اور نصیب کا لکھا اٹل ہے جسے گزرنا وقت بھی نہیں بدل سکتا۔

مرعلی کی دوسری شادی کی خبر اس کی دونوں بہنوں کے حواس پر بجلی بن کر گری اور انہیں سب سے پہلی فکر اپنی اپنی ازدواجی زندگی کے متعلق لاحق ہو گئی وہ دونوں حبیب اللہ اور حبیب اللہ کی فطرت سے واقف تھیں جانتی تھیں کہ وہ مرعلی کی ضد میں تو صرف دوسری شادی کر سکتے تھے بلکہ ان سے کچھ بعید نہ تھا کہ وہ یہ شادیاں ڈٹکے کی

آج اس کی تیاری ہمیشہ سے مختلف تھی وہ بہت دل سے تیار ہوئی اس کی یہ تیاری صرف اور صرف اپنے شوہر کے لیے تھی اسے دنیا سے ستائش نہیں چاہیے تھی ریڈ اور اورنج سوٹ میں وہ بے حد خوبصورت لگ رہی تھی پل سی میں داخل ہوتے ہی اسے بہت کچھ یاد آیا یہ وہ ہوش تھا جہاں کسی زمانے میں اس کی ہر شام گزرتی تھی اسے دانش سہگل بھی یاد آیا اور دانش کے ساتھ گزرنے ہوئے کل کی کئی یادیں اس کی آنکھیں بھگو گئیں جانے کیا بات تھی آج کل اس کا دل ذرا ذرا اسی بات پر بھر آتا تھا اسے اپنے گھروالے بھی بہت یاد آتے تھے پہلے ان کا غم بھلانے کے لیے وہ تلخ مشروب کا سہارا لیتی تھی لیکن اب مرعلی کی قوت اسے تمام برائیوں سے دور لے جا چکی تھی اسے لگتا کہ اتنے سالوں کی لا حاصل کو ششوں کے بعد آج اسے وہ عزت حاصل ہوئی ہے جو اس کی ماں اور بہن کا مقدر تھی آج وہ بھی ان سب کے مقابل کھڑی ہونے کی صلاحیت حاصل کر چکی تھی اور یقیناً ”یہ سب کچھ مرعلی کی بدولت ہی ممکن ہوا تھا۔

مرعلی کے ساتھ نے اسے احساس دلایا کہ اللہ تعالیٰ نے شوہر کا مقام اتنا بلند کیوں رکھا ہے؟ یقیناً ”آج اگر اللہ کے بعد کسی کو سجدہ کرنا جائز نہ ہوتا تو وہ ضرور کرتی۔ اتنا سب کچھ حاصل کر کے بھی وہ اپنے گھروالوں سے تعلق استوار نہ کر سکی بہت پہلے شہر پارانے اسے بتایا تھا کہ ولید گھر میں اس کا ذکر کرنا بھی پسند نہیں کرتا وہ نہیں چاہتا کہ کسی کو علم ہو دل ربا کبھی اس کی بہن تھی۔ وہ اس رشتے کو مکمل طور پر فراموش کر دیتا تھا اور اگلوتے بیٹے کی محبت نے ارم اور شہباز کو بھی مجبور کر رکھا تھا کہ وہ دروہ کو بھول جائیں اور اپ دروہ کے لیے ناممکن تھا کہ وہ خود سے قدم آگے بڑھائی اپنا سب کچھ گنوا کر وہ صرف ایک چیز بچا پائی تھی اور وہ تھی اس کی ”انا“ یہ انا ہی تھی جس کے سبب کراچی میں رہتے ہوئے بھی وہ اپنے گھروالوں سے اتنی ہی دور تھی جتنی لاہور میں جہاں وہ دل ربا تھی۔ دل ربا سے درباب تک کی واپسی کا سفر بے شک وہ طے کر چکی تھی لیکن رشتوں کے معاملے میں آج بھی تنگ دست تھی اپنا وہ ماضی جو وہ دور کہیں دفنا آئی تھی شاید اس کے خاندان کی یادداشت میں زندہ تھا۔

پلی سی میں مرعلی کے ساتھ کیا خانے والا کینڈل لائٹ ڈنر اس کی زندگی کے یادگار لمحوں میں سے ایک تھا جب وہ باہر نکلی تو ہوش کی لابی سے گزرتے ہوئے کئی سال پرانا منظر اس کی نگاہوں میں لہرا گیا جب وہ شاہویر کی نظروں میں ذیل ہوئی تھی آج فرق صرف اتنا تھا کہ کل اس کے ساتھ فاضل کریم تھا اور آج اس کا شوہر مرعلی آج وہ دنیا کی نگاہوں میں معتبر تھی۔ آج کوئی اس پر انگلی نہ اٹھا سکتا تھا اس کے اور مرعلی کے درمیان وہی رشتہ تھا جو سمرن اور شاہویر کا تھا بغیر کسی ڈر خوف، شرمندگی کے وہ نہایت فخر سے مرعلی کی ہمراہی میں چلتی ہوئی سے باہر آئی۔ گاڑی میں بیٹھنے سے قبل اس نے ایک بھر پور نظر مرعلی پر ڈالی اور اپنی خوش قسمتی پر تازاں اندر بیٹھ گئی یہ جانے بغیر کہ اس کی خوش قسمتی کسی کی نظر پر کا شکار ہو گئی ہے۔

آج سے کئی سال قبل اسی ہوش میں جس طرح وہ شاہویر کی نظروں میں آئی تھی بالکل اسی طرح آج بھی وہ کسی کی نظروں میں آ چکی تھی اور وہ تھا ”حبیب اللہ“ مرعلی کا سالار اور بہنوئی ”صدوری کا بھائی“ حبیب اللہ۔“

حبیب اللہ اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ ڈنر کے لیے آیا تھا کہ اچانک ہی اس کی نگاہ ریڈ اور اورنج سوٹ میں ملبوس اس خوبصورت سی لڑکی پر پڑی ایک سرسری نگاہ ڈالتے ہی اسے احساس ہوا کہ اس نے پہلے بھی اسے کیس دیکھا ہے اور اگلے ہی پل اسے یاد آچکا تھا یقیناً ”یہ دل ربا تھی۔ مشہور شیخ ڈانس ریل ربا“ جس سے اس کی ملاقات اپنے دوست عباسی کی ایک نجی محفل میں ہوئی تھی جہاں وہ بطور ڈانسرد عموماً جاتے اس میں ایسی کیا بات تھی کہ چند سال قبل ہونے والی ایک ملاقات آج بھی حبیب اللہ کو یاد تھی ورنہ تو اس کی زندگی اتنی رنگینیوں کا مرقع تھی کہ اسے ہر گزرتی رات پچھلی رنگینی بھلا کر نئے دور اور نئی رنگینی میں گم کر دیتی تھی۔ دل ربا کو دیکھ کر وہ حقیقی

چوٹ کر کرتے اور ان کی متوقع سو کن کو حوصلے میں ہی لا سکتے اس سوچ نے فاطمہ اور ماروی کی راتوں کی نیند اڑادی بلکہ فاطمہ نے فوراً ”ہی مرعلی کو فون کر کے اس سلسلے میں باز پرس کرنے کی بھی کوشش کی۔“

”مرعلی ایسا کرتے ہوئے تم ہمیں کیوں بھول گئے کیا تم نہیں جانتے کہ تمہاری اس غلطی کا خزانہ ہمیں بھگتنا پڑے گا۔“ وہ حبیب اللہ سے چھوٹے حبیب اللہ کی بیوی تھی جو نا صرف غصے کا بہت تیز بلکہ اپنی اگلی بن سنے سے بے حد محبت بھی کرتا تھا۔

”ادی تم غلط کہہ رہی ہو جو میں نے کیا وہ کوئی غلطی نہیں ہے بلکہ میرا شرعی حق ہے تمہارا میاں جو کچھ کرتا ہے میں سب جانتا ہوں لیکن تم خود بتاؤ کیا میں نے کبھی اس سے باز پرس کی؟ نہیں تا تو پھر وہ کون ہوتا ہے مجھ سے سوال کرنے والا۔“

مرعلی کو بہت کم ہی غصہ آتا تھا وہ عام طور پر دھیمے مزاج کا حامل شخص تھا۔

”تم جانتی ہوادی اگر وہ صدوری کا بھائی ہے تو میں بھی تمہارا اور ماروی کا بھائی ہونے کے علاوہ ان کا بہنوئی بھی ہوں اور جائیداد کا بھی اتنا ہی وارث ہوں جتنے وہ، لیکن تم خود ایمان داری سے بتاؤ کہ میں نے آج تک کبھی کسی کو اس بات کا احساس دلایا؟ کبھی کسی کے ذاتی معاملے میں دخل اندازی کی نہیں تا تو پھر ان کو بھی سمجھاؤ میرے معاملے میں مت بولیں۔“ یہ تو کوئی اور ہی مرعلی تھا جو مروت و لحاظ بھول چکا تھا شاید دریا ب کی محبت اور ساتھ نے مرعلی کو دوسروں کے سامنے کھڑا ہونا سکھایا تھا وہ جان چکا تھا کہ اگر آج وہ اپنے سالوں سے ڈر گیا تو اس کا نتیجہ دریا سے دوری کے علاوہ کچھ نہ نکلتا تھا اور یہی وہ نہیں چاہتا تھا اور اسی چیز نے اسے بے خوفی بخشی تھی دریا جو مرعلی کے قریب ہی بیٹھی تھی یہ سب سن کر دنگ رہ گئی اسے یہ امید نہ تھی کہ مرعلی اپنے خاندان والوں کے سامنے ڈنگے کی چوٹ پر اپنی شادی کا اقرار کرے گا وہ تو آج تک اس شادی کو خفیہ ہی سمجھ رہی تھی مرعلی کے اس اقرار نے دریا کو اس کا بے مول غلام بنایا فاطمہ کے بعد نیاز علی کا فون آگیا وہ مرعلی سے سخت ناراض تھے۔

”بابا اس ناچنے والی کو فوراً ”طلاق“ دے کر گاؤں واپس آؤ مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“ ان کے بچے کی گرج مرعلی کو بہت کچھ سمجھا گئی لیکن وہ بھی ان ہی کا بیٹا تھا ایک عورت کو محبت کے نام پر دھوکہ دیں کرینج نچھڑاؤ میں چھوڑنا اس کے مردانہ وقار کے خلاف تھا وہ دریا سے محبت کرتا تھا سچی اور حقیقی محبت۔

”بابا جان پلیز وہ کوئی ناچنے والی نہیں ہے بلکہ میری بیوی اور آپ کی بہو ہے اگر آپ نے اس کے لیے دوبارہ کوئی ایسا لفظ استعمال کیا تو شاید آپ اپنے بیٹے کو ہمیشہ کے لیے کھودیں۔“ بے شک لفظ ناچنے والی نے اس کے خون کو گرم کیا تھا پھر بھی وہ باپ کا احترام ملحوظ رکھ کر بولا۔

”مگر آئندہ آپ مجھ سے بات کریں تو پلیز دریا کے متعلق کوئی بات نہ ہو تو بہتر ہے۔“ اس نے حتمی انداز سے کہتے ہوئے بات ختم کی اور نیاز علی کو اندازہ ہو گیا کہ مرعلی کی زندگی سے اس عورت کو نکالنا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے اور اس ناممکن کو ممکن کس طرح جانتا تھا اس کا فیصلہ نیاز علی نے کرنا تھا جس کے لیے مناسب وقت کا انتظار اس کی بجوری بن گیا۔

”فی الحال اس عورت کو مرعلی کی ضد نہ بنایا جائے۔“ یہ نیاز علی کا حکم تھا جبکہ صدوری اور اس کے تمام بھائی بھی اس فیصلے سے متفق تھے وہ جان چکے تھے کہ مرعلی ضد میں آکر کچھ بھی کر سکتا تھا انہیں خدشہ تھا کہیں مرعلی جائیداد کی تقسیم کا مطالبہ نہ کر دے۔

”یہی عورتیں صرف دولت کی عاشق ہوتی ہیں۔“ یہ نیاز علی کی رائے تھی۔

”کسی ایک مرد کے ساتھ ساری زندگی گزار دینا ان کے بس کی بات نہیں ہوتی مرعلی نہ سہی وہ مرعلی کو جلد ہی چھوڑ جائے گی اور ہمیں اسی وقت کا انتظار کرنا ہوگا۔“ وہ وقت آنے سے پہلے ہی قدرت نے دل ربا کو وہ پیش ہا

خزانہ عطا کر دیا جس کے لیے وہ کئی سالوں سے ترس رہی تھی اس کی سوتلی دھرتی پر رحمت کی وہ بارش برس گئی جس میں وہ سر تپا بھیگ گئی اللہ نے اسے وہ معتبری بخشی جو اس سے قبل زندگی بھر اسے نصیب نہ ہوئی تھی اللہ نے اسے ”ماں“ کے رتبہ پر فائز کر دیا تھا۔



اس کی طبیعت کچھ دنوں سے خراب ہو رہی تھی کچھ کھانے کو دل نہ چاہتا۔ اگر جو کچھ کھا لیتی تو ہضم ہی نہ ہوتا یہ ہی وجہ تھی کہ آج وہ مہر کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس چیک اپ کے لیے آئی ہوئی تھی ڈاکٹر نے معائنہ کے علاوہ اس کے کچھ ٹیسٹ بھی کیے اور پھر جو خبر اسے سنائی من کر وہ دنگ رہ گئی اسے یقین ہی نہ آیا کہ جو کچھ ڈاکٹر نے بتایا ہے وہ درست ہے۔

”آپ پریگنٹ ہیں۔“ یہ وہ خبر تھی جس نے دریا کو چند لمحوں کے لیے ساکت کر دیا اور جب اسے ہوش آیا تو وہ خوشی سے روئی پڑی۔

”واقعہ اللہ بہت مہربان ہے جو مجھ جیسے گناہ گار بندوں کو بھی نواز دیتا ہے۔“ یہ وہ سوچ تھی جس کے زیر اثر اس دن شاید کئی سالوں بعد دریا ب نے نا صرف نماز پڑھی بلکہ اللہ کے حضور دو نفل شکرانے کے بھی ادا کیے۔

اس دن وہ حقیقی معنوں میں بہت خوش تھی اور چاہتی تھی کہ اپنی یہ خوشی کسی سے شیئر کرے اور یقیناً ”وہ شہرہ پارا کے علاوہ کوئی دوسرا نہ ہو سکتا تھا شہرہ پارہ اس خبر کو سنتے ہی خوشی سے نہال ہو گئی۔

”میں جلد ہی تم سے ملنے آؤں گی اپنا خیال رکھنا۔“ فون رکھنے سے قبل وہ اسے ہدایت کرتا نہ بھولی مرعلی اس کا پہلے سے بھی زیادہ خیال رکھتا اس سے شادی کے بعد وہ دوبارہ گاؤں جا چکا تھا جہاں اب کوئی بھی اس سے دریا کی بات کوئی ذکر نہ کرتا تھا پھر بھی جانے کیوں وہ یہ چاہتا تھا کہ یہ خبر اس کے خاندان تک نہ پہنچے لیکن اپنی اس کوشش میں وہ زیادہ عرصہ تک کامیاب نہ ہو سکا اور جلد ہی یہ خبر اس کے باپ اور گھر کے دیگر افراد تک پہنچ گئی جسے سنتے ہی ہر فرد ششدر رہ گیا۔

”اس کا مطلب ہے وہ دو لکے کی ناچنے والی ہماری بہن کے مقابل آگئی اب حیا باختہ عورتیں شرفاء کا مقابلہ کریں گی۔“ حبیب اللہ غصے کی شدت سے تملتا رہا تھا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ دل ربا کو کوئی مار کر اس سارے قصے کو ہی ختم کر دیتا۔

”مگر اس عورت کا بیٹا ہو گیا تو۔“ صدوری کا خدشہ اس کی زبان تک آ ہی گیا۔

”نہیں ایسا کچھ نہیں ہو گا اب ہمیں ضرور ایسا کچھ کرنا ہو گا جس سے سانپ بھی میرا جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔“ یہ اس کا اپنا باپ تھا گا باپ نیاز علی جس کے نزدیک بیٹے سے زیادہ زمین اہم تھی وہ نہیں چاہتا تھا کہ دل ربا کے مال بننے کی صورت میں اس کی جائیداد و حصوں میں تقسیم ہو اور یہی بات صدوری کے بھائیوں کو پسند نہ تھی۔



دروازے پر تیل ہو رہی تھی۔ اس کی طبیعت صبح سے بھی بہت خراب تھی سارا دن ہو گیا اسے الٹیاں کرتے ہوئے ابھی بھی وہ ہاتھ روم میں ہی تھی پتا نہیں باہر کون ہے؟ یہ وقت مرعلی کے گھر آنے کا نہ تھا ویسے بھی اس کے پاس داخلی گیٹ کی چابی موجود تھی جانے کون ہے؟ یہ سوچتی ہوئی وہ نڈھال سی داش روم سے نکلی اور بے دم سی بستر پر گر گئی۔

”بی بی بی بڑی مالکن اور فاطمہ بی بی آئی ہیں آپ سے ملنے۔“ ایک دم دروازہ کھول کر گھبرائی ہوئی رضیہ اندر

داخل ہوئی اور آہستہ آواز میں بولی رضیہ کچھ عرصہ قبل مرعلی کے ساتھ گاؤں سے آئی تھی جسے وہ دریاب کی دیکھ بھال کے لیے لے کر آیا تھا یہ ہی وجہ تھی کہ وہ ان دونوں عورتوں سے واقف تھی۔

”کون بڑی مالکن۔“ اس نے بمشکل اپنی آنکھیں کھولیں۔
”وہ جی صدوری بی بی مرسانیں کی پہلی گھر والی۔“ رضیہ کا تعلق مرعلی کے گاؤں سے ہی تھا۔ اس لیے پہچان کے سلسلے میں کوئی غلطی اس سے متوقع نہ تھی۔

”صدوری۔ وہ یہاں کیوں آئی ہے؟“ درزیہ نے سوچا ضرور مگر بولی نہیں۔
”تم چلو میں آتی ہوں۔“ باہر جانے سے پہلے اس نے مرعلی کو فون کر کے اس کے گھر والوں کی آمد کی اطلاع دینا ضروری سمجھی اس کے نزدیک مرعلی کا باخبر ہونا ضروری تھا ویسے بھی اس وقت مرعلی کی گھر موجودگی بہت ضروری تھی وہ اکیلی ان عورتوں کا سامنا کرنے کی ہمت خود میں نہ پا رہی تھی۔

”جانے یہ عورتیں کس ارادے سے آئی ہیں۔“ یہی ہی سوچتی ہوئی وہ خاموشی سے اٹھی اور آٹھنے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنا تنقیدی جائزہ لیا وہ پہلی بار اپنے سسرال سے آئے کسی فرد کے سامنے جا رہی تھی بے شک آنے والی ہستی اس کی سوکن ہی تھی پھر بھی وہ ہر حال میں خود کو بہتر دیکھنا چاہتی تھی اس وقت وہ اسکن طر کے شوکنگ پنک کڑھائی والے تلکبے سے سوٹ میں بھی خاص خوبصورت لگ رہی تھی ممتا کا نور اس کے چہرے پر سن کر جھلک رہا تھا اچھی طرح مطمئن ہو کر اس نے پنک لپ۔ انک لگائی پال بنائے ڈرنک سے نکال کر اپنی چوڑیاں پہنیں وہ ہر حال میں مرعلی کی خاندانی بیوی سے بڑھ کر نظر آنا چاہتی تھی ہر طرح سے مطمئن ہو کر نہایت پر اعتماد چال چلتی وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہوئی۔

”السلام علیکم۔“ سامنے بیٹھی عورت یقیناً ”صدوری تھی جبکہ دوسری عورت یقیناً ”مرعلی کی بڑی بہن تھی اس کی شکل کافی حد تک اپنے بھائی سے ملتی تھی۔

”ہائے میں صدقے جاؤں تم تو بہت خوبصورت ہو میرے اندازے سے کہیں بڑھ کر خوبصورت۔“ صدوری نے اسے گلے لگا کر ہاتھ چومتے ہوئے کہا اور یہ صورت حال اس کے لیے بالکل غیر متوقع تھی کیا کوئی عورت اپنی سوکن سے اس طرح بھی مل سکتی ہے؟ وہ تو خود کو ایک مختلف صورت حال کے لیے تیار کر کے یہاں تک آئی تھی اسے یقین تھا مرعلی کی بیوی ضروری اس سے لڑنے جھگڑنے آئی ہوگی اس نے حیرت سے پہلے خود کو گلے لگا کر چومتی صدوری کو دیکھا اور پھر ذرا فاصلے پر بیٹھی اس عورت کو دیکھا جو ٹانگ برٹانگ دھڑے بڑی نخوت سے اسے ہی تنک رہی تھی اس کی آنکھوں میں لہرائی واضح نفرت و حقارت اسے دور سے بھی نظر آرہی تھی۔

”میں نے تو جب سے نا تم امید سے ہو نہ سکی، تم سے ملنے کو میرا دل تڑپ اٹھا تمہارا تو ہمارا بچہ ہے پھر کوئی رشتہ دار بھی قریب نہیں، جانے اس حال میں تم کسی طرح رہتی ہو گی یہ ہی سوچ کر تم سے ملنے آگئی آخر تم میرے سر کے ساتیں مرعلی کے بچے کی ماں بننے والی ہو وہ بے شک مجھ سے محبت نہ کرے میں تو اس سے وابستہ ہر شے سے محبت کرتی ہوں مانو جس کو اس نے پیار سے دیکھا وہ شے میرے لیے معتبر ہو گئی۔“ اپنے آنسو پونچھتی یہ عورت اسے مرعلی کی بتائے گئے تجزیہ سے قدرے مختلف لگی شاید مرعلی کو ہی کبھی اس کے پیار کا احساس ہی نہ ہوا ہو وہ یہ سوچ کر رہ گئی۔

”آپ بیٹھیں میں رضیہ کو دکھوں کیا کر رہی ہے۔“

وہ مرعلی کی بہن کی نظروں سے قدرے خائف ہو کر بولی۔

”تم مجھے ایسا یا آپا کہہ کر بلا سکتی ہو کیونکہ تم میری چھوٹی بہن جیسی ہی ہو اور رہنے دو رضیہ کو تم یہاں بیٹھو میرے پاس اسے سب بتا ہے ممانوں کی خاطر وہی کس طرح کرتے ہیں وہ خود سب کچھ کر لے گی۔“ صدوری

نے اسے کندھوں سے تھام کر صوفے پر لا بٹھایا۔

”تم تو خود اتنی بیمار اور کمزور دکھ رہی ہو کہ کچھ ہے رضیہ تمہاری کوئی دیکھ بھال نہیں کرتی۔“ درزیہ نے بے اختیار اس عورت کی جانب دیکھا جس نے کالی کڑھائی والی بے حد خوبصورت چادر اوڑھ رکھی تھی تاکہ میں بڑی بڑی سی لونگ اس کے چہرے پر اچھی لگ رہی تھی کچھ تو ویسے ہی وہ مہرے عمر میں زیادہ تھی کچھ اس کے فربہ مائل جسم نے اس کی عمر میں کئی گنا اضافہ کر دیا تھا اور وہ کہیں سے بھی مرعلی جیسے ہندے کی بیوی دکھائی نہ دے رہی تھی اس سب کے باوجود اس کی شخصیت بڑی بارعب نظر آرہی تھی درزیہ اطمینان سے بیٹھی اس کا بھرپور جائزہ لے رہی تھی جبکہ وہ اپنے ساتھ لایا ہوا مختلف سامان رضیہ اور سیکنہ کی مدد سے اٹھوا کر کچن میں رکھوا رہی تھی کہ یک دم باہر کا دروازہ کھول کر مرعلی اندر داخل ہوا اور اندر داخل ہوتے ہی سامنے دکھائی دینے والے منظر نے اسے حیران سا کر دیا وہ جانے کیا کیا قیاس آرائیاں کرتا ہوا بڑی گھبراہٹ کے عالم میں گھر تک پہنچا تھا یہاں تک کہ باہر گاڑی میں موجود ڈرائیور سے بھی اس نے سلام دعا تک نہ کی تھی وہ تو اپنے گھر میں ایک معرکہ کا تصور کرتا ہوا داخل ہوا تھا لیکن سامنے دکھائی دینے والے منظر نے اس کی پریشانی کو یک نخت ختم کر دیا اور وہ کافی حد تک پرسکون دکھائی دینے لگا۔

”سلام ادی۔“ صدوری پر ایک نظر ڈال کر وہ فاطمہ کے سامنے جا کھڑا ہوا بھائی کو سامنے دیکھتے ہی فاطمہ تمام گلے شکوے بھلا کر کھڑی ہو گئی اور نہایت محنت سے اسے اپنے ساتھ لگایا۔

”کیسے ہو میرے بھائی تمہیں تو دیکھنے کو ہماری آنکھیں ہی ترس گئیں۔ گاؤں آتے ہو تو کبھی بہنوں کی خیریت پوچھنے ان سے ملنے بھی آجایا کرو۔“ اور وہ جواب میں ان کے رویہ اور ناراضی پر کوئی جوابی شکوہ نہ کر سکا اس کی بہن سب کچھ بھلا کر اس کے گھر آئی تھی۔ اس خوشی سے بڑھ کر مرعلی کے لیے کوئی دوسری بات نہ تھی۔
”کچھ کھانے کا انتظام کیا ہے۔“ بہن کے پہلو میں بیٹھتے ہوئے اس نے درزیہ سے دریافت کیا۔

”ہاں رضیہ کو میں نے سب سمجھا دیا ہے وہ بتا رہی ہے اسے پریشان نہ کرو۔“ صدوری کا جواب اس کے لیے بالکل غیر متوقع تھا آج تک جس صدوری سے وہ واقف تھا یہ صدوری اس سے سو فیصد مختلف تھی۔
”کھانا لگو آؤ میں فریش ہو کر آتا ہوں۔“ وہ درزیہ کی جانب دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

”جی اچھا۔“ اور پھر جلد ہی رضیہ نے کھانا تیار کر لیا پھل اور ساگ صدوری گاؤں سے لائی تھی اس کے علاوہ بریانی اور چکن کا سالن اس نے قفاقت تیار کر لیا جبکہ کباب پہلے سے فریزر میں موجود تھے نہایت ہی خوشگوار ماحول میں رات کا کھانا کھایا گیا صدوری گاؤں سے بہت ساری سوغات درزیہ کے لیے لائی تھی جس میں بہت خوبصورت کڑھائی والے سوٹ مگر م شال اور کھانے بننے کا بے شمار سامان شامل تھا۔ اس کے پیار بھرے رویے نے درزیہ کو بہت متاثر کیا اور اسے خود سے بے حد شرمندگی محسوس ہونے لگی اسے اپنا وجود مرعلی اور صدوری کے درمیان حائل ایک دیوار کی مانند لگنے لگا۔

”میرے آنے سے قبل ان دونوں کے تعلقات کون سے بہتر تھے۔“ اس احساس نے اس کی شرمندگی کے اثر کو زائل کر دینے کی کوشش کی ابھی وہ کھانا کھا کر فارغ ہی ہوئے تھے کہ حبیب اللہ آگیا۔

درزیہ نے کھانا نہیں کھایا کیونکہ اس کی طبیعت ٹھیک نہ تھی اس لیے وہ قریب ہی صوفے پر نیم دراز تھی جیسے ہی حبیب اللہ لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا وہ یک دم اٹھ بیٹھی اور اپنا ڈھونڈا درست کر کے اوڑھ لیا۔

”سلام دل راجی کیسی ہو آپ۔“ وہ بڑے انداز سے کہتا ہوا اس کے پاس ایسے آیا جیسے اسے صدیوں سے جانتا ہو اس کی اس حرکت نے درزیہ کو جی بھر کر شرمندہ کیا اسے ایک دم ہی اپنا گزرا ماضی یاد آگیا۔ یقیناً ”یہ تجھ سے واقف ہے ورنہ مجھ سے اتنی بے تکلفی نہ ہر تبت۔“ شرت کا جنون ایک دقتی دیوانگی اس کا ایسا گزرا ہوا اکل تھا جو کہیں

نہ کہیں اس سے آکر ٹکرائی جاتا تھا اس سے نگاہیں ہی نہ اٹھائی گئیں۔

”اس کا نام دل رہا نہیں دریا ب ہے دریا ب مرعلی۔“ اس کے منہ سے لفظ دل رہا مرعلی کو کس قدر ناگوار گزرا تھا اس کا احساس دریا ب کو مرعلی کے لہجے سے ہی ہو گیا تھا وہ ایک دم ہی جی اٹھی اس کی آنکھیں احساس تشکر سے بھر گئیں اس نے نظراٹھا کر مرعلی کی جانب دیکھا جو لب پہنچنے حبیب اللہ کو تک رہا تھا۔

”وہ دریا ب علی لیکن ہم نے تو دل رہا سنا تھا چلیں ہو سکتا ہے ہمیں ہی سننے میں غلط فہمی ہو گئی ہو۔“ اپنے مذاق پر خود بھی لطف اندوز ہو کر وہ کھلکھلا کر ہنس دیا اور مرعلی محض خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا سچ ہے اس معاشرے میں مرد کچھ بھی کرے کوئی سوال نہیں کرتا لیکن عورت کا ماضی ساری عمر اس کے لیے کس طرح ایک طعنہ بن جاتا ہے یہ ہر گزرتا دن دریا ب کو احساس دلانا تھا پچھتاوے ناگہن کر اسے ڈستے تھے کاش۔

”دریا ب تم اندر جاؤ تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“ مرعلی غالباً ”اس کی اندرونی کیفیت بھانپ چکا تھا حبیب اللہ کی موجودگی میں وہ خود کو خاصا بے چین محسوس کر رہی تھی اسی لیے بنا کوئی جواب دیئے خاموشی سے اٹھ کر اندر چلی گئی صدوری اور فاطمہ اس سے مل کر جلد ہی گاؤں واپس چلی گئیں اور جاتے جاتے صدوری نے پھر آنے کا وعدہ بھی کر لیا۔

پھر وقتاً فوقتاً ”صدوری نے کئی چکر دریا ب کے گھر کے لگائے یہاں تک کہ ایک دفعہ تو وہ اسے بے حد اصرار سے اپنے ساتھ گاؤں بھی لے گئی جہاں جاتے ہوئے دریا ب سے حد تک راز رہی تھی لیکن مرعلی کے ساتھ نے اسے تقویت بخشی وہ جو بے انتہا خشوں میں گھری مرعلی کی آہنی حویلی آئی تھی یہاں کے لوگوں کا خلوص دیکھ کر جلد ہی ان ’اندیشوں سے چھٹکارا حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی جو اس کے دل میں سراب بھار رہے تھے اس دن جب انہوں نے شہر واپس آنا تھا ایک ہی حبیب اللہ ’مرعلی سے ملنے حویلی آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی دریا ب گھبرا سی گئی اسے لگا وہ یقیناً ”اس شخص سے پہلے بھی مل چکی ہے لیکن کہاں؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جس پر زیادہ غور و خوض کر کے وہ مزید شرمندگی کی دلدل میں نہیں دھنسا چاہتی تھی لیکن جلد ہی اس کے خیال کی تردید ہو گئی حبیب اللہ کی آنکھوں میں شناسائی کی ہلکی سی رمت بھی موجود نہ تھی اور یہ بات یقیناً ”اس کے لیے باعث اطمینان تھی۔

صدوری چاہتی تھی کہ اپنی ڈیوری کے ایام دریا ب حویلی میں رہ کر گزارے لیکن جانے کیوں مرعلی اس بات پر آمادہ نہ تھا شاید وہ اپنے گھر والوں پر ابھی تک اعتبار نہ کر سکا تھا اسے سب سے زیادہ حیرت اپنے باپ کے رویے پر تھی جو دریا ب سے اس طرح علا جس طرح بیارو محبت سے وہ صدوری سے ملتا تھا دریا ب کے بارے میں کئے گئے الفاظ لگتا تھا جیسے کسی اور شخص کی زبان سے ادا ہوئے ہوں کم از کم مرعلی اپنے باپ کو ضرور جانتا تھا وہ جانتا تھا کہ اس کا باپ کم تر لوگوں کو کبھی منہ لگانے کے قابل نہیں سمجھتا چاہے وہ دولت میں کم تر ہوں یا عزت میں اور ایسے میں دریا ب سے اس کا رویہ مرعلی کو خاصا الجھا گیا یہ ہی وجہ تھی کہ سب کے بے حد اصرار پر بھی وہ دریا ب کو دودن رہ کر اپنے ساتھ ہی کرچی واپس لایا ویسے بھی یہ ہدایت اسے شہہ پارانے گاؤں جانے سے قبل کی تھی کہ وہ دریا ب کو اکیلا چھوڑ کر نہ آئے وہ کچھ خوف زدہ تھی اور اپنا یہ ہی خوف اس نے مرعلی کے اندر بھی منتقل کر دیا منع تو اس نے دریا ب کو بھی کیا تھا کہ وہ صدوری سے زیادہ تعلقات استوار نہ کرے بقول اس کے سو کن کی مثال اس ناکن کی سی ہے جس کا ڈسا پانی بھی نہیں مالتا لیکن جانے کیوں دریا ب نے ہر طرف سے اپنے کان بند کر رکھے تھے اس پر صدوری کا جادو سر نہ بھ کر بول رہا تھا۔

وہ جب سے گھر آیا تھا کچھ پریشان سا لگ رہا تھا الجھا الجھا کچھ سوچتا ہوا بڑی بے دلی سے تھوڑا سا کھانا کھایا اور اب بھی سامنے چائے کا کپ رکھے جانے کیا سوچ رہا تھا بظاہر تو اس کی نگاہیں پی وی اسکرین پر مرکوز تھیں لیکن دریا ب جانتی تھی کہ اس کا دھیان کہیں اور ہے۔

”کیا بات ہے مہر آپ کچھ پریشان سے لگ رہے ہیں۔“

بالاخر اس سے برداشت نہ ہو سکا اور وہ پوچھ ہی بیٹھی حالاً نہ کسی بھی بات کی تفتیش اور کیرد کرنا اب اس کی عادت نہ رہی تھی۔

”آلہ ہاں کچھ نہیں۔“ وہ ایک دم چونک اٹھا اور خالی خالی نظروں سے دریا ب کی جانب نکلنے لگا۔

”آپ نہ بتانا چاہیں تو آپ کی مرضی۔“ وہ کندھے اچکا پی آگے بڑھی اور مرعلی کے سامنے دھرا ٹھنڈی چائے کا کپ اٹھالیا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ اب مرعلی نے یہ چائے نہیں پینی مرعلی خاموشی سے اس کی جانب تکتا رہا۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ اس کے واپس پلٹتے ہی مرعلی سے نہ رہا گیا اور ایک دم ہی اس کا آپٹل تھام کر روک لیا۔

”دوسری چائے بنا لاؤں۔“

”ناراض ہو گئی ہو۔“ وہ اٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔

”نہ مہرحلا میں آپ سے ناراض ہو کر زندہ رہ سکتی ہوں۔“

جانے کیا ہو دریا ب کی آنکھیں ایک دم ہی آنسوؤں سے بھر گئیں۔

”آپ تو میرے سر کے سامنے ہیں آپ ہی سے تو میری پوری دنیا آباد ہے نہ مر میں آپ سے ناراض نہیں ہو سکتی میں تو دوسری چائے بنانے جا رہی ہوں آج رضیہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے وہ جلدی سو گئی تھی۔“ اس نے گیلی آنکھوں سے مسکراتے ہوئے کہا۔

”رہنے دو چائے یہاں آؤ میرے پاس بیٹھو مجھے تم سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“ مرعلی نے چائے کا کپ دریا ب کے ہاتھ سے لے کر سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا اور اسے تھام کر صوفے پر لا بٹھایا اور خود بھی اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”بات یہ ہے دریا ب۔“ وہ پل بھر کر اور اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالی جو نہایت معصومیت سے اس کی جانب تکتی رہی تھی۔

”کون کہہ سکتا ہے یہ لڑکی ماضی کی اسٹیج ڈانس رول رہا ہے ایک غلاظت بھری دلدل میں ڈوب کر ابھرنے والی؟ تو آج بھی ویسی ہی پاکیزہ اور معصوم ہے عام لڑکیوں جیسی ایک لڑکی۔“ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر دریا ب کی جانب دیکھا جو مختصر لگا ہوں سے اس کی جانب دیکھ رہی تھی۔

”دراصل بابا جان کا چیک اپ ہے جس کے لیے انہوں نے ابرو ڈ جانا ہے۔“ بات کرتے کرتے اس نے دریا ب کا ہاتھ تھام لیا۔

”پہلے بھائی منصور ان کے ساتھ جاتے تھے لیکن اب انہوں نے اپنی ذاتی مصروفیات کا بہانہ بنا کر انکار کر دیا ہے وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ وہ تم اچھی طرح جانتی ہو اسی طرح حبیب اور حبیب اللہ نے بھی منع کر دیا ہے اب ظاہر ہے ان کے ساتھ چیک اپ کے لیے کسی کو تو جانا ہی ہے اور میرے سوا کون ایسا ہے جو بابا جان کے ساتھ جائے اسی سلسلے میں شام ان کا فون آیا تھا۔“ اس کا ہاتھ اپنے ہونٹوں سے لگا تا ہوا مرعلی آہستہ آہستہ تمام تفصیل بتاتا گیا۔

”تو اس میں اتنی پریشانی والی کیا بات ہے۔“ دریا ب ابھی بھی اس کی پریشانی کا سبب جان نہ پائی۔

”اس حال میں تمہیں اکیلا چھوڑنے پر میرا دل آمادہ نہیں ہو رہا تمہارے پاس کم از کم کسی ایک مرد کا ہونا ضروری ہے اگر خدا ناخواستہ تمہیں آدھی رات کو کوئی پرالہم پیش آجائے تو تم دونوں عورتیں کیا کرو گی بس یہ ہی

سوچ کر میں پریشان ہوں گاڑی اور ڈرائیور کا ہر وقت تمہارے پاس رہنا ضروری ہے۔“ وہ درویش کے ماتھے سے بال ہٹاتا ہوا بولا۔

”بات یہ ہے کہ درویش میں اپنے گاؤں کے کسی بھی بندے پر بھروسہ نہیں کر سکتا، یہی وجہ ہے کہ میں حویلی کے کسی بھی بندے کو یہاں تمہارے پاس اکیلا نہیں چھوڑ سکتا، بظاہر میری ہمدردی کا دم بھرنے والے لوگ بھی اصل میں میرے باپ اور سالوں کے غلام ہیں، ان کے اشاروں پر ناپٹنے والے دم ہلاتے تھے۔“ وہ کسی قدر نفرت اور حقارت سے بولا۔

”میرا خیال ہے تم مہاسے بات کرو، اگر وہ کچھ دن اگر رہ لیں تو میری تسلی ہو جائے گی۔“

”چلیں ٹھیک ہے میں بات تو کر لوں گی، لیکن مجھے امید نہیں ہے کہ وہ آسکیں۔“ اور پھر درویش کا اندیشہ درست ثابت ہوا، شہر پار آنے اپنی بیماری کے سبب آنے سے انکار کر دیا، کیونکہ وہ بیڑھیاں نہیں چڑھ سکتی تھی۔

”ایسا کرو تم میرے پاس آ جاؤ۔“ پارو کو اس سے بہتر کوئی حل نہ سوجھا۔

”نہیں مجھ کو اس گھر کے لوگ مجھے زندہ دفن چکے تو میں کیوں سامنے آ کر ان کی رسوائی کا سبب بنوں۔“ اسے اچانک ہی ولید کی کسی بات یاد آئی۔

”چلیں اللہ مالک ہے، خود ہی کوئی بندہ دست ہو جائے گا۔“ کچھ دیر ادھر ادھر کی بات کر کے اس نے فون بند کر دیا۔

”ایسا کرو تم میرے ساتھ گاؤں آ جاؤ، پندرہ دن کا تو مسئلہ ہے پھر تو مر علی نے آئی جانا ہے۔“ صدوری اکثر پیشتر ہی درویش کو فون کرتی اور گھنٹوں لمبی لمبی گفتگو کیا کرتی، جس میں زیادہ تر وہ اپنی مندوں کے شکوے بیان کرتی جن کی عیاریوں سے وہ ہمیشہ ہی خائف رہتی، جبکہ درویش صرف ہوں ہاں ہی کرتی، کیونکہ اس کا واسطہ ابھی تک منڈانی اس رشتے سے کھل کر نہ پڑا تھا، اسے کبھی کبھی صدوری کی باتیں سن کر احساس ہوتا کہ مندوں کی بے اعتنائی اور بہن کی غیر موجودگی نے اسے درویش کے قریب کر دیا تھا۔ وہ شاید اپنا اور درویش کا رشتہ بھی فراموش کر بیٹھی تھی یہی وجہ تھی کہ جیسے ہی اسے درویش کا مسئلہ پتا چلا فوراً فون کر کے اسے گاؤں آنے کی آفر دے ڈالی۔

”تم بہت سیدھی ہو درویش، تم صدوری کو کبھی نہیں جان سکتیں۔“

”جانے کیوں آپ ادبی سے اتنی نفرت کرتے ہیں، وہ تو بہت اچھی ہیں، نرم خور اور مجھ سے محبت کرنے والی۔“ درویش بات کرتے کرتے رکی اور مر علی کی جانب دیکھا۔

”چلیں میں ادبی کو منع کر دیتی ہوں، پھر آپ بتائیں میں کہاں جاؤں، میرا کون سا میکا ہے جو مجھے اپنی آغوش میں چھپالے گا، مر علی خود سوچیں میں اکیلی کیسے رہوں گی۔“

”وہ سب تو ٹھیک ہے۔“ مر علی نے اس کے کھٹے کھٹے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔

”چلو تم تیار ہو جاؤ میں تمہیں اور رضیہ کو آج ہی گاؤں لے جاؤں گا، وہاں اپنا بہت خیال رکھنا، رات کو اچھی طرح دوا نہ بند کر کے سونا، یاد رکھنا اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھو، کوئی تو بی فائدے میں رہو گی، ورنہ تم ہماری حویلی کی روایات کو نہیں جانتیں میری جان کسی دھوکے میں نہ آنا، اپنا بہت خیال رکھنا۔“ جانے کو ہی بات مر علی کو بدلا رہی تھی اور مر علی کی باتیں اسے الجھا رہی تھیں۔

”جھلا مجھے کوئی کیا دھوکہ دے گا۔“ اس نے سوچا ضرور، لیکن مر علی سے پوچھا نہیں اور پھر اسی رات اسے گاؤں چھوڑ کر بہت سی ہدایات دیتا ہوا مر علی ابھڑ کے لیے روانہ ہو گیا، جہاں سے واپس تو اسے پندرہ دن بعد آ جانا تھا، لیکن بابا جان کے کچھ کام کی وجہ سے اس کا قیام ایک ہفتہ مزید بڑھ گیا، درویش کے بغیر ایک ایک پل اسے صدیوں کا زمانہ محسوس ہو رہا تھا، آنے سے تین دن قبل اس نے درویش کو فون کیا تو وہ بے حد خوش تھی۔ صدوری نے اس کا

بہت خیال رکھا تھا، بالکل اپنی چھوٹی بہنوں کی طرح۔

”مہر جب واپس آؤ تو جو کچھ میرے لیے لاؤ، ادبی کے لیے بھی ضرور لے کر آنا۔“ فون رکھتے رکھتے وہ اسے تاکید کرتا نہ بھولی۔

”شاید میں ہی صدوری کو نہ سمجھ سکا۔“ پل بھر کو اسے افسوس ہوا، صدوری کے سلسلے میں لگائے گئے اس کے تمام اندیشے غلط ثابت ہوئے، درویش کی خوشی نے اسے بھی اندر تک مطمئن کر دیا۔



دو دن بعد مر علی نے آنا تھا وہ بہت خوش تھی ایک ایک پل اسے گزارنا مشکل ہو رہا تھا، دل چاہتا وقت پر لاگر اڑ جائے اور مر علی اس کے سامنے آکھڑا ہو، ابھی ابھی مر علی سے ملنے کے لیے درمیان میں اڑنا لیس گھنٹوں کا وقت حاصل تھا۔ صدوری اس کی یہ بے قراری کب سے نوٹ کر رہی تھی۔ لیکن کچھ بول نہ پائی، کیونکہ اس وقت اس کا ذہن بہت الجھا ہوا تھا۔ حبیب اللہ نے آج ہی رضیہ کو اس کے گھر واپس بھیج دیا تھا، جس کا طم درویش کو نہ تھا، وہ تو اپنی خوشی میں مگن حویلی والوں کے بدلے روئے بھی نہ جانچ سکی اسے پتا ہی نہ چلا کہ پندرہ دن میں ایک بار بھی حویلی نہ آنے والی اس کی منڈی آج صبح سے وہاں بیوی موجود ہیں؟ وہ تو مر علی کی ہدایت کے مطابق اپنے کمرے میں ہی موجود تھی اسے کیا خبر تھی کہ اس کا کمرہ ہی اس کی قتل گاہ بننے والا ہے۔

مر علی کے بدترین اندیشے درست ثابت ہونے والے تھے، اس کے گرد ملک الموت کا پھیلا یا جانے والا جال کس دیا گیا تھا۔ کاش وہ مر علی کی بات مان لیتی، لیکن وہ جو کہتے ہیں کہ موت کا ایک وقت مقرر ہے تو بالکل درست کہتے ہیں۔ درویش نے اپنا وہ بیگ کھولا ہوا تھا جس میں صدوری نے ڈھیروں ڈھیروں چھوٹے چھوٹے کپڑے ڈال کر بھر دیا تھا، وہ سارے کپڑے بیڑ پر پھیلا کر بیٹھی تھی، صرف دو ماہ بعد اس کا سب سے بڑا خواب پورا ہونے والا تھا۔ وہ ماں بننے والی تھی، دنیا کی سب سے بڑی اور سچی خوشی اس سے محض چند قدموں کے فاصلے پر کھڑی تھی۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ ماں بننے ہی سب سے پہلے مر علی کے ساتھ جا کر آرام سے ملے گی اور اپنی تمام غلطیوں، نا فرمانی اور کوتاہیوں کی معافی مانگے گی، جیسے جیسے ولادت کا وقت قریب آ رہا تھا اس کا دل عجیب سی کیفیات میں گھرتا جا رہا تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ اس نے اپنے خاں باپ کا دل دکھا کر گناہ کبیرہ کیا ہے۔

”بس میرے اللہ مجھے خیریت سے فارغ کرنا، میں ضرور اپنے ماں باپ سے معافی مانگوں گی۔“ دل ہی دل میں پختہ ارادہ کرتی وہ بستر پر نیم دراز ہو گئی کہ ایک دم ہی اس کے تھنوں میں پیٹرول کی تیز بو آئی، جس کی شدت سے اس کا دل متلا گیا وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

”یہ بدبو کہاں سے آ رہی ہے؟ شاید جزیئر میں پیٹرول ڈالا گیا ہے۔“ اس کے کمرے کی کھڑکی باہر گیلری میں کھلتی تھی جہاں ایک عدد جزیئر رکھا ہوا تھا، اس خیال کے آتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی اسے مٹی سی محسوس ہو رہی تھی۔ ہاتھ روم جانے کے لیے وہ کھڑکی کے پاس سے گزری تو اچانک ہی کھڑکی کی گرل سے کسی نے اس پر سیال پھینکا بدبو مزید تیز ہوئی، وہ سر سے پاؤں تک جھجک گئی۔

”پیٹرول۔“ اسے یہ بدبو اپنے کپڑوں سے آئی۔

”یہ مجھ پر پیٹرول کس نے ڈالا ہے۔“ وہ یک دم گھبرا گئی، ایک لمحے کے ہزاروں پل میں ہی اس کی چھٹی حس نے اسے کسی خطرے کا احساس دلادیا، وہ مٹی کرنا بھول گئی اور پلٹ کر دروازے کی طرف بھاگی، دروازہ کھلا ہوا تھا، وہ باہر نکل آئی، دالان میں کوئی نہ تھا، جانے کیوں وہ مزید خوف زدہ ہو گئی، اپنے دودھ کو گھسیٹتی ہوئی وہ بمشکل باہر کی طرف بھاگی، جہاں صحن میں سب ہی جمع تھے، وہ بھاگتے بھاگتے صدوری کے سامنے جا کھڑی ہوئی جو بڑی خاموشی سے اس کی جانب تک رہی تھی۔

”ادی۔۔۔ ادی۔“ اس کی سانس پھول گئی اس سے بات کرنا دشوار ہو گیا اسے لگا وہ ابھی گر جائے گی اس کے قدموں نے اس کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیا۔

”یہ مجھ پر کسی نے پیڑوں پھینکا ہے۔“ وہ انک انک کر اپنی بات مکمل کر گئی۔
 ”کسی نے نہیں میں نے پھینکا ہے؟“ ایک سفاک آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی اس نے پلٹ کر دیکھا یقیناً وہ حبیب اللہ تھا ہاتھ میں تیل کا ڈیا اٹھائے ہوئے اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتی وضاحت طلب کرتی اس نے ڈبے کا سارا تیل اس کے قریب فرش پر گرا دیا وہ جیسے ہی آگے بڑھی سلب ہو گئی اور کرتے کرتے اس نے صدوری کے ہاتھوں میں ماچس کی ڈیا دیکھ لی وہ ہراساں ہو گئی اسے صدوری کی آنکھوں میں اپنے لیے واضح نفرت اور درندگی جھلکتی نظر آ رہی تھی اور یہی نفرت اور سفاکی اس سے کچھ دور کھڑے تمام افراد کے چروں پر درج تھی اس کی ٹانگوں میں جان ہی نہ رہی وہ اٹھ کر کھڑی بھی نہ ہو سکی جب اس نے ماچس کی تیلی کو اپنے جانب بڑھتے دیکھا اس کے حلق سے نکلنے والی دلدوز چیخ نہایت ہی بھیا تک اور دردناک تھی جو اس حویلی کی اوچی اوچی دیواروں میں گھٹ کر دم توڑ گئی۔

☆ ☆ ☆

اس سے پہلے کہ بچھڑ جائیں گے
 دو قدم اور مرے ساتھ چلو
 ابھی دیکھا نہیں جی بھر کے تمہیں
 ابھی کچھ دیر مرے پاس رہو
 مجھ سا بچھڑ کوئی نہ آئے گا یہاں
 روک لو مجھ کو اگر روک سکو

جائے کب کا آیا ہوا درویش کا مہیجہ مرعلی کئی بار بڑھ چکا تھا لیکن ہر بار بڑھنے پر وہ اسے نیایں محسوس ہوتا اور اس کا دل درویش کی محبت سے سرشار ہو جاتا کراچی انٹرپورٹ سے باہر نکلتے ہی اس نے ایک بار پھر درویش کو فون کیا جانے کیوں پچھلے دو دنوں سے اس کا موبائل آف تھا جبکہ وہ جانتی تھی کہ آج مرعلی نے آنا ہے پھر فون کیوں آف ہے؟ اسی سوچ نے اسے پریشان کر رکھا تھا جبکہ بابا جان کی موجودگی میں اپنی پریشانی وہ ظاہر نہ کرنا چاہتا تھا۔

”ہو سکتا ہے بیٹھی ختم ہو گئی ہو یا شاید فون ہی خراب ہو گیا ہو۔“ اس خیال سے اس نے اپنے دل کو تسلی دینے کی کوشش کی لیکن جانے کیوں پچھلے دو تین دنوں سے اس کا دل گھبرا رہا تھا پورے پندرہ دن اس نے روزانہ درویش سے بات کی تھی اگر بابا جان کی مصروفیت کے سبب وجہ فون نہ کرپا تا تو درویش خود کہتی لیکن ان پچھلے دو دنوں سے درویش نے اس سے رابطہ ہی نہ کیا تھا اور یہی بات اس کی پریشانی بڑھانے کا سبب بن رہی تھی باہر غلام رسول گاڑی لے کر ان کا شہر تھا وہ چاہتا تھا کہ بابا جان کے ساتھ اسی وقت گاؤں روانہ ہو جائے لیکن بابا جان بے حد تھکے ہوئے تھے لندن سے کراچی تک کے سفر نے انہیں تھکا دیا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ رات مرعلی کے فلیٹ پر گزار کر صبح روانہ ہونا چاہتے تھے اور مرعلی ان کی حکم عدولی کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا ورنہ اس کے لیے تو اب ایک مل بھی درویش کے بغیر گزارنا دشوار تھا گھر جاتے ہی نہاد حوکر فریش ہونے کے بعد اس نے ایک بار پھر درویش سے رابطہ کرنے کی کوشش کی۔ جو ممکن نہ ہو سکا بے شک وہ بہت تھکا ہوا تھا لیکن درویش کی یاد نے اسے بے چین کر رکھا تھا۔ صبح سویرے ہی بابائی روڈ وہ اپنے گاؤں کی جانب روانہ ہو گیا پانچ گھنٹوں کا یہ سفر اسے پانچ صدیاں محسوس ہو رہا تھا لیکن جانے کیا بات تھی جیسے جیسے گاؤں قریب آ رہا تھا مرعلی کو اپنا دل ڈوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا اسے لگ رہا تھا کہ شاید وہ اب کبھی درویش کو نہ دیکھ سکے گا۔ اس عرصہ میں اس نے کئی بار درویش سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن لا حاصل اس کا رابطہ حبیب اللہ سے ضرور ہوا لیکن وہ درویش کے مشغول کوئی سوال نہ کر سکا۔ جیب حویلی کی چار

دیواری میں اندر داخل ہوئی تو حویلی کی چل چل پہل معمول سے کچھ زیادہ تھی وہ اندر کی جانب بڑھا دالان میں کچھ دریوں پر بیٹھی عورتوں میں درویش نہ تھی۔

”درویش کہاں ہے؟“ بالا خراس سے صبر نہ ہو سکا اس نے صدوری سے سوال کیا جو ابھی ابھی بابا جان کو کمرے میں پہنچا کر واپس آئی تھی اور صدوری کے جواب نے مرعلی کے حواس پر بجلیاں گرا دیں اسے حویلی کے در و دیوار خود پر گرتے ہوئے محسوس ہوئے صدوری کی دی ہوئی خبر نے مرعلی کو ہوش و حواس سے مکمل طور پر بے گانہ کر دیا۔

”درویش کونسا۔۔۔“ یہ خبر تھی یا کوئی ہم دھماکہ جس نے مرعلی کے پر فٹے اڑا دیئے اور پھر جو وہ بے ہوش ہو کر گرا تو پورا ایک ہفتہ لگا اسے مکمل طور پر ہوش میں آنے کے لیے۔

☆ ☆ ☆

جائے کیوں آج صبح سے ہی شہر پارا کا دل بہت بے چین تھا کبھی وہ اوپر جاتی کبھی نیچے ارم کے پاس آ جاتی لیکن اسے کہیں بھی سکون نہ مل رہا تھا سمرن شاہ ویز اور بچوں کے ساتھ اسلام آباد گئی ہوئی تھی جبکہ ولید بھی ان کے ساتھ ہی تھا فانیہ اور سادیہ سے اس کی ویسے بھی کبھی نہ بنی تھی لے دے کر ارم ہی تھی جس کے پاس وہ کچھ دیر جا کر بیٹھ جاتی تھی۔

”سمرن نے کب آتا ہے؟“ کبھی سمرن کے لیے اتنی بے قراری اس کے لیے تھی کہ اسے جانے کیا بات تھی جو آج اسے سمرن کا بے چینی سے انتظار تھا یہ بات ارم نے محسوس تو کی لیکن کچھ بولی نہیں۔
 ”میرا خیال ہے کل تک آجائیں گے آپ کو کوئی کام ہے اس سے۔“ ارم غور سے شہر پارا کو دیکھتے ہوئے بولی جس کے چہرے پر چھائی بے چینی کسی انمولی کا پتا دے رہی تھی۔

”آں۔۔۔ ہاں کچھ نہیں وہ اصل میں دریا ب کا فون پچھلے کچھ دنوں سے مسلسل بند ہے بس اسی لیے میرا دل ہول رہا ہے۔“ دل کا خدشہ زبان تک آئی گیا۔

”ہو سکتا ہے اس نے نمبر تبدیل کر لیا ہو۔“ ارم اطمینان سے کہتی کپڑے تہہ کرتی رہیں۔

”اس کے مہاں سے پوچھ لیں اس کا نمبر بھی تو ہو گا آپ کے پاس۔“

”نمبر تو ہے لیکن وہ یہاں نہیں ہے لندن گیا ہوا ہے۔ درویش بھی گاؤں اپنی سرسراں میں ہے میں نے تو منع بھی کیا تھا نہ سوکن پر اعتبار کرنے جا گاؤں میرا دل نہیں مان رہا لیکن اس نے کبھی کسی کی سنی ہو جواب سنتی اسے تو بیش سے عادت رہی ہے اپنی من مانی کرنے کی جود میں آیا صرف وہی کیا۔“ ساری تفصیل بتاتے بتاتے شہر پارا کی آواز بھرا گئی اور وہ خاموشی سے اٹھ کر اوپر چلی گئی جبکہ ارم حیران سی اسے پیچھے تک دیکھتی رہیں اور پھر جلد ہی شہر پارا کی بے چینی کا راز سب پر کھل گیا۔

☆ ☆ ☆

سمرن آگئی تھی ابھی ابھی وہ اپنے کپڑے وغیرہ الماری میں رکھ کر فارغ ہوئی تھی شہر پارا دو تین چکر لگا کر جا چکی تھی وہ جب بھی آتی سمرن کو مصروف دیکھ کر پتا کچھ کہے خاموشی سے پلٹ جاتی لیکن سمرن اس کی بے چینی بھانپ چکی تھی تیسری بار جب وہ اوپر آئی تو سمرن پوچھے بنانہ رہ سکی۔

”کیا بات ہے امی کوئی کام ہے آپ کو مجھ سے۔“

”ہاں ذرا دریا ب کا تو پتا کر دو گاؤں سے آئی ہے کہ نہیں اس کا موبائل بند ہے گھر کا فون بھی کوئی نہیں اٹھا رہا۔“ شہر پارا کے لیے کا خوف سمرن کو بھی محسوس ہو چکا تھا۔

”جب اس کا فون ہی بند ہے تو کیسے پتا کروں۔“ سمرن کی بات سنتے ہی شہر پارا نے ایک جھوٹی سی ڈائری اس کی سمت بڑھائی۔

”اس میں میرا نمبر ہے ملا کر دیکھو شاید وہ باہر سے آگیا ہو۔“
 مرعلی نے دوسری ہی بیل پر فون ریسیو کر لیا اس نے جیسے ہی شہر پارا کی آواز سنی بلک بلک کر رو دیا اس کا رونا
 شہر پارا کو کسی انمولی کا احساس دل رہا تھا وہ مزید خوف زدہ ہو گئی۔
 ”ممداریہ اب ہم میں نہیں رہی چلی گئی ہے مجھے اس دنیا میں اکیلا چھوڑ کر دور یہ مرگئی ماما۔“ الفاظ تھے یا کوئی ہم
 جو شہر پارا کو اپنے گروڈلاسٹ ہوتا محسوس ہوا اس کے ہاتھ سے فون ہی گر گیا جبکہ اسے آگے بڑھ کر سرن نے
 سنبھال لیا۔

”کیا ہوا امی خیریت تو ہے؟“ وہ گھبرا اٹھی۔ اس سے پہلے کہ شہر پارا کوئی جواب دیتی اس کا فون پھر بچا تھا دوسری
 طرف یقیناً ”مرعلی تھا۔ سرن نے فوراً فون ریسیو کیا اس سے قبل کہ وہ ”ہیلو“ کہتی مرعلی کی کرلائی آواز نہ پہنچیں
 سے ابھری۔

”میں لندن سے آیا تو مجھے پتا چلا دریا بجل گئی ہے ماما میرے گھر والوں کا کہنا ہے کہ رضیہ کی غیر موجودگی کی بنا
 پر وہ بغیر کسی سے کسے چائے بنانے پکن میں گئی تھی جہاں شاید چوہا کھلا رہنے کے سبب گیس بھر چکی تھی ماما جس
 جلائے تھی اسے آگ نے پکڑ لیا رات زیادہ تھی اس لیے اس کی چیخ و پکار پر جب تک سب پہنچے وہ نوے فیصد جل
 چکی تھی وہ جل گئی ماما اس کا جسم جل کر کوئلہ ہو گیا اور میں کچھ نہ کر سکا۔“ وہ بلک بلک کر رو رہا تھا سرن حیرت سے
 گنگ رہ گئی اس کے منہ سے کوئی لفظ ہی نہ نکلا وہ دکھ اور غم کی شدت سے مرعلی سے یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ دریا بجل تو
 چائے ہی نہ پتی تھی پھر وہ کیوں پکن میں گئی؟

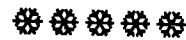
اس سے ملنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ چائے پینا تو درکنار اس نے تو کبھی خود سے اٹھ کر چوہا جلائے کی بھی
 زحمت نہ کی تھی کیونکہ وہ حد درجہ کام چور اور کاہل تھی اور پھر اس حالت میں اتنی خرابی طبیعت کے باوجود کیا
 مجبوری تھی جو دریا بجل کو آدھی رات کو پکن میں لے گئی۔ اتنے ملازمین کے ہوتے ہوئے وہ کیوں پکن میں گئی لیکن
 مرعلی کی مخدوش حالت کے پیش نظر وہ کچھ نہ بول سکی اس سے قبل کہ وہ خاموشی سے فون رکھ دیتی مرعلی کی آواز
 پھر سنائی دی اس کی آواز کا کرب سرن کا دل ہولا رہا تھا۔

”میں نے سمجھا یا تھا کہ میرے گھر والے قابل اعتبار نہیں مگر وہ نہ مانی کیونکہ وہ کبھی کسی کی نہ مانتی تھی اس نے
 ضدوری پر بھروسہ کیا، ضدوری سے محبت کر کے بہت غلط کیا ماما آپ تو جانتی ہیں تاکہ دریا بجل بھی چائے نہیں پتی
 تھی ان سب نے مل کر اسے مار دیا اور میں کچھ بھی نہ کر سکا۔“ مرعلی کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔

”تو یہ خود بھی سب کچھ جانتا ہے، آگئی رکھتا ہے پھر تو میرا کچھ بھی کہنا بے کاری ہو گا۔“ یہ سوچتے ہی سرن نے
 خاموشی سے فون بند کر دیا اور وہیں زمین پر بیٹھتی چلی گئی اس کا دل غم کی شدت سے پھٹ رہا تھا اس کی نگاہوں کے
 سامنے ہنسی مسکراتی خوبصورت ترین دریا بجل کی جو اپنی خوبصورتی کا بہتر استعمال جانتی تھی جو خوبصورتی سے
 محبت کرتی تھی اس دریا بجل کا خوبصورت جسم جل کر کوئلہ بن گیا اس کے تصور میں دریا بجل کا جھلسا ہوا جسم اور چرو
 آگیا اسے جھرجھری سی آگئی۔

”اف میرے خدا یا دنیا میں ہی سزاوار جزا کا حساب کر دیا۔“

اس سوچ کے آنے ہی وہ شہر پارا کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی اسے آج احساس ہوا کہ دریا بجل جیسی
 بھی تھی ان کی اپنی تھی اور اپنوں کا وہ انسان کو کس طرح اندر تک چیر کر رکھ دیتا ہے اس کا اور اک سرن کو ابھی
 ابھی ہوا تھا دریا بجل کی بے بسی اور موت کی اذیت کے احساس نے سرن کے کلیجے کو چھلنی کر کے رکھ دیا اور وہ بے
 ساختہ ہی دوھاڑیں مار مار کر رو رہی گئی۔



شہر دل کے باسی

حویلی کی گھما گھمی اپنے عروج پر تھی۔ والان میں کچھی دروہوں پر لڑکیاں بالیاں جمع ہو کر زور و شور سے ڈھولک
 بج رہی تھیں۔ وقفہ وقفہ سے ان کی ہنسی کی آواز گونجتی تالیوں کے ساتھ مل کر ایک عجیب سا سماں باندھ دیتی۔
 بڑی اماں اپنے جھولے میں بیٹھی یہ سب بڑی دلچسپی اور اشتیاق سے دیکھنے کے ساتھ ساتھ اپنی بڑی منڈ ثریا
 بیگم سے بھی محو گفتگو تھیں، جبکہ پھوپھو الماس اپنی ہم عمر خواتین کے ساتھ والان کے درمیان میں کچھی دروہ پر
 بیٹھی بڑی کے جوڑے ٹانگنے اور سنبھالنے میں دل و جان سے مگن تھیں، آمنہ اور چچی زہرہ پکن میں پلٹتے مختلف
 پکوانوں کی گھرائی کرنے میں مصروف تھیں۔ بیٹھے چاول اور پلاٹھ چھلی کی سوندھی خوشبو پورے والان میں پھیلی ہوئی
 تھی۔ ایسے میں کبھی کبھی مروانے سے آنے والے تیز گانوں اور سیٹیوں کی آواز سب کی توجہ کچھ دیر کے لیے ہی
 سہی اپنی طرف مبذول ضرور کر دیتی، لیکن جلد ہی خواتین ان کی آوازوں کو نظر انداز کر کے اپنی اپنی خوش گہیوں
 میں مشغول ہو جاتیں۔

حویلی کی یہ رونق ابراہیم گھسی کے بڑے بیٹے اور جانشین علی شیر کی بدولت تھی جس کی آج رسم مندی تھی۔
 علی شیر نہ صرف ابراہیم گھسی کا بے حد لاڈلا بیٹا تھا، بلکہ اس حویلی میں منعقد ہونے والی یہ پہلی شادی کی تقریب
 تھی۔ اس لیے خاندان کا ہر فرد بے حد خوش تھا اور سب ہی اپنی اس خوشی کا اظہار بڑھ چڑھ کر کر رہے تھے۔ یہی
 وجہ تھی کہ تقریباً ”ہفتہ بھر سے ہی دوپار کے تمام رشتہ دار حویلی میں جمع تھے اور خوب رونق لگی ہوئی تھی، لیکن
 جانے کیوں خوش نما کا دھیان مروانے سے آنے والی ناچ گانے کی آوازوں میں ہی لگا ہوا تھا“ اس سے رہا
 نہ گیا اور اس نے سو رٹھ کا بازو کھینچ کر اس کی توجہ اپنی جانب مبذول کروائی۔

”سورٹھ! خوشی نے دھیسے سے پکارا گانا گالی سورٹھ نے رک کر اس کی جانب دیکھا۔

”کیا بات ہے؟“ بات کرتے ہوئے بھی سورٹھ نے تیزی سے تالیاں بجانے کا عمل بھی جاری رکھا۔

”او، تھوڑی دیر کے لیے اوپر چھت پر چلیں۔“
”کیوں؟“ سورٹھ کے تالیاں بجاتے ہاتھ پل بھر کو تھمے اور اس نے حیرت سے دریافت کیا۔

”دیکھ کر آتے ہیں، مردانے میں کیا ہو رہا ہے۔“
”لو اس میں دیکھنے کے لیے چھت پر جانے کی کیا ضرورت ہے سب کو پتا ہے کہ وہاں تاپنے والیاں آئی ہوئی ہیں اور ویسے بھی چھت سے دوسری طرف نہیں دیکھا جاسکتا۔“ سورٹھ نے بے پروائی سے جواب دے کر گانے میں شامل ہونے کی کوشش کی۔

”تمہیں نہیں آتا تو بے شک مت آؤ، لیکن میں تو چھت پر جا رہی ہوں۔“ خوشی کہہ کر ہار کی جانب چل دی۔ اسے یقین تھا کہ سورٹھ اس کے پیچھے ضرور آئے گی اور ایسا ہی ہوا، ابھی وہ والان کے دروازے تک ہی پہنچی تھی کہ سورٹھ آگئی۔

”رک جاؤ خوشی! میں بھی چل رہی ہوں۔“ وہ خفگی سے کہتے ہوئے چل دی۔
”لیکن ایک بات بتا دوں، تمہارا چھت پر جانا بالکل بے کار ہے، کیونکہ چھت کی اونچی اونچی دیواروں سے حویلی کے اس پار دیکھنا نہ صرف مشکل بلکہ ناممکن ہے۔“ خوشی نے کوئی جواب نہ دیا۔ صرف کندھے اچکاتے ہوئے آگے کی جانب بڑھ گئی، میڈیوں پر کھل تاریکی کا راج تھا۔ دونوں نہایت خاموشی سے میڑھیاں ملے کر کے اوپر کھلی چھت پر آگئیں، جہاں موجود بڑی بڑی دیوہیکل دیواروں نے خوشی کو یک دم ہی مایوسی سے دوچار کر دیا۔ اس سے قبل اتنے سالوں میں اس نے کبھی ان دیواروں کی بلندی کو جانچا ہی نہ تھا۔ آج غور کیا تو اندازہ ہوا کہ حقیقت میں اس بلندی سے اس پار دیکھنا تقریباً ناممکن ہے۔

”خواتین خوار کی بھلائی دیواروں سے اس پار بھی کچھ دیکھا جاسکتا ہے۔ چلو آؤ واپس چلیں۔“
سورٹھ میڈیوں کی جانب واپس چل دی، کھلی چھت پر ناچ گانے کی آواز کے ساتھ ساتھ ہنسنے کی جھنکار اور تالیوں کا شور بھی کافی تیز سنائی دے رہے تھے، ایسے میں جب کوئی من چلا فانگ شروع کرتا تو شور کی آواز مزید بڑھ جاتی، خوشی کچھ دیر تو کھڑی دیکھتی رہی، لیکن جب دیکھا کہ کامیابی مشکل ہے تو نیچے جاتی سورٹھ کے پیچھے بھاگی اور آواز دی۔

”رک جاؤ، میں بھی آ رہی ہوں۔“ ابھی وہ وہی میڑھیاں اتری ہوں گی کہ اچانک تیز گانوں کی آواز بند ہو گئی اور ساتھ ہی فانگ کی تیز آواز سے پوری چھت دھل گئی۔

”یہ کیا ہوا؟“ یک دم ہی خوشی نے گھبرا کر سورٹھ کا ہاتھ تھام لیا۔
”کچھ نہیں ہوا، کسی ناچنے والی کے پیچھے کوئی ہنکڑا ہو گیا ہو گا۔ یہ تو حویلی والوں کا عام معمول ہے، تم چھوڑو، آؤ نیچے چلیں۔“ سورٹھ اس کا ہاتھ تھام کر تیزی سے میڑھیاں اتر گئی، لیکن جیسے ہی وہ دونوں بڑا سا صحن عبور کر کے والان کے قریب پہنچیں اندر سے آنے والی تیز آوازیں سن کر وہیں ٹھم گئیں۔

”بند کرو سب شور شراب۔“ اچانک ہی ابراہیم گھسی ان کے بھائی یاور گھسی اور علی شیر کے ساتھ چند اور مرد جن میں خوشی کا ماموں اور بڑے تایا کا بیٹا علی گھسی بھی شامل تھے۔ اندر داخل ہوئے ان کی غصیلی آواز سننے ہی لڑکیوں نے گھبرا کر ڈھولک کی تھاپ روک دی اور یک دم اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”اندرا جاؤ تم سب۔“ خوشی کے ماموں اللہ بخش نے لڑکیوں کی جانب دیکھ کر حکم دیا اور صرف ایک لمحہ لگا سارا والان لڑکیوں سے خالی ہو گیا، اب وہاں صرف چند خواتین کے سوا کوئی نہ تھا۔ لگتا ہی نہ تھا کہ چند لمحے قبل یہاں زندگی جاگ رہی تھی۔ پورے والان پر موت کا سا ساٹا طاری تھا۔

”ابراہیم پتہ لگایا بات ہے، خیریت تو ہے؟“ اماں بی نے انجانے اندیشوں میں گھرتے ہوئے سوال کیا، کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ ایسے وقت میں جب تمام عورتیں حویلی میں اکٹھی ہوں، مگر کبھی بھی بنا اطلاع کیے اس طرف نہ آتے تھے اور آج ایک ساتھ اتنے مردوں کا زنان خانہ میں داخلہ کسی انہونی کی نشان دہی کر رہا تھا۔
”خوشی کہاں ہے؟“ ابراہیم گھسی نے ایک نظر اپنی ماں پر ڈالی اور پھر والان کے داخلی دروازے کے قریب کھڑی آمنہ سے سوال کیا۔ قبرستان کے اس سناٹے میں ابھرنے والی ابراہیم کی آواز نے آمنہ کے دل کو اندر تک چیر کر رکھ دیا۔

”الٹی خیر کرنا۔ میری معصوم بچی کی حفاظت کرنا۔“ آمنہ نے لرزتے دل سے بے ساختہ دعا کی، کیونکہ وہ جان چکی تھی کہ خوشی سے کوئی خطا سرزد ہو گئی ہے اور اپنا نام سننے ہی دروازے کے باہر کھڑی خوشی اور سورٹھ وہیں منجمد ہو گئیں۔

”کیوں خیر تو ہے ابراہیم؟ کیا لگایا ہے خوشی نے، تم لوگ بتاتے کیوں نہیں ہو؟“
اماں بی نے ایک نظر گم سم کھڑی آمنہ پر ڈالی اور اپنے بھاری بھر کم وجود کو سنبھال کر بمشکل جھولے سے اٹھ کھڑی ہونے کی کوشش کی، قریب کھڑی دوسری نے تیزی سے آگے بڑھ کر انہیں اٹھنے میں مدد دینا چاہی کہ اچانک ہی علی شیر کی نظر اس پر پڑ گئی اور وہ غصہ سے دھاڑا۔

”تو یہاں کیوں کھڑی ہے؟ سنا نہیں تھا کہ سب لڑکیاں اندر جائیں۔“
دوسری جو شاید بڑی اماں کو بانی دینے کے لیے آئی تھی، علی شیر کی گرج دار آواز سننے ہی کانپ اٹھی اور اس کے ہاتھ سے پانی کا گلاس گر گیا۔ پیشکے کے گلاس کے فرش سے ٹکرانے کی آواز آمنہ کے خوابیدہ اعصاب پر تھوڑا بن کر برسی۔ دوسری خوف زدہ ہو کر اندر کی جانب بھاگی، بڑی اماں کانپتے جسم کے ساتھ اپنے بیٹے ابراہیم گھسی کے سامنے آکھڑی ہوئیں۔

”جہاں تکیوں نہیں ابراہیم لگایا ہے خوشی نے؟“
”اماں سائیں! خوشی کہاں ہے؟ اسے یہاں بلاؤ۔“ ابراہیم کے چہرے پر پتھروں جیسی سختی تھی۔
”پتا نہیں ابھی تو بیٹیں تھیں۔ اندر ہی ہوگی۔“ کسی انجانے اندیشے سے کانپتے دل کے ساتھ بمشکل آمنہ کے منہ سے نکلا اور اس نے دیوار کا سہارا لے لیا۔

اور باہر کھڑی خوشی کو یقین ہو گیا کہ روز حشر آچکا ہے اور اب بنا حساب کتاب دیے اس کی گلو خلاصی ناممکن ہے، اس نے ایک نظر سورٹھ پر ڈالی جو دیوار سے ہی لگی تھوڑا کانپ رہی تھی اور آہستہ آہستہ چلتی والان کے دروازے سے اندر داخل ہوئی، لیکن اپنے سامنے کھڑے افراد کے تیور دیکھ کر اس کے قدموں نے مزید آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔

”وہ رہی خوشی؟“ اس پر نظر پڑتے ہی پھر بھی الماس تیزی سے آگے بڑھیں اور اسے بازو سے تھام کر اپنے بھائی کے سامنے لا کھڑا کیا، ابراہیم گھسی کا کانپتا وجود ان کے غصی و غضب کو ظاہر کر رہا تھا۔ وہ خاموشی سے لب بچھینے سے تکتے رہے۔

”جسید عباسی کو جانتی ہو؟“
علی شیر نے خوشی کے جھکے ہوئے سر پر ایک قہر آلود نظر ڈالتے ہوئے سوال کیا، جبکہ اس سوال نے کمرے میں موجود تمام خواتین کے جسموں سے گویا جان ہی نکال دی، خوشی کے لیے اب کسی بھی بات سے انکار کرنا ناممکن تھا۔

”ہاں!“ اس کے کپکپاتے لبوں سے ہاں کا لفظ سننے ہی علی شیر نے ایک زوردار تھپڑ اس کے منہ پر دے مارا۔

”سجاد کے ساتھ جاؤ اور اسے لے کر جا کر کوٹھڑی میں چھوڑ آؤ۔“ اس نے خوشی کو دھکا دیتے ہوئے بھاگی کو حکم دیا۔ بھاگی نے تیزی سے آگے بڑھ کر خوشی کو تھام لیا اور وہ تقریباً ”تھسیتی ہوئی اس کے ساتھ چل دی۔ اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بالکل مفلوج ہو چکی تھی، جبکہ اس کے پیچھے رہ جانے والوں کو پکا یقین ہو چلا تھا کہ آج کے بعد وہ اسے دوبارہ نہ دیکھ سکیں گے، کیونکہ یہی اس حویلی کی روایت رہی تھی۔



اس کال کو ٹھڑی میں جانے سے کتنے دن بیت چکے تھے۔ اب تو وہ دنوں کا حساب کتاب بھی بھول گئی تھی۔ بھاگی تینوں ٹائم کھانے کی ٹرے اندر سر کاجانی تھی جو شروع شروع میں تو یوں ہی رکھی رہتی تھیں کہ اس کا دل ہی نہ چاہتا تھا کچھ کھانے کو، لیکن آہستہ آہستہ اس نے حالات سے سمجھوٹا کر لیا اور تھوڑا بہت کھانے لگی۔ اسے حیرت تھی کہ وہ اب تک زندہ کیسے ہے؟ کیونکہ اپنے خاندان کی روایتوں سے وہ بخوبی واقف تھی، بہر حال اتنا تو وہ جان چکی تھی کہ اس کی موجودہ زندگی جیند عباسی کی مرہون منت ہے، ضرور اس کی پولیس رپورٹ کی بنا پر حویلی والے اسے زندہ رکھنے پر مجبور تھے، کیونکہ وہ خوشی پر یہ واضح کر چکا تھا کہ وہ اس کی رخصتی کے لیے پہلے کورٹ میں کیس کرے گا، پھر حویلی آئے گا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اسے مناسب حالات کے انتظار میں زندہ رکھا گیا تھا۔ ورنہ اب تک تو اسے مار کر حویلی کے کسی اندھے کنوئیں میں ڈال دیا جاتا اور باہر کسی کو بتا بھی نہ چلتا کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے؟ اب اسے انتظار تھا آنے والے وقت کا، کیونکہ وہ جان نہ پا رہی تھی کہ وقت کا فیصلہ کیا ہوگا، لیکن اتنا ضرور تھا کہ ہر آنے والا دن اس کی مایوسی میں اضافہ کا سبب بن رہا تھا۔



”جلدی جلدی ناشتا کرو، بالاج آرہا ہے، تمہیں کالج چھوڑ دے گا۔“ امی نے بچن کی جانب جاتے ہوئے پلوٹہ کو ہدایت کی، جبکہ بالاج کے ساتھ کالج جانے کا سنتے ہی پلوٹہ کا حلق اندر تک کڑوا ہو گیا۔

”فہ امی! آپ سے کس نے کہا تھا کہ اس سے کہیں کہ مجھے کالج چھوڑ آئے۔ میں خود ہی پبلک ٹرانسپورٹ سے چلی جاتی۔ آخر دنیا کی لڑکیاں جاتی ہیں۔ اب آدھا گھنٹہ اس کا سزا ہوا منہ دیکھوں۔“ اس نے کوفت زدہ ہو کر جواب دیا، لیکن اپنی ماں کے خوف سے آخری جملہ منہ ہی منہ میں بدبہایا تھا۔

”بری بات ہے پلوٹہ! وہ تم سے بڑا ہے۔“

امی نے بچن کے دروازے پر رک کر تنبیہی نگاہوں سے اسے گھورا۔

”اب بڑے ہونے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ منہ ہر وقت انگارے ہی چباتا رہے۔“

”پلو جلدی باہر آؤ میں گاڑی نکال رہا ہوں۔“

اس سے قبل کہ وہ مزید بھگوتی گاؤں کے دروازے پر بالاج کا سنجیدہ چہرہ نظر آیا، جسے دیکھتے ہی پلوٹہ کا سانس حلق میں اٹک گیا۔ اس نے جلدی جلدی سلاسن حلق سے اتارا اور پانی کا ایک بڑا سگھونٹ بھر کر اپنا بیگ اٹھا کر باہر کی جانب دوڑ لگا دی، بالاج گاڑی باہر نکال چکا تھا۔ ٹراؤزر کے ساتھ موجود جو کرز اس بات کی نشاندہی کر رہے تھے کہ وہ کچھ دیر قبل ہی واک سے واپس آیا ہے اور یقیناً ”لبنی جو پلوٹہ کی دین کے نہ آنے کے سبب پریشان تھیں۔ انہیں بالاج کی شکل میں اپنی پریشانی کا حل نظر آ گیا۔ سارے راستے وہ خاموشی سے باہر دیکھتی رہی اور بالاج بھی بنا کچھ کہے ڈرائیور کو تارباہیاں تک کہ گاڑی اس کے کالج کی بلند بالا عمارت کے سامنے جا رک گئی۔

”واپس دین میں آؤ گی کہ میں لینے آؤں؟“ اس کے دروازہ کھول کر باہر نکلنے سے قبل ہی بالاج نے پوچھ لیا اس

خوشی منہ کے بل فرش پر جاگری۔ اس کے ہونٹ کے کنارے سے خون کی باریک لکیر نکلی، خون کا ذائقہ اس کا حلق کو تر کر گیا۔

”دیکھا بابا سائیں! اس بے غیرت کو یہ صلہ دیا ہے اس نے ہمارے لاڈ پیار کا“ آج پوری برادری کے سامنے ہمیں منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا۔“

علی شیر نے اسے بالوں سے پکڑ کر زمین سے اٹھایا اور سیدھا کھڑا کرتے ہوئے بولا۔

اب کسی عورت میں اتنی جرات نہ تھی کہ آگے بڑھ کر خوشی کو اس ظالم کے قہر سے بچانے کی کوشش کرتیں۔ سب کی سب اپنی جگہ پتھر کے بجائے بن کر رہ گئیں۔

”بس بابا سائیں! اب کسی سوال و جواب کی ضرورت نہیں ہے، اسے مار کر اسی حویلی میں گاڑ دو تاکہ سب کو عبرت حاصل ہو کہ بے غیرتی اور بے شرمی کا انجام کیا ہوتا ہے۔“ کافی دیر سے خاموش تماشائی کی مانند کھڑا فلک شیر آگے بڑھا اور اپنے باپ سے مخاطب ہوتے ہوئے نفرت بھری نگاہ بن پڑائی، جبکہ علی شیر کے ہاتھوں کی گرفت اس کے بالوں پر مزید سخت ہو گئی۔ تکلیف کی شدت سے اس کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے، اس کا دوشہ زمین پر گر گیا۔ وہ آج زندگی میں پہلی بار اپنے خاندان کے اتنے مردوں کے سامنے ننگے سر کھڑی تھی، جس کا احساس وہاں کسی کو نہ تھا۔

”خدا کے لیے کچھ ہمیں بھی تو ہٹا لگے کہ ہوا کیا ہے؟“

بالا خیزی اماں اپنی برداشت کھو بیٹھیں اور آگے بڑھ کر اپنے بیٹے کو جھنجھوڑا۔

”یہ دیکھیں یہ کیا ہے؟“ ابراہیم نے جواب دینے کے بجائے اپنے ہاتھ میں پکڑا کاغذ بڑی اماں کے سامنے کر دیا۔

”یہ نکاح نامہ ہے آپ کی اس لاڈلی پوتی کا۔“

یاد رکھی کے الفاظ تھے یا کوئی ہم آمنہ کو ایسا محسوس ہوا، جیسے زلزلہ آگیا ہو، پورے حویلی کے درودیاور لفظ نکاح نامہ سے لرز اٹھے۔

”ہائے میرے اللہ سائیں!“ بڑی اماں دہل اٹھیں، ”یہ کیا کہہ رہے ہو تم۔“ وہ اپنے سینے پر ہاتھ رکھے رکھے زمین پر بیٹھ گئیں۔ ان کی ٹانگوں سے جان نکل گئی ان کا پورا جسم کپکپا اٹھا۔

”سچ کہہ رہا ہوں، ابھی باہر جیند عباسی اپنے باپ بھائیوں کے ساتھ آیا تھا، ان کا مطالبہ تھا کہ خوشی کو ان کے حوالے کیا جائے، پولیس اور مجسٹریٹ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ وہ علی شیر کے ساتھ ساتھ خوشی کی بھی رخصتی چاہتے تھے۔“

ابراہیم نے چھٹکارتی ہوئی آواز میں ساری بات کی وضاحت کی۔

”وہ تو ایس بی ساتھ تھا ورنہ ایک کو بھی زندہ واپس نہ جانے دیتا۔“

علی شیر نے غصہ سے دھاڑتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی خوشی کے بالوں کو جھٹکا دے کر اس کی گردن، کمر تک لگا دی، تکلیف کی شدت سے اس کے منہ سے کراہ نکل گئی۔

”سجاد! سجاد! ابراہیم نے دھاڑتے ہوئے پکارا اور اگلے ہی پل باہر کھڑا سجاد بھاگتا ہوا اندر داخل ہوا۔

”حاضر سائیں۔“ وہ نظریں جھکائے ابراہیم مگسی کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”بی بی بی کو لے جا کر پچھلی کوٹھڑی میں ڈالو، پہلے ذرا ہم اس جیند کو دیکھ لیں۔ پولیس لے کر ہمارے احاطے میں آنے کی جرات کی ہے آج اس نے۔ پھر اس کو دیکھیں گے۔“ یہ کہہ کر ابراہیم باہر نکل گئے۔

”بھاگی! بھاگی! علی شیر دھاڑا اور کانپتی ہوئی بھاگی اندر داخل ہوئی۔

نے ایک نظر بالاج کی جانب دیکھا جو اسی کو دیکھ رہا تھا۔ ”میں کیا پوچھ رہا ہوں؟ واپس کیسے آؤ گی؟“
 ”وین میں۔“ اس نے باہر نکل کر جواب دیا۔

”ایک منٹ بات سنو میری۔“ اسے پیچھے سے بالاج کی آواز سنائی دی۔

”اللہ خیر کرے۔ اب جانے کیا ہو گیا؟“ وہ دل ہی دل میں گھبراتے ہوئے واپس پلٹی۔

”یہ تم کالج چادر اوڑھ کر کیوں نہیں آتیں؟“ جس بات کا خدشہ تھا وہ سامنے آئی گئی۔ اب اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔

”میں نے چچی جان سے بھی کہا تھا اور تم سے بھی کئی بار کہا ہے، لیکن جانے کیوں تم پر کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ سہرا حال اگر اب میں نے تمہیں بنا چادر کالج آتے دیکھا تو یاد رکھنا، وہ دن تمہارا کالج کا آخری دن ہو گا۔“

اس نے غصہ سے کہتے ہوئے پلوٹھ کے تخت زدہ سرخ ہوتے چہرے پر ایک نظر ڈالی اور تیزی سے گاڑی نکالتا ہوا چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی پلوٹھ کی جان میں جان آئی اور وہ جلدی جلدی سے کالج کا گیت عبور کر کے اندر داخل ہو گئی۔

وہ آج تک بالاج کے روز کو نہ سمجھ پائی تھی، وہ اپنے ہم عمر لڑکوں سے قدرے مختلف طبیعت کا حامل تھا۔ اس کا کوئی دوست نہ تھا اور اگر تھا بھی تو وہ اسے گھر تک نہ لایا تھا۔ پلوٹھ نے جب سے ہوش سنبھالا تھا، بھی اسے رات گئے تک گھر سے باہر نہ دیکھا تھا۔ گھر میں بھی اس کا رویہ سب کے ساتھ بہت ہی نپا تلا ہوتا۔ وہ پلوٹھ کا تایا زاد تھا۔ پلوٹھ کے ابو رحمان احمد تین بھائی تھے۔ سب سے چھوٹے و سیم احمد جو اکثر تختے اپنی بیوی بچوں کے ساتھ سعودی عرب کے شہر دام میں تھے، جبکہ رحمان صاحب سے بڑے بھائی اور والے فلور میں ہی رہتے تھے، ان کے دو بی بچے تھے، بڑا بالاج اور چھوٹا جس کی شادی میٹرک کے فوراً بعد ہی ہو گئی تھی اور اب وہ دو سالہ بیٹے ارحم کی ماں تھی۔ بالاج کا رویہ اپنی بہن سے بھی بہت سخت ہوتا اور اسی بات پر پلوٹھ ہمیشہ حیران ہوتی، کیونکہ اس کے دونوں چھوٹے بھائی اس سے بے حد محبت کرتے تھے۔ ایسے میں نمروا سے بے چاری سی لگتی جس کی پیدائش کے فوراً بعد تائی جی کا انتقال ہو گیا۔ اس کی پرورش بھی پلوٹھ کی امی نے ہی کی، ذرا سا ہوش سنبھالتے ہی بالاج نے اس پر کڑی نگرانی شروع کر دی تھی۔ اسے کبھی کوئی دوست بنانے کی اجازت نہ تھی، وہ شروع سے ہی عیبیا پسندی تھی، حالانکہ وہ برہان کی شوٹیں بھی، پھر بھی اسے مزید تعلیم حاصل کرنے کی اجازت نہ مل سکی اور اس مسئلہ پر ہمیشہ بالاج نے نایا جی کا ہی ساتھ دیا، یہاں تک کہ کبھی رحمان صاحب نے بھی انہیں سمجھانے کی کوشش نہ کی۔

کبھی کبھی تو پلوٹھ کو ایسا محسوس ہوتا کہ نایا جی اور بالاج کسی خوف کا شکار ہیں اور یہ خوف ہی ہے جو نمروا کی سخت نگرانی کا سبب ہے اور وہ خوف کیا تھا جس نے نایا جی اور بالاج کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ آج تک پلوٹھ نہ جان پائی تھی، لیکن اسے اتنا احساس ضرور تھا کہ کچھ نہ کچھ ایسا ضرور ہے جس کا علم صرف اسے اور نمروا کو نہیں ہے باقی سب جانتے نہیں یا ہو سکتا ہے، نمروا بھی جانتی ہو، سہرا حال نمروا کی موجودگی میں بالاج کا دھیان اس کی طرف تھا تو ضرور، لیکن اتنا نہ تھا جتنا نمروا کی شادی کے بعد ہو گیا تھا۔ یقیناً اگر اس کا بس چلتا تو وہ پلوٹھ کو کبھی بھی کالج پڑھنے کی اجازت نہ دیتا۔ وہ تو رحمان صاحب کی وجہ سے خاموش رہا جو چاہتے تھے کہ پلوٹھ اعلیٰ تعلیم حاصل کرے۔

وہ ہمیشہ کالج وین سے آتی جاتی اسے کبھی بھی پبلک ٹرانسپورٹ میں اکیلے سفر کی اجازت نہ تھی، یہاں تک کہ وہ اکیلے کبھی اپنی خالہ یا ماموں کے گھر بھی ایک رات نہ رہی تھی۔ وہ جب بھی ان کے گھر جاتی ہمیشہ اپنی امی کے ساتھ ہی جاتی اور پھر ان ہی کے ساتھ واپس آجاتی، یہاں تک کہ وہ اپنی کسی دوست کے گھر بھی نہ جاتی تھی، کیونکہ اس بات کی اسے اجازت نہ تھی۔ چونکہ وہ خود کسی کے گھر نہ جاتی تھی۔ اس لیے کبھی کوئی لڑکی بھی اس کے گھر نہ آتی

تھی، یہی وجہ تھی کہ وہ شروع سے ہی نمروا کے زیادہ قریب رہی۔

نمروا اس سے تقریباً ”ڈیڑھ سال“ بڑی ہونے کے باعث اس سے اسکول میں بھی ایک سال سینئر تھی۔ اس سب کے باوجود ان دونوں کی دوستی مثالی تھی۔ نمروا کا شوہر حماد بھی ایک اچھا انسان تھا۔ وہ اپنی امی کے ساتھ اکثر اوقات ہی نمروا سے ملنے جاتی تھی اور وہاں بھی اسے رات رات کے کی اجازت نہ تھی۔ اپنے گھر میں ہر سہولت میسر ہونے کے باوجود گھروالوں کی یہ احتیاط اور رویہ ہمیشہ اس کی سمجھ سے بالاتر رہا۔ کبھی کبھی تو اسے یہ سب کچھ بہت پر اسرار سا لگتا تھا۔ خاص طور پر اس وقت جب بالاج کی نگرانی اس پر کڑی ہوتی۔ ایسے میں اسے خواہ مخواہ ہی الجھن ہونے لگتی اور اس کا دل اسے بغاوت پر اکساتا، یہی وجہ تھی کہ آج وہ جان بوجھ کر چادر کے بغیر کالج آئی تھی۔ اور اس کا مقصد محض بالاج کو تنگ کرنا تھا، جس میں وہ خاصی حد تک کامیاب بھی ہو گئی تھی، لیکن اب پچھتا رہی تھی کیونکہ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ بالاج بہت غصہ میں واپس گیا ہے اور یقیناً ”واپس میں اسے ایک نفیثہ عدالت کا سامنا کرنا پڑے گا“ جس میں بالاج کے ساتھ اس کی امی بھی شامل ہوں گی۔ سہرا حال اب توجہ ہونا تھا ہو چکا، کیونکہ گہرا وقت واپس نہیں آتا۔

”اے اللہ مجھ پر رحم کرنا، میں اس کھڑوس شخص کے ساتھ کیسے زندگی گزاروں گی؟“

ان ہی پریشان کن سوچوں میں گہری وہ اپنی کلاس کی جانب چل دی۔

اسے دو دن سے بخار تھا، یہی وجہ تھی کہ اس نے کھانا بالکل بھی نہ کھایا تھا، کھانے کی ٹرے جوں کی توں واپس جاری تھی۔ مایوسی نے اسے بڑی طرح جکڑ رکھا تھا۔ کبھی کبھی اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے یہ کال کو نمروا کی قبر میں تبدیل ہونے والی ہے اس جیسی نفس طبیعت کی حامل لڑکی کو آج کئی دن ہو گئے تھے لباس تبدیل کیے ہوئے، یہاں تک کہ اس نے منہ بھی نہ دھوا تھا۔ سر میں کنگھا کرنا تو دور کی بات اس وقت اگر کوئی اسے اس حال میں دیکھ لیتا تو یقین ہی نہ کرنا کہ یہ خوشنما ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ اس کی ہمت جواب دیتی جا رہی تھی۔ ہر نیا دن اسے خاموش موت کی جانب دھکیل رہا تھا اور آج تو دلے بھی صبح سے ہی اس کی طبیعت خراب تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑی بھی نہ ہو پا رہی تھی اور ایسے میں جب وہ مایوسی کے گھپ اندھیرے میں ڈوبی بستر پر لیٹی سسکیاں لے رہی تھی کہ بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ یقیناً ”بھائی آئی ہو گی۔ کھانا رکھنے، مجھے اس سے کہنا چاہیے کہ میرے لیے کوئی میڈیسن ہی لے آئے شاید کسی کے دل میں رحم آجائے اور مجھے بخار کی کوئی دوا ہی نصیب ہو جائے۔ یہی سوچ کر اس نے اپنے نوٹے بدن کے ساتھ بمشکل کر دلی اور باہر دروازے کی جانب دیکھا اور ملگجی روشنی میں اندر داخل ہونے والی شخصیت پر جیسے ہی اس کی نظر پڑی۔

”بڑی اماں! آپ۔“ خوشی کے مارے وہ ہلکے ہلکے کر رو پڑی۔

”ہاں میری بچی، آئیے تو نے کیا ظلم کیا اپنی ذات کے ساتھ۔ ہم تو تجھے بہت سمجھ دار سمجھتے تھے، ہمیں کیا پتا تھا کہ تو یہ بدنامی اور رسوائی کا طوق اپنے ساتھ ساتھ ہمارے گلوں میں بھی ڈال دے گی۔“

بڑی اماں نے اس کی چارپائی پر بیٹھ کر بڑے ہی تاسف سے کہا۔ بڑی اماں کے سرور سے اس کی خوشی کو پبل بھر میں کافور کر دیا اور اس کا سر شرمندگی سے جھک گیا۔

”ذمہ خوشی! تو اچھی طرح جانتی تھی، ذرا بامعنی تیرا منگیت تھا تو اس کی ٹھیکرے کی منگ تھی، پھر تو نے ایسا بے حیائی والا کام کیوں کیا؟ کیوں اپنے دشمنوں کے ساتھ مل کر ہماری عزت کو سہرا زار رسوا کیا۔ ہمارے سروں میں خاک ڈالی، بول خوشی! تو نے کیوں ایسا کیا، کیا تیری جوانی اتنی منہ زور ہو گئی تھی کہ تجھے اپنے پرانے کا احساس بھی بھول گیا۔ کیا تو اس حویلی کی روایات سے واقف نہ تھی جو تیرے قدم ہلک گئے۔“

بڑی اماں مسلسل اسے لاتا رہی تھیں اور جواب میں وہ کچھ بھی بول نہ پا رہی تھی، آنسو مسلسل اس کی آنکھوں سے رواں تھے۔

”تو نے ہمیں خوب سزا دی اس لاڈ پیار کی جو ہم نے تجھ سے کیا۔ تیرے اس ایک غلط قدم نے حویلی کی ساری لڑکیوں پر کھلنے والے تعلیم کے دروازے بند کر دیے، پر تجھے کیا باتو نے تو اپنی مرضی پوری کر لی تھی۔“ بڑی اماں کے لہجہ میں تھوڑا غصہ بول رہا تھا۔

”بڑی اماں! مجھے معاف کرویں، پلیز بابا سائیں سے کہیں، صرف ایک دفعہ اگر میری بات سن لیں، خدا کے لیے بڑی اماں!“

اس کے اعصاب جواب دے گئے اور وہ بلک بلک کر رو پڑی۔ اس کا ذہن جس جذباتی توڑ پھوڑ کا شکار تھا، اس کی بنا پر اسے ایسا محسوس ہوا کہ اگر آج بڑی اماں یہاں سے واپس چلی گئیں تو دوبارہ شاید کسی اپنے کا چہرہ اسے دیکھنا نصیب نہ ہو۔

”نہیں نے تجھے کیا معاف کرنا ہے، تو تو جانتی ہے میرے اختیار میں کچھ نہیں ہاں اگر تو اپنے باپ اور بھائیوں کی بات مان لے تو شاید تیری جان بخشی ہو جائے، دیکھ خوشی! اگر تو اس زندان سے زندہ سلامت نکلنا چاہتی ہے تو وہ ہی کر جو تیرے وارث تجھ سے چاہتے ہیں۔“

”وہ مجھ سے کیا چاہتے ہیں بڑی اماں؟“

”اگر جنید عباسی سے طلاق حاصل کرنے کی صورت میں مجھے میری بچھلی زندگی واپس مل جائے تو بھی مجھے منظور ہے، یقیناً اس سے زیادہ میرے باپ، بھائیوں کا مطالبہ اور کیا ہو گا۔“ وہ دل ہی دل میں جنید عباسی سے طلاق کے لیے خود کو راضی کر چکی تھی۔

”یہ تو میں نہیں جانتی۔ بہر حال ابراہیم کا کہنا ہے کہ اگر تو ان کی بات مان لے تو بہت جلد رہائی تیرا مقدر بن سکتی ہے۔“

”میں ان کی ہر بات ماننے کے لیے تیار ہوں بڑی اماں! بس مجھے یہاں سے باہر نکالیں۔“ اس نے بے اختیار بڑی اماں کے ہاتھ تھام لیے۔ انہوں نے خوشی کو گلے لگا لیا۔

”نہ رو خوشی! بڑی اماں نے اپنا لڑنا ہاتھ اس کے سر پر رکھا۔

”دیکھ خوشی! میری بات دھیان سے سن۔“ انہوں نے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے کہا۔

”تجھے آج رات کسی بھی وقت شہر جانا ہو گا۔ میری بیٹی تو نہیں جانتی جنید عباسی نے ہمیں کتنا ستایا ہوا ہے، وہ رات کو بھی مجسٹریٹ اور پولیس کے ساتھ حویلی آیا تھا۔ تجھے بازیاں کروانے وہ کہتا ہے کہ ہم نے تجھے قتل کر دیا ہے۔ اس نے تیرے قتل کا مقدمہ تیرے باپ کے خلاف درج کروا دیا ہے۔ وہ تو حویلی کی تلاشی کے وارنٹ بھی لایا تھا، لیکن ایسے برے وقت میں تیرے باپ کے تعلقات کام آگئے اور اوپر سے آنے والے فون نے پولیس کو واپس جانے پر مجبور کر دیا، لیکن ہمیں یقین ہے وہ بد بخت پھر آئے گا۔ پہلے ہی اس لڑکے نے ہمیں کہیں گاہ نہیں چھوڑا، سارے مروتھانے پکھڑیوں کے چکر لگا رہے ہیں، کل بھی تیرے بھائی علی شیری کی پیشی ہے۔ اسی لیے وہ شہر گیا ہوا ہے، اس کے دائرے کیے ہوئے مقدموں نے ہماری پستوں کی عزت کو مٹی میں بدل دیا ہے۔ آج اگر وہ حکومت کے اعلیٰ عہدے پر پہنچ گیا ہے تو اس کا یہ مطلب تو نہ ہوا کہ شریفوں کی پگڑیاں اچھالتا پھرے اور ان کے گریبان پر ہاتھ ڈالے، لیکن کیا کریں ہم تو مجبور ہیں، خود اپنی اولاد کے ہاتھوں جن کی ناعاقبت اندیشی نے یہ خاک ہمارے سروں پر ڈالی۔“

بڑی اماں اتنے سارے انکشافات کرتے ہوئے ایک آہ سرد بھر کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور ان کے انکشافات نے

”پہلو۔“

پلو نے سر اٹھا کر دیکھا، سامنے نہایت ہی خوب صورت اور طرح دار لڑکی کھڑی تھی۔

”میں یہاں بیٹھ سکتی ہوں تمہارے پاس؟“

”وائے ٹائٹ۔“ اس نے مسکرا کر جواب دیا، لڑکی دھپ سے اس کے سامنے ہی گھاس پر بیٹھ گئی۔

”مجھے سبب نہ کہتے ہیں اور تم؟“ لڑکی نے اس کی جانب اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوئے مسکرا کر تعارف کروایا۔

”پلو! احمق۔“ پلو نے کو جانے کیوں پہلی ہی نظر میں وہ لڑکی اچھی لگی تھی، ورنہ عام طور پر وہ کسی سے زیادہ گھٹنے ملنے کی عادی نہ تھی۔

”وہ تمہارا نام بھی تمہاری ہی طرح خوب صورت ہے۔“

سبب نے مسلسل چیونٹہ گم چباتے ہوئے تبصرہ کیا، جبکہ پلو صرف مسکرا دی۔

”یہ تمہارے لیے۔“ اس نے اپنے یونیفارم کی جیب سے چیونٹہ نکال کر اس کی جانب بڑھائی۔

”تھینک یو۔“

”کیا مصیبت ہے بار! اینٹین میں اتار رہے کہ۔“

تیزی سے بولتی ہوئی وریشہ کی زبان کو بریک لگ گیا، جیسے ہی اس کی نگاہ پلو سے قریب بیٹھی سبب پر پڑی۔

اس سے قبل کہ وہ کچھ پوچھتی سبب نے خود ہی بول پڑی۔

”پہلو آئی ایم سبب۔“ اور اپنا ہاتھ وریشہ کی جانب بڑھا دیا۔ ”میں بھی کچھ دن قبل ہی میرے والد کا لڑنا سفر یہاں ہوا ہے، اس لیے آپ کے کالج میں ہی بنی ہوئی اور چاہوں گی کہ آپ دونوں مجھ سے دوستی کریں، مگر کوئی اعتراض نہ

ہو تو۔“ اس نے مکمل وضاحت پیش کی۔

”نہیں یا! اس میں اعتراض والی کیا بات ہے؟“ پلوٹہ کے جواب نے وریشہ کو حیرت زدہ کر دیا کیونکہ وہ جانتی تھی کہ پلوٹہ دوستی کے معاملے میں خاصی محتاط طبیعت کی مالک تھی اور کسی بھی لڑکی سے کم ہی دوستی کرتی تھی اس کی اور وریشہ کی دوستی تو اسکول کے زمانے سے تھی۔ دونوں کے گھر بھی ایک ہی محلے میں تھے جس کی بنا پر ان کی گھریلو واقفیت بھی تھی وریشہ بالاج احمد اور پلوٹہ کے درمیان موجود رشتہ سے بھی واقف تھی اور اسے ہمیشہ یہ بات اچھی لگتی تھی کہ گھر میں اتنی یا بند یوں کے باوجود بالاج نے بھی ان دونوں کی دوستی پر اعتراض نہ کیا تھا یہاں تک کہ اگر کبھی پلوٹہ کو اس سے کوئی کام ہو تو بالاج بخوشی اس کے ساتھ وریشہ کے گھر بھی آجاتا حالانکہ باہری کھڑا رہتا اور پلوٹہ جلدی جلدی کام لے کر چلی جاتی ویسے بھی ان دونوں کے گھر کا ماحول بھی تقریباً ایک ہی جیسا تھا جس کی بنا پر انہیں کبھی کوئی مسئلہ پیش نہ آیا تھا، لیکن ان کے درمیان بیٹھی الزام اور دن سی سب سے ان دونوں سے بالکل بھی چھپ چھپ نہیں ہو رہی تھی۔

”یہ کولڈ ڈرنک تم لے لو میں اور لے آتی ہوں۔“

وریشہ نے ایک کولڈ ڈرنک پلوٹہ کو پکڑا کر دوسری سب سے ان کی جانب بڑھائی۔

”نہیں سو ری یا! میں کولڈ ڈرنک نہیں پیوں گی، میرا گلہ خراب ہے بس تمہارے ساتھ سمو سے شیر کر لوں گی! تم بیٹھ جاؤ۔“

وہ بڑے مزے سے سامنے رکھی پلیٹ سے سمو اٹھا کر کھانے لگی۔ اسے دیکھ کر محسوس ہی نہ ہو رہا تھا کہ ان کی اس لڑکی سے پہلی ملاقات ہے یا یقیناً وہ ایک پر اعتماد اور خاصی فرینک سی لڑکی تھی اس کی ہر حرکت کا بغور جائزہ لیتے ہوئے وریشہ نے دل ہی دل میں یہ اعتراف کیا۔

نمو کی طبیعت پچھلے کچھ دنوں سے خراب تھی۔ لہذا حماد بھائی کی درخواست پر امی تقریباً روزانہ ہی دوسرے کے بعد اس کے گھر چلی جاتی تھیں اور رات واپسی میں حماد بھائی گھر چھوڑ جاتے۔ نمو کی ساس تو انہیں نہیں، دونوں ننڈیں بھی دوسرے شہر میں رہتی تھیں۔ یہ یہ وجہ تھی کہ گھر میں کام والی کے ہونے کے باوجود اسے اور ارحم کو دیکھنے کے لیے امی کو روز ہی جانا پڑتا، لیکن آج چونکہ اتوار تھا اور صبح سے ہی شیوہ کے ساتھ مل کر امی نے کپڑے دھونے کی مشین لگائی ہوئی تھی اور ابھی بچن کا کام بھی باقی تھا ایسے میں حماد بھائی کے فون نے امی کو بوکھلادیا، نمو کی طبیعت زیادہ خراب تھی آخر بہت سوچ کر وہ پلوٹہ کی جانب آئیں جو مشین سے کپڑے نکال نکال کر شیوہ کو دے رہی تھی۔

”تم جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ میں بالاج کا پتا کرتی ہوں۔ تمہیں نمو کے گھر چھوڑ آئے۔ اس کی اپنی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے اور ارحم بھی بہت تنگ کر رہا ہے۔“

یہ کہتے ہوئے وہ تیزی سے سیڑھیوں کی جانب بڑھ گئیں، تاکہ بالاج کو دیکھیں کہ وہ گھر پہنچا یا نہیں، جبکہ پلوٹہ کا دل نمو اور ارحم سے ملنے کے تصور سے ہی کھل اٹھا۔

”یہ بانی کپڑے مشین سے تم خود نکال لو۔“

شیوہ کو کہہ کر اس نے قریب ہی رکھے تلیہ سے ہاتھ صاف کیے اور اندر کمرے کی جانب چل دی اور تقریباً پندرہ منٹ میں ہی تیار ہو کر وہ باہر آچکی تھی۔ اس نے جلدی سے بچن کی کینٹ کھول کر بسکٹ کے کچھ ڈبے اور چپس کے پیکٹ شاپر میں ڈالے، پھر فرنج میں رکھا ہوا اہتمام کا چاکلیٹ کا پیکٹ بھی نکال لیا۔

”خیر ہے۔ اہتمام اور لے آئے گا۔“ ویسے بھی وہ تینوں بہن بھائی ارحم سے بے حد محبت کرتے تھے۔ سارا

سامان شاپر میں ڈال کر وہ جیسے ہی باہر نکلی نظر ارحم سے آتے بالاج پر پڑ گئی۔ بلیک کرتے شلوار میں وہ کمنیوں تک آسمنیں فولد کیے بے حد سنجیدہ چہرے کے ساتھ بھی نظر لگ جانے کی حد تک اچھا لگ رہا تھا۔

”تیار ہو گئی ہو تو آ جاؤ۔“ پلوٹہ سے کہتے ہوئے وہ لاؤنج کے دروازے کی سمت بڑھ گیا۔

”ایک منٹ ٹھہرو بیٹا! امی بالاج کو روک کر تیزی سے بچن کی جانب بڑھ گئیں، اس نے سامنے صوفے پر رکھی کالی چادر اٹھا کر اوڑھ لی۔

”یہ لے جاؤ اس میں نمرو کے لیے سوپ ہے اور میں نے کھانا بھی بیک کر دیا ہے۔“

لبنی نے اسے ہدایت کی، لیکن اس کے آگے بڑھنے سے قبل ہی بالاج نے ان کے ہاتھ سے شاپر تھام لیا اور باہر کی جانب چل دیا۔ وہ خاموشی سے اس کے پیچھے چلتی ہوئی باہر کھڑی گاڑی میں جا کر بیٹھ گئی۔

”تمہاری پڑھائی کیسی جارہی ہے؟“ بالاج نے گاڑی اشارت کرتے ہی سوال کیا۔

”جی اچھی جارہی ہے۔“ وہ آہستہ سے جواب دے کر باہر دیکھنے لگی۔

”اگر کبھی پڑھائی کے سلسلے میں کوئی مدد چاہیے ہو تو مجھے بتا دینا۔ میں یونیورسٹی سے اگر گھر ہی ہوتا ہوں۔“

”جی اچھا۔“ اور پھر سارے راستے ان کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔ تقریباً بیس منٹ بعد ہی نمرو کا گھر آگیا۔ بالاج نے گاڑی سے باہر نکل کر گیٹ کی تیل بجائی۔ وہ خاموشی سے گیٹ کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ دروازہ نمرو کی کل وقتی ملازمہ ناہید نے کھولا۔ وہ پلوٹہ کو دیکھتے ہی کھل اٹھی۔

”شکر ہے باجی آپ آ گئیں۔ ارحم نے تو رو کر پورا گھر سربراٹھا رکھا ہے۔“ پلوٹہ بنا جواب دیے اندر داخل ہو گئی۔ بالاج سارا سامان ناہید کو تھما کر باہر سے ہی چلا گیا۔

اندر داخل ہوتے ہی وہ نمرو اور اس کے گھر کی حالت دیکھ کر حیران و پریشان ہی رہ گئی۔ لگتا ہی نہ تھا کہ یہ گھر نمرو جیسی نفاست پسند لڑکی کا ہے۔ ارحم الگ گندہ میلا پھر رہا تھا۔ اسے یہاں آکر پتا چلا کہ نمرو ریجنٹ تھی اور اس کی بے حد کمزوری کے باعث ڈاکٹرز نے اسے مکمل بیڈ ریسٹ بتایا تھا ایک تو کم عمری کی شادی اور پھر جلدی جلدی ہونے والی ریجنٹ سنسی نے اس کی حالت ابتر کر رکھی تھی اسے اپنی اس چھوٹی سی کرن پر یک دم ہی ڈھیروں ڈھیر پار آگیا، جہاں نمو اور ارحم اسے دیکھ کر بے حد خوش ہوئے وہاں حماد بھائی بھی مطمئن ہو گئے، پھر جلد ہی اس نے ناہید کے ساتھ مل کر سارا گھر سمیٹ دیا، ارحم کو نسلادھلا کر صاف کپڑے پہنا دیے اور فارغ ہو کر اس کے ساتھ کمپیوٹر گیم کھیلنے لگ گئی، سارا دن کیسے گزرا، اسے پتا ہی نہ چلا، وہ تو جب مغرب کے وقت بالاج اسے لینے آیا تو اندازہ ہوا کہ رات ہو چلی ہے۔ نمو اور حماد نے بہت کوشش کی کہ وہ رات ان کے گھر رہ جائے، کیونکہ کل کالج کی چھٹی تھی، لیکن بالاج نے سننے ہی بغور انکار کر دیا، جبکہ ارحم اس کے جانے کا سن کر پھر سے رونے لگا تھا۔

”کل میں صبح ہی چچی جان کو تمہارے پاس چھوڑ جاؤں گا۔“ بالاج نے نمو کے بار بار ضد کرنے پر اسے حتیٰ انداز اختیار کرتے ہوئے سمجھایا۔

”چلو اب جلدی کو دیر ہو رہی ہے، نمو کو سمجھانے کے ساتھ ساتھ وہ پلوٹہ سے مخاطب ہوا جو نمو کے قریب ہی کھڑی دعا کر رہی تھی کہ بالاج مان جائے اور وہ ایک رات ارحم کے ساتھ گزارے، کیونکہ اسے نمو اور ارحم کو دیکھ کر ترس آ رہا تھا، لیکن بالاج کے باہر نکلتے ہی وہ بھی سب سے مل کر مرے مرے قدموں سے باہر جا کر گاڑی میں بیٹھ گئی، اسے حیرت تھی کہ سگی بہن کو اس حال میں دیکھ کر بھی یہ شخص کوئی سمجھوتہ کرنے کو تیار نہ تھا اور پھر واپسی کا سارا راستہ اسی سوچ میں کٹ گیا کہ وہ بالاج جیسے سخت مزاج اور انتہا پسند شخص کے ساتھ ساری زندگی کیسے گزارے گی۔

”میں تو شاید مر ہی جاؤں گی، یہ تو مجھے کیسے جانے ہی نہ دیا کرے گا۔“ اس سوچ کے آتے ہی پلوٹہ کو خود پر ترس



چھ سات گھنٹوں کے مسلسل سفر کے بعد جیپ رک چکی تھی اور رات کے سناٹے میں جیپ کے تیز بارن کی آواز سن کر اندازہ ہو رہا تھا کہ منزل آچکی ہے، سارے راستے بخار کی شدت کے سبب وہ حالت غودگی میں رہی تھی اس کا سر بھاگی کی گود میں تھا جو نہایت ہی عزت و احترام اور پیار و محبت سے اپنی ماں کے سر کو دلاتی آئی تھی۔ جیپ رکے ہوئے دو منٹ سے زیادہ وقت ہو چکا تھا جب گاڑی کا دروازہ کھلنے کی آواز کے ساتھ ہی سجاد کی آواز بھی سنائی دی۔

”چلو بی بی جی کو لے کر باہر آ جاؤ۔“ وہ یقیناً ”بھاگی سے مخاطب تھا، بھاگی نے بنا کوئی جواب دے لے اسے اٹھا کر بٹھایا، پھر اس کی چادر کو درست کرتے ہوئے پاؤں میں چپل پہنائی اور پھر اسے تھامتے ہوئے پیچھے اتر گئی، اس کا سر بری طرح چکرا رہا تھا اور پاؤں زمین پر ٹک نہ رہے تھے۔ بھاگی کے سہارے تقریباً ”گھٹکتی ہوئی“ وہ جیسے ہی اندر داخل ہوئی پہلے نگاہ سامنے کو فرکے ساتھ کھڑے بھائیوں پر پڑی۔ اس کے نگے بھائی علی شیر اور فلک شیر اس کے وجود سے قطعاً ”بے نیاز“ کھڑے تھے بالکل ایسے جیسے اپنے سامنے کھڑی اس بد حال لڑکی سے ان کا کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔

”راستہ میں کوئی مشکل تو پیش نہیں آئی؟“ فلک شیر نے یہ سوال یقیناً ”سجاد سے کیا تھا۔

”نہیں چھوٹے سائیں! ہم بڑی احتیاط سے یہاں تک آئے ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ اب تم جاؤ اور بھاگی! اسے اندر لے جا کر نملا دھلا کر کپڑے تبدیل کر دو اور پھر کچھ کھانے کو

دو۔“

”چھوٹے سائیں! بی بی سائیں کو بہت بخار ہے جی۔ یہ تو کئی دنوں سے کچھ بھی نہیں کھا رہیں۔“ بالا خربھائی سے رہانہ گیا اور وہ بول ہی پڑی۔

”ٹھیک ہے، ابھی صندل آتی ہے۔ وہ اسے کوئی دوا دے دے گی۔ تم اسے لے جاؤ اندر۔“

وہی مختارت بھرا لہجہ اور وہ جو اپنے بھائیوں سے ہمدردی کی امید کر رہی تھی، اس بے نیازی پر اندر تک ٹوٹ گئی، اس بے نیازی نے اس کی روح کو چھلنی کر دیا وہ مردہ روح کے ساتھ ان کی جانب دیکھتی رہ گئی، علی شیر نے تو اس کے پاس سے گزرتے ہوئے اک نگاہ اس پر ڈالی بھی تھی جو بے شک قبر آلود تھی، لیکن فلک شیر نے تو یہ بھی نہ کیا وہ اس کا سب سے پیارا بھائی تھا۔ اتنی اجنبیت سے اس کے پاس سے گزرتا ہوا چلا گیا کہ خوشی کا دل دکھ سے بھر گیا۔

”اتنے شدید رد عمل سے تو بہتر تھا کہ یہ مجھے ماری دیتے۔ میں کم از کم ان سب کی اتنی نفرت کا شکار تو نہ بنتی۔ کاش میرے باپ بھائی ایک دفعہ مجھ سے کہتے کہ میں جنید عباسی سے طلاق لے لوں۔ میں تو وہ بھی کر گزرتی، لیکن یہ کیا انہوں نے تو مجھ زندہ در گور ہی کر ڈالا۔“

اس سوچ کے آتے ہی اس کے دل میں نفرت اور غصہ کی ایک نئی لہر ابھری تھی۔

”اے میرے پروردگار مجھے اپنے رحم و کرم کے صدفے ان ظالموں سے نجات دلا، بے شک میں نے جو کیا وہ غلط تھا، لیکن تو جانتا ہے میں گناہ گار نہیں ہوں، میرے مالک اگر میرے نصیب میں عبرت ناک موت لکھ دی ہو ہے تو بھی وہ موت مجھے ان ظالموں کے ہاتھوں سے نہ عطا کرنا۔“

دل ہی دل میں یہ دعا کرتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی اور اسے سنبھالتے سنبھالتے بھاگی بھی اس کے ساتھ رو پڑی۔



ثناء اللہ گمشدگی کے تین بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں۔ سب سے بڑا احمد گمشدگی، پھر ابراہیم گمشدگی اور سب سے چھوٹا یار اور گمشدگی اپنے دو بیٹے چھوڑ کر جوانی میں ہی دشمنی کی نذر ہو گیا تھا، جبکہ ابراہیم گمشدگی کی دو بیویوں سے ایک ہی بیٹی بھی خوشنما، جبکہ بیٹی پانچ تھے جن میں سے تین بیٹے بالترتیب علی شیر، فلک شیر اور علی عمران شیر آمنہ کے بطن سے تھے اور دس سالہ امیر حنزہ اور آٹھ سالہ اسامہ دو سری بیوی ماہ زیب کے بطن سے تھے۔ یار اور گمشدگی کی صرف دو ہی بیٹیاں تھیں۔ بارہ سالہ سکھاں اور دس سالہ ماری جنہیں خوشنما کے اٹھائے گئے قدم کے بعد سزا کے طور پر اسکول سے اٹھایا گیا تھا اور ان پر تعلیم کے دروازے مکمل طور پر بند ہو گئے تھے۔ اس کے چچا یار گمشدگی نے اپنے وارث کے لیے کچھ دن قبل ہی شادی کی تھی، وہ سب ایک حویلی میں رہتے تھے جس میں سب کے علیحدہ علیحدہ پورشنز بنے ہوئے تھے، لیکن داخلی گیٹ اور پکن ایک ہی تھا، سب کا کھانا ایک ہی پکن میں تیار ہوتا اور بڑی اماں کے ساتھ مل کر کھایا جاتا، کھانے کے وقت سارا خاندان بڑی اماں کے ساتھ اکٹھا ہو کر کھانا کھاتا۔

خوشی کی بڑی پھوپھو کا نکاح اس وقت قرآن پاک سے کر دیا گیا تھا، جب مہوایا پنج سال کی تھی اس کے بعد اس نے اپنی پھوپھو کو بھی بھی حویلی میں نہ دیکھا تھا، وہ حویلی کے پھوپھو اے بی کاں کو غمزی میں تنہا قید تھیں، جہاں انہوں نے اپنی ایزیاں رگڑ رگڑ کر تھائی کا عذاب سہتے ہوئے اپنی جان، جاں آفرین کے سپرد کر دی تھی، جس کا احساس حویلی کے سخت گیر مردوں میں سے کسی کو بھی نہ ہوا تھا، یہاں تک کہ اس نے بھی اپنی داوی، بڑی اماں کو بھی اپنی بیٹی کی یاد میں دھکی نہ دیکھا تھا، سوائے آمنہ کے کبھی اس نے اپنی پھوپھو کا ذکر کسی سے نہ سنا تھا، وہ حیران ہوتی تھی کہ یہ سب لوگ اتنے بے حس کیوں ہیں، جو اپنے سکول کا دکھ بھی محسوس نہیں کرتے۔

چھوٹی پھوپھو الماس اپنے چچا کے گھر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے بیٹے زریاب کا رشتہ بچپن سے ہی خوشنما سے ملے تھا، جبکہ بدلے میں سورٹھ اس کی ہونے والی بھابھی اور فلک شیر کی منگ تھی۔ حویلی کے رواج کے مطابق لڑکیوں کو پڑھنے کی اجازت نہ تھی، جبکہ خوشی تعلیم حاصل کرنے کی بے حد شوقین تھی۔ اس سلسلے میں زریاب اس کا مددگار ثابت ہوا، کیونکہ وہ حویلی کے دوسرے لوگوں سے مختلف تھا اور خود چاہتا تھا کہ اس کی بیوی تعلیم یافتہ ہو۔ اسی کے ایما پر گاؤں سے میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد خوشی نے قریبی قصبہ کے کالج سے انٹر کی تعلیم حاصل کی اور پھر زریاب کی خواہش پر قریبی شہر میں موجود یونیورسٹی میں ٹیکسٹائل ڈیزائننگ میں داخلہ لے لیا۔ زریاب اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے ابرو ڈھکیا ہوا تھا۔ لہذا خوشی کی شادی اس کی واپسی کے بعد متوقع تھی۔ زریاب کی چچا زاد صندل علی شیر کی بیوی تھی، جس کی شادی کے موقع پر حویلی میں وہ ناخوش گوار واقعہ پیش آیا، جس نے خوشی کو حویلی والوں سے دور کر دیا اور وہ اپنوں کی محبت کو ترستی رہ گئی۔ جنید عباسی خوشی کو یونیورسٹی میں ہی ملا تھا۔ پہلی بار ہی اسے دیکھ کر خوشی کے دل میں محبت کا دیا جل اٹھا تھا، لیکن چونکہ وہ اپنی خاندانی روایات سے واقف تھی، اس لیے اپنے دل پر جبر کرتے ہوئے اس سے بچنے کی کوشش کرتی رہی، لیکن ٹک ٹک رفتہ رفتہ اس کا دل بھی جنید کی محبت سے بھر چلا گیا۔ اور ان ہی محبت بھرے دنوں میں جب اس کا انگ انگ جنید کی محبت کی پھوار سے بھیک چلا تھا اس پر اعشاف ہوا کہ جنید کا تعلق ان کے مخالف اور دشمن قبیلے سے تھا یہ جان کر خوشی نے چاہا کہ وہ پیچھے ہٹ جائے، لیکن جنید نے ایسا نہ ہونے دیا، وہ سی ایس ایس کا امتحان پاس کر کے حکومت کے اعلیٰ عہدے پر فائز ہو چکا تھا، وہ خوشی سے کسی طور بھی دستبردار ہونے کو تیار نہ تھا اور پھر محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر بنا نتیجہ کی پروا کیے خوشی نے جنید سے نکاح کر لیا، کیونکہ جنید کا کہنا تھا کہ اس عمل کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے جو ان دونوں کو ایک کر سکے۔

حویلی والے کبھی کسی طور پر جنید کو قبول نہیں کر سکتے تھے، اسی لیے وہ کہتا تھا کہ مناسب وقت کو دیکھتے ہوئے وہ

عدالت کے حکم کے مطابق خود حویلی آئے گا اپنے باپ اور بھائیوں کے ساتھ اور اسے عزت سے رخصت کروا کر لے جائے گا۔ اور بس یہاں ہی وہ جذبات کے ہاتھوں مار کھا گیا، اسے حویلی والوں کی طاقت اور ظلم کی شدت کا اندازہ نہ تھا اس کے تمام بہن بھائیوں کی پرورش شہر میں ہی ہوئی تھی، کیونکہ اس کی والدہ کا تعلق شہر سے تھا۔ اس کا باپ صد عباسی خود بھی ایک پڑھا لکھا انسان تھا، یہی وجہ تھی اس نے بیشہ اپنی اولاد کو اپنے خاندانی مسائل سے دور رکھا اور نہ صرف خاندانی مسائل بلکہ وہ اپنے گاؤں سے بھی دور رہے۔

اپنے گھر کے پرسکون ماحول کو دیکھتے ہوئے جنید نہیں جانتا تھا کہ بظاہر بڑھے لکھے یہ لوگ اپنی خاندانی روایات کے لیے سگے رشتوں کو بھی قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتے اور جیسے ہی اس کا اور ایک جنید کو ہوا، بہت دیر ہو چکی تھی، خوشی کو حویلی سے غائب کر دیا گیا تھا۔ جنید کا اثر و رسوخ بالکل کام نہ آ رہا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ خوشی کو مار کر حویلی میں ہی دفن کر دیا گیا ہے، اسی خیال کے تحت اس نے کورٹ میں کیس دائر کر رکھا تھا۔ جہاں اس نے اپنا نکاح نامہ جمع کروا کر اپنی بیوی کی باذیالی کا مطالبہ کیا تھا، اس کی دائر کردہ درخواست کے مطابق عدالت نے علی شیر کو پابند کر دیا تھا کہ وہ جلد از جلد خوشی کو کورٹ میں پیش کر کے اس کا بیان قلمبند کروائے تاکہ عدالت کو فیصلہ کرنے میں آسانی ہو، اسی سبب اسے شہر لایا گیا تھا، اگر جنید یہ سب کچھ نہ کرنا تو یقیناً ”خوشی کو پہلے ہی دن مار دیا جاتا، لیکن اس کا بھائی ایٹشن لڑنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس لیے وہ لوگ اتنا بڑا سکیٹل افرورنہ کر سکتے تھے۔ جس کی بنا پر خوشی کو چند دنوں کی زندگی واپس دے دی گئی تھی۔

وہ جان چکی تھی کہ اس کی زندگی کی مہلت عدالت میں دیے جانے والے بیان تک محدود ہے، جب وہاں جا کر اپنے باپ بھائیوں کے حق میں بیان دے دے گی۔ اسی وقت اسے دی گئی مہلت زندگی اس کے پیاروں کے ہاتھوں کی ختم کر دی جائے گی اور اب اپنی زندگی بچانے کے لیے جو کچھ کرنا تھا اسے اکیلی ہی کرنا تھا۔

”تمہارے پاس موبائل نہیں ہے؟“ سبیر نے اچانک ہی موبائل پر اپنی رنگ ٹون چیک کرتے ہوئے اس سے سوال کیا۔

”نہیں کیونکہ مجھے کبھی اس کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔“ پلوٹہ نے اطمینان سے جواب دیا۔

”وہل دن یا آج کے اس جدید دور میں تم جیسی لڑکی کاپیا جانا ایک حیرت انگیز بات ہے۔“

وہ سمجھی نہیں کہ یہ تعریف تھی یا اس پر طنز کیا گیا ہے۔

”اور یہ تم کالج کس کے ساتھ آئی تھیں۔ تمہارا بھائی تھا کیا؟“

اپنے کام میں مصروف سبیر نے کانڈا مفتی سرسری سا تھا۔ سمجھ گئی کہ یہ سوال یقیناً ”بالاج کے سلسلے میں کیا گیا ہے کیونکہ وہ آج اسے اور وریشہ کو کالج ڈراپ کر کے گیا تھا۔

”ہاں! اس نے تھوڑا سا سوچا اور چاٹ کھاتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا کیونکہ سبیر نے کے مزید کسی سوال سے بچنے کا واحد حل ایک ہاں تھی۔

”یار! بڑا شگ بندہ تھا۔ میری اس بات ہی کروا دو۔ ذرا ہم بھی ایک ووٹ مار لیں تمہارے بھائی کے ساتھ۔“ سبیر نے بے باک قہقہہ لگاتے ہوئے کہا جبکہ اس کی بات سن کر وریشہ کے کالوں کی لویں تک سرخ پڑ گئیں۔

”دونوں دھڑکیاں مذاق کر رہی ہوں سیریس مت ہو جانا۔“

پلوٹہ کے کچھ بولنے سے قبل ہی اس نے خود ہی وضاحت بھی کر دی۔ ”پلو جلدی آؤ! آنا کس کا پیڑ شروع ہو گیا ہے، جانتی ہو اگر لیٹ ہو گئے تو مسز ضوی نے کلاس روم میں داخل نہیں ہونے دینا۔“

وریشہ جو کچھ دیر قبل ہی آئی تھی جانے کیا سوچ کر اس نے پلوٹہ کو بازو سے تھام کر کھڑا کر دیا جبکہ وہ جانتی تھی کہ ان کا یہ پیڑ فری ہے کیونکہ آج مسز ضوی کالج ہی نہیں آئی تھیں پھر بھی ہانکھ پوچھے خاموشی سے اس کے ساتھ چل دی۔

”میرا تو یہ پیڑ فری ہے۔ میں جتنا زہم جاری ہوں۔ تم لوگوں کا اگر موڈ ہو تو فارغ ہو کر وہیں آ جانا۔“ مگر اوٹنڈ کی سوکھی گھاس سے کھڑے ہوئے سبیر نے اپنے کپڑے بھاڑے اور بڑی لاپرواہی سے کہتی ہوئی اپنا بیگ تھام کر جتنا زہم کی سمت چل دی۔

”مجھے تو یہ لڑکی بالکل پسند نہیں ہے۔“ وریشہ نے بے لاگ تبصرہ کیا۔

”کیوں اچھی بھلی تو ہے۔ اتنی لونگ اور کیئرنگ۔ جانے کیوں تم اس سے اتنا جڑتی ہو۔“ پلوٹہ کو اس کا تبصرہ پسند نہ آیا وریشہ نے ذرا کی ذرا رک کر پلوٹہ کے چہرے پر ایک نظر ڈالی جہاں چھائی ناگواری واضح طور پر محسوس کی جاسکتی تھی، ویسے بھی پچھلے کچھ دنوں سے وہ نوٹ کر رہی تھی کہ پلوٹہ کا رویہ اس سے خاصا فائل ہونا جا رہا ہے پہلے وائی گرم چوٹی اس کے درمیان سے تقریباً ”مفقود ہو چکی تھی۔ اب وہ عام طور پر وریشہ کے بجائے سبیر کے ساتھ کو زیادہ اہمیت دینے لگی تھی بلکہ اکثر ہی وہ اور سبیر کے وریشہ کو چھوڑ کر غائب ہو جاتی ہیں یہاں تک کہ کینٹین جاتے ہوئے بھی اس سے پوچھنا گوارا نہ کرتیں۔

”سوچ لو جس دن بالاج بھائی نے اسے تمہارے ساتھ دیکھ لیا اس دن تمہاری خیر نہیں ہے۔“ وریشہ نے دل ہی دل میں سبیر کے بے باک حیلے کا تصور کرتے ہوئے کہا۔

”سارا دن کالج میں کلاسز تک کرتی ہے۔ ٹخنوں سے اونچی شلوار ہوتی ہے گربان کے سارے ٹخن بند کرنے کا اکثر ہی محترمہ کو ہوش نہیں ہوتا۔ سارا دن موبائل کا پیڈ فری اس کے کان میں ہوتا ہے جانے ایسی چپ لڑکی تمہاری چوائس کب سے ہو گئی، مجھے تو حیرت ہے۔ اور ہاں تم نے شاید نوٹ نہیں کیا، ہر روز ایک نئی گاڑی گیٹ پر اس کی شہر ہوتی ہے ایسے جیسے باپ کسی ریاست کا شہنشاہ ہو۔“

وریشہ نے اپنی کئی دنوں کی بھڑاس نکالتے ہوئے کہا۔

”ایک تو تمہاری فطرت میں شک بہت ہے بالکل بالاج کی طرح۔ تم شاید نہیں جانتیں۔ اس کا بھائی ریٹ اے کار کا بزنس کرتا ہے۔ اس علاوہ ان کا گاڑیوں کا شوروم بھی ہے تو ظاہر ہے رنگ برنگی گاڑیاں تو اسے لینے آئیں گی ہی، جس دن جو گاڑی فارغ ہوتی ہے ڈرائیور یا بھائی اسے پک کر لے آ جاتا ہے۔“

”ہو سکتا ہے ایسا ہی ہو بہر حال مجھے اس سے کیا لینا دینا۔ میرا کام تو صرف تمہیں سمجھانا تھا سو میں نے سمجھا دیا۔ اب آگے تمہاری مرضی ہے جو دل چاہے کرو۔“

وریشہ کا موڈ واضح طور پر خراب ہو چکا تھا۔ اب وہ ہمارے آگے بڑھ گئی پلوٹہ نے اسے روکنے کی کوشش بھی نہ کی اور ایسا شاید اتنے سالوں میں ان کے درمیان پہلی بار ہوا تھا کہ وہ کسی دوسرے کی وجہ سے ایک دوسرے سے ناراض ہوئی تھیں۔

”تمہاری بو نہیں آئی۔ آج آؤ میں تمہیں چھوڑ دوں۔“

”نہیں یار! میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکتی۔“ سبیر نے اس آفر پر یک دم ہی گھبرا اٹھی۔

”کیوں میرے ساتھ جانے میں کیا حرج ہے۔ کم آن یا میں بھی تمہارے جیسی ایک لڑکی ہوں اور ویسے بھی وریشہ آج کالج نہیں آئی۔ تم اکیلے واپس کیسے جاؤ گی جبکہ تم تو شاید کبھی پبلک ٹرانسپورٹ سے گھر نہیں گئی ہو؟“ سبیر نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن۔۔۔“ کچھ کتے کتے وہ رکی۔ ”چھا چلو۔ میں چلتی ہوں۔“ پھر جانے کیا سوچ کر اس نے ہائی بھر لی۔

”تھینک گاؤ جلدی آجاؤ ورنہ میرے بھائی نے تو مجھے زندہ ہی گاڑ دیتا ہے بے چارہ اپنا کام کاج چھوڑ کر مجھے لینے آیا ہے کیونکہ آج ڈرائیور چھٹی پر ہے۔“

وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہوئی جلدی جلدی وضاحت دے رہی تھی جبکہ پلوٹہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی کہ بالاج ابھی یونیورسٹی سے گھر نہ آیا ہو اور اسی دھیان میں وہ گاڑی کا دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گئی۔

”السلام علیکم!“ یہ آواز یقیناً ”سبب“ کے بھائی کی تھی۔

”وعلیکم السلام“ وہ دل ہی دل میں شرمندہ ہوئی کیونکہ اسے بیٹھنے سے قبل سلام کرنا چاہیے تھا۔

”سبب! تمہاری دوست کو گئی ہے کیا؟“

وہ دونوں بس بھائی آگے بیٹھ جانے کیا باتیں کیے جارہے تھے جبکہ اس کا دھیان مکمل طور پر اپنے گھر اور بالاج میں لگا ہوا تھا جب اچانک ہی سبب نے کے بھائی کی تیز آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی اور ایسا یقیناً ”اسے سنانے کے لیے کیا گیا تھا۔“

”نہیں یا رگو گئی تو نہیں ہے لیکن بولتی ذرا کم ہے۔“ سبب نے گردن ترچھی کر کے اس کی جانب دیکھا ”اور ویسے بھی میرا ہی قصور ہے۔ میں نے آپ دونوں کا تعارف تو کروایا ہی نہیں یہ میری دوست ہے پلوٹہ عباسی اور پلوٹہ بی بی میرے کزن ہیں شہروز آج بھائی گھر نہیں تھے اس لیے مجھے یہ لینے آئے ہیں۔“

”تمہاری دوست کو تو میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔“ شہروز نے سامنے والا آئینہ اس پر فوس کرتے ہوئے کہا تو یکدم ہی گھبرا اٹھی۔

”آپ اسے کیسے جانتے ہیں؟“ سبب نے حیران تھی۔

”یار آتم سارا دن اس کا اتنا ذکر کرتی ہو کہ اگر تم نہ بھی تاشیں تو بھی میں جان چکا تھا کہ شی از پلوٹہ لیکن اسے دیکھ کر میں حیران ضرور ہوا کہ یہ اتنے عرصہ سے تمہارے ساتھ ہے لیکن پھر بھی ابھی تک تم نے اسے اپنے جیسا نہ بنایا۔ حیرت ہے یا ربا یہ تو تم سے بالکل مختلف ہے۔“

”اس میں حیرت والی کیا بات ہے۔ یہ مجھے اسی طرح اچھی لگتی ہے۔ سادہ سادہ سی، سہمی ہوئی ہرنی جیسی۔“ سبب نے نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا جبکہ وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

”یہ اس طرف دائیں ہاتھ پر لے لیں۔“ اس کی نگاہ اچانک ہی اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے روڑ پر پڑی اور پھر اگلے چند ہی لمحوں بعد وہ اپنے گھر کے گیٹ پر کھڑی تھی۔

”آجاؤ سبب! اندر آؤ۔ میری ای سے مل لو۔“ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے آفر کرنی پڑی۔

”نہیں یا ربا! آج نہیں“ آج شہروز کو دیر ہو رہی ہے پھر کسی دن آؤں گی اوکے۔ ٹیک کینیڈا۔ اللہ حافظ۔“

اس نے گھر کی سی ہی ہاتھ ملایا اور جلدی جلدی وضاحت کی اور اگلے ہی بل گاڑی زن سے اڑ گئی۔ وہ گیٹ سے اندر داخل ہو گئی اور سامنے خالی پڑے پورچ کو دیکھ کر اس نے سکھ کی سانس لی۔

اس کا مطلب ہے بالاج ابھی تک یونیورسٹی سے گھر نہیں آیا۔

☆☆☆

نہانے کے بعد بھائی نے اسے بلک کٹر کا قیمتی شیفلون کا سوٹ پہننے کے لیے دیا جسے دیکھ کر وہ حیران ضرور ہوئی لیکن بولی کچھ نہیں۔ خاموشی سے کپڑے تبدیل کر لیے۔ بھائی نے ہی اس کے بالوں میں اچھی طرح کنکھی کر کے انہیں سوکھنے کے لیے کھلا چھوڑ دیا اور پھر حیرت انگیز طور پر اگلے تیس منٹ میں اس کا کمر جو سزاور پھلوں سے بھر

گیا۔ لیڈی ڈاکٹر اس کا چیک اپ کر کے کچھ دوائیں بھی لکھ کر دے گئی۔ وہ ڈاکٹر کی دی ہوئی دوا کھا کر سو گئی شام تک اس کی طبیعت بہتر ہو چکی تھی۔ بھائی اس کے لیے چائے بنا کر لے آئی۔ آج کافی عرصہ بعد وہ ایک صاف ستھرے ہوا دار کمرے کے آرام دہ بستر پر تھی۔ یہ ہی وجہ تھی کہ وہ پہلے سے کافی بہتر محسوس کر رہی تھی۔ ابھی اس نے چائے ختم ہی کی تھی کہ داخلی دروازہ کھول کر صندل اندر داخل ہوئی دلہنا پے کے نئے روپ کے ساتھ وہ خاصی ٹھنڈی ٹھنڈی لگ رہی تھی جانے کیوں صندل کو اتنے عرصہ بعد اپنے سامنے دیکھ کر بھی خوشی کے دل میں محبت کا وہ احساس نہ جاگا جو گزشتہ دنوں کی یادگار ہوا کرتا تھا۔ ایک عجیب سی بے حس نے اس کے پورے وجود کے گرد احاطہ کر رکھا تھا بھی کبھی اسے محسوس ہوتا اس کے سینے میں دل کی جگہ پتھر نے لے لی ہے۔ ان ہی پتھریلے تاثرات کے ساتھ چائے کا کپ سائڈ ٹیبل پر رکھ کر وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

”کیسی ہو خوشی؟“ صندل اس کے قریب آتے آتے جبکہ کر رک گئی شاید وقت نے ان کے درمیان ایک نامعلوم سا فاصلہ کھینچ دیا تھا۔

”ٹھیک ہوں۔“ وہ دھجھے سے بولی صندل اس کے قریب ہی بیڈ کی پائلنتی پر بیٹھ گئی اور کئی خاموش لمحے بنا دتک وہ ان کے درمیان سے گزر گئے بالکل ایسے جیسے وہ ابھی شخص موضوع ڈھونڈ رہے ہوں۔ بات شروع کرنے کے لیے صندل بھائی ”آپ نے مجھ سے کوئی بات کرنی ہے؟“ اس نے اپنے تئیں صندل کی مشکل کو آسان کر دیا۔

”اے ہاں۔“ صندل ایک دم چونک سی گئی اور خالی خالی نظروں سے خوشی کی جانب دیکھا جو سوالیہ نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

”وہ ایسا ہے خوشی! اس ہفتے زریاب پاکستان آ رہا ہے۔“

یہ خبر یقیناً ”اس کے لیے نئی تھی لیکن پھر بھی اس نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا بلکہ سپاٹ چہرے کے ساتھ اپنے قریب بیٹھی صندل کی جانب ہنسی رہی۔ وہ جانتا چاہتی تھی کہ صندل آگے کیا کہنا چاہ رہی ہے۔

”دیکھو خوشی! اتم چھی طرح جانتی ہو کہ جنید عباسی نے تمہاری پازیلی کے لیے تمہارے باپ بھائیوں پر مقدمہ دائر کر رکھا ہے۔ حویلی میں دو تین دفعہ پولیس آچکی ہے اور اگلے ماہ ہمیں ہر حال میں تمہیں عدالت میں پیش کرنا ہے کیونکہ اس کا کہنا ہے کہ اس کی منکوحہ کو حویلی والوں نے قتل کر دیا ہے۔“ وہ ذرا کی ذرا سانس لینے کو رک کر اور اک نگاہ خوشی کے سپاٹ چہرے پر ڈالی۔

”پھر۔۔۔؟“ اس کی پل بھر کی خاموشی نے خوشی کو بے چین کر دیا وہ جلد از جلد جانتا چاہتی تھی کہ اس ساری تہمید کا اصل مقصد کیا ہے۔

”وہ ایسا ہے کہ خوشی اگر تم چاہو تو سب کچھ پہلے جیسا ہو سکتا ہے۔“

”میں سمجھی نہیں“ آپ کیا کہنا چاہتی ہیں۔ صاف صاف بات کریں۔“

”تم کو زریاب کسی سے نکاح کرنا ہو گا۔“ صندل نے تیزی سے اپنی بات مکمل کی۔

”نکاح۔۔۔؟“ یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟“ صندل کی بات سنتے ہی اسے حیرت کا شدید ترین جھٹکا لگا۔ ”آپ اچھی طرح جانتی ہیں میرا نکاح جنید عباسی کے ساتھ ہو چکا ہے اور قانوناً“ اور شرعاً ”میں اس کی بیوی ہوں اور جب تک یہ نکاح ختم نہ ہو گا۔ میں دوسری شادی نہیں کر سکتی۔“

دیکھ اور صدمہ سے اس کی آواز بھرا گئی اور آنکھوں میں پانی سا بھر آیا جیسے دیکھ کر صندل کے دل کو کچھ ہوا ضرور لیکن وہ نظر انداز کر گئی کیونکہ یہ وقت جذباتی ہونے کا نہ تھا۔

”آہستہ بولو خوشی! باہر تمہارے دونوں بھائی موجود ہیں۔“

اس کی تیز آواز نے صندل کو خوف زدہ کر دیا اور وہ جلدی سے اس کا ہاتھ تھام کر اسے خاموش کر داتے ہوئے

بولی جبکہ اس کی نگاہیں مسلسل دروازے کی جانب لگی ہوئی تھیں۔
 ”میری بہن تم نہیں جانتیں، تم کس قدر مشکل میں گھر چکی ہو اور اس مشکل سے نکلنے کا واحد حل یہ ہی ہے کہ تم زریاب سے نکاح کر لو کیونکہ تمہارے باپ اور بھائیوں کی بات مان لینے میں ہی تمہارا بھلا ہے ورنہ تم نہیں جانتیں یہ لوگ تمہارا کیا شکر کرنے والے ہیں۔“ صندل کی آنکھوں میں آنسو جھلکانے لگے اور وہ خوف زدہ آواز میں خوشی کو سمجھانے لگی۔

”کچھ بھی ہو جائے بھائی! میں نکاح پر نکاح نہیں کروں گی۔ یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔“
 لیکن خوشی تمہارا بھائی کو رٹ میں تحریری بیان جمع کروا چکا ہے جس کے مطابق تم شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ ملک سے باہر ہوا انہوں نے تمہارے اور جنید کے نکاح کو کورٹ میں چیلنج کر رکھا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جنید کی طرف سے جمع کروایا گیا نکاح نامہ جعلی ہے اور تمہارا نکاح اس نکاح سے قبل زریاب مگسی کے ساتھ ہو چکا تھا۔ ”اب صندل کے لیے تفصیل بتانا ناگزیر ہو چکا تھا۔“ اپنی عزت کو بچانے کے لیے اس سے بہتر راستہ ہمارے لیے کوئی نہ تھا۔“

”آپ کے نزدیک اہمیت صرف عزت کی ہے۔“ دکھ سے اس کی آواز حلق میں ہی پھنس گئی اور اس نے اپنا ہاتھ صندل کی گرفت سے چھڑوا لیا۔
 ”شریعت کی کوئی اہمیت نہیں ہے آپ لوگوں کے نزدیک۔ آپ نہیں جانتیں، نکاح پر نکاح کرنا گناہ کبیرہ ہے۔ کیوں نہیں ڈرتے بھائی! آپ لوگ اللہ کے عذاب سے۔ ایسا نہ کریں اس کی لاشی بے آواز ہے جب پڑتی ہے تو بڑے بڑے سو ماؤں کو زمین نگل جاتی ہے بھائی!“

وہ صندل کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے رو پڑی۔
 ”بس بابا بس۔ اب زیادہ ڈراما بازی نہ کرو۔ جو ہم نے کہا ہے۔ وہ تو تمہیں کرتا ہی پڑے گا کیونکہ اسی میں تمہاری بہتری ہے ورنہ یاد رکھو۔ تمہیں مار کر تمہاری لاش کمر اعدالت میں لے جاؤں گا“ کاری کروں گا تمہیں تمہارے جیسی بد کردار بہن کے ہونے سے تو اچھا ہے کہ تمہیں مار کر زمین میں گاڑ دیا جائے اور میں تو یقیناً ایسا ہی کرتا اگر اس حرامی نے ہمارے اوپر کیس نہ کیا ہوتا۔ میں تو اسے ہی کب کا بچکا ہوتا اگر اس نے اپنی جان کی حفاظت کے لیے کورٹ میں اسائنمنٹ نہ جمع کروائی ہوتی۔ چھوٹوں کا تو خیر اسے میں اب بھی نہیں سار کر ہی سکھ کا سانس لوں گا۔“

جانے کمرے میں کب فلک شیر داخل ہوا تھا اس کی پھنکارتی ہوئی نفرت بھری آواز ہتھوڑے کی طرح خوشی کی سماعتوں پر برس رہی تھی اور وہ خوف سے ہر تھمر کانپ رہی تھی جبکہ صندل گھبراہٹ میں بیڈ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی تھی۔

وہ خوشی کے قریب آیا اور بالوں سے پکڑ کر اسے گھسیٹ کر بیڈ سے اتار دیا۔ وہ تکلیف کی شدت سے بلبلاتا لگی۔

”دل تو چاہتا ہے تجھے آج ہی آگ لگا کر جلادوں بلکہ اس کمرے کو ہی تیری قبر بنا دوں لیکن کیا کروں۔“
 اس نے خوشی کے بالوں کو پھوڑ کر اسے ایک زوردار دھکا دیا وہ زمین پر گر گئی۔ اس کا سر بیڈ کے کنارے سے جا لگا، صندل اور بھائی کے سامنے اپنی شدید توجہ کا احساس اسے خون کے آنسوؤں لگا لگا۔

”چلو بھائی! اپنی ماں جانی پر ایک نفرت انگیز نگاہ ڈال کر وہ صندل سے مخاطب ہوا جو سر جھکائے وہیں کھڑی تھی کیونکہ وہ بھی اسی خوشی کی بیٹی تھی اور جانتی تھی کہ اس کی حیثیت بھی خوشی جیسی ہی ہے یہ ہی وجہ ہے کہ اس نے آگے بڑھ کر فلک شیر کو روکنے کی کوشش نہ کی اور خاموشی سے اس کے پیچھے چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل

گئی۔

ان کے جاتے ہی بھاگی تیزی سے آگے بڑھی اور زمین پر پڑی خوشی کو اٹھایا۔ خوشی بھاگی کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی ایسے میں بھاگی بھی اپنی ماں کے دکھ کو محسوس کر کے اس کے ساتھ رو دی۔

زریاب پاکستان واپس آچکا تھا اور اسے حیرت تھی کہ کس طرح اس جیسا بڑھا لکھا اور فارن پلٹ شخص ایسا غیر شرعی کام کر سکتا تھا۔ کبھی بھی تو خوشی کو ایسا محسوس ہوتا کہ صرف جنید عباسی کو نیچا دکھانے کے لیے کیے جانے والے ایک عمل نے اس کے سارے خاندان کو یکجا کر دیا تھا ورنہ اسے سو فیصد یقین تھا کہ اس سارے قصہ کے ختم ہونے کے ساتھ ساتھ اس کا قصہ بھی ختم کر دیا جائے گا جب دل چاہے گا اسے مار کر کسی اندھے گڑھے میں گاڑ دیا جائے گا۔ ”اگر میری موت ان کی غیرت کی سر بلندی کے لیے ضروری ہے تو پھر اپنی زندگی کی بقا کے لیے آخری وقت تک کوشش کرنا بھی میرا انسانی حق ہے۔ میں اس طرح نہیں مروں گی ایک کتے کی موت۔ مجھے کوشش کرنا ہوگی۔ آخری وقت تک جب تک میری زندگی کی ایک سانس بھی باقی ہو۔“

اور یہ ہی وہ فیصلہ تھا جس نے خوشی کے خوابیدہ ذہن کو ایک جھٹکے سے بے وار کر دیا اب اسے تلاش تھی ایک ایسی درختی جہاں سے آنے والی روشنی کی ننھی سی کرن اس کی بقا کا پیغام لے کر آئے اور باا خرا سے وہ درخت ہی گئی۔

جانے اس کا موبائل کب سے بچ رہا تھا اس نے بمشکل آنکھیں کھول کر یہاں وہاں ہاتھ مارتے ہوئے نیکیے کے نیچے سے اپنا موبائل نکالا اور نیس کا شیٹن ہیش کر کے کان سے لگا لیا۔

”ہیلو!“ تیند میں ڈوبی اس کی آواز بڑی مشکل سے حلق سے نکلے۔ ”عماد بات کر رہا ہوں۔“
 ”جانتی ہوں۔“ عماما کی آواز سننے ہی اس کی نیند اڑن چھو ہو گئی اس نے جلدی سے اٹھ کر کھڑکی کا پردہ ہٹایا اور باہر پھیلے ہوئے اندھیرے کو دیکھ کر شاکہ نہ گئی۔

”وہائی گاڈ! یا ہر تو گمراہ اندھیرا چھا رہا ہے۔ اس کا مطلب ہے رات کافی سے زیادہ ہو چکی ہے غیرت ہے آج مجھے ممانے چکا گیا بھی نہیں۔“

”میں بھی کافی دیر سے نرائی کر رہا ہوں اور حیران تھا کہ تم دس بجے تک سو رہی ہو ورنہ یہ وقت تو تمہاری انجوائے منٹ کا ہوتا ہے ہر حال یہ سب فالتو باتیں چھوڑو اور پہلے یہ بتاؤ میرے کام کا کیا ہوا؟“

”ظاہر ہے۔ آج کل صرف تمہارے ”کام“ پر ہی کام کر رہی ہوں۔“ ریا نے لفظ ”کام“ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

”بس اب تھوڑا ہی وقت ہے۔ جلد ہی تمہاری مرضی کا نتیجہ سامنے آجائے گا۔“
 ”یہی دے جو بھی ہے بس اب جلد از جلد میرا کام ہو جانا چاہیے تقریباً“ چھ ماہ ہو گئے ہیں مجھے تمہیں ایڈوانس دے رہے ہوئے اور اب اس سے زیادہ انتظار کرنا میرے لیے تقریباً ناممکن ہے۔“

”پلیز عماما! تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میرے پیسے میں کس طرح کی دھوکا دہی شامل نہیں ہے آج اپنی فطرت کے برخلاف اگر میں کسی کو دھوکا دے رہی ہوں تو وجہ تمہیں سمجھ جانا چاہیے یقیناً“ میں یہ سب پیسے کے لیے نہیں کر رہی بلکہ تمہاری محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کر رہی ہوں۔“

”یہ الزبانی کے لیے تمہیں میں ہی ملا ہوں میں تم اور تمہاری محبت کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم جیسی

عورتیں سوائے پیسے کے کسی کی نہیں ہوتیں یہ فون میں نے تمہاری رام کہانی سننے کے لیے نہیں کیا بلکہ اپنے کام کے لیے کیا ہے جس کی منہ مائی قیمت تم نے مجھ سے لی ہے لہذا اب تمہاری ذمہ داری ہے کہ میرا کام جلد از جلد ہو۔“

اور یہ کہہ کر ہی دوسری طرف لائن بے جان ہو گئی یقیناً ”عماد نے فون بند کر دیا تھا“ ”لو کا بچھا“ زیر لب اسے گالی دیتے ہوئے ریائے فون بیڈ پر پھینکا اور غصہ کی حالت میں ہاتھ روم کی جانب چل دی۔



”سائیں! آپ کو بڑے سائیں نے یاد فرمایا ہے۔“ وہ جیسے ہی جیب سے نیچے اترنا سنانے کھڑے اسماعیل نے اسے بابا جان کا پیغام پھنچا دیا وہ پیغام سنتے ہی سمجھ گیا کہ اتنی رات کو باہر موجود اسماعیل شاید اسی کا منتظر تھا۔ سرے اثبات کا اشارہ کر کے وہ والان عبور کرتا ہوا اوطاق کے بند دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ وہ جانتا تھا کہ اس وقت اس کا منتظر باپ یقیناً ”اسی اوطاق میں موجود ہوگا اور دروازے کو خاموشی سے دھکیل کر اندر داخل ہوتے ہی اس کے اندازے کی تصدیق ہو گئی سامنے ہی لکڑی کی بڑی سی کرسی پر فلک شیر نشہور اڑ تھا۔

”آؤ بابا! آؤ۔ ہم تمہارا ہی انتظار کر رہے تھے۔“

دروازہ کھلنے کی بدھم سی آواز سننے ہی وہ یک دم سیدھا ہو بیٹھا۔ عماد نہایت خاموشی سے چلتا ہوا اپنے باپ کی کرسی کے پاس رکھے موڑھے پر جا بیٹھا۔ وہ بنا پوچھے جانتا تھا کہ اس کے باپ نے اسے کیوں بلایا ہے، پھر بھی خاموش رہ کر اپنے باپ کے سوال کا منتظر تھا لیکن دوسری طرف جانے فلک شیر کن خیالوں میں گم ہو چکا تھا۔

”بابا جان! آپ نے مجھے بلایا تھا؟“ کچھ دیر کے انتظار کے بعد عماد نے آہستہ سے اپنے باپ کے کھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے دریافت کیا۔

”ہاں بچہ! تم اچھی طرح جانتے ہو۔ تمہارا باپ کیوں بے سکون ہے۔ آج چھبیس سال ہو گئے ایک ایک لمحہ ایک ایک ٹھٹھی میری اس بے سکونی کی گواہ ہے۔“

فلک شیر نے ٹھنڈا سا اس بھرتے ہوئے عماد پر ایک نظر ڈالی جو نہایت توجہ سے اپنے باپ کی بات سن رہا تھا۔

”میری اس بے سکونی کا صرف ایک ہی حل ہے جو تم جانتے ہو۔“

”جی بابا! میں آج بھی اسی سلسلے میں ہی کراچی گیا تھا۔“ اس نے تھکے تھکے انداز میں جواب دیا۔

”یہ بات سننے ہوئے آج مجھے پورا ایک سال ہو چکا ہے عماد! اب مجھے نتیجہ چاہیے جلد از جلد۔ اب مجھ سے مزید انتظار نہیں ہو رہا ہے۔“

علی شیر کی آواز غصہ کی شدت سے یک دم ہی بلند ہو گئی۔

”میں اپنی موت سے قبل اپنا بدلہ چاہتا ہوں بالکل ویسا ہی بدلہ جیسا آج سے چھبیس سال پہلے عباسی خاندان نے ہمیں بے عزت کر کے لیا تھا۔ میں جب تک ان کی بے عزتی اور جگ ہنسی نہ دیکھوں گا، سکون سے نہ مر سکوں گا اور یہ بات تم بہت اچھی طرح جانتے ہو؟“

غصہ کے ساتھ ساتھ نفرت کی شدت نے فلک شیر کے سرخی مائل چہرے پر سیاہی پھیر دی تھی۔ اس کی آواز میں سانپ کی سی پھنکار شامل ہو گئی۔

”مجھے جلد از جلد وہ لڑکی چاہیے یا کچھ ایسا جس سے عباسی خاندان ساری دنیا میں ذلیل و خوار ہو جائے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اس کے کھڑے ہوتے ہی عماد بھی اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔

اپنے باپ کے کندھے پر ہاتھ رکھ اسے تسلی دیتے ہوئے عماد نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ اب اسے اپنا اگلا قدم جلد ہی اٹھانا ہوگا اگر برائے اس کی مرضی کا رزلٹ اسے نہ دیا تو پھر اسے کوئی اور راستہ دیکھنا ہوگا لیکن جلد از جلد کیونکہ اب وہ مزید دیر کر کے اپنے باپ کی ناراضی مول نہیں لے سکتا تھا۔

”مجھے امید ہے کہ اگلی دفعہ جب میں تمہیں بلاؤں تو یقیناً تمہاری کامیابی کی مبارک باد دینے کے لیے۔“ یہ کہہ کر فلک شیر اوطاق سے باہر نکل گیا۔



”تو یہ کفر ہے کہ تم میرے گھر میلاد پر نہیں آ رہے۔“ سبب نے مایوسی سے سوال کیا۔

”نہیں یار! مجھے پتا ہے کہ مجھے اجازت نہیں ملے گی اس لیے میں پوچھ کر اپنے آپ کو ڈی گریڈ نہیں کرنا چاہتی۔“

”پھر بھی ایک دفعہ اپنی امی سے پوچھ کر تو دیکھ لو۔“

”کوئی فائدہ نہیں ہے سبب نے! میں اپنی امی کو اچھی طرح جانتی ہوں وہ کبھی اجازت نہیں دیں گی اور پھر خواہ مخواہ انکار سن کر میری امید ٹوٹے گی میں ایسی کوئی امید باندھتی ہی نہیں ہوں۔“ پلو شہ نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

”خیرت ہے یار تم کس صندی میں زندہ ہو؟ اللہ جانے تمہارے گھروالے کسی قسم کے لوگ ہیں جو تم پر اتنا اعتماد بھی نہیں کرتے کہ تم اپنی دوست کے گھر میلاد پر جا سکو۔“ سبب نے کو بے حد دکھ ہوا۔

”وہ میرے بڑے ہیں اور ہر معاملے کو مجھ سے زیادہ بہتر جانتے ہیں ہو سکتا ہے ان کے خیال میں میری اسی میں بہتری ہو۔“ وہ بظاہر اطمینان سے بولی۔

”پتا نہیں اس طرح وہ تمہاری کون سی بہتری کر رہے ہیں۔ ہمارے گھر تو ہر سال یہ تقریب بڑے اہتمام سے منائی جاتی ہے بڑے بڑے نعت خواں آتے ہیں ہم ایک دفعہ شریک ہو کر دیکھتیں تو کتنا مزہ آتا ہے لیکن چلو چھوڑو جانے دو جیسی تمہاری مرضی۔“

سبب نے نہ ٹیٹ کی جانب بڑھتے ہوئے پلو شہ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور پھر اس کا ہاتھ تھام کر باہر نکل آئی۔ سامنے ہی اس کی گاڑی کھڑی تھی۔

”او کے اللہ حافظ یار! میرا خیال ہے تم کچھ دیر باہر کھڑی ہو کر انتظار کر لو تمہاری دین بھی بس آنے ہی والی ہوگی۔“

اس کے گاڑی کی جانب بڑھتے ہی پلو شہ کی دین بھی سامنے آ گئی اور وہ سبب نے کو ہاتھ ہلاتی ہوئی اپنی دین میں سوار ہو گئی اور پھر سارے راستے وہ یہی سوچتی آئی کہ کیا تھا جو اگر میں سبب نے کو گھر میلاد میں شریک ہو سکتی؟ اسے یقین تھا کہ کبھی بھی اس کی امی اسے بالاج سے مشورہ لیے بغیر میلاد میں جانے کی اجازت نہ دیں گی اور بالاج یقیناً منع کر دیتا یہ وہ اچھی طرح جانتی تھی۔



آرزو ارمان، چاہت، مدعا کچھ نہیں تھا بہت کچھ پاس لیکن اب رہا کچھ بھی نہیں کیسی کیسی قیمتی چیزوں سے اٹھا ہے حجاب دوستی، نل، جوتی، ہمدردی، وفا کچھ بھی نہیں وہ ابھی ابھی نما کر کپڑے تبدیل کر کے آئی تھی۔ اس نے نماز پڑھنے کے لیے اپنے دھڑکے کو اچھی طرح سر پر لپیٹا

ہی تھا کہ باہر کا دروازہ کھول کر صندل اندر داخل ہوئی۔ اسے اندر آتا دیکھ کر خوشی کے ہاتھ وہیں رک گئے۔ اس کا دل کسی انسوئی کے احساس سے دھڑک اٹھا۔ وہ جانتی تھی کہ صندل کی آمد بے مقصد نہ تھی اور جلد ہی اس کے خیال کی تصدیق ہو گئی۔

”دیکھو خوشی! کل رات تمہارا اور میرا زیاں مگسی کا نکاح ہے جس میں دو چار لوگ باپا سائیں کے جاننے والے بھی ہوں گے اور مجھے امید ہے کہ تم اپنے لیے اور ہمارے لیے کوئی مشکل کھڑی نہ کرو گی کیونکہ تمہاری وجہ سے ہم پہلے ہی بڑی پریشانی میں مبتلا ہیں۔“ صندل صرف کھڑے کھڑے اسے سمجھانے لگی تھی۔

”لیکن بھابھی! اگر عدالت میں ثبوت ہی پیش کرنا ہے۔ تو پھر باقاعدہ نکاح کی کیا ضرورت ہے؟ آپ پیپر زلے آئیں۔ میں سائن کروں گی۔“ صندل کی بات سن کر وہ حیرت سے اپنی جگہ پر کھڑی رہ گئی۔

”نہیں۔ تمہارا اور میرا زیاں کے ساتھ باقاعدہ نکاح ہو گا کیونکہ ہم میں سے کوئی بھی تمہارے پہلے نکاح کو تسلیم نہیں کرنا۔ وہ جو کچھ تم نے کیا صرف خاندان والوں کی بدنامی اور رسوائی کے لیے کیا اور اب تمہاری زندگی کی بقا کے لیے یہ نکاح بہت ضروری ہے تم شکر ادا کرو کہ میرا زیاں تمہیں رکھنے کو تیار ہے وہ تمہارے پہلے نکاح کو جوانی کی ایک بھول سمجھ کر بھلانے پر بھی رضامند ہے۔ وہ تمہیں اپنا ساتھ لندن لے جائے گا کیونکہ اسی طرح تم اپنے بھائیوں کے قہر و غضب سے محفوظ رہ سکو گی۔“

صندل کے الفاظ تھے یا کوئی پگھلا ہوا سیسہ خوشی کو۔ محسوس ہوا کہ اگر وہ مزید سختی رہی تو شاید اپنے خواس کھو بیٹھے گی۔ ”پلیز بھابھی بس کر جائیں۔ آپ جانتی ہیں کہ آپ کیا کہہ رہی ہیں۔“

”ہاں خوشی! میں صرف وہ جانتی ہوں جو ہمارے خاندان کے مرد جانتے ہیں کیونکہ اس سے زیادہ جاننے کی نہ ہمیں اجازت ہے اور نہ ہی ضرورت۔“

”یا میرے اللہ! یہ سب لوگ کس قدر جاہل ہیں بغیر طلاق اور عدت کے میرا دوسرا نکاح کر رہے ہیں۔ اے میرے خدا! تو اوارہ رہنا اگر میں خود کو اس گناہ آلود زندگی سے محفوظ نہ رکھ سکی تو میری خودکشی کو حرام موت نہ سمجھنا میرے مالک اس مشکل گھڑی میں میری مدد فرما۔“

اس خیال کے دل میں آتے ہی خوشی کی اس نفرت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا جو اپنے خاندان اور رسم و رواج کے خلاف اس کے دل میں پنپ رہی تھی لیکن اس وقت زبان سے کچھ بھی کہنا بے کار تھا کیونکہ وہ اس کا انجام جانتی تھی ابھی۔ ایک دن قبل ہی اسے یہ سب فلک شیر سمجھا چکا تھا۔

وہ ان ہی سوچوں میں غلطال و پچاں تھی کہ بھائی اس کے لیے کھانا لے آئی اپنی پیاری ما لکن کو اس اجڑی ہوئی حالت میں دیکھ کر اس کا دل بھر آیا اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو گئیں۔

”خوشی! لیٹی اپکڑے نکال دوں بدل لیں۔“

”تم میرے کپڑوں کی فکر مت کرو بھائی! اگر کر سکتی ہو تو میرا ایک کام کرو۔“

آر پار یہ فیصلہ سہرا لیا اسے آج ہی کرنا تھا کیونکہ ہرگز نہ تاہو ادن اسے موت کے قریب لے جا رہا تھا۔

”جی جی بی بی! بولیں۔“ بھائی کے اہلے دروازے پر ایک نظر ڈال کر خوشی کے مزید قریب ہو گئی۔

”ایک کانڈ اور پین لاسکتی ہو؟“ اس کی آواز سرگوشی میں ڈھل گئی۔ بھائی نے یک دم گھبرا کر کمرے کے بیرونی دروازے پر ایک نظر ڈالی لیکن آج شاید نکاح کے متوقع انتظامات کے سبب ان سب کا دھیان اس کمرے اور خوشی سے ہٹ چکا تھا۔

”میں کوشش کرتی ہوں۔“

”کو شش نہیں وعدہ۔“ اس نے اپنے ہاتھ کی دوسری انگلی میں موجود انگوٹھی اتار کر بھائی کی ہتھیلی پر رکھ دی۔

بھائی نے تیزی سے اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ انگوٹھی بیڈ پر گر گئی۔

”یہ کیا بی بی جی! آپ نے کیا مجھے اتنا ہی ذلیل سمجھ لیا ہے کہ میں آپ کے ایک ذرا سے کام کے لیے یہ انگوٹھی رکھ لوں گی۔“ دکھ اس کے لہجہ میں بول رہا تھا۔

”آپ یقین جانیں میں اگر جان دے کر بھی آپ کے کسی کام آسکوں تو یہ میرے لیے ایک اعزاز کی بات ہوگی۔ آپ فکر نہ کریں چھوٹی بی بی! میں ابھی پین اور کانڈ لے کر آتی ہوں۔“

اور پھر جلد ہی اس نے اپنا وعدہ پورا کر دیا اور جانے کہاں سے اپنے گریبان میں چھپا کر ایک پین اور کانڈ کا ٹکڑا لے آئی۔ خوشی کو یہ سب سمجھاتے ہوئے اس کے ہاتھ مسلسل خوف سے کانپ رہے تھے جبکہ خوشی بھی بے حد خوف زدہ تھی اس نے جلدی جلدی بنا وقت ضائع کیے کانڈ کے پرزے پر جنید کا نمبر لکھا اور پرچہ بھائی کی جانب بڑھایا۔

”یہ ایک نمبر ہے، تم اس پر فون کر کے صرف یہ بتا دو کہ میں زندہ ہوں اور جب آٹھ تارت کو میں عدالت میں پیشی کے لیے آؤں تو تمام انتظام کر کے آنا مجھے لے جانے کے لیے۔“

”ٹھیک ہے بی بی!۔“

”بھائی نے کوئی بھی دوسرا سوال کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس پر خوشی نے اعتبار کیا تھا اس کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اب چاہے وہ اپنی جان سے جاتی لیکن ما لکن کے اعتماد کو توڑنا بھی گوارا نہ کرتی۔



”یہ آج تم کس کی گاڑی میں گھر آئی ہو؟“

وہ مسمیہ کے ساتھ آتے ہوئے جس بات کا خدشہ کا شکار تھا وہ بالا خر سامنے آئی گیانہ صرف بالاج گھر پر تھا بلکہ ستم بالائے ستم گھر کے گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی سامنے برآمدے کی میز پر کھڑا تھا بلیک لی شرت اور جینز میں ملبوس اس کا سرخ و سفید رنگ غصہ سے دھک رہا تھا اس کی تیز آواز سننے ہی پر پوشہ کانپ اٹھی اور اس کی آواز حلق میں ہی کہیں پھنس گئی جسے بشکل اس نے بردہ کیا۔

”وہ میری دوست تھی۔“

”یہ تم نے ایسی دوستیں کہاں سے بنالیں؟ جو ہر روز ایک نئی گاڑی میں تمہیں چھوڑنے آتی ہیں۔“

وہ میز پر سے اتر کر اس کے قریب آکھڑا ہوا۔ ”وہ میرے خدایہ شخص کس قدر باخبر ہے اور میں آج تک یہ سمجھتی رہی کہ اسے میرے آنے جانے کا علم ہی نہیں ہے۔“

”اب کیا سوچ رہی ہو جو میں پوچھ رہا ہوں۔ اس کا جواب دو۔“

وہ غصہ سے دھاڑا اس کی دھاڑ نے پوشہ کی رہی سہی ہمت بھی ختم کر دی۔ اسے لگا کہ وہ ابھی گر جائے گی وہ تو بھلا ہوا کہ بالاج کی تیز آواز سننے ہی امی اندر سے باہر آئیں اور حیرت زدہ اپنی جگہ پر کھڑی ان دونوں کو ہنسنے لگیں۔

”تمہیں ہمیشہ منع کرتا ہوں۔ اجنبی لوگوں سے دوستیاں نہ کرو اور تم ہو کہ بغیر کسی سے پوچھے انجانے لوگوں کے ساتھ گاڑیوں میں گھوم رہی ہو۔“ وہ اسے خشکیں لگا ہوں سے گھورنا اس کے مزید نزدیک آگیا جبکہ خوف سے اس کی ٹانگیں لرز اٹھیں۔

”کیا ہوا بالاج خیریت تو ہے؟“ بالا خر لینی سے نہ رہا گیا اور انہوں نے تیزی سے آگے بڑھ کر بالاج کو بازو سے تھام لیا۔

”اسی سے پوچھ لیں یہ آپ کو زیادہ بہتر طور پر بتا سکے گی۔“

وہ اس پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالتا ہوا باہر نکل گیا جبکہ وہ اپنی جگہ حیران و پریشان ہی کھڑی رہ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ

آیا کہ دین نہ آنے کی صورت میں اگر وہ سب سے بڑے گناہ میں گھر آئی گئی تو اس میں کیا قیامت تھی بلالاج کے بلا سبب اتنا غصہ کرنے کی کوئی بھی وجہ اس کی سمجھ میں نہ آئی اور ایسے میں جب لپٹی نے اس سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو وہ بلک بلک کر رو دی۔ اپنی ذات پر اس قدر بے اعتباری نے اس کے حساس دل کو دکھی کر دیا تھا۔

اور جانے کیسے بھاگی نے بارہ گھنٹے کے اندر اندر اس کا پیغام چند تک پہنچا دیا۔

”اس سے کہنا کہ اپنا خیال رکھ۔“ چند کے اس جوابی پیغام نے اسے زندگی کی نوید سنا دی۔

”انہوں نے کہا ہے کہ میں چھ تاریخ کو انیس پھر سے فون کروں، وہ آپ کے لیے کوئی پیغام دینا چاہتے ہیں۔“ بھاگی نے آہستہ آہستہ بتایا اس تمام عرصہ میں وہ مسلسل ادھ کھلے دروازے سے باہر دیکھتی رہی۔

”ٹھیک ہے تم فون کر لیتا۔“ خوشی نے سامنے لگے کینڈر پر ایک نظر ڈالی جہاں 29 کا ہندسہ چمک رہا تھا درمیان میں صرف نو دن تھے۔ نو دن بعد فیصلے کی گھڑی آنے والی تھی۔ زندگی یا موت کوئی ایک اس کے مقدر میں درج ہو جاتی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ ناکامی کی صورت میں صرف موت ہی اس کا مقدر بننے والی تھی لیکن اب وہ ڈر خوف کی کیفیت سے نجات پا چکی تھی اور فیصلہ کر چکی تھی کہ عدالت میں صرف وہ بیان دے گی جس کا حکم اس کا دل دے گا اور جو حق ہو گا۔ سچ کے علاوہ اسے کچھ نہ کہنا تھا اب اگر اسے انتظار تھا تو صرف چند کے حکم کا کہ وہ اس سلسلے میں بھاگی کو کیا بدایت دیتا ہے آج رات اس کا نکاح تھا ایک ایسا نکاح جس کی قانونی اور شرعی کوئی حیثیت نہ تھی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ نکاح پر نکاح کا عمل قطعاً غیر اسلامی اور جاہلانہ طرز عمل ہے لیکن اس کے باوجود وہ مجبور تھی۔ اس مسئلے پر جتنا وہ احتجاج کر سکتی تھی کر چکی تھی اور اب مزید کوئی فائدہ نہ تھا اسی لیے اس نے عمل خاموشی اختیار کر لی تھی۔

وہ جان چکی تھی کہ اگر آج اس کے بھائی پر چند عباسی نے جس بے جا اور اندیشہ قتل کا کیس دائر نہ کر رکھا ہوتا تو شاید آج وہ زندہ بھی نہ ہوتی۔ اس کی یہ زندگی محض کسی مصلحت کے تحت تھی پہلے پہل تو اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اگر زریاب اس سے شادی کے لیے تیار ہے تو کیوں یہ لوگ پہلے چند عباسی سے طلاق اور پھر عدت کے بعد شادی کا سارا عمل قانونی اور شرعی طور پر انجام نہیں دیتے؟ لیکن آہستہ آہستہ سمجھ گئی کہ اس کے بھائی نے چند پر جعلی نکاح کا جوابی کیس دائر کر رکھا ہے اب اگر وہ طلاق کا مطالبہ کرتے ہیں تو عدالت انہیں جھوٹا قرار دے دے گی اور ان کا مقصد محض اپنی عزت بچانا تھا اور چند عباسی کو جھوٹا قرار دینا تھا اور اپنی اس جھوٹی شان و شوکت اور عزت کے لیے اسے بھیٹ چڑھایا جا رہا تھا۔ نکاح نامہ پر تاریخ چند ماہ قبل کی ڈالی گئی تھی۔ وکیل اور مولوی صاحب کی ملی بھگت اور پیسوں کے زور پر تمام عمل مکمل کر لیا گیا تھا۔ اب انتظار تھا صرف آٹھ تاریخ کا جس دن عدالت میں خوشی نے پیش ہو کر بیان دینا تھا کہ وہ چند عباسی کو نہیں جانتی بلکہ زریاب اس کا شوہر ہے اور شاید چند عباسی نے یہ جعلی نکاح نامہ اپنی کسی دشمنی کا انتقام لینے کے لیے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہ تھا کہ وہ فی الحال اپنے بھائیوں کی ہر بات خاموشی سے مانتی چلی جائے اور ایسا ہی وہ کر رہی تھی اور سب کچھ اس کے بھائیوں اور باپ کی مرضی کے مطابق ہوتا چلا گیا لیکن جب نکاح کے بعد اس نے رخصتی کا سنا تو اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

یہ اس نے سوچا بھی نہ تھا کہ اس قسم کی صورت حال سے بھی دوچار ہوا جاسکتا ہے اور اب اپنی عزت بچانے کے لیے کوئی بھی راستہ اختیار کرنا پڑتا، جائز تھا۔ بھاگی شام سے ہی اس کے ساتھ تھی جب وہ زریاب کے ساتھ رخصت کی گئی تو بھی بھاگی کو ہی اس کے ہمراہ کر دیا گیا جبکہ اس کے دونوں بھائی فلک شیر اور علی شیر نہایت ہی پھرے تاثرات کے ساتھ اس سے کچھ قدم کے فاصلے پر موجود رہے لیکن بالکل ایسے جیسے ان کا کوئی بھی رشتہ

خوشی سے نہ ہو۔ انہوں نے زریاب سے گلے مل کر اپنی بسن پر ایک نظر بھی ڈالنا گوارا نہ کیا۔ وہ بھی نہایت خاموشی سے خود کو بمشکل سنبھالتی ہوئی بھاگی کا سارا لیے باہر کارڈور تک آگئی جہاں زریاب اپنی گاڑی کے ساتھ اسی کا منتظر تھا اور اس وقت جب وہ پچھلا دروازہ کھول کر اندر داخل ہونا چاہتی تھی اچانک ہی اسے اپنے عقب میں اپنے باپ ابراہیم کسی کی آواز سنائی دی۔

”ایک منٹ رو کر زریاب! مجھے خوشنما سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“ دروازے سے اندر داخل ہوتے ہوئے خوشی ٹھٹک کر رک گئی اور اس نے اپنے قدم واپس موڑ لیے۔ آج اتنے ماہ بعد اپنے باپ کی آواز سن کر اس کا دل بھر آیا اسے لگا شاید اس کے باپ کو اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہو شاید وہ اپنی بیٹی سے وقت رخصت ملنے آیا ہو۔ وہ منتظر تھی۔ کب اس کا باپ آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھے اور وہ اس کے سینے سے لگ کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرے زریاب آگے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا جبکہ بھاگی بھی اسے دروازے کے قریب تنہا چھوڑ کر چپ کے اندر داخل ہو گئی تھی۔ رات کی تاریکی میں لان پر بیرونی روش پر وہ تنہا کھڑی تھی جب ابراہیم کسی دھیرے دھیرے چلتا اس کے قریب آیا۔

”میں نے قسم کھائی تھی۔ اپنی زندگی میں کبھی تمہارا منہ دوبارہ نہ دیکھوں گا لیکن آج وقت کے ہاتھوں میں مجبور ہو گیا اور مجھے اپنی قسم توڑنی پڑی ورنہ تم جیسی حیا بانختہ لڑکی کی شکل بھی شاید میں کبھی نہ دیکھتا۔ تم جیسی لڑکیاں جو چڑھتی جوانی کے جوش میں اپنے باپ بھائیوں کو دنیا کے سامنے ذلیل کرواتی ہیں زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں رکھتیں۔“

وہ بغیر کسی تہدید کے بول رہا تھا۔ ان کے لہجہ کی سفاکی نے خوشی کے رگ دپے میں جھرجھری سی بھر دی اور ایک سرور اس کی ریڑھ کی ہڈی میں اتر گئی۔

لیکن جانے کیوں میر زریاب تمہارے قتل کے فیصلے کے خلاف ہمارے سامنے اکھڑا ہوا اور ہمیں اس کی بات ماننی پڑی۔ وہ جیسا چاہے تمہارے ساتھ سلوک کرے۔ ہمیں کوئی اعتراض نہ ہو گا اور تم بھی یہ بھول جانا کہ تمہارے ماں باپ زندہ ہیں کیونکہ تمہارے جیسی لڑکی کو بیٹی کہتے ہوئے بھی ہمیں شرم آتی ہے اب جاؤ لیکن یاد رکھنا جب تک زندہ ہو، تمہیں ہمیں اپنا منخوس چہرہ نہ دکھانا اور ماں باپ زریاب۔“

اس سے بات کرتے کرتے ابراہیم کسی نے اچانک ہی زریاب کو پکارا۔

”جی بابا سائیں! وہ فوراً“ جب سے نیچے اتر کر اس کے باپ کے سامنے اکھڑا ہوا۔ اس کا انداز نہایت ہی مودبانہ تھا۔

”بابا! جب تک یہ کیس چلے ٹھیک ہے۔ جب ختم ہو جائے تو جو تمہارا دل چاہے وہ سلوک اس لڑکی سے کرنا۔ ہمیں کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ چاہو تو مار کر کہیں گاڑ دینا پھر گھر کے کسی کونے میں ڈال کر بھول جانا۔“

زریاب کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر لوتا ہوا ابراہیم کسی کا لہجہ اس نفرت کا غماز تھا جو اس کے دل میں خوشی کے لیے موجود تھی وہ بڑی مشکل سے اپنی لاش کو کھینچتی ہوئی زریاب کی ہمراہی کر اس گھر تک پہنچی ہو شاید زریاب نے حال ہی میں خرید اتھا وہاں اس کے استقبال کے لیے صرف پھونچھی الماس موجود تھیں لیکن بالکل ایسے جیسے اسے جانتی ہی نہ ہوں۔ ان کا رویہ اتنا حقارت آمیز تھا جیسے وہ کوئی ناپاک اور نجس چیز ہو جسے جھوٹے سے ان کے وجود کے کندھے ہونے کا خدشہ ہو زریاب کے پیچھے پیچھے چلتی بھاگی کی ہمراہی میں اپنے کمرے تک آگئی جو بالکل سادہ سا تھا اور اتنے قیمتی گھر کا حصہ ہی معلوم نہ ہوتا تھا۔ اس کمرے کو دیکھتے ہی اسے اپنی اوقات سمجھ میں آگئی اور وہ جاں گئی کہ زریاب کے نزدیک اس کی کیا حیثیت ہے۔

آٹھ تاریخ آپہنچی۔ آج اسے عدالت میں پیش ہو کر اپنے باپ بھائیوں کے حق میں بیان دیتا تھا۔ اس کا نکاح نامہ پچھلی پیش میں ہی عدالت میں جمع کروا دیا گیا تھا۔ شادی میں شریک مختلف لوگ بھی بطور گواہ اپنا بیان ریکارڈ کروا چکے تھے۔ ہر شخص نے حلفیہ بیان دیا تھا کہ وہ خوشنما اور زریاب کی شادی میں شریک تھا۔ اس کی تصاویر ثبوت کے طور پر پیش کر دی گئی تھیں۔ جنید عباسی کا کیس فیصد کمزور ہو چکا تھا اور اب مگسی خاندان کو یقین تھا کہ خوشی کا بیان اس کیس کے ثبوت کی آخری کیل ثابت ہو گا۔ خوشی نے پچھلے نو دن ایک امید و بیم کی کیفیت میں گزارے تھے اس نے شکر ادا کیا تھا کہ زریاب خود ہی اس کے کمرے میں نہ آیا تھا ماسوائے ایک دن کے جب وہ صرف اسے یہ یقین دلانے آیا تھا کہ اگر وہ عدالت میں جنید عباسی کے خلاف بیان دے دے اور بتا دے کہ وہ اسے قطعاً نہیں جانتی اور اس نکاح سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے تو وہ اسے دل سے اپنی بیوی تسلیم کر لے گا۔

اور اس لمحہ خوشی نے اسے یقین دلایا کہ جنید اس کے ماضی کی ایک غلطی تھا جسے وہ وقت گزرنے کے ساتھ بھول چکی ہے اور اب جو کچھ ہے اس کے لیے میر زریاب ہی ہے۔

خوشی کی اس یقین دہانی کے بعد اتنا ضرور ہوا کہ اسے اس گھر میں آزادانہ گھومنے پھرنے کی اجازت مل گئی باوجود اس کے کہ وہ ان نو دنوں میں سوائے چند محلوں کے اس کمرے سے باہر ہی نہ نکلی جہاں وہ اس شادی کے بعد مقیم تھی اور وہ چند لمحے جن میں اس نے کمرے سے باہر نکلنے کی غلطی کی تھی اسے اچھی طرح اس کی اوقات یاد دل گئے تھے۔ اس کی سگی اور لڑائی پھوپھی نے اسے دیکھ کر بڑے کدو فرسے کہا تھا۔

”آج ابراہیم کی اپنی لڑکی نے اتنا گند ڈالا تو کسی کو نظر نہ آیا اگر خاندان کی کوئی اور لڑکی ہوتی تو کاری کر دی جاتی یہاں تو باپ بھائیوں نے اپنے گھر کا گند اٹھا کر میرے معصوم بچے کی جھولی میں ڈال دیا خیر کوئی بات نہیں ہم نے کون سا اسے ہمیشہ اپنے پاس رکھنا ہے کسی کا جھوٹا تو بیٹے بھی میرے بیٹے نے بھی زندگی میں نہیں کھایا۔ وہ تو ہمیشہ ستھری چیز کھانے کا عادی ہے۔ یہ منحوس کیس ختم ہو تو ہم بھی اسے جھاڑو پھیر کر باہر نکالیں اور میں اپنے بیٹے کی شادی کر کے اس کی زندگی خوشیوں سے بھروں۔“

بھائی کمرے میں ہی اس کے لیے جائے کھانا اور ضرورت کی ہر چیز لے آتی تھی جبکہ وہ ایک ایک دن مگن کر آٹھ تاریخ کا انتظار کر رہی تھی۔ بھائی کے ذریعے اسے جنید کا ایک اور پیغام مل چکا تھا اس نے کہا تھا کہ ”پیشی سے تقریباً پندرہ یا بیس منٹ قبل کسی بہانے سے عدالت کے احاطے میں بنے واش روم تک آ جانا اس کے بعد جو ہو گا وہ ہمارا کام ہے تمہارا کام صرف باہر احاطے تک آنا ہے۔“

اس نے مزید کہا تھا کہ ”عدالت میں دینے جانے والے کسی بھی بیان سے ان دونوں کو کوئی فائدہ ہونے والا نہ تھا کیونکہ اگر خوشی کمرہ عدالت میں اپنے باپ بھائیوں کے خلاف کوئی بیان دے بھی دے اور عدالت اس بیان کی روشنی میں اسے جنید کے ساتھ جانے کی اجازت بھی بے شک دے دے تو بھی اس کے بھائی کبھی اسے زندہ سلامت باہر نکلنے نہ دیں گے۔“ جنید کو سو فیصد یقین تھا کہ اسے پولیس کے پہرے میں بھی مار دیا جائے گا اور یقیناً اس کا انتظام اس کے بھائی کر کے گئے تھے اور اپنے پچھلے دنوں کے حالات کو دیکھتے ہوئے وہ بڑی آسانی سے جنید کی بات پر یقین کر سکتی تھی کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے سو فیصد درست ہے اور اب اسے وہی کرنا تھا جو جنید نے سمجھایا تھا۔ تقریباً ”بارہ بج کر پانچ منٹ پر وہ کمرہ عدالت میں داخل ہوئی کیونکہ ایک بجے کے قریب اس کی پیشی تھی۔ اس کے ساتھ اس کے دونوں بھائیوں کے علاوہ زریاب سمجاول اور علی شیر کے باڈی گارڈ بھی تھے۔ اندر صرف وہ بھائی زریاب علی شیر اور فلک شیر گئے تھے جبکہ باقی لوگ باہر ہی رک گئے تھے۔

ان سب کے پاس بھاری تعداد میں اسلحہ موجود تھا لیکن وہاں کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اس سلسلے میں ان

سے باز پرس کی جاسکتی۔ وہ آگے کی نشستوں پر بھاگی کے ساتھ بیٹھی تھی جب اچانک ہی اس کے پیٹ میں شدید درد اٹھانے لگا کہ وہ درد سے بے حال سی ہو گئی ویسے ہی اسے پچھلے دو دن سے ڈائریا ہو گیا تھا۔

”مجھے ہاتھ روم جانا ہے۔“ بالا خر تکلیف نہ برداشت کرتے ہوئے اس نے اپنے قریب بیٹھے میر زریاب سے کہا جس نے ایک نظر سامنے کھڑی پر ڈالی ایک بجنے میں دس منٹ باقی تھے جبکہ ابھی کمرے میں عدالت کا کوئی بھی آدمی موجود نہ تھا۔

”ٹھیک ہے آؤ۔“ زریاب اٹھ کھڑا ہوا۔

زریاب ساتھ چل پڑے گا اسے یہ امید ہرگز نہ تھی وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

”بھائی باہر دیکھو سمجاول ہو گا۔ اسے کو تم دونوں کے ساتھ واش روم تک جائے۔“

جائے کیا سوچ کر زریاب نے بھاگی کو آواز دی۔ اس کی بات سنتے ہی خوشی نے اطمینان کا سانس لیا بھاگی جو کہ متوحش نگاہوں سے اس کی جانب تک رہی تھی۔ زریاب کا حکم سنتے ہی تیزی سے باہر کی جانب لپکی۔

”زریاب! تم بھی ان کے ساتھ ہی جاؤ گے اور ذرا جلدی فارغ ہو کر واپس آؤ جج صاحب آگئے ہیں۔“

باہر نکلتے نکلنے اس نے علی شیر کی آواز سنی اور پھر زریاب بھی اس کے ساتھ ہی باہر آئے۔ اس نے اٹھ کھڑا ہوا اور سمجاول اپنے گارڈز کے ہمراہ کھڑا تھا ان دونوں کو آتا دیکھ کر وہ سب احتراماً ”ایک جانب ہو گئے جیسے ہی وہ بھاگی اور زریاب کی ہمراہی میں احاطے کی جانب بڑھی۔ سمجاول اپنے گارڈز کے ہمراہ خاموشی سے ان کے پیچھے چل دیا وہ

بے حد خوف زدہ اور گھبرائی ہوئی تھی دل ہی دل میں مختلف قرآنی آیات کا ورد کرتی۔ وہ اس مقام تک آگئی جہاں سامنے ہی بنے ہوئے احاطے میں واش روم تھے۔ وہاں میں ہاتھ پر مردانہ جبکہ بائیں طرف زنانہ کا بورڈ آویزاں تھا اور ظاہر ہے کہ زنانہ واش روم میں چاہتے ہوئے بھی کوئی مرد اندر داخل نہ ہو سکتا تھا لہذا وہ صرف بھاگی کے ہمراہ دھڑکتے ہوئے دل سے اندر داخل ہوئی۔ سمجاول اور زریاب ہاتھ روم میں پہنچ کر قدم کے فاصلے پر ہی رک گئے تھے۔

اس تمام عرصہ میں ان دونوں نے بھی ایک دوسرے سے کوئی بات نہ کی تھی اندر داخل ہو کر اس نے جیسے ہی بھاگی کی زور زور گت دیکھی اسے احساس ہوا کہ وہ خوشی سے بھی زیادہ گھبرائی ہوئی ہے۔ آگے کیا ہونے والا تھا؟

یہ ان دونوں میں سے کوئی نہ جانتا تھا۔ وہ تو صرف جنید کی ہدایت کے مطابق یہاں تک آگئی تھیں اور اب کسی انمولی کی منتظر تھیں جو انہیں اس ایک لمحہ کی قید سے آزادی دلائی اور بالا خراطلے ایک سیکنڈ میں ہی وہ انمولی وقوع پذیر ہو گئی جس کے انتظار نے انہیں صلیب پر لٹکا رکھا تھا اچانک ہی داخل ہونے والے مردوں میں سب سے آگے جنید تھا جسے شاید اس نے آج کی ماہ بعد دیکھا تھا۔ وہ سب بھاگتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے جنید کے ساتھ موجود دیگر تمام مرد اسلحہ سے لیس تھے۔

”جلدی نکلو باہر جلدی۔“ جنید نے اندر داخل ہوتے ہی اسے بازو سے پکڑ کر کھینچا۔ اس کی کالی چادر سر سے ڈھلک کر کندھوں پر آگئی وہ یک دم گھبرا اٹھی۔

”میرے ساتھ بھاگی بھی جائے گی۔“ جنید کے ساتھ زندگی کا نیا سفر شروع کرنے سے قبل اسے بھاگی کی زندگی محفوظ کرنے کا کوئی دوسرا بہتر حل نظر نہ آیا تھا۔

جنید نے ایک نظر جاکر میں ملبوس سٹونی سلونی سی بھاگی پر ڈالی جو سر جھکائے کھڑی تھی لیکن اس کے جسم کی پکیا ہٹ اس بات کی گواہی دے رہی تھی کہ موت کا خوف اسے اپنی پلٹ میں لے رہا ہے۔

”ٹھیک ہے۔ آجاؤ تم بھی۔“ جنید کو ایک لمحہ لگا اور فیصلہ ہو گیا۔

وہ اور بھاگی جیسے ہی جنید کی ہمراہی میں باہر نکلیں سامنے ہی میر زریاب اور سمجاول جنید کے آدمیوں کے نرے میں گھرے نظر آئے ان سب کا اسلحہ چھین لیا گیا تھا اور اب وہ سب منتہے تھے۔

”میں ان دونوں کو لے کر نکل رہا ہوں تم دوسری جیب میں انہیں بھی اپنے ہمراہ لے آؤ۔ جلدی کرو ایسا نہ ہو اندر خبر پہنچ جائے اور وہ لوگ باہر نکل آئیں جلدی کرو جلدی۔“ جنید جلدی جلدی ہدایت دیتا ہوا تیزی سے باہر کی جانب لپکا۔ وہ جنید کے ساتھ تقریباً بھاگ رہی تھی اتنے اسلحہ کے زغہ میں دو لڑکیوں کو لے جاتے آدمیوں کے لیے خود بخود ہی راست بننا چلا گیا۔

چند قدموں کے فاصلے پر ہی جیب موجود تھی وہ سب تیزی سے اندر داخل ہوئے اور جیب ہو۔ اسے باتیں کرتی ہوئی گیٹ سے باہر نکل گئی اور اس عدالت کے گیٹ سے باہر نکلتے ہی وہ اپنے پیچھے سب کچھ چھوڑ آئی۔ اپنا خاندان اپنے سارے رشتے تاتے عدالت میں کھڑے بظاہر غیر متند اپنے بھائی جنہوں نے بغیر نکاح کے اپنی سگی بہن ایک ناخرم کے حوالے کر دی تھی اور میر زریاب جو کچھ نہ ہوتے ہوئے ہی بظاہر دنیا کے سامنے اس کا شوہر تھا یہ سب کچھ ایک خوف ناک بھولی بصری یاد کے طور پر دور کہیں رہ گیا۔

اگر کچھ اس کے ساتھ تھا تو وہ جنید عیسیٰ اور برے وقت میں اس کا ساتھ دینے والی ایک معمولی ملازمہ بھاگی جو اسے آج اپنے ہر رشتہ سے زیادہ عزیز تھی۔ اسے افسوس تھا کاش اس کے گھر والے قانونی طور پر جنید سے طلاق کے بعد اس کی دوسری شادی زریاب سے کرتے تو وہ بھی یہ انتہائی قدم نہ اٹھاتی بہر حال جو ہونا تھا ہو چکا اور اب گزرے وقت کو یاد کرنا بے کار تھا وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے اس عمل کے بعد پیچھے کیا ہوا؟ لیکن جلد ہی اخبارات کے ذریعے اسے کافی کچھ پتا چل گیا۔ زریاب اور سچاویں جنہیں حفظ باقاعدہ کے طور پر جنید کے آدمی ساتھ ہی لے آئے تھے اسی رات رہا کر دیے گئے کیونکہ ان کا اغوا اس منصوبے میں شامل نہ تھا۔ اس کے جنید کے ساتھ فرار کی خبر نے اس کے بھائیوں کے ہوش اڑا دیے انہوں نے نا صرف باہر نکل کر اندھا دھند فائرنگ کی بلکہ جنید کے وکیل کو بھی احاطہ عدالت میں بری طرح پٹیا جس کی بنا پر انہیں گرفتار کر لیا گیا اور دو دن بعد ابراہیم گمشدگی کی کوششوں کے نتیجہ میں ان کی ضمانت ہوئی۔

خوشی نے ہر روز کے اخبار میں اپنا اور اپنے سے وابستہ رشتوں کا نام کئی بار پڑھا۔

عدالت سے اس کے فرار کی خبر جو بڑے مہینے لگا کر اخبارات میں پیش کی گئی تھی اب تک کہ چند اخبارات نے توجہ دی کر دی کہا گیا کہ وہ اپنے شوہر کو چھوڑ کر شیخ نکاح کے بغیر فرار ہوئی ہے جس کی بنا پر اس پر شرعی دفعہ نافذ کی جائے وہ جب بھی کوئی نئی خبر دیتی اس کی نگاہوں میں اپنے باپ اور بھائیوں کے شرمسار چہرے آجاتے اور جانے کیوں نہ چاہتے ہوئے بھی اسے ایک نامعلوم سا احساس بزم گھیر لیتا کاش وہ محبت میں اتنی اندھی نہ ہوتی کہ آج اپنے ہی ہاتھوں اپنے باپ کی عزت کو روندنا نہ پڑتا لیکن شاید یہ تمام ذلت اس کے خاندان کا مقدر بن چکی تھی۔ جو بھی حقیقت یہ تھی کہ اب وہ حد سے زیادہ خوف زدہ رہنے لگی تھی حالانکہ اس کے حالات میں جنید کے گھر والوں نے بھرپور انداز سے اس کا ساتھ دیا تھا لیکن اس کے دل بدن بدھتے ہوئے خوف نے جنید کو مجبور کر دیا کہ وہ اسے لے کر پاکستان سے باہر چلا جائے۔

اپنے گاؤں سے انہوں نے بالکل واسطہ ختم کر رکھا تھا کیونکہ اسی میں ان سب کی بہتری تھی۔ وہ جانتی تھی کہ اس کے بھائی اسے جان سے مارنے کا عہد کر چکے ہوں گے جس کے مطابق وہ اپنا یہ عہد بہر حال میں پورا کریں گے چاہے انہیں اس کے لیے کتنا ہی انتظار کیوں نہ کرنا پڑے۔

بھاگی کی شادی کر دی گئی تھی۔ وہ ملتان اپنے شوہر کے ساتھ مقیم تھی جو جنید کی زمیوں پر ہی کام کرتا تھا۔ شروع شروع کا کچھ عرصہ وہ خوف زدہ رہی لیکن جلد ہی جنید کی محبت اور بچوں کی پیدائش نے اسے سب کچھ بھلا دیا لیکن شاید جنید کبھی بھی کچھ نہ بھول سکا۔ اس نے ہمیشہ خوشی اور اپنے بچوں کو بہت زیادہ احتیاط سے رکھا۔ اسے ہمیشہ یہ خدشہ رہا کہ کہیں خوشی کے بھائی زندگی کے کسی چھوڑ پر اس سے ٹکرانہ نہ جائیں اور اس فکر کو ناقصان اس کی اولاد

کو نہ ہو اور اس کی طبیعت کی یہ انتہا پسندی اور دل کا خوف خود بخود اس کی اولاد میں بھی منتقل ہو گیا گزرتے وقت کے ساتھ جنید اپنی اولاد کا خاص طور پر اپنے بیٹے کو بھی سب کچھ بتا دیا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ بے خبری کے سبب انہیں کوئی نقصان پہنچے۔

بہر حال وقت کبھی نہ رکنے والی چیز ہے اور ہمیشہ بہر حال میں گزری جاتا ہے۔ خوشی کی موت کے ساتھ ہی محبت کا وہ سفر جو لمبی سی شروعات ہوا تھا اپنے اختتام کو پہنچا۔



”دیکھو پلوٹ! اب میں تمہارا انکار نہیں سنوں گی۔ تمہیں بہر حال میں میری سالگرہ کا فنکشن اٹینڈ کرنا ہی ہوگا۔“ مہینہ نے تھمتی طور پر اپنا فیصلہ سناتے ہوئے کہا۔

”لیکن بہن!“

”تو لیکن، لیکن بس آج اور ابھی فیصلہ کرو ہاں یا ناں اگر ہاں تو ٹھیک ہے اور اگر تمہارا فیصلہ ناں ہے تو پھر سواری۔“ میری اور تمہاری دوستی کا یہ سفر بھی یہیں ختم ہو جائے گا کیونکہ اب میں مزید کسی ایسی لڑکی سے دوستی کی متحمل نہیں ہو سکتی جو خود اور اس کے گھر والے مجھے قابل بھروسہ نہ سمجھتے ہوں۔“

وہ ذرا کی ذرا سانس لینے لگی۔

”ٹوٹی ویری فرینک یار! اگر تمہیں لگتا ہے کہ میں کوئی خراب لڑکی ہوں جس کی بنا پر تم مجھے اپنے گھر والوں سے متعارف کرواتے ہوئے گھبرا رہی ہو یا شاید تمہارے گھر والے تمہاری اور میری دوستی کو پسند نہیں کرتے تو ایزیو دس اپنی اور میری دوستی کے چھپٹو کو نہیں کھڑ کر دو۔“

جائے یہاں آج اسے خواہواہی پلوٹ سے انکار سن کر غصہ سا آگیا اور نہ وہ ہمیشہ اس کی مجبوری کو آسانی سمجھ جایا کرتی تھی اور اب پلوٹ کے لیے بھی انکار کی مزید گنجائش باقی نہ بچی تھی اسی بنا پر کچھ سوچتے ہوئے اس نے پوچھا۔

”ٹھیک ہے یا راکھیاں ناراض ہوتی ہو یہ بتاؤ یا راکھیاں کا نام کیا ہے؟“

بالا خیرہ ہار مان ہی گئی کیونکہ اپنے گھر والوں کی فضول سی ضد کے سبب وہ اپنی اتنی اچھی دوست کو ناراض نہ کر سکتی تھی۔

”پاپی ٹولیت ٹائٹ تنک چلے گی لیکن میں تمہیں زیادہ دیر تک نہیں روکوں گی۔“ پلوٹ اس کی رضامندی سے خوش ہو گئی۔ اور وہ جلدی جلدی اپنا پروگرام ترتیب دیتے ہوئے بولی۔

”میں بھی نہیں۔“

”بھئی دیکھو گیا کرتے ہیں۔ کل کالج میں فن فنس ہو۔ تم گھر والوں کو بتا کر آنا کہ لیٹ آؤ گی کل ہم صبح کالج سے بھائی کے ساتھ گھر چلے جائیں گے۔ میں شام میں برتھ ڈے کا ایک کانٹے کے بعد جلدی میں تمہاری بوین کے آنے تک تمہیں واپس کالج چھوڑ دوں گی۔ اس طرح تمہارے گھر والوں کو بھی علم نہ ہوگا اور میری برتھ ڈے پر ہونے والی تمہاری کمی بھی پوری ہو جائے گی۔“

”چلو ٹھیک ہے یہ زیادہ صحیح رہے گا۔“ وہ آسانی مان گئی کیونکہ اسے اس تمام عمل میں کوئی قباحت نظر نہ آ رہی تھی۔

”گڈ با راکم نے تو آج میرا دل خوش کر دیا۔“ مہینہ خوشی سے چلا اٹھی ”تم جان نہیں سکتیں تمہارے اس اقرار نے مجھے کتنا مان دیا ہے۔ شکریہ میری اچھی دوست اس بھروسہ کا جو تم نے مجھ پر کیا۔“

”وہ تو ٹھیک ہے بہن! لیکن خیال رہے ربات کالج میں کسی کو ہٹانے چلے کیونکہ ایسا نہ ہو کہ ورثہ کے ذریعے یہ خبر میرے گھر تک پہنچ جائے۔“ وہ خدشہ ظاہر کرتے ہوئے بولی۔

”چھا ہوا“ تم نے خود ہی کہہ دیا ورنہ میں تو تمہیں خود منع کرنے والی تھی کہ اس بات کا ذکر کالج میں کسی سے نہ کرنا ویسے بھی کل کالج میں فن فیسور ہے۔ آل ریڈی تم نے گھر کے کپڑوں میں ہی آتا ہے لہذا تمہارے میرے ساتھ جانے کا علم کسی کو بھی نہ ہو گا ٹھیک ہے نا۔“

”ہاں ٹھیک ہے۔“ وہ مزید مطمئن ہو گئی۔

سارا رات اس کے ذہن پر سبب نہ ہی سوار رہی اس کے گھر جانے کی خوشی کے ساتھ ساتھ ایک انجانے سے خوف نے بھی اسے گھیرے رکھا۔

اگر جو بلا لاج امی کو ہٹا چل گیا کہ میں کالج سے کہیں گئی تھی تو کیا ہو گا؟ وہ سبب نہ کی چار دن کی دوستی کی خاطر اپنے گھر والوں کی محبت، پیار اور اعتماد کو دھوکا دینے چلی تھی جس کا احساس اسے ابھی نہ تھا اس نے رات ہی جیکے جیکے اپنا سوٹ استری کر کے پینگ کر دیا تھا۔ بیچنگ کی چوڑی اپنے ہینڈ بیک میں چھپا کر رکھ لی تھی تاکہ کالج جا کر پن سے، صبح جلدی جلدی اٹھ کر وہ خوب اچھی طرح تیار ہوئی لیکن جیسے ہی وہ ناشتے کے لیے کچن میں داخل ہوئی امی کی تنقیدی نگاہوں سے نہ بچ سکی۔

”پنی لپ اسٹک کا کمر بکا کر اور یہ تم فن فیسور میں جاری ہو یا کسی فیشن شو میں شرکت کے لیے۔ کیا ضرورت تھی اتنا بھاری سوٹ پہننے کی، جاؤ جا کر کوئی کاٹن کا سوٹ پہنو۔“

حالانکہ وہ دین آنے سے تقریباً ”پندرہ منٹ قبل ہی باہر آئی تھی تاکہ جلدی جلدی میں امی کی نگاہوں کی زد سے بچ سکے لیکن ایسا ناممکن تھا۔ پلوٹہ نے بے بسی سے اپنی ماں کو دیکھا اور دوسری نظر اپنے بلیک جارجٹ کے کڑھائی والے سوٹ پر ڈالی جو اتنا بھی قیمتی اور بھاری نہ تھا جتنا لینی نے جتا دیا تھا لیکن اس کا ارادہ اس لباس کو تبدیل کرنے کا نہ تھا۔ اسی لیے خاموشی سے ناشتا کرنے کے لیے کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ وہ اس وقت لینی کو کوئی جواب بھی نہ دینا چاہتی تھی کیونکہ اسے اندازہ تھا کہ اگر اس کی امی غصہ میں آگئیں تو شاید آج وہ فن فیسور کے لیے گھر سے ہی نہ نکل سکے۔

”ارے تم نے ابھی تک کپڑے تبدیل نہیں کیے؟“

چائے لے کر کچن سے واپس آئی لینی کی نظر جیسے ہی پلوٹہ پر پڑی غصہ سے ان کی بھنویں تن گئیں اور انہوں نے سخت لہجہ میں اسے مخاطب کیا۔

”جی امی! جاری ہوں کپڑے تبدیل کرنے۔“

اس کی مری مری آواز حلق سے برآمد ہوئی کیونکہ اب ناگزیر تھا۔ اسی لیے وہ خاموشی سے کرسی سے اٹھ کھڑی ہوئی کہ اچانک ہی قدرت کو اس پر رحم نہ آگیا اور باہر تیز بارن کی آواز سنائی دی، جسے سنتے ہی اس نے ایک بے بسی نگاہ لینی کے سخت چہرے پر ڈالی۔ بات لینی کی سمجھ میں بھی آہی گئی۔ بالان کھچلے دو دن سے اسلام آباد گیا ہوا تھا۔ اب جو اگر دین چلی جاتی تو لازماً ”پلوٹہ کو کالج سے چھٹی کرنا پڑتی جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ فن فیسور میں شریک نہ ہو سکتی تھی اور فن فیر میں شرکت کی جو خوشی اس لمحہ انہیں پلوٹہ کے چہرے پر نظر آ رہی تھی وہ اسے خراب نہ کرنا چاہتی تھیں۔ اس لیے ہی مجبور ہو گئیں۔“

”چلو ٹھیک ہے“ آج تو چلی جاؤ، لیکن آئندہ احتیاط کرنا اور دوشلا اپنے سر پر اوڑھو۔“

اس کے گیت سے باہر نکلنے تک پیچھے سے لینی کی نصیحت آمیز آواز اسے سنائی دیتی رہی، جسے سن کر نظر انداز

کر کے وہ دین میں سوار ہو گئی اور سارا رات اپنی دوست کے گھر گزارنے والے ایک مبسوط دن کا تصور لے کر وہ کالج گیت کے سامنے اتر گئی جیسے ہی وہ گیت پار کر کے اندر داخل ہوئی، پہلی ہی نگاہ سامنے کھڑی سبب پر پڑی جو غالباً ”گھر کے عام سے کپڑوں میں ہی ملبوس تھی۔ ٹراؤزر کے ساتھ ٹی شرٹ اور دوپٹا بندار دیکھتے ہی وہ تیزی سے آگے بڑھی۔“

”شکر ہے خدا کا، تم آگئیں، چلو آ جاؤ جلدی کرو، چلیں۔“

اس کے لہجہ میں چھلکتی بے تحاشا خوشی پلوٹہ کو حیران سا کر گئی۔

”ارے اتنی صبح صبح، کچھ دیر صبر تو کرو، ہم پہلے تھوڑا سا فن فیسور تو انجوائے کر لیں، پھر چلتے ہیں۔“

جانے کیوں سبب نے کے لہجے پلوٹہ کو خائف سا کر دیا اور وہ یکدم ہی پریشان سی ہو اٹھی۔ اسے احساس ہوا کہ شاید وہ کچھ غلط کرنے جا رہی ہے۔

”نہیں یار! میں توجہ میں ناشتا بھی نہیں کر کے آئی۔ پلیز چلو بہت بھوک لگی ہے۔“

سبب نے لجاجت سے کہتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا اور چند لمحے پہلے دل میں پیدا ہونے والا احساس بھی خود بخود معدوم ہو گیا۔ وہ دونوں کالج گیت سے باہر آگئیں جہاں سبب نے کی گاڑی ڈرائیور سمیت موجود تھی۔ گاڑی میں بیٹھنے سے قبل ایک بار تو پلوٹہ کا دل چاہا کہ وہ سبب نے کے ساتھ اس کے گھر نہ جائے۔ جانے کیوں اس کا دل گھرا رہا تھا۔ سبب نے گاڑی میں بیٹھتے ہی اپنے سیل کے ہیڈ فون کانوں میں لگا کر آس پاس سے بے خبر ہو چکی تھی اور پھر اسی خاموشی میں سبب نے کے گھر کا فاصلہ طے ہو گیا اور اگلے دس پندرہ منٹ تک وہ اس کے گھر پہنچ چکی تھی، داخلی دروازے سے اندر لاؤنج میں داخل ہوئی اور سامنے نظر آنے والے قیمتی فرنیچر اور آرائشی سامان نے اسے گنگ سا کر دیا۔

”مما آگئی ہیں؟“ سبب نے نہ کچن میں داخل ہو کر غالباً ”اندر موجود کسی ملازمہ سے سوال کیا، جبکہ وہ وہیں لاؤنج میں ہی کھڑی تھی۔

جی بی بی جی! ابھی ابھی آئی ہیں اور اوپر اپنے کمرے میں چلی گئی ہیں۔ ملازمہ کی جوابی وضاحت اس کے کانوں سے ٹکرائی۔

”جسٹ آمنت پلوٹہ! تم یہاں بیٹھو میں مام سے مل کر آؤں، دراصل آج ہی دینی سے واپس آئی ہیں۔“

کچن سے غلبت میں نکل کر اسے صوفہ پر بیٹھا کر وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی اوپر چلی گئی، وہ سارے ٹی وی لاؤنج کا تفصیلی جائزہ ہی لے رہی تھی کہ سبب نے واپس آگئی۔

اس کے ساتھ اس کی مام بھی تھیں، بے حد اسٹائلف کدھوں پر آنے والے گولڈن بال، سلیولیس ٹاپ اور کیپری کے ساتھ وہ کہیں سے بھی ایک جواں سال بیٹی کی ماں نظر نہ آ رہی تھیں، انہیں اس قدر ویل ڈرہسلو میج کر یکدم پلوٹہ کے ذہن میں اپنی سادہ سی گھریلو عیال والی ماں کا تصور آگیا، ”اف خدا یا کس قدر فرق ہے میری امی اور سبب نے کی مام میں۔“

”مام! میٹ ہر مٹی آزمائی، بسٹ فرنیچر پلوٹہ۔“

”السلام علیکم!۔“ جائزہ لیتی لیتی وہ یکدم گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

”ارے بیٹھو بیٹی۔ میں تو صرف تمہیں دیکھنے آئی تھی۔ دراصل میری بیٹی تمہارے حسن کی بہت شیدائی ہے۔“

تعریف کا عجیب سا انداز سبب کچھ نارمل ہوتے ہوئے بھی پلوٹہ کے ذہن کو الجھا سا گیا۔ جانے کیوں ان کے بولنے سے زیادہ دیکھنے کا انداز پلوٹہ کو مضرب کر رہا تھا۔

”میں نے! تمہاری دوست تو واقعی بہت ہی پیاری ہے، بس ذرا سی سیدھی ہے، ورنہ آج اپنے حسن کے نور پر دنیا کو اپنی انگلیوں پر نچا رہی ہوتی۔“

وہ اس کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے ذرا سانس کر لیں، جبکہ پلوٹہ کا چہرہ ان کی تعریف سے سرخ سا رہ گیا۔
 ”اوکے رہا بیٹا! انجوائے یور سیلف، میں اب آرام کروں گی۔“ اوپر جاتے جاتے ہاتھ میں پکڑا سگار اپنے لائنز سے جلا کر انہوں نے ہونٹوں سے لگا لیا۔
 اور ہاں رہا ملازمہ کو بیچ کے لیے بتا دیتا۔“

”اوکے ماہم۔“
 ”تمہاری امی سگریٹ چیتی ہیں؟“ وہ قدرے حیران تھی کیونکہ ان کی فیملی میں مردوں کی بھی سگریٹ نوشی پسند نہ کی جاتی تھی۔

”ہاں کیوں؟“ اس کے سوال نے سبینہ کو حیران سا کر دیا اور اس نے کندھے اچکاتے ہوئے دریافت کیا۔
 ”بس۔ ایسے ہی پوچھ رہی تھی۔“

”چلو آؤ میرے کمرے میں چلیں، شہناز میرے کمرے میں جوس کے دو گلاس لے آؤ، پھر اچھا سا ناشتا بنا دیتا۔“
 پلوٹہ سے کہتے ہوئے ساتھ ہی اس نے ملازمہ کو بھی ہدایت دی اور آگے کی جانب چل دی، پلوٹہ بھی اپنا پیڈل بیگ اٹھا کر خاموشی سے اس کے ساتھ ہوئی، سبینہ کا کمرہ بھی پانی گھر کی طرح بے حد خوب صورت تھا، ابھی وہ کمرے کا جائزہ ہی لے رہی تھی کہ ملازمہ جوس لے کر آئی جو اس نے کمرے میں موجود ٹیبل پر رکھ دیے اور خاموشی سے واپس پلٹ گئی، وہ سگریٹ سمنی سی بیڈ کے کونے پر تنگ گئی، جبکہ سبینہ نے اپنا ہوم ٹیشر آن کر دیا۔ اتنی بڑی اسکرین شاید نہیں بلکہ یقیناً اس نے آج زندگی میں پہلی بار دیکھی تھی، سبینہ نے جوس کا گلاس اسے تھما دیا۔ بے حد خوب صورت کرشل کے بلوریں گلاس سے گھونٹ گھونٹ جوس اس کے حلق میں اترنے لگا۔
 سبینہ جانے الماری کھولے کیا نکال رہی تھی۔

”تم ذرا بیٹھو، میں ملازمہ کو ناشتا اور بیچ کا کمرہ آؤں۔ ریلیکس ہو کر بیٹھو یا ر۔ اتنا گھبرا کیوں رہی ہو؟“
 وہ تیزی سے باہر جاتے جاتے واپس چلی۔

”ذرا اپنا دیشا دے دیتا، یہ وقت میرے دادا کے واک سے واپس آنے کا ہے، اگر انہوں نے مجھے اس طبقے میں دیکھ لیا تو نہ پوچھو میرا کیا شہر ہوگا۔“

اس نے خاموشی سے اپنا دیشا اتار کر اسے تھما دیا اور خود ریلیکس سی ہو کر بیڈ کے کراؤن سے ٹیک لگا کر قریب رکھا ریٹوٹ اٹھالیا اور مختلف چینل سرچ کرنے لگی، جانے سبینہ کو کتنے کتنا وقت ہو گیا تھا، اسے نیوی دیکھتے ہوئے احساس ہی نہ ہوا، لیکن اتنا ضرور ہوا کہ کمرے کے پرسکون ماحول میں اسے نیند سی آنے لگی، جانے کیوں اس کی آنکھیں بند ہی ہو رہی تھیں جنہیں وہ بمشکل کھول رہی تھی کہ اچانک دروازہ کھلنے کی آواز آئی، غالباً سبینہ واپس آئی تھی، وہ اسی بے فکری سے نیوی اسکرین کی جانب دیکھتے ہوئے بے فکری سے لپٹی رہی۔

”سبینہ نہ کہاں ہے؟“ اچانک ہی کانوں سے ٹکرانے والی مردانہ آواز سن کر وہ کراؤن کھا کر پلٹی، ”ادھر ادھر ہاتھ مارا، یاد آیا دیشا تو سبینہ نے لے گئی، وہ ایک دم شرمندہ ہو گئی، کیونکہ سامنے دکھائی دینے والا مرد صرف ایک ٹراؤزر میں پلوٹہ تھا اور واش روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

”دراصل میرے واش روم میں گرم پانی نہیں آ رہا تھا، اسی لیے ریا کا واش روم استعمال کرنا پڑا۔“ وہ قدرے وضاحت سے بولا۔

اس سے قبل کہ وہ کوئی جواب دیتی اسے غصہ کی کا زوردار جھٹکا سا لگا اور اس کے گرنے سے قبل ہی سامنے

کھڑے اجنبی مرد نے اسے تھام لیا۔
 ”آریو اوکے۔“ وہ اس پر جھکا ہوا دریافت کر رہا تھا، پلوٹہ نے چاہا کہ خود کو چھڑوائے لیکن اس کا جسم بے جان ہو چکا تھا۔

”لگتا ہے تمہاری طبیعت خراب ہے۔“

اسے خود سے قریب کرتے ہوئے وہ کان میں بولا۔ پلوٹہ کے جسم میں کچھ سی دوڑ گئی۔ اس نے چاہا کہ وہ دھکا دے کر اس اجنبی کو خود سے دور کر دے، لیکن جانے کیوں اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اس انجان مرد کے جسم سے آتی، بھینی، بھینی کلون کی خوشبو نے اسے مدہوش کر دیا ہے۔

”پلیز مجھے چھوڑ دو۔“ خود کو چھڑوانے کے لیے ناکام سی مزاحمت کرتے ہوئے وہ دم دم سی آوازیں بولی۔
 ”چھوڑنا ہوں یا ر، لیکن ایک بات ہے تم جو کوئی بھی ہو، پتہ قیامت کی ہو۔“

وہ اسے خود سے قریب کرنا ہوا بولا۔

”میرا خیال ہے تمہاری طبیعت خراب ہو رہی ہے تم یہاں لیٹو میں ریا کو بلا کر لاتا ہوں۔“ اسے ساتھ ساتھ لگاتے ہوئے بیڈ کے قریب پہنچ گیا۔ وہ چکراتے سر کے ساتھ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ اس کا سر جانے کیوں بھاری بھاری ہو رہا نیند بری طرح اس پر غلبہ پا چکی تھی، شاید میرا بلڈ پریشر لوہا ہے یا پھر رات کی بے آرائی۔ اس سے زیادہ وہ نہ سوچ سکی، کیونکہ اس کا ذہن سن ہو چکا تھا۔

”پلوٹہ! پلوٹہ۔“ وہ بارش میں بیگ رہی تھی اور ٹھنڈک بری طرح اس کے رگ و پے میں سرایت کر چکی، جب اسے محسوس ہوا کوئی اسے پکار رہا ہے، ایسے میں اچانک ہی بجلی کی تیز چمک سے وہ گھبرا اٹھی اور ایک تیز چیخ کے ساتھ اس کی آنکھ کھل گئی، پہلے تو اس کی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ وہ کہاں ہے پھر جیسے ہی اس کا ذہن بیدار ہوا آہستہ آہستہ اسے سب کچھ یاد آ گیا، وہ تیزی سے اٹھ بیٹھی۔ اس کے پاس ہی سبینہ بیٹھی تھی پانی کا پیالہ لے کر جو شاید اسے ہوش میں لانے کے لیے استعمال کیا گیا تھا اسے پکپکا ہٹ محسوس ہو رہی تھی۔

”شکریہ، تمہیں ہوش آ گیا، ورنہ میں تو ڈری گئی تھی۔“

سبینہ کی آواز اس کے کانوں سے ٹکرائی۔ اس کا سر ابھی بھی بھاری تھا۔

”کیا ناٹم ہوا ہے؟“ بمشکل اس کے منہ سے نکلا۔

”تین بجے ہیں۔“ شکر خدا کا، میں سبھی شام ہو چکی ہے، خود کو سنہال کر وہ جلدی سے بستر پر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اپنا بے ترتیب لباس درست کیا، جانے کیوں اس کا دل بھاری ہو رہا تھا، اسے خود بخود رونا آ رہا تھا۔

”سبینہ! پلیز مجھے جلدی گھر جانا ہے، کیونکہ میں اپنے گھر کالج کے بیٹا بازار کا کمرہ کرائی ہوں، اگر مجھے مزید دیر ہوگئی اور میری تلاش میں کوئی کالج تک آ گیا تو بہت مشکل ہوگی۔“ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں سبینہ کو مخاطب کیا۔

”وہ تو ٹھیک ہے یا ر، لیکن میرا خیال ہے، تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے، میں تمہیں خود ذرا سیور کے ساتھ جا کر چھوڑ آئی ہوں، اپنی امی سے کہہ دینا کہ کالج میں تمہاری طبیعت خراب ہوگئی تھی، پہلے ذرا منہ دھو کر فریش ہو جاؤ اور کھانا کھا لو۔“

”سبینہ! ہاتھ روم کی طرف جاتے ہوئے وہ ایک دم پلٹ آئی۔

”بولو۔“

”کچھ نہیں۔“ جانے کیا سوچ کر اس اجنبی مرد سے متعلق کوئی بھی سوال پلوٹہ کی نوک زبان پر آگرا واپس پلٹ گیا۔ یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ جوس پیتے ہی اس کا ذہن اتنا بوجھل کیوں ہو گیا تھا؟

”میں کھانا نہیں کھاؤں گی۔“ اپنی جانب منتظر نگاہوں سے نکلتی سبب سے کہتے ہوئے وہ تیزی سے واش روم میں گھس گئی اور پھر واپس آتے ہوئے تمام راستہ اس کا باغ الجھار ہا۔ وہ سمجھ نہیں پاری تھی کہ اس بات کو کس طرح سبب سے ڈسکس کرے؟ آج اسے احساس ہوا کہ اپنے گھر والوں کے علم میں لائے بغیر اٹھایا جانے والا چھوٹا سا قدم بھی کتنا خطرناک ہو سکتا ہے۔ وہ دل ہی دل میں شکر ادا کر رہی تھی کہ کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا جو اسے بدنامی کے عمیق گڑھے میں گرا دیتا، وہ اپنی عزت و ناموس کے محفوظ رہ جانے پر اللہ کی شکر گزار تھی۔ لیکن نہیں جانتی تھی کہ گھر والوں کو دیا جانے والا یہ چھوٹا سا قدم کہ جو بظاہر بے ضرر بھی تھا، آگے جا کر اس کے لیے کتنے بڑے بڑے مسائل کو جنم دینے والا ہے۔

جانے کیا بات تھی، پلوٹہ کا وہم تھا یا واقعی میں حقیقت تھی اسے سبب سے کاروبار پہلے سے خاصا تبدیل لگ رہا تھا، پہلے والی گرم جوشی اور محبت تقریباً ”مفقود ہو چکی تھی۔“ اس دن کے بعد سے وہ پلوٹہ کو جب کالج میں لے کر جاتی تو خاصی ناراض تھی، پلوٹہ کو لگتا کہ وہ جان بوجھ کر اسے انور کر رہی ہے، لیکن یوں؟ وہ ایساری ایکٹ کیوں کر رہی ہے؟ بغیر کسی وجہ کے اور یہی بات پلوٹہ کے ذہن کو الجھا رہی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ سبب سے پوچھے، لیکن اسے موقع ہی نہ مل رہا تھا یا شاید سبب نے جان بوجھ کر اسے موقع فراہم نہ کر رہی تھی۔

اس دن بھی وہ فری ریڈ میں بیڑھیوں پر بیٹھی ان ہی سوچوں میں گم تھی جب سبب نے بدی خاموشی سے اس کے پاس آکر بیٹھ گئی، کانوں میں ہیڈ فون ڈالے، بڑی بے فکری سے چوٹم چاتی ہوئی۔ آج کئی دنوں بعد سبب نے کو یوں اپنے پاس بیٹھا دیکھ کر پلوٹہ کو حیرت تو ضرور ہوئی، مگر کچھ بولی نہیں بلکہ خاموشی سے اپنی کتابوں میں الجھی رہی۔

”عماد تم سے ملنا چاہتا ہے۔“ بغیر کسی تمہید کے وہ اچانک پلوٹہ سے مخاطب ہوئی۔

”کون عماد؟“ وہ حیرانی سے بولی۔

”اب اتنی جلدی بھی نہیں ہو تم؟“ اچھی طرح جانتی ہو کہ عماد کون ہے۔

الفاظ تھے یا زہریلے ناگ جو پلوٹہ کو خود کو ڈھونڈتے ہوئے محسوس ہوئے، سبب نے کا انداز مخاطب اس کی سمجھ سے بالکل بالاتر تھا۔ اس کا ذلت آمیز خشک رویہ پلوٹہ کو حیران کر رہا تھا۔

”تین جانو، میں بالکل بھی کسی عماد کو نہیں جانتی۔“ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے وہ بمشکل بولی، اس کی آواز حلق میں ہی کہیں پھنس سی رہی تھی۔

”تو پھر یہ کیا ہے؟“ اگلے ہی پل سبب نے اپنا آئی فون اس کے سامنے کر دیا۔ سامنے ہی اسکرین پر نظر آنے والی تصویر نے اس کے چوہ طبق روشن کر دیے اور اسے بے ساختہ سبب سے کہہ جانے والا اپنا پہلا اور آخری دن یاد آگیا ساتھ وہ اجنبی بھی جسے سبب نے عماد کے نام سے پکار رہی تھی، وہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ اس ایک پل کو جب وہ پلوٹہ کے قریب تھا۔ اس طرح موبائل کی اسکرین پر منتقل کیا جائے گا اور پھر یاد آیا اسکول میں لکھا جانے والا موبائل فون کے نقصانات پر مضمون لیکن یہ تو۔

آگے اس کی سمجھ میں ہی نہ آیا کہ وہ کیا وضاحت دے۔

”دیکھو یا راجھے نہیں پتا کہ تمہارا اور عماد کا کیا سین ہے؟ اب بات صرف اتنی ہے کہ وہ تم سے ملنا چاہتا ہے۔“ سبب نے کاٹھنڈا اٹھا کر لہجہ پلوٹہ کو زمین میں گاڑ رہا تھا، جانے وہ کیا سمجھ رہی تھی۔

”سبب نے! میرا تین کرو۔ جو تم سمجھ رہی ہو ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔“ وہ دبا ہوا ہنسی ہو کر بولی۔

”چلو، میں کچھ بھی نہیں سمجھ رہی، سمجھنا تو تمہیں ہے، اگر تم عماد سے نہ ملیں تو ایس ایم ایس کے ذریعے وہ یہ تصویر نہ صرف بالاج بلکہ تمہارے دیگر رشتہ داروں کو بھی بھیج دے گا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ تمہارے سارے خاندان کو جانتا ہے، وہ تمہاری تصویریں بنا کر بھی سب کو پوسٹ کر سکتا ہے، تم نہیں جانتیں۔ وہ بہت کچھ کر سکتا

ہے، بہتر یہ ہے کہ تم ایک دفعہ اس سے مل لو، دیکھو وہ تم سے کیا کہنا چاہتا ہے؟ تم سے کیوں ملنا چاہتا ہے؟ ایک دوست ہونے کے نام پر یہ میرا تمہیں مشورہ ہے، باقی آگے جو تم بہتر سمجھو۔“ بات کرتے کرتے سبب نے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”اور ہاں اپنے فیصلے سے تم مجھے ایک ہفتہ تک آگاہ کرنا، ورنہ دوسری صورت میں ذمہ دار تم خود ہو گی۔“

کندھے پر بیک ڈالے وہ تیزی سے بیڑھیوں اتر گئی، یہ جانے بغیر کہ پیچھے رہ جانے والی ہستی کس حال میں ہے، یقیناً ”سبب نے“ جیسے لوگوں کو سوائے اپنی ذات کے دنیا میں کسی سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ پلوٹہ کو آج احساس ہوا کہ ماں کے علم میں لائے بغیر اٹھایا جانے والا ایک چھوٹا سا قدم، کبھی کبھی کتنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ یہ تو اس نے کبھی سوچا نہ تھا کہ سبب نے اس کے ساتھ اتنا برا دھوکہ کر سکتی ہے اب آگے کیا ہو گا؟ اس سوچ نے ہی اس کے دماغ کو ماؤف کر دیا، وہ اپنی تمام ہمت کو مجتمع کر کے بمشکل وہاں سے اٹھی اور پھر کس طرح گھر تک پہنچی اسے کچھ ہوش نہ رہا۔ گھر کے گلے گیٹ سے اندر داخل ہوتے ہی اسے تحفظ کے احساس نے اپنے حصار میں لے لیا، تھکی تھکی سی چال چلتی ہوئی وہ اپنے کمرے میں آئی اور بستر پر گر سی گئی۔

”اسے کیا ہوا ہے؟“ فریق سے کچھ نکالتی ہوئی لبنی کی نگاہ جیسے ہی پلوٹہ پر پڑی انہوں نے حیرت سے سوچا، جبکہ پلوٹہ ان کے پاس سے ایسے گزری جیسے نیند کے عالم میں ہو۔ انہوں نے فریق کا دروازہ جلدی سے بند کیا اور پلوٹہ کے پیچھے ہی کمرے میں آ گئیں۔

”کیا ہوا ہے تمہیں؟“ نڈھال سی پڑی پلوٹہ کو دیکھتے ہی وہ وحشت زدہ ہو گئیں، جوان بیٹی کی ماں تھیں، ایک دم ہی دل میں بے بنیاد اندیشے سر اٹھانے لگے، ایسے اندیشے جن سے وہ خود بھی گھبرا اٹھیں۔

”پلوٹہ! کیا بات ہے؟“ وہ تیزی سے چلتی ہوئی اس کے بستر پر آ گئیں اور جیسے ہی اسے کندھے سے تھام کر سیدھا کرنا چاہا، وہ تڑپ کر ماں کی بلک بلک کر رونے، اسے روتا دیکھ کر لبنی بیگم بدحواس سی ہو گئیں۔

”مجھے پتاؤ پلوٹہ! کیا ہوا ہے؟“

”کچھ نہیں امی!، بمشکل آواز اس کے حلق سے برآمد ہوئی۔“ راستے میں بہت برا الیکسیڈنٹ دیکھا تھا، اسی لیے دل بھرا تھا۔“ بروقت پلوٹہ کے ذہن میں آنے والے ہمانے نے لبنی کو دکھا تھا۔

”میں تو ڈر رہی تھی کہ جانے کیا بات ہے۔“ اسے خود سے دور کرتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئیں، ”تم ہاتھ منہ دھو کر بپا ہر آؤ۔ کھانا کھاؤ۔“

اسے ہدایت دے کر وہ باہر نکل گئیں اور پھر اگلا پورا ہفتہ وہ کالج ہی نہ گئی، کالج جانے کا خیال آتے ہی اس کا دل کانپ اٹھتا، لبنی بیگم اس کے کالج نہ جانے کو الیکسیڈنٹ کا خوف سمجھتے ہوئے خاموش تھیں، جبکہ پلوٹہ کو کبھی کبھی بالاج کا رویہ سہا دتا اسے ایسا محسوس ہوتا کہ وہ کھو جاتی ہوئی نگاہوں سے پلوٹہ کو تکتا ہے، حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ نہ صرف آج کل نیچے زیادہ آنے لگا تھا، بلکہ پلوٹہ کی پرہائی اور روزمرہ کے امور سے متعلق گفتگو بھی کرنے لگا تھا۔

اب وہ مزید چٹھیاں بھی نہیں کر سکتی تھی، کیونکہ امتحان سر پر تھے۔

وہ عشاء کی نماز پڑھ کر کمرے میں آئی، جب امی نے آواز دے کر پکارا کہ اس کی کسی دوست کا فون آیا ہے اور بغیر نام کے ہی وہ سمجھ گئی کہ فون کس کا ہو گا اور پھر پہلو کہتے ہی اس کے بدترین اندیشے کی تصدیق ہو گئی، دوسری طرف سبب نے تھی۔

”کہاں غائب ہو تم؟“ بغیر کسی سلام دعا کے ایک سپاٹ اور خشک لہجہ پلوٹہ کے کانوں سے نکرایا۔ کافی دیر تو وہ بول ہی نہ سکی۔

”طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔“ مری مری آواز بمشکل اس کے حلق سے نکل۔

”اوہو! اچھا۔ اب کیسی ہو؟ بہر حال یہ جتاؤ کالج کی آ رہی ہو؟“

پہلے سوال کا جواب جانے بغیر ہی وہ اپنے مطلب کی بات پر آگئی وہ خاموش رہ گئی۔

”دیکھو میری بات سنو، وہ تم سے صرف ملنا چاہتا ہے اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے، وہ تمہاری ساری تصویریں ڈیلیٹ کر دے گا بشرطیکہ تم ایک بار اس سے مل کر درخواست کرو۔“

”میں شاید کل آ جاؤں۔“ وہ مرے مرے لہجے میں بولی، مبینہ نے فون بند کر دیا۔ جبکہ کتنی دیر تک ریسیور اپنے ہاتھ میں تھا، اسے پلوٹہ ساکت سی کھڑی رہی۔

”فون کس کا تھا؟“ وہ بالکل اس کے قریب ہی کھڑا تھا۔

”دوست کا۔“ مزید کوئی سوال نے بغیر وہ تیزی سے اس کے قریب سے گزر کر کمرے میں آگئی اور وہ ساری رات اس نے ایک عجیب سی کیفیت میں گزار دی۔ جانے کیوں ایک انجانے خوف نے اسے اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ اسے پتا تھا، کچھ ہونے والا ہے، ایسا کچھ جو اسے تباہ و برباد کر دے گا۔ وہ اپنی اس کیفیت کو کسی سے شیئر نہیں کر سکتی تھی، وہ بے وقوف لڑکی اپنیوں کے شدید رد عمل سے سہمی ہوئی تھی، لیکن یہ نہ جانتی تھی کہ ماں سے زیادہ اولاد اور وہ بھی بیٹی کا کوئی غم گسار نہیں ہو سکتا۔ وہ ساری رات اس نے سوئے جانے کی زاری دی۔ صبح تیار ہو کر جیسے ہی ناشتا کرنے ڈائننگ ٹیبل پر پہنچی سامنے ہی اخبار پڑھتے بلال ج کو دیکھتے ہی خون مزید خشک ہو گیا۔ یہ اتنی صبح صبح نیچے کیا کر رہا ہے سوچا ضرور لیکن زبان سے کچھ نہ کہا اور خاموشی سے کرسی چھینچ کر ٹائٹلے کے لیے بیٹھ گئی، لیکن اس تمام عرصہ جانے کیوں اسے محسوس ہوا کہ بظاہر اخبار پڑھتا بلال مکمل طور پر اس کی جانب متوجہ ہے، پہلے ہی اس کا ناشتا کرنے کا دل نہ چاہ رہا تھا، اب اس نے احساس نے اس کی بھوک کو بالکل ہی ختم کر دیا، دو تین تفرقے لینے کے بعد اس نے ہاتھ میچھینچ لیا۔

”کیا بات ہے بیٹا! ناشتا کیوں کر رہیں؟“ چائے کا گھونٹ لیتے رحمان صاحب نے بوئے ہی پیار سے اسے مخاطب کیا۔

”ویسے ہی ابوالدیل نہیں چاہ رہا، کینٹین سے کچھ کھالوں گی۔“ آہستہ سے کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا سی گئی، جس پر صبح کی افرا تفری میں کسی نے دھیان ہی نہ دیا۔ اسی دم باہر سے آتی دین کے ہارن کی آواز سننے ہی اس نے بیک اٹھایا اور خاموشی سے باہر کی جانب چل دی۔

”ٹھہرو۔“ لاؤنج کا دروازہ کھولتے ہی پیچھے سے آتی بلال ج کی آواز نے اس کے قدم جکڑ لیے ”یا اللہ خیر۔“ دروازہ کے پینڈل پر رکھا اس کا ہاتھ کانپ سا گیا اور وہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھ سکی۔

”چلو! میں تمہیں چھوڑ آؤں؟“ اس کے پاس سے کہتا ہوا وہ تیزی سے باہر نکل گیا اور وہ مرے مرے قدموں سے اس کے پیچھے چل دی اور پھر سارے راستہ وہ یہی دعا کرتی آئی کہ مبینہ نہ اسے کالج سے باہر نہ مل جائے، ورنہ یقیناً ”آج اس کی خبر نہ تھی۔“

ان ہی سوچوں میں گھری جانے کب کالج آیا اسے پتا ہی نہ چلا۔

”واپسی میں لینے آ جاؤں؟“ بلال ج کی آواز نے اسے سوچوں کی دنیا سے باہر کھینچ نکالا۔

”نہیں۔“ میں دین میں ہی آ جاؤں گی۔“ آہستہ سے جواب دے کر وہ گاڑی کا دروازہ بند کرتی باہر نکل گئی اور کالج گیٹ سے اندر داخل ہونے تک اسے اپنی پشت پر بلال ج کی نگاہیں محسوس ہوتی رہیں۔

”بابا! میں شام تک حویلی پہنچ جاؤں گا اور وہ میرے ساتھ ہی ہوگی۔“

فون پر رابطہ ہوتے ہی عماد نے فلک شیر کو اطلاع دی۔

”نہیں۔ تمہیں اس کو یہاں نہیں لے کر آنا۔“

علی شیر کے جواب نے عماد کو حیران کر دیا، کیونکہ سب کچھ پہلے سے پروگرام کے مطابق طے تھا، پھر اچانک اس تبدیلی کی وجہ اس کی سمجھ میں نہ آئی، لیکن پھر بھی وہ کوئی سوال کر کے اپنے بابا کے غیض و غضب کا تحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے بہتری اسی میں تھی کہ خاموشی سے ان کی اگلی ہدایت سنی جائے۔

”جی بابا!“ وہ جانتا تھا کہ یہ دو الفاظ ہی اس کے انار پرست باپ کو پسند ہیں۔

”تم نکاح کر کے اس لڑکی کو گھر بھیج دینا باقی حساب کتاب اس کے گھر آکر میں خود جنید رضا عباسی سے لوں گا۔“ اپنا چھبیس سالہ پرانا حساب بالکل اسی طرح بابا! جس طرح اس نے ہم سے لیا تھا، میں بھی اسے اس کے شہر میں ہی ذلیل کروں گا، ساری دنیا کے سامنے پولیس لے کر جاؤں گا میں بھی اس کے گھر، عماد جس طرح وہ تیری پھوپھی کو لینے پولیس لے کر آیا تھا۔“

اور عماد اپنے باپ سے۔ یہ بھی نہ پوچھ سکا کہ پھوپھی نے تو جو کچھ کیا اپنی رضا سے کیا تھا، لیکن جو ہم آج اس لڑکی کے ساتھ کرنے جا رہے ہیں، وہ بے خبر تو اس سے انجان ہے، لیکن اپنی روایتوں اور بدلہ کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ایک بڑھے لکھے شخص کی زبان بھی گنگ تھی اور اس وقت اس کا مقصد صرف اور صرف آج سے سالوں پہلے جنید رضا عباسی کے عمل کا بدلہ تھا جو ہر حال میں اس کے خاندان کو بھگتنا تھا، بدلہ جو لینے تو بظاہر مردو ہیں، لیکن اس کی زو میں بیٹھ عورت آئی ہے۔ مردوں کے اس معاشرے میں ایک عورت کو پھر سے رسوا ہونا تھا۔ اس کی اگر غلطی تھی تو صرف اتنی کہ اس نے دوستی پر اندھا اعتبار کر کے اپنے گھر والوں کو بے اعتبار کیا۔

”یہ تمہارا گھر تو نہیں ہے؟“ سامنے نظر آنے والے مشہور فانیو اشار ہوٹل کے پاس ہی گاڑی رکھتے دیکھ کر بے ساختہ پلوٹہ کے منہ سے نکلا۔

”ہاں۔“ تمہیں عماد نے ملنے کے لیے یہاں ہی بلایا ہے؟“

”لیکن تم نے تو کہا تھا۔“ وہ ہراساں ہو گئی۔

”ہاں ڈیر! میں نے کہا تھا کہ وہ تم سے میرے گھر ملے گا، لیکن جانے کیوں رات اس نے اپنا پروگرام تبدیل کر دیا۔“ دروازہ کھول کر ہار نکلتے ہوئے اس نے لا روایتی سے جواب دیا۔

”کچا ڈیر! پارکنگ میں مت لگنا، میں ابھی واپس آ رہی ہوں۔“ ڈرائیور کو ہدایت دے کر وہ آگے کی جانب چل دی اور مرنا کیانہ کرنا کہ مصداق وہ بھی قدم کتنی اس کے ساتھ ہوئی۔

”مگر آج میرے گھر کے کسی فرد نے مجھے یہاں دیکھ لیا تو یقیناً“ مجھے زندہ دفن کر دیا جائے گا۔“ یہ سوچتے ہوئے بھی وہ دل ہی دل میں دعا کر رہی تھی۔

”کاش مجھے یہاں بلال ج مل جائے، بے شک وہ مجھے جان سے مار دے، لیکن میں اس اذیت سے توجہ جاؤں گی، اے میرے خدا! میری عزت کو محفوظ رکھنا۔“ بے خیالی میں مبینہ نے کے ساتھ چلتی ہوئی وہ ایک روم کے سامنے رک گئی جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

”تم جاؤ اندر، واپسی میں تمہیں عماد جھوڑے گا۔“

”پلیز مبینہ!“ آخری بار التجا۔

”دیکھو پلوٹہ!“ ایک بار اس کی بات سن لو، اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ صرف ایک بار تم سے مل کر وہ تمہاری ساری تصویریں موبائل سے ڈیلیٹ کر دے گا اور پھر تمہیں کبھی تنگ نہیں کرے گا۔“ وہ پلوٹہ کا ہاتھ تھامے اسے یقین دہانی کروا رہی تھی، لیکن جانے کیوں اسے یقین نہ آ رہا تھا، یہ کرا اسے ایک پنجرہ لگ رہا تھا، جہاں قید ہونے کے بعد وہ بھی باہر نہ نکل پاتی اور پھر شاید یہ قید ختمی اس کا مقدر بننے والی تھی۔

”او کم آن یا راجو بات کرنی ہے اندر اگر کرو۔“

دروازہ میں یقیناً ”عماد تھا جو اس کا منتظر تھا۔“

”بس عماد! میں چلتی ہوں، تمہارا کام ہو گیا۔ میری رقم میرے اکاؤنٹ میں آج ہی آجانی چاہیے۔“ مسیونہ تیزی سے آگے بڑھ گئی، پلوٹھ کا ایک نئی حقیقت سے روشناس کروا کر یہ سب کچھ پیسے کے لیے کیا گیا تھا۔

مسیونہ سے نفرت کے شدید احساس نے اسے گھیر لیا۔

”اجا پلوٹھ! یہاں بیٹھو، مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

وہ جو جانے کیا کیا سوچ رہی تھی۔ عماد کے الفاظ سننے ہی چونک اٹھی اور خاموشی سے اس کی جانب ٹکر ٹکر دیکھ گئی جو نہایت سنجیدگی سے ہاتھ باندھے اس کی جانب متوجہ تھا۔

”میں نہیں بیٹھ رہی، تم مجھے یہ بتاؤ کہ تم نے یہ سب کیوں کیا؟ میں نے تمہارا کیا کیا ڈانٹا تھا؟ کیوں بلوایا مجھے اس طرح یہاں اس ہوٹل میں؟“

عماد کے رویہ نے اسے حوصلہ بخشا، یقیناً ”بات کچھ اور تھی جو وہ سمجھ رہی تھی، وہ نہ تھا اس خیال کے آتے ہی وہ لگا تار سوال کر بیٹھی۔“

”تم نے کچھ نہیں بگاڑا، تم تو صرف سزا دینے والی ہو، اس عمل کی جو تمہارے خاندان والوں نے چھیس سال پہلے کیا تھا، ہمیں رسوا کر کے۔“

”میرے خاندان نے؟“ وہ حیرت زدہ سی تھی۔

”ہاں پلوٹھ! تمہارے تباہ چند عباسی نے ہمیں چھیس سال پہلے جو ذلتیں بخشی تھیں، آج اس کا حساب برابر ہو گا۔ میں تمہیں کچھ بھی نہیں کہوں گا، صرف تمہیں مجھ سے نکاح کرنا ہو گا، پھر میں تمہیں واپس گھر چھوڑ آؤں گا۔“ اطمینان سے یہ سب کتاوہ پلوٹھ کو پاگل لگا۔

”واٹ ڈیو مین! تم پاگل ہو کیا؟“ وہ چلا اٹھی۔ ”نکاح کا مطلب سمجھتے ہو؟ اور میں تم سے نکاح کیوں کروں؟ کمال ہے تم نے نکاح کو کوئی کھیل سمجھ رکھا ہے؟“

”چلاؤ مت، مجھے تم سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، میں آل ریڈی شادی شدہ ہوں۔“ ایک اور انکشاف۔

”یہ سب تو میں اپنے بابا جان کے کہنے پر کر رہا ہوں۔ میرا یقین کرو، نکاح کے بعد میں تمہیں بٹا ہاتھ لگائے گھر چھوڑ آؤں گا، بالکل ویسے جیسے تمہارے تایا نے میری بیوی کے ساتھ کیا تھا۔“ استہزاء سے لہجہ۔

”اور پھر حویلی والوں کے ساتھ تمہیں رخصت کروانے آؤں گا۔“ وہ آہستہ آہستہ چلتا اس کے قریب آیا ”مجھے صرف اپنی پھوپھو خوشنما کا بدلہ لینا ہے۔“

”خدا کے لیے ایسا نہ کرو۔“ بالاج کے تصور نے اسے رلا دیا اور وہ ہاتھ باندھ کر عماد کے سامنے کھڑی ہو گئی، آنسو اس کے چہرے کو بھگو گئے۔ اسے آج پتا چلا کہ اس کے گھر والے اتنے محتاط کیوں تھے، کاش یہ سب داستان اسے پہلے پتا ہوتی تو وہ بھی اتنی ہی محتاط ہوتی، لیکن اب کیا ہو سکتا تھا۔ وقت تو گزر گیا اور گزر اوقات شاید کبھی واپس نہیں آتا۔

”پلیز عماد! مجھے جانے دو۔“ میرا تو اس قصہ میں کوئی قصور نہیں ہے۔“

”قصور ہے پلوٹھ! تمہارا قصور ہے، تم اس خاندان کی عزت ہو جس کو ہم نے مٹی میں ملانا ہے۔“

بے بسی عماد کے لہجہ میں آئی اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتی اچانک دروازے پر ہونے والی دستک سے دونوں ہی چونک اٹھے۔

”یقیناً“ سجاد قاضی صاحب کو لے کر آیا ہو گا، تم واش روم میں جا کر منہ ہاتھ دھو لو۔“ اسے ہدایت دیتا وہ تیزی سے دروازے کی جانب بڑھا اور بے فکری سے لاک کھول دیا، دروازہ کھلتے ہی کسی نے عماد کو دھکا دیا اور کچھ افراد

تیزی سے کمرے میں داخل ہو گئے جن میں سے ایک یقیناً ”بالاج تھا“ جسے دیکھتے ہی پلوٹھ کے جسم میں بجلی سے بھر گئی۔

”اللہ تیرا شکر ہے؟“

آخری احساس اس کے ذہن میں جاگا اور پھر شاید وہ بے ہوش ہو گئی، اس کا شدید نروس پریک ڈاؤن ہوا تھا اور پورے ایک ہفتہ بعد جب وہ ہوش میں آئی تو شرمندگی کے شدید احساس میں گھری ہوئی تھی، وہ خود کو کسی سے بات کرنے کے قابل نہ پاتی تھی۔

ہوش میں آتے ہی اس کے ذہن میں بہت سے سوالات نے سر اُبھارا، جن میں سب سے قابل ذکر سوال تو یہ تھا کہ بالاج اس تک کس طرح پہنچا؟ پھر وہ جاننا چاہتی تھی کہ اس کی تائی خوشنما کے بارے میں جو کچھ عماد نے بتایا کیا وہ درست تھا؟ لیکن وہ خود کو اس کے قابل نہ پاتی تھی کہ کسی سے کچھ پوچھتی، وہ تو صرف یہ ہی سوچ سوچ کر شرمندہ تھی کہ عماد کے ساتھ ہوٹل کے کمرے میں اپنے موجود ہونے کا کیا جواز اپنے گھر والوں کو پیش کرے گی؟ وہ اس وقت سے ڈر رہی تھی جب یہ سوال اس سے کیا جائے گا؟ اسے سب سے زیادہ فکر بالاج کی تھی جس دن سے وہ ہوش میں آئی تھی بالاج اس سے ملا ہی نہ تھا، وہ نیچے آتا ضرور تھا اس کی آواز کسی نہ کسی وقت اس کے کان میں پڑ جاتی تھی، لیکن کبھی وہ پلوٹھ کے سامنے نہیں آیا۔



اس دن غالباً ”اتوار کا دن تھا“ صبح سے ہی نمرو آئی ہوئی تھی، دو دفعہ وہ اس کے کمرے سے چکر لگا کر گئی تھی، لیکن وہ جان بوجھ کر سوئی بن گئی، لیکن جب وہ تیسری دفعہ اس کے لیے ناشتالے کر آئی تو پلوٹھ خور سے اختیار کھو بیٹھی اور بے ساختہ اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی، نمرو نہایت پیار سے اس کی پشت سلاتی رہی۔

”میں بہت بری ہوں نمرو! میں نے تم سب کو دھوکا دیا۔ کاش میں مر جاتی۔“

”پاکل ہو گئی ہو کیا جو فضول بول رہی ہو، شکر کرو، تمہیں اللہ تعالیٰ نے کسی بڑے نقصان اور ہمیں بدنامی سے بچا لیا، یہ سوچو اگر اس دن وہاں بالاج بھائی نہ جاتے تو کیا ہوتا۔“

نمرو اسے خاموش کرواتے ہوئے دھیرے دھیرے سمجھا رہی تھی۔

”لیکن بالاج وہاں کیسے پہنچا؟“ یہ سوال خود بخود اس کی زبان پر آئی گیل، مسیونہ کی مدد سے وہ عماد سے محبت کرنے لگی تھی، اس نے عماد سے اپنی چاہت کا اظہار کیا تو عماد نے اس کو اس کی اوقات یاد دلائی اور کہا ایسی لڑکی جو پیسے سے خریدی جاسکتی ہے، جس کا دین ایمان پیسہ ہے۔ اس کی محبت مذاق کے سوا کچھ نہیں ہو سکتی۔ اس کے گہمے میں اتنی حقارت تھی کہ مسیونہ نفرت اور انتقام میں پاگل ہو گئی۔ اس نے عماد سے بدلہ لینے کے لیے عین وقت پر بالاج سے رابطہ کر کے اسے سب کچھ بتا دیا۔ بہر حال جو ہوا سو ہوا، اللہ کا شکر کرو کہ تم بحفاظت گھر آ گئیں۔ اور تم اب یہ تو جان ہی چکی ہو گی کہ عماد کون ہے؟ تو سمجھ لو یہ سب کچھ میرے خفیہ خیال والوں کا کارنامہ ہے۔ وہ نفرت، بدلہ کی آگ جس میں وہ پچھلے چھیس سالوں سے جل رہے ہیں۔ لیکن شکر کرو وہ اپنے اس گھناؤنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بہر حال اس سب کے باوجود بالاج نے بدنامی سے بچنے کے لیے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی۔ اور پھر عماد نے تو بالاج سے معافی بھی مانگ لی ہے اور تمہیں پتا ہے، آج میں یہاں کیوں آئی ہوں۔“

بات کرتے کرتے رک کر اس نے ایک نظر پلوٹھ کے ستے ہوئے چہرے پر ڈالی جس پر کھنڈی زردی نے نمرو کے حساس دل کو دکھایا اور پلوٹھ کو اپنی جانب سوالیہ نگاہوں سے تنکٹا کر اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

”رات بابا کا فون آیا تھا، وہ چاہتے ہیں کہ اب جلد از جلد تمہاری اور بالاج کی شادی ہو جائے۔“

”پلیز نمرو! تم تایاجی کو منع کرو مجھے بالاج سے شادی نہیں کرنی۔“
نمرو کی بات ختم ہوتے ہی وہ ایک دم تیز آواز میں چلا اٹھی۔ اس کی بات سنتے ہی نمرو گھبرا اسی گئی۔
”کیا کہہ رہی ہو تم پلو! تم ہوش میں تو ہو۔“ اسے یقین ہی نہ آیا کہ یہ الفاظ پلو شہ کی زبان سے ادا ہوئے ہیں۔
”ہاں نمرو! میں سچ کہہ رہی ہوں میں بالاج سے شادی کر کے ساری زندگی اس کی نفرت کا نشانہ نہیں بن سکتی۔“ وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر سسکا اٹھی۔
”میں جانتی ہوں بالاج مجھے کبھی بھی پسند نہ کرتا تھا اور اب اب تو شاید کبھی بھی نہیں اب تو میں اس کے قابل رہی بھی نہیں ہوں۔“

”کیسے بلو شہ، ڈرو مت، جو تمہارے دل میں ہے کہہ ڈالو میں بالکل برائے مانوں گا۔“ وہ اپنی بات کہتے ہوئے کرسی کھینچ کر اس کے بیڈ کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

”تمہیں اپنی پسند اور ناپسند کا اختیار ہے، اگر تم مجھے پسند نہیں کرتیں تو صاف صاف کہہ دو، یقین جانو میں بالکل برائے مانوں گا اور جہاں تم کہو گی وہیں تمہاری شادی کرانے میں تمہاری مدد کروں گا۔“

”یہی کوئی بات نہیں ہے؟“ وہ اس الزام پر زور نہ لگایا ”میں تو صرف آپ کی وجہ سے۔“

”کیا میری وجہ سے؟ کھل کر کہو، تم سے کس نے کہا میں تمہیں پسند نہیں کرتا۔“

”کسی نے نہیں۔“ وہ کمزور لہجہ میں بولی۔ ”لیکن اس سب کے بعد بھی آپ کیسے مجھ سے شادی کر سکتے ہیں؟“

دل کی بات لبوں پر آہی گئی۔

”نہیں نہیں۔“ پولو شہ بے ساختہ بولی ”یہ میں نے کب کہا ہے؟“ بالاج بے اختیار ہنس پڑا تو اس نے جھینپ کر سر جھکا لیا۔